دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS · CPNE

11 — چینی، نکتہ چینی — مدیراعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

18 — جال در جال — سلیم فاروقی

عالمی طاقتوں کے بے رحم شکنجے میں جکڑے ہوئے
ایک دلیر اور جانفروش نوجوان کی جدوجہد مسلسل...

77 — دستِ قاتل — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جرم... محبت اور شہرت
کی مثلث کا سنگین احوال

87 — خریدار — بابر نعیم

ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی فنکاری جوہر
حال میں اپنا فائدہ چاہتا تھا...

94 — للکار — طاہر جاوید مغل

محبت کے محاذ پر ٹھکرائے ہوئے شخص کی جدوجہد...
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

137 — مکین و مکان — کاشف زبیر

چلبلے اور شرارتی جلیل میاں کا ایک اور کارنامہ...
لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دینے والا سلسلہ

151 — ہم سفر — تنویر ریاض

ایک زیرک و دانا سراغرساں کا مشاہدہ
جو جرم کی تہ تک جا پہنچا تھا

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

160 — گرداب — اسما قادری

تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی کا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195 — سودا — سیرینا راض

ایک سودے کی آڑ میں کھیلے جانے
والے کھیل کا انوکھا ماجرا...

209 — خاندانی مجرم — جمال دستی

ایک روایت پرست خاندان
کے سربراہ کی موت کا پراسرار معما

219 — کار فراڈ — مختار آزاد

ایف بی آئی کے ایجنٹ کے لیے دردِ سر بن
جانے والے کیس کی سنسنی خیز روداد

236 — زاد ہمزاد — سرور اکرام

رہ حیات میں مل جانے والے زاد ہمزاد
کی ہم نشینی کا ماجرائے فسوں

262 — وطن فروش — امیمہ سلیم

ایک وطن فروش کے دلیرانہ اقدام ماہِ
آزادی کے موقع پر خصوصی کہانی

000 — تراش خراش — ادارہ و قارئین

اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کے
کچھ آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے

جلد 42 • شمارہ 07 • اگست 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اگست 2012ء کا یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک رمضان المبارک کا پہلا بابرکت عشرہ گزر چکا ہوگا اور دوسرے عشرے کی عبادات کے ساتھ عیدالفطر کی تیاریاں بھی زور پکڑ چکی ہوں گی۔ رمضان المبارک کی آمد تو ویسے ہی نہایت خوشی کی بات ہے مگر اس بار رمضان کے چاند نے خوشیوں کو اس لیے بھی دوبالا کیا کہ کئی سالوں بعد بنا کسی اختلاف کے، سب نے رویتِ ہلال پر اتفاق کیا۔ پورے ملک میں ایک ہی روز پہلا روزہ رکھا گیا۔ اس 'اتفاق' نے دل کو وہ راحت بخشی کہ اب چاند سے گزارش ہے کہ برائے مہربانی عید کے موقع پر بھی ایک ہی دن نظر آنا تا کہ پورے ملک میں ایک ہی عید ہو۔ عید، روزہ اور افطار ایک ساتھ... کئی بار یہ منظر دیکھ چکے، اب روزوں کی طرح عید بھی ایک ہی دن ہو تو وہ قومی یکجہتی کا بہت حسین منظر ہوگا... عید کے دن... حقیقی معنوں میں روزِ عید جیسا۔

اس ماہ ہمیں اکٹھی تین خوشیاں ملیں۔ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں کا ساتھ، یومِ آزادی کی آمد آمد اور پھر عیدالفطر کا تحفہ۔ وہ بھی رمضان المبارک کی بابرکت ساعتیں ہی تھیں جب 1947ء میں پاکستان کا جنم ہوا تھا۔ اس بار پھر آزادی کا وہ دن رمضان المبارک کے دوران آیا ہے۔ دعا ہے کہ رب العزت! اس ماہِ مبارک کی برکت سے ہمارے ملک پر رحمتوں کی وہ تیز بارش برسا دے جس سے دلوں میں بھرا نفرتوں کا میل کچیل، بدعنوانیوں کا کھوٹ... سب کچھ دُھل دُھلا جائے اور پاکستان آئینے کی طرح اُجلا ہو جائے (آمین)۔

تمام قارئین کو ہماری طرف سے رمضان المبارک، یومِ آزادی اور عیدالفطر کی دل کی گہرائیوں سے مبارک باد!

اپنی بات تو کرلی... چلیے! اب رخ کرتے ہیں آپ کے حلقۂ نامہ کا اور سنتے ہیں کہ کیا ہے آپ کے نامۂ دل میں!

لاہور سے کرن خان کی داستان ''آٹھ سال کی عمر سے ہی سب موسموں کے ناز و انداز، برکھا کی شوخی و رنگینی، سرما کی خنکی و یخ بستگی، خزاں کی اداسی و ویرانی و پژمردگی اور گرما کی حرارت و تیزی، حدت و شدت جو آج کل اپنے پورے عروج پر ہے اور باقی سب موسموں کی طرح ہماری نازک طبیعت اور جسم و جاں کو عجب سی بے قراری میں ڈال جاتی ہیں۔ ان موسموں کو ہماری نازک سی طبیعت برداشت کر بھی لیتی ہے مگر ستم بالائے ستم یہ حکم بھی صادر نہ ہوتا کہ جی پڑھائی کرو۔ اب ایسے موسموں اور ایسی حالت میں کوئی کب تک اور کیونکر پڑھے؟ جب ہماری طبیعت بوجھل ہونے لگتی تو ہم چوری چھپکے سے اپنے انکل کے گھر جا کر جاسوسی اٹھا لاتے کیونکہ... جوائنٹ سسٹم فیملی میں ہمیں اجازت نہیں تھی، کورس کے علاوہ کچھ بھی پڑھنے کی کیونکہ ہمارے گھر والوں کے خیال میں ہماری یہ عجیب و غریب شخصیت بنانے میں انہی میگزینز کا ہاتھ ہے۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہم نے جاسوسی کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں تو اب جاسوسی کا بھی امتحان لینا چاہیے۔ یہی سوچ کر اور گھر والوں کے ڈراوؤں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال کر پورے یقین کے ساتھ ایک خط بھیج ڈالا۔ اب اگر ہم آپ کو خط بھیجنے کے جاں کنی لمحات بھی بتائیں تو بس پھر! قصہ مختصر یہ کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ٹکٹ لگے خط والے لفافے کے پیچھے بیسیوں مرتبہ دوڑا دوڑا کر اور پھر بھی ٹکٹ لگا لفافہ نہ پا کر ہم نے غصے میں سادہ سے لفافے میں خط بھیج ڈالا جو کہ ٹکٹ کے بغیر اتنی دور پہنچنے سے رہا مگر 5 فروری کی حسین شام جب ہم نے اپنا خط پڑھا تو بارہا آنکھیں ملنے کے باوجود بھی یقین نہ آیا۔ یونہی لگا جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ فٹافٹ سب کو دکھایا اور دل ہی دل میں پھولے نہ سمائے کہ ہماری پہلی ہی کوشش رنگ لائی۔ اس کے بعد دو بار ہم نے خط بھیجا ہم دونوں بار محفل میں ہمارا خط ندارد اور ہمارا وہ سارا غرور اور خمار جو ہمارا پہلا خط چھپنے پر چڑھا تھا، ماند پڑ گیا اور پھر تو جیسے گھر میں ہمارے مخالفین کو آتے جاتے ہمیں چھیڑنے کا اچھا کام مل گیا۔ آج آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ہم یہ سب آپ کو بتا کیوں رہے ہیں اور غالباً آپ کو یہ بھی لگ رہا ہوگا کہ ہم آپ سے شکوہ کر رہے ہیں۔ لو جی ایسا کچھ اگر آپ نے سوچا تو بالکل غلط سوچا۔ ہم ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر رہے، ہمیں آپ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ ہم اچھی طرح سے جانتے اور سمجھتے ہیں اس بات کو کہ آپ کی بھی مجبوریاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ ہم تو صرف اور صرف اپنا بھرا ہوا دل ہلکا کرنا چاہ رہے ہیں۔ سوری جی، اتنا خط تو ہم نے جولائی کا شمارہ خریدنے سے پہلے لکھا تھا۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ ہمارا پرانا والا خط چھاپ دیں گے۔ ویسے ایک بات ہے، اگر ہمارا یہ پرانا خط جو آپ نے جولائی کے شمارے میں چھاپا ہے اگر اپنے صحیح ٹائم پر شائع ہوتا، تو بھی ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوتی یقیناً ہوتی مگر ہمیں اب جو خط پڑھ کر مزہ آیا ہے نا، تب نہ آتا، سچ میں جی، بہت مزہ آیا۔ اس مرتبہ شمارہ نئی خوب صورت دوشیزہ کے دیدار کی شکل میں ملا۔ حسین نقش و نگار دل میں اتر گئے پر ساتھ کارٹون نما آدمی ذرا اچھا نہیں لگا۔ چینی، نکتہ چینی میں سب فرینڈز لوگ کے تبصرے شاندار تھے۔ پہلا شوہر ایک دلچسپ تحریر تھی۔ منصوبہ ساز اور عقل کا اندھا بہت سیدھی سیدھی تحریریں تھیں۔ مطلب ایسی تحریریں جن کا دی اینڈ کہانی کے درمیان میں ہی تقریباً تقریباً پتا چل جاتا ہے۔ استاد شاگرد بس گزارے لائق ہی تھی، البتہ اپنا راستہ ہمیں بہت اچھی لگی۔ ٹکٹ کی چوری اور حسرت تیز رفتار اور سسپنس سے بھرپور تحریریں تھیں۔ للکار اس بار بھی فل ٹائم ایکشن میں نظر آئی اور جلالی صاحب کی غیر معمولی اور دلچسپ شخصیت سے کہانی کا لطف زیادہ ہو گیا۔ اور گرداب کے لیے یہی کہ فل ٹائم سپرسونک رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ قرض کا فرض بہت ہی دلچسپ اور دکھ بھری کہانیوں پر مشتمل ایک کہانی تھی۔ ہم بور ذرا بھی نہیں ہوئے پڑھتے ہوئے، اچھی لگی اور سرورق کے دوسرے رنگ کے رائٹر تو ویسے ہی ہمارے فیورٹ ہیں، ان کا لکھا ہوا سب کچھ پسند آتا ہے ہمیں۔''

کراچی سے احمد خان توحیدی کی وجوہات ''محفل میں پہلی بار شرکت کی وجہ، کچھ وقت سے میں سرگزشت و سسپنس کی محفل خطوط میں گاہے

بگاہے شرکت کرتا ہوں۔ ساتھیوں کا شکوہ جاسوسی بھی پڑھتا ہوں تو محفل میں شرکت کیوں نہیں کرتا؟ جاسوسی کی گرداب، للکار، پہلی و آخری رنگ لاجواب کہانیاں ہوتی ہیں۔ نجی مشورہ قسط وار کہانیاں جیسے للکار، گرداب سرگزشت کی سراب زیادہ سے زیادہ 20 قسط سے 24 قسط تک دو سال کی ہونی چاہئیں، تاکہ قاری کہانی کا انجام جان سکیں۔ میرے دونوں ہمسائے میرے مطالعے کے بعد پڑھتے تھے، قسط وار کہانیوں کا انجام جاننے کی حسرت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چاروں رسالے یہاں سے مطالعے کے بعد آبائی گاؤں چکری راولپنڈی بھیجتا ہوں۔ ادھر بھی کچھ بزرگ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جاسوسی کی محفل میں عدم شرکت بروقت مطالعے کے بعد ٹائم ختم ہونا ہے۔ حقیقی اردو کہانیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ جاسوسی کی تحریریں اچھی معیاری ہوتی ہیں، اہلِ محفل کو سلام۔''

سپاہی صابر علی کی کراچی سے آمد ''دو جولائی کو کراچی آنا ہوا ایک بک اسٹال پر اپنا من پسند جاسوسی ڈائجسٹ نظر آیا جو کہ تپتی دوپہر میں ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے کی طرح لگا۔ سرورق کو نظر انداز کر کے کانپتے ہاتھوں سے اپنی محفل میں آئے۔ تفسیر عباس بابر آپ دعا کریں کہ میری پوسٹنگ اوکاڑہ کینٹ ہو جائے پھر انشاء اللہ آپ سے ملاقات کریں گے۔ اعجاز احمد کی طرح آپ سے کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ پریشان نہ ہوں میں بھی ساہیوال کا رہنے والا ہوں لیکن ڈیوٹی کی وجہ سے آج کل حیدر آباد تھا لیکن اب کراچی میں ہوں۔ تمام لوگوں کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ صرف اتنی سی گزارش ہے کہ تھوڑی سی جگہ نئے آنے والوں کے لیے چھوڑ دیا کریں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ گرداب پڑھی۔ اسما قادری کو کہانی اس خوب صورت طریقے سے آگے بڑھانے پر مبارک باد۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ملک دشمن سے نمٹنے کی توفیق دے۔ للکار کافی الجھ گئی ہے۔ اس میں کئی سلسلے چل پڑے ہیں۔ کاشف زبیر نے بہت دنوں کے بعد سیدھی چال چلی جو کہ سیدھی ہی تھی۔ کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ سلیم فاروقی صاحب کی جال در جال کا انجام دیکھیں کیا ہوتا ہے، جاننے کے لیے دل بے چین رہے گا۔ احمد اقبال کی قرض کا فرض بہت اچھی کہانی تھی۔ مقصود بے چارے کو فاطمہ کے بعد بھی کنوارا ہی رکھا گیا۔ چلو اس کی کرن سے شادی ہو جائے گی۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں کیونکہ سی ایم ایچ میں داخل ہوں اس وجہ سے مطالعہ کرنے سے سر میں درد ہوتا ہے۔ خط بھی بڑی مشکل سے لکھ رہا ہوں۔ اب اس دعا کے ساتھ خداوندِ کریم ہمارے ملک کو دشمن کی شیطانی چالوں سے محفوظ رکھے، آمین۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یابی عطا فرمائے۔ ہم آپ کے مشکور ہیں کہ اتنی بیماری کی حالت میں آپ نے خط لکھا...)

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی ثقاہت ''ماہ جولائی کا شمارہ کیا ملا گویا سب کچھ مل گیا۔ سرورق کے لیے بس اتنا کہوں گا کہ یہ ذاکر انکل کی خداداد صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ دوستو! جب اداسیاں رگوں میں خون کے مانند اتر جائیں، جیون کا آنگن اور خوشیوں کے دامن سونے سونے لگنے لگیں، آنکھوں کی جلتی لَو مدھم پڑ جائے اور امیدیں دم توڑنے لگیں تو جاسوسی کی قربت میرے لیے بڑی اہم ہوتی ہے۔ (ہمارے لیے بھی یہ باعث خوشی ہے کہ بے کل لمحات میں کوئی تو آپ کا ساتھی بنتا ہے) سب سے پہلے اپنی محفل میں حاضری دی۔ اس دفعہ بلھے شاہ کی نگری سے کاشف علی مہران بازی لے گئے۔ لالہ جی مبارکاں۔ راجن پور سے ماہ تاب گل کی انٹری خوب رہی۔ ادارہ سے پُرزور اپیل ہے اب محترمہ کو کنجوس نمبر 1 کا ایوارڈ دیا جائے۔ (دے دیا...) انفال اینڈ صبا مرزا کا تبصرہ اچھا تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے کوشش کر کے لکھا کریں۔ مقصود الحسن طاہر کا تبصرہ اور ماہا ایمان کو دیے گئے ریمارکس پسند آئے۔ علی پور سے محمد جاوید بلوچ صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، آپ کا تبصرہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ بہرحال ادارے والوں کی نظر میں ہم سب برابر ہیں۔ سمیعہ سومی صاحبہ برادر ہمایوں سعید نے بجا فرمایا ہے لیکن اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ ہمیشہ عورت ہی بے وفائی کرتی ہے (یہ کوئی کلیہ نہیں ہے...) صبا گل صاحبہ! بڑی مہربانی لیکن کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو راز ہی رہیں تو بہتر ہے۔ میں ایک شاعر بھی ہوں، میرا اک لکھا ہوا لفظ کسی اپنے کے لیے ہے جو اب اپنا نہیں۔ تونسہ شریف کی انعم رشید لگتا ہے گرمی نے آپ کا یہ حال کر دیا ہے۔ ادارے والے بھی اب تو یہ بات جان گئے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر موجود جال در جال کہانی نہیں بالکل حقیقت ہے۔ دوسرا حصہ پڑھ کر اپنے خیال پیش کروں گا۔ للکار کو طاہر جاوید مغل صاحب زبردست طریقے سے ہینڈل کر رہے ہیں۔ تابش اپنے فل ایکشن میں نظر آیا۔ بہرحال تابش کی مدد کے لیے عمران کا پہنچنا ضروری ہے۔ جاوے کا نام سن کر رستم شانی اور ڈیرا بہت یاد آیا۔ گرداب میں جاوید علی اور ذیشان کا کردار اہم جا رہا ہے۔ موہنی بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ اسما قادری صاحبہ یقیناً مبارک باد کی حق دار ہیں جو ملکِ پاکستان کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی اپنی سی سعی کر رہی ہیں۔ کاشف زبیر کی سیدھی چال بالکل سیدھی سی ثابت ہوئی۔ بہرحال چاند بھائی اور ابراہیم نے یہ ثابت کیا کہ بھینس، بھینس کی بہن ہوتی ہے۔ پہلا شوہر، منصوبہ ساز، ٹکٹ کی چوری اچھی کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بے مثال تھا۔''

عدنان یوسف بنوں سے اظہارِ خیال کرتے ہیں ''جاسوسی 4 جولائی کو نہیں بلکہ 2 دن لیٹ 6 جولائی کو موصول ہوا۔ سرورق میں ٹائٹل گرل کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ سرورق کو دیکھنے کے بعد چھلانگ لگائی۔ ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے محفلِ یاراں میں کاشف کے اوپر گر پڑے۔ سوری کاشف، کرسیِ نزاکت مبارک ہو۔ صبا گل! یہ مسکراتے ہوئے رونا کیسی ہوتی ہے۔ ماہا ایمان کو بلیک لسٹ دیکھ کر دل... باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ جاسوسی کے تمام اسٹاف اور تمام دوستوں کو رمضان مبارک۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اتنا شاندار اور پرفیکٹ ناول زندگی میں پہلی دفعہ پڑھنے کو ملا ہے۔ مہناز اور جلالی کی شادی کا سن کر بہت غصہ آیا۔ تابی نے پہلی بار عمران کے بغیر کچھ کرنے کا تہیہ کر لیا اور بری طرح پھنس گیا۔ مجموعی طور پر للکار بہت زبردست جا رہی ہے اور خط لکھنے کی وجہ یہی للکار ہے۔ کاشف زبیر کی سیدھی چال اچھی کہانی تھی۔ شامی اور تیمور ہر بار اک نہ اک مشکل میں پھنس جاتے ہیں اور اب تو اس کے ساتھ جوجی بھی شامل ہوا ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کے جوابات ''سرورق کی لڑکی اس بار بھی جانی پہچانی محسوس ہوئی لہٰذا سرورق پہ ضائع کرنے کے لیے مختص وقت کا زیادہ حصہ کیئر سوپ والی لڑکی کے ساتھ گزارا۔ (گزارنا ضرور ہے چاہے کوئی بھی مل جائے!) جاوید بلوچ صاحب! اپنی فلرٹ نیچر سے ہم نے جو کچھ حاصل کیا، وہ تمہیں کسی خوب صورت شام شرفِ میزبانی بخش کے سنائیں گے۔ ابھی شارٹ کٹ میں یہ سنو کہ میری ڈکشنری میں مضبوط کردار کا انسان وہ ہے جو کسی بھی گناہ پر قدرت رکھنے کے باوجود اسے نہیں کرتا۔ اور بھائی میرے ایسے انسان کو دیکھنے کے لیے جب آنکھیں ترس جاتی ہیں تو میں آئینے سے رجوع کر لیتا ہوں۔ (کیا مردم شناسی ہے) سمعیہ سومی صاحبہ! ٹھیک ہے کہ ہم مردوں کی قبیل سے ہیں مگر اب دو میٹھے لفظوں سے بے وقوف بن جانے والی مخلوق پہ بے تحاشا رحم آتا ہے۔ گستاخی معاف شہزادہ صاحب! تم جیسے بگڑے ہوئے شہزادوں کے صنفِ نازک کے آگے بچھنے اور بچھے رہنے کی تاریخ ہم نے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے پڑھی ہے۔ صبا گل صاحبہ! ہم قول و فعل میں تضاد کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اعجاز برادر! ہم کسی کے چکر میں پڑے ہی کب تھے، ایک بس کے نکلنے کا ہم کبھی افسوس نہیں کرتے فوراً دوسری بس کے لیے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنا لیتے ہیں۔ ہاں آپ اگر اپنی پرانی یادوں کی گٹھڑی کو گٹر برد کر دیں تو یقیناً افاقہ ہوگا۔ للکار پڑھتے ہوئے اب حقیقی معنوں میں بہت مزہ آتا ہے۔ کرشمہ اور ایشوریا سے تو ملاقات ہو چکی ہے، امید ہے آگے کترینہ اور کرینہ بھی مل سکیں گی۔ تابش پر ایک دفعہ پھر موت کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ گرداب میں خواجہ سرا ایک دفعہ پھر ایکٹیویٹ ہو چکے ہیں۔ جاوید کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ شہریار کی ایکشن سے بھرپور سرگرمیاں نہ جانے کب دیکھنے کو ملیں گی۔ سلیم فاروقی کا ولولہ انگیز اسٹائل ہمیں بے حد اچھا لگتا ہے۔ جال در جال نے بھی پلک جھپکنے کی مہلت نہیں دی۔ احمد اقبال کی کہانی بے حد الجھی ہوئی تھی۔ ہمیں خاص متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ شامی اور تیمور کی آمد اچھی لگی۔ کاشف زبیر ٹریک بدل رہے ہیں اور اب تیمور کو مرکزی جبکہ شامی کو سائڈ رول دیتے ہیں۔ جوجی کا اضافہ بھی نیک شگون ہے۔ استاد، شاگرد کو انتہائی مشکل الفاظ کی وجہ سے انجوائے نہ کر سکے۔ اپنا راستہ اور منصوبہ ساز قدرے مشترک تھیں مگر دونوں بے حد پسند آئیں۔ اپنا راستہ میں میکس نے پاپا جارجی اور جینی لوگوں کو چونا لگا کے جی خوش کر دیا۔ منصوبہ ساز میں مائیکل بلاشبہ اعلیٰ درجے کا منصوبہ ساز ثابت ہوا۔ جیف کو اپنے کیے کی سزا ملی۔ اس نے جو بویا تھا وہی کاٹا۔ مختار آزاد کی کہانی پہلا شوہر بھی پھیکی رہی۔ ٹکٹ کی چوری لاجواب رہی۔''

محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور سے لکھتے ہیں ''جاسوسی کو باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ جولائی کا شمارہ مقررہ تاریخ کو ملا۔ ذاکر انکل کی کیا بات ہے، بہت زبردست ٹائٹل تھا۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ بہت ہی زبردست سلسلہ وار کہانی ہے۔ للکار بہت اچھی اسٹوری ہے، اس کا ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ عمران کا کردار بہت پاورفل جا رہا ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔ امید ہے یہ بھی گزشتہ شماروں کی طرح اعلیٰ ذوق کی ہوں گی۔ یہ جاسوسی ادارے والوں کا کمال ہی ہے کہ یہ لاکھوں لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔''

چکوال سے ایم عزیر اسد کی پسند ''ٹائٹل پر نظر پڑی۔ ذاکر انکل جی! کیا لڑکی کا گردن ٹیڑھی کر کے دیکھنا لازمی ہوتا ہے؟ ایک صاحب، شطرنج، مہرے، ایسا لگا کہ ہمارے ایک تبصرہ نگار دوست (نام نہیں لوں گا) پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے، تھال اٹھائے رس گلے، گلاب جامن بیچ رہے ہیں۔ راجہ امجد صاحب دیکھ لیں، میں نے آپ کا نام کسی کو نہیں بتایا۔ ویلکم یار، دوڑے دوڑے چینی والے ہال میں پہنچے۔ چہروں پر مسکراہٹیں ہاتھوں میں مکھن، گھی، شکر۔ اوہ نو ہمارے ہاتھ خالی۔ انکل جی اگر برا نہ مانیں تو پھر کبھی سہی آپ کا دل تو ویسے بھی بڑا ہے اجازت دے ہی دیں آنے کی... کاشف مہران کا پورے صفحے کا جھونگا تیرا بھلا ہو، ویسے مبارک باد یار۔ اشفاق صاحب چلیں آپ کی مسکراہٹ نے کچھ تو کام کر دیا نا۔ محمد کبیر عباسی یار شہزادے کیا کھچڑی بن رہی ہے، ہمیں بھی پتا چلے ہم بھی آخر پہاڑوں کے بادشاہ ہیں بے تاج۔ سلیم فاروقی کی پہلی کہانی جال در جال بہت پسند آئی۔ باقی کا انتظار ہے۔ منظر امام کی استاد شاگرد دہشتے کا پختہ ارادہ تھا مگر کہانی صاحبہ سنجیدگی سے گزر گئی اور مسکراہٹ ہنوز غائب۔ للکار میں سب چالیس پسند آئیں۔ ماہا جی! کیا خیال ہے کیا تابی، عمران کو بلا لے گا؟ پہلا رنگ قرض کا فرض نارمل سی تحریر تھی۔ اس دفعہ کاشف انکل کی تحریر خاص پسند نہیں آئی۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت علی کاظمی کا اعلان ''سخت گرمی کے موسم میں جاسوسی بک اسٹال کا دوسرا چکر لگانے پر ملا۔ (شکر کریں مل گیا) سرورق انتہائی شاندار اور شاہکار قسم کا تھا۔ سرورق سے فارغ ہو کر ہم نے تبصروں کی دنیا میں چھلانگ لگائی جہاں حسبِ معمول دلنشین بلوچ غائب تھیں۔ شکیل کاظمی کے تبصرے نے دل کو چھو لیا۔ باقی سب کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی جو کہ بہت زبردست جا رہی ہے۔ ذیشان کی کارکردگی نے بہت متاثر کیا، بہت اچھے اسما جی۔ للکار تو اس مرتبہ ٹاپ پر رہی۔ تابی اب عمران کو بلاتا ہے یا نہیں۔ آخری بات جو آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں نے اے گریڈ سے فیڈرل بورڈ میں میٹرک پاس کر لیا ہے اور یہ میرا آخری خط ہو شاید جاسوسی کی محفل میں، تمام سسٹرز اینڈ برادرز سے گزارش ہے کہ اگر کوئی غلطی ہو تو نظر انداز کر دیجیے گا شکریہ۔ اسپیشلی ماہا ایمان! ہم آپ کے ساتھ صرف مذاق کرتے تھے۔ امید ہے کہ آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔'' (کیوں بھئی مزید تعلیم حاصل کرنے سات سمندر پار جا رہے ہیں... جہاں سے .... ملاقات ممکن نہیں؟)

ارشاد حسین کلیرا، ضلع خوشاب سے لکھتے ہیں ''4 تاریخ کو دکاندار نے ہمیں دیکھ کر کہا بھائی صاحب! وہ آ گیا ہے۔ ٹائٹل خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے للکار میں پہنچے۔ عمران کی پھرتی نے جاوا، سلطان جیسے لوگوں کو زیر کیا۔ بابے جلالی کا سیکیورٹی سسٹم، ثروت کی بہن کا علاج، تابش کی جلد بازیاں یہ سب کچھ شاندار رہا ہے۔ گرداب میں پہنچتے ہی سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے او بھائی صاحب! مجھے نہیں جاوید علی (رنجی) کے ساتھ یہ صورتِ حال پیش آنے والی ہے۔ شالنی بڑی گھاگ قسم کی ایجنٹ معلوم ہو رہی ہے۔ میجر ذیشان نے موہنی کو جس طرح قابو کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ چودھری کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ دوسروں کا سہارا مردوں کے لیے ہوتا ہے چودھری صاحب۔ جال در جال جیسی کہانیوں سے امریکیوں کی اصلیت عیاں ہوتی ہے۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے ہیں۔ کاشف زبیر کی سیدھی چال بہت سلو کہانی تھی اور اس میں کئی خامیاں تھیں مثلاً چاند بھائی کے پیچھے کون لوگ تھے اور چاند بھائی نے ان کے کروڑوں روپے کس طرح ہتھیائے تھے، وضاحت طلب باتیں ہیں۔ قرض کا فرض، والدین بھی آج کل اپنی اولاد سے بے پروا ہوتے جا رہے ہیں۔ فاطمہ کا کردار اچھا تھا۔ جوان اولاد پر نظر رکھنی چاہیے۔ منصوبہ ساز میں جیف کو حد سے زیادہ خود اعتمادی اور لالچ لے ڈوبا۔ حسرت میں کاسل نے اپنے ملک کے لیے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ میکس نے اپنا راستہ اپنانے کے لیے بڑا خطرناک گیم کھیلا تھا۔ میکس بھی بڑا چالاک نکلا۔ شیئر بکس، چیک بکس کی وجہ سے پاپا جارجی سے اپنا مستقبل محفوظ کر لیا۔ ورنہ کسی دن پولیس کے سیکیورٹی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ اچھی کہانی تھی۔ ایڈی عقل کا اندھا نہیں لالچ

کا اندھا تھا۔ وہ راتوں رات امیر ہونا چاہتا تھا۔"

ڈیرا اسماعیل خان سے حاضر فرحان کی شکایت "ڈائجسٹ تو ہمیں موقع پر ہی مل گیا تھا مگر بغیر سرورق کے... حیران تو ہمیں ہونا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی پریشان بھی ہوئے۔ پریشانی یہ تھی کہ ساری دنیا تبصرے کا آغاز سرورق سے کرتی ہے... مگر ہم نے تو یہ دیکھا ہی نہیں۔ (یہ کیونکر ممکن ہے؟) خیر، فہرست بڑی خوب صورت تھی... تمام آئٹمز کو ایک مثلث کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں تو ہمیں چین ہی چین نظر آیا۔ رفتار بڑھائی اور سیدھے پہنچے للکار میں۔ داستان اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ پہلے ہی کی طرح تابش کو انتہائی حالات کا سامنا ہے۔ گرداب تو جیسے ہیجڑوں کے محلے میں گھس گئی ہے۔ بڑا عجیب وغریب محسوس ہوا۔ منظر امام کی استاد شاگرد پڑھ کر اندازہ ہوا کہ استاد کی جناتی زبان واقعی ہماری عقل ناقص کی سمجھ سے باہر ہے۔ سرورق تو ہم نہ دیکھ پائے مگر سرورق کی کہانیوں میں سرورق کا بلیک اینڈ وائٹ عکس آنکھوں کو بھا گیا۔ سرورق کا دوسرا رنگ کاشف زبیر کی تیمور اینڈ شامی سیریز پر مشتمل تھا۔ سیدھی چال میں ہر چیز ہی الٹی لگی۔ مگر مزہ آگیا۔ سلیم فاروقی کے نام سے ہی کہانی کے تہلکہ خیز ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے... جادرجال کو اس ماہ کی بہترین کہانی قرار دیا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ انتہائی سنسنی خیز اور تیز رفتار قسم کی داستان تھی۔ باقی کہانیوں میں پہلا شوہر، منصوبہ ساز، ٹکٹ کی چوری، اپنا راستہ، حسرت، عقل کا اندھا اور قرض کا فرض، جاسوسی ڈائجسٹ کے شایان شان تھیں۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی رائے "اس بار جاسوسی 2 جولائی ہی کو مل گیا۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سرورق اس بار بھی جان دار تھا۔ پہلی کہانی جال درجال وہی 9/11 کے قصے پر مبنی ہے اور کوئی جدت نہیں رکھتی۔ للکار اب ایک مار دھاڑ سے بھرپور کہانی بنتی جارہی ہے اور جاسوسی کے معیار سے ہٹتی جارہی ہے۔ (یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟) گرداب میں ابھی شہریار اپنے نئے روپ میں آنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ اس ماہ کی بہترین کہانی آصف ملک کی منصوبہ ساز رہی۔"

اٹھارہ ہزاری، جھنگ سے قیصر رضوان عباسی کی مرعوبیت "جولائی کا جاسوسی اتفاقاً ہی مل گیا۔ سرورق پر موجود موٹی گردن والی عورت نیم وا ہونٹوں اور ترچھی نظروں سے اذیت ناک انداز میں مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ شطرنج کے مہرے شہ مات کی عکاسی کررہے تھے۔ سرورق کا ولن نہ جانے غمگین تھا یا خوش، کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ چینی، نکتہ چینی میں مدیر اعلیٰ کو حالات کا رونا روتے ہوئے پایا جو کہ پوری پاکستانی قوم کا مقدر ہوچکا ہے۔ پہلا خط کاشف علی میراں کا تھا، ان کی یہ بات پسند آئی کہ کہانی تو کہانی ہوتی ہے اگر یہ بھی حقیقت کی طرح تلخ ہوجائے تو دل ودماغ مزید بوجھل ہوجاتا ہے۔ باقی تبصرہ نگاروں نے بھی خوب چینی گھولی۔ محمد کبیر عباسی اور اعجاز احمد راحیل کے اشعار پسند آئے۔ ہمایوں سعید تو لگتا ہے بڑی مشکل سے بزم کی آخری نشست کے حق دار بنے اور وہ بھی دوسروں کی ٹانگیں کھینچ کر۔ سب سے پہلے سلیم فاروقی کی جال درجال پڑھی۔ افغانوں کی جدوجہد اور عالمی طاقتوں کی عیاریوں پر مشتمل کہانی کی پہلی قسط ہی شاندار تھی... اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی سیدھی چال پڑھی، تیمور اور شامی سلسلے کی اسٹوری بڑی دلچسپ تھی۔ طاہر جاوید مغل کی للکار تو درحقیقت جاسوسی کی جان ہے، جسے پڑھنے کے لیے دل ہر ماہ بے چین رہتا ہے۔ اسما قادری کی گرداب وطن کی محبت سے سرشار بلند حوصلہ جوانوں کی داستان ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ منظر امام کی استاد شاگرد میں استعمال ہونے والی ثقیل زبان بڑی عجیب لگی۔ احمد اقبال کی قرض کا فرض بڑی پُرپیچ اور جاندار کہانی تھی جس میں عجب گل کا کردار چونکا دینے والا تھا جس نے نہ صرف اپنی بیوی بلکہ اپنے بیٹے ببلو اور موقع کی ویڈیو بنالینے والی فاطمہ کی بھی جان لے لی۔ کہانی کو مزید آگے چل کر اپنے منطقی انجام کو پہنچنا چاہیے تھا۔ ٹکٹ کی چوری میں سراغ رساں مسٹر کوئن نے جس طرح معما حل کیا، وہ واقعی داد کے لائق ہے۔ اپنا راستہ ایک اچھی کہانی تھی جس میں میکس نے پاپا جارجی اور اس کے گروہ کو حقیقی معنوں میں ناکوں چنے چبوادیے۔ عقل کا اندھا میں چورایڈی واقعی عقل سے پیدل ثابت ہوا اور اپنی جان گنوا بیٹھا۔ منصوبہ ساز بھی ایک زبردست کہانی تھی۔ الغرض ماہ جولائی 2012ء کا جاسوسی ڈائجسٹ پرفیکٹ تھا جس نے ابھی تک اپنے سحر میں ہمیں جکڑ رکھا ہے۔"

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا چکوال سے حاضر ہیں "اس دفعہ پرچہ وقت پر مل گیا، ذاکر انکل! اس دفعہ تو ہماری دادو جان نے بھی آپ کی ٹائٹل گرل کی تعریف کرڈالی۔ ٹائٹل گرل کی کیا تعریف کریں بہرحال، اتنا کہہ سکتے ہیں۔

یہ دیکھنے کی چیز ہے اسے بار بار دیکھو

تکون نما فہرست کا ڈیزائن ہمیں کچھ پسند نہیں آیا اور بلیک کلر کا استعمال نمایاں تھا جو ہمیں اچھا نہیں لگا۔ صدارت کی کرسی پر کاشف علی کا تبصرہ کہانیوں پر پاورفل تھا لیکن تھوڑا تبصرہ محفل پر بھی کردیتے تو زیادہ بہتر ہوجاتا۔ خیر نال بہت بہت مبارکاں جی۔ سمعیہ سومی! ہمایوں صاحب کو مکھن لگاتی ہوئی نظر آئیں۔ خیال رکھیے کہیں ہمایوں صاحب پھسل نہ جائیں۔ محمد کبیر عباسی عرف شہزادہ! اف رے تیری خوش فہمیاں، ہمایوں صاحب اکثر آپ تبصرے میں عقلمندی کی باتیں لکھ جاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ محمد جاوید، کبیر عباسی، صبا گل، اعجاز احمد ان کے تبصرے بیسٹ لگے۔ محمد عزیر اسد آپ کو تو سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ بہت بہت اچھا ہوا آپ کے ساتھ..... چلیے اب کہانیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ احمد اقبال کی قرض کا فرض ہر نئے صفحے پر کہانی نے نیا رخ اختیار کیا۔ فاطمہ کا کردار اچھا لگا، کہانی بس ٹھیک تھی۔ سیدھی چال، کاشف انکل سچ پوچھو تو اب ہمیں تیمور اور شامی کے کردار میں کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی۔ فولاد خان اور جوجی کا کردار ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ سلیم فاروقی صاحب پہلے صفحات پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ جال درجال ہمیں شک ہے عاقل خان یا پھر دلاور خان میں سے کوئی ایک بابر سے ملنے آیا ہے۔ رائٹر نے کہانی کے لیے اچھا موضوع سلیکٹ کیا ہے۔ عقل کا اندھا، بوڑھے میاں بیوی کی عقل کے تو کیا ہی کہنے۔"

ضلع بدین سے نوید ساجد زیڈ کی حاضری "اس ماہ کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ہم آم کھانا بھول گئے۔ سرورق پر شطرنج کے مہرے اور مات کھایا جواری حسینہ کے کریکٹر کو مشکوک بنارہے تھے۔ ذاکر انکل کو نہ جانے کہاں سے ایسے حسین چہرے دستیاب ہوتے ہیں ہمیں تو بقول شاعر

وہ کیسے لوگ تھے یارب جنھوں نے پالیا تجھے
ہمیں تو دشوار ہوگیا ہے اک انسان کا ملنا

بزم یاراں میں اونچے سنگھاسن کے حق دار کاشف علی میراں ٹھہرے۔ ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔ تبصرہ جاندار تھا۔ اپنے منہ میاں مٹھو شہزادہ کوہسار گھسے پٹے جملوں سے تبصرے کو مزاحیہ بنانے میں ناکام رہے۔ صبا گل، ماہ تاب گل، ہمایوں سعید اور جاوید بلوچ کے تیکھے تبصرے اچھے لگے۔ معراج محبوب عباسی اور مرزا اسسٹرز کے سادہ سے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ ایکشن ٹھیک ہے اسپیڈ کچھ کم ہے۔ جلالی صاحب کا کردار جلد ختم ہونا چاہیے اس نے تو بور کردیا ہے۔ گرداب اپنے ردھم میں ہے۔ ضرورت کے مطابق کردار چل رہے ہیں۔ چودھری جیسے سنپولیوں کا قصہ ختم ہونا چاہیے۔ اولین صفحات پر سلیم فاروقی حقائق سے قریب تر اسٹوری کے ساتھ وارد ہوئے۔ اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ پہلا شوہر میں سیر کو سوا سیر مل گیا۔ جینی نے عقل مندی کی جو کہ پال کے ساتھ شادی کرلی۔ آصف ملک مغربی معاشرے کی حقیقت کی عکاس تحریر کے ساتھ وارد ہوئے۔ استاد شاگرد کافی پُرمزاح تحریر تھی۔ داروغہ جہنم کی زبان پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ آپ خوامخواہ جناتی زبان کہہ رہے ہیں۔ اگر جن ایسی زبان سن لے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے (آزمائش شرط ہے) آخری صفحات پر بکھرے رنگ اس دفعہ کچھ پھیکے لگے۔ پھر حاضر ہوں گے یار زندہ صحبت باقی۔"

راجن پور سے ماہتاب گل کی "سب اچھے" کی نوید "لوڈشیڈنگ کی بدولت اندھیرے میں ڈوبے راجن پور میں جاسوسی روشنی کی کرن ثابت ہوا۔ ذاکر انکل! لگتا ہے آپ نے ساری محنت سرورق حسینہ کی پلکوں پر کردی تھی۔ ارے یہ کیا، حسینہ کا چہرہ تو لائٹیں مار رہا تھا۔ شطرنج کی بساط، بڑے عرصے کے بعد سرورق کی زینت بنی۔ اچھا لگا اینڈ بھولی بسری یاد تازہ ہوگئی۔ محفلِ یاراں میں جھانکا۔ کاشف علی... مبارک باد۔ انجینئر عمیر! آپ کا نام انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پڑھنا پڑھتا ہے کیونکہ... مظفر شاہین! ہم اگرچہ آپ کی تجویز سے متفق ہیں لیکن اخلاقیات کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ انفال اینڈ صبا! یہ کیا بھاگم بھاگ تبصرہ لکھ مارا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہونا، بہت برداشت کرلیا آپ کا مختصر سا تبصرہ۔ محمد جاوید! مجھے واقعی انکل جی پر حیرت ہوئی کہ آپ کا تبصرہ جوں کا توں لگادیا۔ کمال برداشت ہے۔ سمعیہ! خوش آمدید اینڈ ہر ماہ حاضری دیجیے گا کیونکہ ہماری نفری کم ہوگئی ہے۔ کبیر عباسی کا تبصرہ پڑھ کے صنفِ مخالف جن کے اب تک کئی نام سامنے آچکے ہیں مثلاً صنف وجاہت، صنف کرخت، صنف فلرٹ وغیرہ کے نام میں اضافہ ہوگیا ہے یعنی صنف خوش فہم۔ جن کا فہم وفراست سے دور، دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بہرحال، تبصرہ مزے دار تھا۔ صبا گل! آپ نے اس مرتبہ ماہا ایمان کی سیٹ سنبھال لی۔ زبردست جوابات دیے مزہ آگیا۔ گرداب میں ذیشان اور اس کے ساتھیوں کی کامیابی نے دل خوش کردیا۔ للکار میں مہناز اور جلالی کے میاں بیوی ہونے کا انکشاف سن کر گیا۔ ڈاکٹر مہناز کی حساسیت حیران کرگئی کہ آج کے دور میں بھی ایسے دل موجود ہیں۔ خیر، اینڈ میں ایک سنسنی خیز سچویشن کری ایٹ کرکے مغل انکل نے ہمیں پھر انتظار کی سولی پر لٹکا دیا۔ منظر امام بڑے عرصے کے بعد استاد صاحب کی جناتی زبان کے ساتھ حاضر ہوئے اور اس تحریر نے لوٹ پوٹ کردیا۔ مزہ آگیا پڑھ کے۔ سرورق کا پہلا رنگ احمد اقبال کے قلم سے نکلا ہے بلکہ لکھا گیا ہے۔ یقین نہیں آیا، نہ کوئی سر نہ پیر۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر شامی، تیمور کے ہمراہ حاضر ہوئے لیکن کہانی میں ایکشن تو کہیں تھا ہی نہیں۔ بیٹھے بٹھائے سارا مسئلہ حل ہوگیا۔ محمد عفان آزاد کی عقل کا اندھا بھی اچھی تحریر تھی۔ تراش خراش بھی ٹھیک تھیں اور شاہد انکل کے اسکیچز بھی اچھے تھے۔"

صفدر آباد سے احتشام قریشی کی علالت "تین چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضری دینے کا ارادہ بن ہی گیا۔ غیر حاضری کی وجہ مصروفیات تھیں۔ انٹر کے امتحان، اس کے بعد ایک آپریشن ہوا میرا، مجھے فائر لگا تھا اسی سلسلے میں آپریشن تھا۔ (اب طبیعت کیسی ہے... چاق وچوبند ہیں؟) جولائی کا شمارہ دوسرے چکر پر 4 کو مل گیا۔ ٹائٹل پر ایک موصوف ملے، چہرے پر فتح کی چمک لیے جانے کس کو دیکھ رہے تھے۔ جانے کھلاڑی تھا یا شطرنج کا بادشاہ۔ ایک حسینہ بھی نظر آئی، جانے کوئن تھی یا کھلاڑی۔ خیر ٹائٹل پر نگاہ غلط ڈال کر بزم یاراں میں پہنچ گیا۔ (آپ نگاہ درست بھی ڈال لیتے تو کچھ نہ ہوتا...) سید شکیل صاحب آپ کی بات درست لگی، محکمہ ڈاک قابلِ بھروسا نہیں ہے مگر ہم جیسے غریبوں کو مجبوراً ان کی خدمات لینی پڑتی ہیں۔ ماہ تاب گل لگتا ہے راجن پور میں آپ کی مٹھائی کی دکان بھی ہے۔ سمعیہ سومی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہمایوں سعید کی بات سے میں متفق نہیں۔ کچھ انسانوں کی سرشت میں وفا کا عنصر ناپید ہوتا ہے اور اس میں مرد، عورت دونوں شامل ہیں۔ شہزادہ کوہسار نے کس کس مخالف کے چھکے چھڑائے؟ انعم خوش آمدید۔ تبصرہ جاندار تھا خوب میٹھی میٹھی باتیں سنائیں۔ ماہا ایمان! بلیک لسٹ میں شرمندہ سی کھڑی نظر آئیں۔ (گرتے ہیں شہسوار ہی... یہ تو سنا ہوگا آپ نے) سب سے پہلے مغل انکل کو پڑھا۔ سنسنی خیز موڑ پر آکر حسبِ معمول باقی آئندہ منہ چڑا رہا تھا۔ اگست کے شمارے کا بے تابی وبے چینی سے انتظار ہے۔ دوسری طرف اسما قادری کے تو کیا کہنے، تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ للکار سے زیادہ گرداب دلچسپ ہے۔ اگرچہ سست روی سے منزل کی جانب گامزن ہے۔ میں کوئی بہت زیادہ محب وطن انسان نہیں ہوں مگر اسما کی تحریر پڑھ کر دل میں اپنے وطن کی محبت کے جذبے ابھرنے لگتے ہیں۔ ذیشان، شہریار اور دیگر کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے۔ شروع کے صفحات میں اپنے پسندیدہ مصنف سلیم فاروقی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانی پڑھی تو منہ سے زبردست نکلا۔ سلیم فاروقی کے ہاتھ چومنے کا دل چاہا۔ (بس رہنے دیں...) اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ منظر امام کی استاد شاگرد نے دماغ جھنجوڑ ڈالا۔ پڑھ کے ہنسی بھی آئی، ڈکشنری کی ضرورت بھی پڑی اتنی مشکل اردو سمجھنے کے لیے۔ احمد اقبال کی قرض کا فرض اچھی تھی مگر رانی اور جمال کا ذکر فضول لگا، کہانی کو بڑھانے کے لیے ان کی کہانی بھی گھسادی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ طبیعت بگڑ گئی ہے پیٹ میں درد، الٹیاں اوپر سے گرمی۔ خط جلدی پہنچانے کی جلدی نہ ہوتی تو سب پر تبصرہ کرتا۔" (آپ کا شکوہ بے جا ہے... ہم توصیف کے ساتھ تنقید بھی خوب شائع کرتے ہیں... نہ جانے آپ کو ایسا کیوں لگا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یاب کرے، آمین)

کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں کی تصحیح "بیس گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کے زمانے میں بھی جاسوسی ڈائجسٹ کا 4 تاریخ کو ہمارے ہاتھوں میں آجانا بلاشبہ دورِ حاضر کا ایک معجزہ ہی ہے اور ٹیم جاسوسی کے تہ دل سے مشکور ہیں۔ سرورق پر اس بار حسینہ کو بہت نمایاں جگہ دے دی گئی تھی۔ اشتہارات کو غور

سے دیکھتے ہوئے فہرست میں پہنچے تو ایک سے بڑھ کر ایک خوش خبریاں منتظر تھیں۔ کاشف زبیر شامی اور تیمور کے ہمراہ اور منظر امام استاد کے ہمراہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے محفلِ یاراں میں حاضر ہوئے۔ اداریہ پڑھا اور آپ سے متفق ہوئے کہ مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آسان ہوگئیں۔ بزمِ یاراں میں کرسیِ صدارت پر کاشف علی میراں صاحب فائز تھے جو اس لحاظ سے خوش قسمت ٹھہرے کہ ان کا دوسرا ہی خط یہ مقام پا گیا اور اس لحاظ سے بدقسمت کہ ان کا نام میراں کے بجائے مہران لکھ دیا گیا جو کہ یقیناً ذہنی کوفت کا سبب بنا۔ اب اگلے مہینے جو خواتین و حضرات مبارک باد پیش کریں گے، وہ بھی کاشف علی مہران ہی لکھیں گے بہرحال... کاشف علی میراں صاحب ادارہ آپ سے سہواً ہوئی غلطی پر معذرت چاہتا ہے۔ تبصرہ اول آنے کا حق دار تھا۔ انتہائی جامع الفاظ میں آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا تھا (شکریہ! اب ہماری تو ضرورت نہیں معذرت کرنے کی) ہاہاہا! جی ہاں ہم اپنی ہی تعریف کر رہے ہیں۔ شکیل کاظمی اور فرید اللہ کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ کہانیوں کی طرف آئے تو اپنے ہم نام اور موسٹ فیورٹ کاشف زبیر پر ٹھہرے۔ سیدھی چال اتنی بھی سیدھی نہ تھی۔ مغل صاحب کی للکار اور اسماجی کے گرداب میں جانے سے پہلے احمد اقبال صاحب کا جانا پہچانا نام سامنے آیا تو سرورق کا دوسرا رنگ کھول کر بیٹھ گئے اور اسرار و تحیر سے بھرے ہوئے اس رنگ نے بہت مزہ دیا۔ اسما قادری صاحبہ نے گرداب میں پاکستانی انٹیلی جنس کے مثبت کارنامے دکھا کر دل خوش کر دیا۔ موہنی اور اس کے ساتھی کی گرفتاری اور قیمتی معلومات کا حصول اور دوسری جانب جاوید علی نے کراچی میں جو کارنامہ سرانجام دیا، وہ انتہائی اہمیت کا حامل نکلا۔ اسلم اور ماہ بانو کی خیریت جاننے کی خواہش تشنہ ہی رہی۔ اسی طرح کشور اور ماسٹر آفتاب بھی گزشتہ ماہ اپنی جھلک دکھا کر ہی گم ہو گئے۔ بات ہو طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار کی تو یہ سلسلہ جاسوسی ڈائجسٹ کی جان ہے۔ عموکا جاوا کے گرگوں کے اڈے پر جا کر ان کو قرار واقعی سزا دینا بہت پسند آیا۔ جال در جال یوں لگتا ہے کہ سلیم فاروقی صاحب کے قلم سے ایک نیا قسط وار سلسلہ شروع ہوا ہے۔ بہرحال پہلی قسط انتہائی تیز رفتار ثابت ہوئی۔ ایک ایسا موضوع جس پر پہلے کبھی کچھ نہیں لکھا گیا، اس پر ایک داستان لکھوانے کا اعزاز بھی جاسوسی کے حصے میں ہی آیا۔ زبردست جی، مبارکاں۔ مختار آزاد کی تحریر پہلا شوہر کافی الجھی ہوئی تحریر تھی جس کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آیا۔ نہایت بور کہانی تھی جی۔ مختصر کہانیوں میں آصف ملک کی منصوبہ ساز ایک عمدہ تحریر تھی۔ تنویر ریاض کی ٹکٹ کی چوری کا موضوع اگرچہ بہت پرانا تھا جھوٹے کلیم کے ذریعے انشورنس کمپنی سے رقم بٹورنا مگر سراغ رسانی کے معیار پر پوری اترتی ہوئی یہ مختصر تحریر مزہ دے گئی۔ مریم کے خان نے جاسوسی ڈائجسٹ میں کامیابی کے ساتھ اپنا راستہ بنالیا ہے۔ منظر امام ایک عرصے کے بعد استاد کے ہمراہ تشریف لائے تھے اور یک نہ شد دوشد ان کے ساتھ ایک شاگرد بھی تھا بھئی واہ۔ دونوں طرف سے جناتی زبان کے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے تو بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ بکھر بکھر گئی۔''

کراچی سے ادریس احمد خان کی حاضری ''جاسوسی اپنے وقت پر مل گیا۔ سب سے پہلے سرورق سے ابتدا کی جہاں شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہے اور آنے والے سپنوں کے تانے بانے بُنے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد چینی کم نکتہ چینیوں کی محفل میں پہنچے جہاں پہلے نمبر پر کاشف علی نظر آ رہے ہیں تو موقع بھی دستور بھی اس لیے مبارک باد۔ اس کے بعد جاسوسی کے مقبول سلسلے للکار سے شروع کیا عمران اور تابش زبردست ایکشن میں نظر آ رہے ہیں۔ جلالی صاحب بھی رنگین آنچلوں کے جھرمٹ میں شاداں اور مسرور ہیں۔ اس کے بعد معروف سلسلے گرداب پر رکے۔ گرداب کی اس قسط میں ذیشان کا زیادہ چرچا ہے۔ جال در جال تیسرے نمبر پر پڑھی۔ افغانستان کے حالات و واقعات پر مبنی اچھی تحریر ہے۔ امید ہے دوسری قسط بھی دلچسپ ہوگی۔ اس کے بعد باری آئی پہلا شوہر کی۔ شوہر ہمیشہ شوہر رہتا ہے، محبوب نہیں بن سکتا اور محبوب جب شوہر بن جاتا ہے تو صرف شوہر رہ جاتا ہے۔ منصوبہ ساز میں یہی کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ ٹکٹ کی چوری میں چور کو ایلری نے ذہانت سے کام لے کر ٹکٹ چور کو پکڑوا دیا۔ اپنا راستہ میں میکس نے اچھا فیصلہ کیا جرم کی دلدل سے نکلنے کا۔ نتیجتاً محبوبہ اور دولت دونوں ملیں۔ استاد دلچسپ تحریر تھی جہاں استادوں کے استاد کو استاد مل گیا۔ قرض کا فرض میں دل لگی دل کی لگی بن گئی اور محبت کرنے والے مقصود نے محبوبہ کے قاتل کو ثبوتوں سمیت گرفتار کرا دیا۔ مجموعی طور پر سرورق کی دونوں کہانیاں اچھی تھیں۔''

ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل آف جلال پور بھٹیاں سے لکھتے ہیں ''دلبر تک پہنچنے میں انتظار کو 3 جولائی کا انتظار کرنا پڑا۔ سرورق حسبِ سابق ماٹھا اور فارمولا بیس تھا۔ ذاکر انکل اس میں جدت لائیں۔ کاشف بھائی! ویلکم بلکہ ویلکم بیک، اب ہمارا ساتھ نہ چھوڑیے گا۔ سید شکیل کاظمی! سالگرہ مبارک ہو، انجینئر عمیر شہزاد بنگش! شکریہ، مٹھائی ادھار؟ کرن لاہوری! تازہ اسٹوریز پر کمنٹس جھاڑیں۔ مصدق محمود دانش! آپ نے آصفہ صداقت کو ہچکولے دے کر اچھا نہیں کیا۔ ماہ تاب گل! آپ بذریعہ ٹی سی ایس یارانِ محفل کو ایک ایک گلاب جامن + رس گلا بھجوائیں۔ محترمہ انفال اور محترمہ صبا مرزا! مغلوں کے دل بڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔ محاورہ ہے کہ اونٹوں کے ساتھ دوستی ہو تو گھروں کے دروازے اونچے رکھتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ بلند پایہ خیالات کے حامل مقصود الحسن طاہر! بونگیاں مارنے کے ساتھ ساتھ کہانیوں پر بھی ہاتھ منہ صاف کیا کریں۔ فرید اللہ! آپ 'تفسیر ایمان' یا ماما عباس بابر یعنی دونوں فساد پلس لوگوں کی خوراک کوؤں کا ناشتا، چوں چوں کے مربے اور خیالی پلاؤ کا ڈنر اور صبر کے پھل کا لنچ کریں گلابی اردو سفید ہو جائے گی۔ ہمایوں سعید راج! اس دفعہ آپ کا تبصرہ اٹھے ہوئے کارتوس کی طرح ٹھنڈا ٹھار اور بیکار تھا۔ اس دفعہ مغلوں کی للکار میں عمران نے جاوا کے گرگے سلطان کی خیریت دریافت کی تو جلالی صاحب کے جلال کو چین نصیب ہوا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر مہناز بھی تھوڑی سی آشکار ہوئی۔ تابش نے عمران کو اعتماد میں لیے بغیر فتح محمد کی جاسوسی کی تو موت کے منہ میں جا پھنسا۔ گرداب میں شالنی جاوید علی عرف رنجنی کو کراچی نواب صاحب کی خدمت عالیہ میں لے گئی جہاں اسے رتی کی جگہ سنبھالنا ہوگی۔ مشا برم خان، ذیشان کی ٹیوننگ سے پھر ایکٹیو ہو گیا۔ پہلا رنگ واقعی الف لیلیٰ کی داستان کی طرح کہانی در کہانی تھی۔ بچوں کو حد سے زیادہ آزادی، حرام کی دولت اور میاں بیوی کی انڈر اسٹینڈنگ نہ ہونا ہمارے معاشرتی المیے ہیں جن کی لاتعداد وجوہات ہیں۔ دوسرے رنگ میں شامی اور تیمور کی بے ساختہ مزاحیہ حرکات خوب تھیں لیکن اس طرح کی فارمولا اسٹوریز پڑھ پڑھ کر ہم اکتا چکے ہیں۔ کاشف بھائی! اس باسی ٹرینڈ کو بدلیں۔ مختار آزاد کی پہلا شوہر مغربی طرزِ معاشرت پر گہری چوٹ تھی۔ جتنے پنڈت نہرو دھوتیاں بدلتے تھے، یا ہم وزیراعظم بدلتے ہیں، اتنے ہی مغرب والے اور والیاں شوہر/بیویاں بدلتے ہیں۔ سلیم فاروقی کی جال در جال حالات حاضرہ پر اچھی تحریر ہے۔ اگلے حصے کا بے صبری سے انتظار ہے۔''

ہری پور سے کبریٰ فہد کا اختصاریہ ''میں بچپن سے جاسوسی پڑھ رہی ہوں مگر خط پہلی بار اپنے شوہر کے اصرار پر لکھ رہی ہوں۔ جولائی کا جاسوسی بہت عمدہ تھا۔ للکار بہت اچھی جا رہی ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ آخر میں چینی، نکتہ چینی کے تمام شرکا کو السلام علیکم۔''

شیر شاہ کراچی سے اقرا بانو کی التجا ''جولائی کا شمارہ حسبِ سابق یکم جولائی کو ملا۔ پچھلے ماہ میرا خط شائع ہوا تھا اور اس بار اس خط پر تبصرے آئے ہیں۔ پہلی بار اس محفل میں آئی اور کیا شاہانہ استقبال کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے تو چڑیل کی آمد قرار دیا ہے۔ افسوس، لوگ سوچے سمجھے بغیر جو دل چاہے لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ قدم، قلم اور قسم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ ازراہ کرم آئندہ میری ذات کو ہدفِ تنقید نہ بنایا جائے۔ میرے قلم سے کسی کے لیے کبھی کوئی تضحیک آمیز جملہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس بار للکار میں انکل ٹی جے مغل نے اپنے قلم کے سحر میں باندھ کر رکھ دیا۔ خاص طور پر وہ حصہ جب جلالی صاحب ملازم سے کہتے ہیں کہ ان کے لیے چائے لاؤ اور ملازم حیرت سے انہیں دیکھتا ہے کہ جن کے لیے چائے منگوائی جا رہی ہے چائے تو وہی بناتے ہیں۔ واہ واہ! کیا خوب سپر نیچرل سچویشن تھی، زبردست۔ گرداب میں اسما قادری صاحب سے پوچھنا چاہوں گی کہ کشور اور آفتاب امریکا کب گئے تھے اور امید ان کو کب ملی تھی۔ ازراہِ کرم وضاحت سے بتائیں۔ ویسے اسماجی جاوید کے کردار کو خوب نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ ایسے کردار کہانی کی جان ہوتے ہیں۔ فی الحال اتنا ہی پڑھا ہے سو اسی پر اکتفا کرتی ہوں۔ جاسوسی وہ شربتِ روح افزا ہے کہ جسے جرعہ جرعہ حرزِ جان بنا چاہیے نا کہ تبصرے کے چکر میں ورق گردانی کر کے نمٹایا جائے۔ انکل! ابھی میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے، دعا کیجیے گا اللہ پاک مجھے کامیابی عطا فرمائے۔'' (آمین)

کھاریاں سے بابر عباس کی پسند ناپسند ''وہ ماہ جولائی کی سہانی صبح کا ایک خوش کن آغاز تھا۔ سورج دیوتا پوری طرح گرمی دکھلاتا ہوا مظہرِ آفتاب تھا اور جولائی کا جاسوسی ہاتھ میں تھا۔ سرورق بہت اچھا تھا، بہت خوب صورت تھا، زبردست تھا ڈر کے مارے کہہ رہا ہوں خط بھی تو شائع کروانا ہے۔ اپنی شوگر بڑھانے کے لیے چینی چکھنے کے لیے چینی نکتہ چینی کی محفل میں پہنچا تو سارے کے سارے اپنی اپنی چینی کے دام بڑھانے کے لیے طرح طرح کی بولیاں لگا رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار میری چینی میرا مطلب ہے میرا خط دیکھ کر سب کا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا اور شوگر تیز ہو جائے گی۔ (اتنا خوفناک تبصرہ ارسال کیا ہے) سب سے برا حال لاہور کی کرن صاحبہ کا دیکھ رہا ہوں جو میرا خط دیکھ کر برے برے سے منہ بنا رہی ہیں۔ محترمہ کیا کبھی کوئی ہینڈسم مرد نہیں دیکھا۔ ہوا اور پھول ایک ساتھ یعنی صبا گل بی بی خط لکھیں شاعری نہ کریں کئی شاخ گل کی طرح لچک کر گر نہ جائیں۔ حسبِ معمول سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر کردہ زبردست کہانی للکار پڑھی۔ جاسوسی کی دوسری سلسلے وار کہانی اسما قادری صاحبہ کی تحریر گرداب اپنے بے جا لمبے مکالموں کی وجہ سے بھی کبھی بور کرنے لگتی ہے۔ اسماجی! اس پر ذرا توجہ دیں، ویسے کہانی اچھی ہے۔ شروع کے صفحات پر اس بار سلیم فاروقی صاحب جال در جال لے کر آئے اور کیا خوب آئے۔ سلیم فاروقی صاحب کی ایک زبردست تخلیق۔ دوسرے حصے کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہے گا۔ ویل ڈن فاروقی صاحب ویل ڈن۔ اب بات ہو جائے سرورق کے رنگوں کی۔ پہلا رنگ احمد اقبال صاحب کا قرض کا فرض احمد اقبال صاحب ایسے رائٹر ہیں جن کو لکھتے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے اور ہم کو بھی ان کو پڑھتے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ قرض کا فرض بھی ایک خوب صورت تحریر جسے کہتے ہیں کہ نام ہی کافی ہے سو احمد اقبال صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر بھائی کا سیدھی چال، کاشف بھائی مزہ نہیں آیا۔ آپ کے قلم سے شامی اور تیمور کے لیے جو مزاح نکلتا تھا، سیدھی چال میں وہ نظر نہیں آیا آپ کا مزاح لکھنے کا اپنا انداز ہے اس انداز کو برقرار رکھیں۔''

احسان سحر میانوالی سے شکوہ کناں ہیں ''اس دفعہ کا شمارہ ذرا جلدی یعنی 3 کو مل گیا۔ اسی خوشی میں سرورق کو نظرانداز کرتے ہوئے محفل شگفتہ میں آ گئے۔ پہلا شوہر خوب صورت تحریر تھی۔ پال کو اپنے کیے کا اجر ملنا شروع ہو گیا۔ منصوبہ ساز میں جیف کو اپنے کیے کی سزا عمدہ طریقے سے مل گئی۔ مائیکل کے منصوبے نے جہاں اسے کامیابی سے ہمکنار کیا وہاں ایک مجرم کا باب بھی ختم ہو گیا۔ اور للکار کی تیسویں قسط واہ کیا کہوں اس کہانی کے بارے میں الفاظ نہیں ہیں پھر بھی طاہر صاحب کا ہمیشہ کی طرح دل نہیں توڑوں گا۔ ایکشن، تیز رفتاری میں تو سب سے آگے، اب واقعات بھی غیر متوقع پیش آنے لگے۔ طاہر صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کو اس طرح موو کیجیے کہ اس میں انوکھی تبدیلی آئے۔ عمران اور تابش کے دشمن بھی ایسے ہوں جو ان کو لوہے کے چنے چبوا دیں اور کسی طرح 4 اقساط کے بعد اس کہانی کو بیرونی ملک کی سیر کرائی جائے جہاں پر عمران اور تابش صحرائی علاقے میں بھی اونٹوں پر سفر کریں۔ اپنے خاص مشن کے لیے عمران سیریز کی طرح اس کہانی کو بنا دیں بس دو کرداروں کے ساتھ... ٹکٹ کی چوری میں ایلری کی ذہانت نے متاثر کیا اور اپنا راستہ میں میکس نے خوب صورتی سے جرائم کی دنیا کو خیرآباد کہا اور مالِ متاع سب لے اڑے، بہت خوب۔ تھوڑا اس کہانی کو لمبا کر دیتیں مریم صاحبہ تو اچھا ہوتا۔ خیر گرداب میری پیاری بہن اسما صاحبہ معذرت پہلے تو چاہتا ہوں کہ آپ کی کہانی کی ایک قسط کی بھی تعریف و تنقید نہ کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پڑھتا نہیں ہوں۔ دل سے پڑھتا ہوں اور آج یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اسما سسٹرز بیسٹ اور آپ کو میری طرف سے پیار بھرا اسلام اللہ۔ پاک آپ کو خوش رکھے آمین۔ اور استاد شاگرد کا سلسلہ جہاں مسکراہٹیں بکھراتا ہے، وہاں ایک سبق بھی موجود ہوتا ہے اور اس ماہ جو سبق ملا کہ شاگرد جتنا بھی ہوشیار ہو تیز ہو استاد استاد ہوتا ہے اور آخر میں اس کا پروف بھی مل گیا اور حیرت بھی اچھی کہانی تھی۔ عقل کا اندھا واقعی آنکھوں کا بھی اندھا تھا جو اپنے بڑے خزانے کو آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہوئے بھی نہ پہچان سکا سچ کہتے ہیں کبھی کبھار کچھ چیزیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں لیکن ہم تلاش کہیں اور کرتے ہیں۔ سرورق میں پہنچے جہاں احمد اقبال صاحب قرض کا فرض لائے خوب صورت اور سبق آموز تحریر۔ انسان کو وحشی اور درندہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ رشتے کے تقدس کو بھول جانا ایک جرم چھپانے کی خاطر کئی جرم کرتے جانا یہ نہ سوچنا کہ جب اپنا کیا دھرا جب اپنے گلے پڑے گا تو اس وقت کیا ہوگا۔ عجب گل بھی اپنے کیے پر پشیمان ہونے کے بجائے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ یہ ہے ہماری انسانیت۔ دوسرا شامی اور تیمور کا مشن بھی اچھا لگا پر اس دفعہ وہ نہ کر سکے جو ہمیشہ کرتے ہیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

سید محی الدین اشفاق، فتح پور لیہ۔ راجہ امجد سعید ناز، ضلع سرگودھا۔ انجینئر عمیر شہزاد بنگش، ضلع ہنگو۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ۔

جال در جال

سلیم فاروقی

دوسرا اور آخری حصہ

سنگلاخ پہاڑوں اور پُراسرار غاروں کی سرزمین جو صدیوں سے جارحیت اور حملہ آوروں کی رہ گزر کے طور پر تاریخ میں اپنی پہچان رکھتی ہے... انیسویں صدی کے اختتام سے اس علاقے میں تبدیلیوں کا ایک دور شروع ہوا... بیسویں صدی کے وسط تک اس بھونچال میں بڑی حد تک ٹھہراؤ آچکا تھا... مگر شوقِ جہانداری میں دنیا کی دو بڑی طاقتیں بدمست سانڈ بن چکی تھیں اور ان سانڈوں نے مقابلے کے لیے افغانستان کی سرزمین کو چن لیا... اس کے بعد سے اب تک اس خطے میں وہی کچھ ہو رہا ہے جو صدیوں سے اس کا خاصہ رہا ہے... مہمان ہو تو سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں... دشمن لپکے تو ان کی وہ جبلت جاگ اٹھتی ہے جس سے بڑے بڑے مہم جو کانپنے لگتے ہیں... سرحدوں کے آر پار یہی رشتے اور یہی معاشرت و ثقافت کارفرما چلی آرہی ہے... سرحدی لکیر کے باوجود خونی رشتے قائم ہیں اور پروان چڑھ رہے ہیں... جنگ کے طبل اور محبت کے شادیانوں میں لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی ایک سنسنی خیز و تیز رفتار داستاں...

عالمی طاقتوں کے بے رحم شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک دلیر اور جانفروش نوجوان کی جدوجہد مسلسل...

میری نظروں کے سامنے جو شخصیت بیٹھی تھی... اس کی وہاں موجودگی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...

میرے بالکل سامنے ہی صوفے پر بابا جان بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت شلوار قمیص کے بجائے بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کے ساتھ چوڑے شانوں اور کسرتی بدن کا ایک امریکن بیٹھا تھا۔

بابا جان مجھے دیکھ کر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

''بس کر بیٹا!'' بابا جان نے میری پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اب رونے کی باری ان لوگوں کی ہے۔'' پھر وہ امریکن سے مخاطب ہوئے۔ ''مسٹر سیکریٹری' یہ میرا بیٹا بابر ہے۔''

''ہیلو بوائے!'' فرسٹ سیکریٹری نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ بولا۔ ''کیسے ہو تم! یہاں تم پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا؟''

''کوئی تشدد!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھ پر بدترین تشدد کیا ہے۔''

''تو فکر مت کر بابر بیٹا! میں ان سب کو عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔ یہ کیا سمجھے تھے کہ تو لاوارث ہے؟''

''سر! سیکریٹری آف اسٹیٹ سے آدھے گھنٹے بعد میری ملاقات طے ہے۔'' سیکریٹری نے کہا۔ ''میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ بہت مصروف آدمی ہیں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا۔''

''چلیے!'' بابا جان نے کہا۔

میں سمجھا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے اور اب مجھے یہاں چھوڑ کر جارہے ہیں۔

میں کھڑا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ بابا جان نے کہا۔ ''چلو بابر! کیا سوچ رہے ہو؟ ہمیں دیر ہورہی ہے۔''

تب مجھے یقین آیا کہ اب میں آزاد ہوں۔

ہم لوگ فرسٹ سیکریٹری کی گاڑی میں سیکریٹری آف اسٹیٹ کے آفس میں پہنچے۔ وہ شخص اپنے چہرے سے انتہائی ذہین اور باوقار لگ رہا تھا۔ فرسٹ سیکریٹری ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

''سوری مسٹر بابر خان! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ناحق ذہنی اذیت اور کوفت اٹھانا پڑی۔ اگر آپ پہلے ہی بتا دیتے کہ آپ دلاور خان کے بیٹے ہیں تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔''

اس نے اپنی دراز کھولی اور اس میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور بابا جان کی طرف بڑھا دیا۔ اس خط پر اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا مونوگرام بھی تھا۔

بابا جان نے وہ خط پڑھا اور بولے۔ ''اس خط میں تو آپ نے الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لیا ہے مسٹر سیکریٹری۔''

انہوں نے وہ خط میری جانب بڑھا دیا۔

اس میں لکھا تھا۔ ''بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ہم نے بابر خان، ولد دلاور خان کو حراست میں لیا تھا لیکن حقیقت کا علم ہوتے ہی اسے رہا کر دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اس غلط فہمی کے لیے مسٹر بابر خان سے معذرت خواہ ہے۔''

''میں اس معاملے کو عدالت میں لے جاؤں گا مسٹر سیکریٹری!'' بابا جان نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کا حق ہے مسٹر دلاور!'' اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''بابر خان امریکی شہری ہیں اور اپنے حق کے لیے کسی بھی عدالت میں جاسکتے ہیں۔''

''او کے مسٹر سیکریٹری۔'' بابا جان نے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیجیے۔''

''ایک منٹ مسٹر دلاور! میں نے آپ کے لیے کافی منگوائی ہے، پلیز کچھ دیر اور ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں۔''

ہم کافی پی کر باہر نکلے تو باہر ہمارے لیے ایک گاڑی موجود تھی۔ باوردی شوفر نے آگے بڑھ کر جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بابا جان نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''مجھے میرے ہوٹل ڈراپ کر دو۔''

ہوٹل پہنچنے تک میں بالکل خاموش رہا، بابا جان بھی کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر بابا جان سے لپٹ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بابر خان! اپنے آنسو پونچھ لے۔ یہ کیا تُو عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے۔ تُو کوئی لاوارث نہیں بلکہ دلاور خان کا بیٹا ہے۔ وہ دلاور خان جس نے اپنے باپ، چچا اور دوسرے رشتے داروں کی شہادت پر آنسو نہیں بہائے۔ تُو کیسا افغان ہے؟''

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں بابا جان۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ تک اطلاع پہنچی کیسے؟''

''یہ سب اسلامک سینٹر کے مولانا ابن ہشام صاحب کی وجہ سے ہوا ہے۔'' بابا جان نے کہا۔ ''انہیں تمہاری بیوی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی کہ ایف بی آئی والوں نے تمہیں حراست میں لے لیا ہے۔ جس وقت ان لوگوں نے تمہیں حراست میں لیا، مریم اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ وہ واپس آئی تو سیکیورٹی ایجنسی کے گارڈ نے اسے تمہارے بارے میں بتایا۔ مریم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلامک سینٹر کے پیش امام صاحب کو اطلاع دے دی۔''

''بابا جان! میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ...''

''تم نے یہاں شادی کرلی۔'' بابا جان نے میرا جملہ مکمل کر دیا۔ ''فوری طور پر مجھے صدمہ تو ہوا تھا لیکن مولانا صاحب نے مریم کی اتنی تعریفیں کیں کہ میں اس سے ملنے کو بے تاب ہوگیا۔''

''لیکن آپ تو پاکستان میں تھے؟'' میں نے کہا۔

''مولانا صاحب نے اطلاع ملتے ہی مجھے ٹیلی فون کر دیا۔ وہ برسوں سے امریکا میں مقیم ہیں اور ایف بی آئی کے کردار کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ماضی میں ان امریکنوں سے میرا بھی سابقہ پڑا ہے۔ میں بھی ایف بی آئی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ پھر میں وقت ضائع کیے بغیر امریکا آگیا۔''

''آپ بروقت یہاں پہنچے ہیں بابا جان! وہ لوگ تو مجھے گوانتانا موبے بھیجنے والے تھے۔''

''میں پرسوں یہاں پہنچا تھا۔'' انہوں نے کہا۔ ''اس وقت سے میں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ میرے ہنگامے پر امریکن سی آئی اے حرکت میں آگئی۔ اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اپنی تفتیش مکمل کرلی اور رپورٹ سیکریٹری خارجہ کو پیش کر دی۔ ان لوگوں کی تفتیش کے مطابق تمہارا تعلق کسی بھی سیاسی، غیر سیاسی یا دہشت گرد تنظیم سے ثابت نہ ہو سکا۔ سیکریٹری خارجہ نے فوراً ایف بی آئی کے چیف سے رابطہ کیا اور میری خواہش پر مجھے تمہارے پاس بجھوا دیا گیا۔''

''اور مریم کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بابا جان کا چہرہ اچانک افسردہ ہوگیا۔ ''بیٹا! جس دن ایف بی آئی نے تمہیں حراست میں لیا تھا، اس کے دوسرے دن شام کو مریم کو اغوا کرلیا گیا۔''

''کیا؟'' میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ''مریم کو اغوا کرلیا لیکن کس نے؟''

''اگر یہ معلوم ہوتا تو میں اب تک اسے بازیاب کرا چکا ہوتا۔''

''لیکن اس کے ساتھ تو یہاں کی ایک بہترین سیکیورٹی ایجنسی کا باڈی گارڈ رہتا تھا۔ وہ اس وقت کہاں تھا؟''

''اس کی گاڑی کو گھر کے نزدیک ہی ایک قدرے ویران علاقے میں گھیر لیا گیا تھا۔'' بابا جان نے کہا۔ ''حملہ آور غالباً پوری تیاری سے آئے تھے۔ اس کے باوجود گارڈ نے ان میں سے تین کو مار گرایا، پھر وہ بے چارہ خود بھی مارا گیا۔ مریم کی گاڑی پولیس کو اسی مقام سے ملی ہے۔ وہاں پولیس کو ایجنسی کے گارڈ کی لاش کے ساتھ کیلی فورنیا کے تین بدنام اور بدمعاش نیگروز کی لاشیں بھی ملی ہیں۔ پولیس اس کیس کی تحقیقات بھی کررہی ہے لیکن ابھی تک اسے مریم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔''

میرا دل غم سے پھٹا جارہا تھا۔ یقیناً یہ مریم کے باپ کی سازش تھی لیکن اسے مجرم ثابت کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ بابا جان کے لاکھ تعلقات سہی لیکن اس کا باپ تو امریکی شہری تھا، وہاں کے کئی سینیٹرز اور اعلیٰ افسران سے اس کے تعلقات تھے۔

''پولیس نے مریم کے باپ سے بات کی؟'' میں نے پوچھا۔ اس وقت میرا پورا جسم غصے کی شدت سے لرز رہا تھا۔

''ہاں، اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور خود بھی اس کی گمشدگی کے خلاف رپورٹ لکھوا دی۔''

''بابا جان! یہ سب کیا دھرا اسی منحوس کا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''ہوش سے کام لو بیٹا!'' بابا جان نے کہا۔ ''ہم اس کی سرزمین پر اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ تم نے یہاں بہت سختیاں برداشت کیں، اب میرے ساتھ پاکستان واپس چلو۔''

''بابا جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مریم میری بیوی ہے، آپ کی بہو ہے اور ہمارے قبیلے کی عزت ہے۔ میں اسے ان کافروں کے چنگل میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''تو پھر تم کیا کرو گے؟'' بابا جان نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میں اسے تلاش کروں گا۔ آپ کیسے افغان ہیں بابا جان! کیا مریم آپ کی عزت نہیں ہے؟''

''میں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟'' بابا جان نے کہا لیکن اب ان کے لہجے میں وہ سختی نہیں تھی۔ ''میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مریم کے سلسلے میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

''آپ شاید یہ بھی بھول گئے ہیں کہ مریم ہی کی بدولت آج میں آپ کے سامنے ہوں۔ اگر وہ بروقت مولانا صاحب کو اطلاع نہ دیتی تو آپ بھی بعد میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ لوگ مجھے گوانتانا موبے روانہ کر چکے ہوتے۔''

''لیکن بیٹا! انسانوں کے اس جنگل میں تُو اسے کہاں تلاش کرے گا؟ اس کے باپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ پھر تجھے کسی کیس میں پھنسوا دے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تجھے اس کیس میں ملوث کرنے والا بھی مریم کا باپ ہی تھا۔''

''بابا جان! مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کسی جنگجو قبیلے کے سردار دلاور خان سے نہیں بلکہ سمندر خان سے بات کر رہا ہوں۔ آپ ہی نے بتایا تھا نا کہ اس نے دشمنوں سے سمجھوتا کر لیا تھا، اس کے باوجود وہ مارا گیا۔''

میری بات سن کر بابا جان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ان کا بایاں ہونٹ پھڑکنے لگا۔ شدید غصے کی حالت میں ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ میں نے تو صرف ایک آدھ دفعہ ہی ان کی یہ حالت دیکھی تھی لیکن اماں بتاتی تھیں کہ افغان جنگ کے موقع پر بے شمار دفعہ وہ اس کیفیت سے دوچار ہو چکے تھے۔

انہوں نے اپنے غصے پر بمشکل تمام قابو پایا اور بولے۔ ''بابر خان! تو نے سمندر خان کہہ کر مجھے گالی دی ہے۔ اس بدبخت نے تو اپنے وطن کا سودا کیا تھا۔ تُو مجھے بھی غدار کہہ رہا ہے؟''

''میں ایسی جرأت کب کر سکتا ہوں بابا جان!'' میں نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ مریم بھی تو ہماری عزت ہے۔ ہم اپنی عزت کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جائیں؟''

''مجھے خود بھی اس کا احساس ہے بچے۔'' بابا جان نے کہا۔ ''میرا خون ابھی اتنا سرد نہیں ہوا ہے لیکن یہ کوئی جنگ نہیں ہے۔''

''میں مریم کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''بس بابر!'' بابا جان نے مجھے بُری طرح جھڑک دیا۔ ''تُو میرے ساتھ پاکستان جارہا ہے اور بس۔''

ان سے اس وقت کچھ بھی کہنا سننا فضول تھا۔ وہ اتنے شدید غصے میں تھے کہ مجھ پر ہاتھ بھی اٹھا سکتے تھے۔ پھر ممکن ہے مجھ سے بھی کوئی گستاخی سرزد ہوجاتی اس لیے میں خاموش ہوگیا لیکن میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں مریم کا سراغ لگائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔

بابا جان نے فون کرکے دو سیٹیں بک کرالیں۔

میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں پاکستان روانگی سے پہلے ہی یہاں سے فرار ہوجاؤں گا۔

''پرسوں صبح دس بجے کی پرواز میں ہمیں سیٹیں ملی ہیں۔'' بابا جان نے کہا۔ ''تمہیں اپنے گھر سے جو ضروری سامان بھی لینا ہو، آج ہی لے آؤ۔''

میں نے سوچا کہ یہ بابا جان سے بچنے کا بہترین موقع ہے۔ میں بعد میں انہیں ٹیلی فون پر بتادوں گا کہ میں مریم کی تلاش میں جارہا ہوں تاکہ انہیں یہ فکر اور پریشانی نہ ہو کہ میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔

''تمہارا سامان تو بہت ہوگا۔'' بابا جان نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ایسا کرتے ہیں، ہم وہیں چلتے ہیں۔ تم اپنا ضروری سامان لے لینا۔ پھر ہم وہیں سے پاکستان روانہ ہوجائیں گے۔''

''بابا جان! وہاں آپ کو خاصی پریشانی ہوگی۔ وہاں کوئی کک نہیں ہے۔ پہلے تو میں کبھی خود الٹا سیدھا کھانا بنالیتا تھا ورنہ ہوٹلوں میں کھاتا تھا۔ پھر مریم نے کچن سنبھال لیا تھا۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے بابر۔'' بابا جان نے کہا۔ ''شادی سے پہلے میں بھی اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ تم میرے ہاتھ کے کھانے کھا کر حیران رہ جاؤ گے۔ چلو، اب دیر مت کرو۔''

میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سامان لینے کے بہانے یہاں سے جاؤں گا اور کہیں غائب ہوجاؤں گا لیکن بابا جان تو مجھے ایک لمحے کو بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ شاید ان کے دل میں بھی یہ خیال ہو کہ میں ایسی کوئی حرکت کرسکتا ہوں۔

''ایسا کرتے ہیں، پہلے سیکیورٹی ایجنسی کے آپریشنل ہیڈ کیپٹن رالف سے مل لیتے ہیں۔ اس کا بھی ایک آدمی مارا گیا ہے۔ وہ بھی اس سلسلے میں خاموش تو نہیں بیٹھا ہوگا۔''

بابا جان نے مجھ سے سیکیورٹی ایجنسی کا نمبر پوچھ کر وہاں فون کردیا اور ملاقات کا وقت طے کرلیا۔ ''چلو بابر! کیپٹن رالف ہمارا انتظار کررہا ہے۔''

کیپٹن رالف ہمارا ہی انتظار کررہا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بہت تپاک سے ملا پھر مجھ سے بولا۔ ''مسٹر بابر! مجھے افسوس ہے کہ میں...''

''اٹس آل رائٹ کیپٹن!'' بابا جان نے جلدی سے کہا۔

''لیکن سر! یہ میرے لیے کوئی ایسی بات نہیں ہے، میری ایجنسی کی ساکھ داؤ پر لگ گئی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے صنعت کار، بینک اور اعلیٰ شخصیات ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کرتی ہیں اور ہم پر آنکھیں بند کرکے یقین کرتی ہیں۔ ہم ایک لڑکی کی حفاظت نہ کرسکے۔''

''مجھے آپ کے گارڈ کی موت کا بہت افسوس ہے کیپٹن! میں...''

''مسٹر بابر!'' کیپٹن نے میری بات کاٹ دی۔ ''اپنے ایک بہترین کمانڈو کے ضائع ہونے کا مجھے بھی شدید افسوس ہے لیکن اب یہ میری اور ان لوگوں کی جنگ ہے۔ میں اپنے طور پر تحقیقات کررہا ہوں۔ میں اپنے آدمی کا خون معاف نہیں کروں گا۔''

اس دوران میں اس کا ایک آدمی کافی اور دوسرے لوازمات لے کر آگیا۔

''کیپٹن! آپ کو اس سلسلے میں کوئی سراغ ملا؟''

''ہاں، مجھے کچھ سراغ ملا تو ہے لیکن ابھی کچھ کہنا قبل ازوقت ہے۔''

''کیپٹن! میں چاہتا ہوں کہ میری وائف کو تلاش کرنے کا کام بھی آپ کی ایجنسی کرے۔'' میں نے کہا۔

''سوری مسٹر بابر!'' کیپٹن رالف نے کہا۔ ''ہم لوگوں کو صرف سیکیورٹی فراہم کرتے ہیں۔ ہاں، اکثر ہم ایک جاسوس ایجنسی کی خدمات حاصل کرتے ہیں بلکہ یوں سمجھ لیں کہ ہم اس جاسوس ایجنسی کے مستقل کلائنٹ ہیں۔ آپ اس سلسلے میں اس ایجنسی کے سربراہ مسٹر پیٹرسن سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے یہیں بلالوں۔ اس کا آفس بھی اسی فلور پر ہے۔''

''مسٹر رالف!'' میں نے کہا۔ ''مسٹر پیٹرسن مصروف آدمی ہوں گے۔ یوں بغیر اپائنٹمنٹ کے...''

''او کم آن مسٹر بابر!'' رالف ہنس کر بولا۔ ''پیٹرسن واقعی بہت مصروف آدمی ہے۔ لیکن میرا کالج کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے قانون کی تعلیم بھی ایک ہی یونیورسٹی سے حاصل کی ہے، پھر میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کرلی۔ پیٹرسن نے دو تین سال پریکٹس کی۔ وہ بہت ذہین بلکہ جینئس وکیل ہے۔ پھر اس نے اپنی ڈیٹکٹو ایجنسی کھول لی۔ ایجنسی کے ساتھ ساتھ اس کی ایک قانونی کمپنی بھی ہے۔ وہ مختلف کیسوں کی تحقیقات بھی کرتا ہے اور اس کی قانونی فرم کے وکیل عدالت میں اس کے کلائنٹس کی مدد کرتے ہیں۔ اگر انہیں سیکیورٹی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ میری خدمات حاصل کرلیتے ہیں۔''

''آپ نے مریم کیس کے سلسلے میں مسٹر پیٹرسن کی مدد نہیں لی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس کیس میں اس کی مدد نہ لیتا۔'' کیپٹن رالف مسکرایا۔ ''ہمیں جو سراغ بھی ملا ہے، وہ پیٹرسن کے جاسوسوں ہی کے ذریعے ملا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ مسٹر پیٹرسن کو بلالیں۔'' میں نے کہا۔

کیپٹن رالف نے ٹیلی فون پر پیٹرسن کی سیکریٹری سے بات کی اور کہا کہ پیٹرسن کو فوراً یہاں بھیجو۔ پھر اس نے سیکریٹری کی بات سنے بغیر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد رالف کے دفتر میں گول مٹول سا ایک شخص داخل ہوا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ لباس کے معاملے میں وہ خاصا بے پروا تھا۔

اس نے رالف سے پوچھا۔ ''کیا مسئلہ ہوگیا جو تم نے مجھے یوں ہنگامی طور پر طلب کیا ہے؟''

''یہ مسٹر بابر خان ہیں اور یہ ان کے والد مسٹر دلاور خان۔'' کیپٹن رالف نے اس سے ہمارا تعارف کرایا پھر ہم سے بولا۔ ''یہ پیٹرسن ہے ڈی اینڈ ڈیز کا چیف۔''

اس نے ہم لوگوں سے بہت پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملایا، پھر رالف سے بولا۔ ''یہ وہی مسٹر بابر ہیں جن کی مسز...''

''ہاں، یہ وہی مسٹر بابر ہیں۔'' رالف نے کہا۔ ''یہ اپنی مسز کی تلاش کے سلسلے میں تمہاری خدمات چاہتے ہیں۔''

''اینی ٹائم مسٹر بابر!'' پیٹرسن مسکرا کر بولا۔ ''ویسے میں رالف کی وجہ سے اس کیس پر پہلے ہی کام کررہا ہوں۔ اب اس کے لیے اپنے دو جاسوس مزید لگادوں گا تاکہ کام تیز رفتاری سے ہوسکے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''کچھ فارمیلٹیز پوری کرنے کے لیے آپ کو میرے آفس تک چلنے کی زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔''

''زحمت کیسی مسٹر پیٹرسن؟'' میں نے کہا۔ ''یہ کام تو دراصل میرا ہے۔''

ہم جانے لگے تو کیپٹن رالف نے مجھے یقین دلایا۔ ''میں اپنے طور پر بھی کوشش کررہا ہوں، پولیس چیف..... بھی اس سلسلے میں سرگرداں ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ ہم آپ کی مسز کو جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے۔''

پیٹرسن کا دفتر بہت شاندار تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ فارمز پر دستخط لیے۔ اپنی فیس وغیرہ کے معاملات طے کیے اور ہم باہر نکل آئے۔

وہاں سے میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ کیپٹن رالف کا سیکیورٹی گارڈ اب بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کی ایجنسی کو چار ہفتے کا معاوضہ پیشگی ادا کیا تھا۔ اس نے مجھے فوجی انداز میں سلام کیا۔ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔

کئی دن سے گھر کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں سمیٹیں اور بابا جان کو بیڈروم میں لے گیا۔

بیڈروم میں ایک طرف شاپرز کے ڈھیر تھے۔ ان شاپرز میں وہ تحفے تھے جو مریم نے پاکستان آنے کے لیے خریدے تھے۔ ان شاپرز کو دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔

میں زیادہ دیر اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ایک ایک گوشے میں مریم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دو بڑے سوٹ کیس لے کر ایک میں اپنے کپڑے، ڈگریاں اور دیگر کاغذات رکھے۔ ان کاغذات میں مریم کی ڈگریاں، میرا نکاح نامہ وغیرہ بھی تھا۔ کچھ فوٹو البم بھی تھے۔ میں نے وہ البم دیکھے بغیر سوٹ کیس میں رکھ لیے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جب میرا بابا جان کے ساتھ پاکستان جانے کا ارادہ ہی نہیں تو پھر اتنا زیادہ سامان ڈھونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کچھ ضروری کاغذات اور اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور بقیہ سامان دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔

رات کا کھانا میں نے باہر سے منگوالیا۔

کھانا کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم نے پیکنگ کرلی ہے؟''

''جی بابا جان!'' میں نے کہا۔ ''مجھے پیکنگ کرنا ہی کیا تھی؟ میں نے اپنی ڈگری، کپڑوں کے چند جوڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھ لی ہیں۔ باقی سامان میں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔''

دوسرے دن ہماری فلائٹ تھی۔ میں نے رات ہی کو کیپٹن رالف کو ہدایت دے دی تھیں کہ سیکیورٹی ایجنسی کا گارڈ میری غیر موجودگی میں بھی یہاں رہے گا۔ وہ اگر چاہے تو میرے اپارٹمنٹ کا ایک کمرا استعمال کرسکتا ہے۔

ہم لوگ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے تو میرا ذہن مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ میں بابا جان کو ڈاج دے کر کیسے نکلوں؟ میں فی الحال پاکستان جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے سوچا، فلائٹ اسلام آباد جاتے ہوئے راستے میں دو تین جگہ رکے گی۔ میں اس ٹرانزٹ کے دوران میں فرار ہو سکتا تھا۔

ہماری فلائٹ فرینکفرٹ پر رکی تو مجھے کچھ امید پیدا ہوئی۔

مسافروں کو ائرپورٹ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے بابا جان بھی مطمئن تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے بیگ سمیت وہاں سے کیسے فرار ہوسکتا ہوں؟

پھر مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ ممکن ہے میری یہ ترکیب کامیاب بھی ہوجاتی۔ سب کچھ میری اداکاری پر منحصر تھا۔

میں اچانک بیٹھے بیٹھے بابا جان کی طرف لڑھک گیا اور ان کے کندھے سے سر ٹکا کر بولا۔ ''بابا جان! مجھے شدید چکر آرہے ہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔'' وہ سمجھے کہ شاید ایف بی آئی کی قید میں رہ کر مجھے کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے۔

''تم کیا محسوس کررہے ہو بابر؟'' بابا جان گھبرا کر بولے۔

''بابا جان! میرے سینے اور پیٹ کے ساتھ ساتھ بائیں ہاتھ میں بھی شدید درد ہورہا ہے۔ مم... میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

بابا جان ایک دم گھبرا گئے اور امیگریشن کے کاؤنٹر کی طرف دوڑے۔ ان لوگوں نے میری حالت کے پیشِ نظر مجھے اسپتال جانے کی اجازت دے دی۔

فوراً ہی ایک ایمبولینس آگئی اور ہمیں لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

اسپتال پہنچتے ہی میری بیان کردہ علامات کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے فوری طور پر مجھے آکسیجن ماسک لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک منی ڈرپ بھی لگا دی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنی حالت سنبھال لی۔ ڈاکٹرز نے مجھے فوری طور پر سفر نہ کرنے کی ہدایت کی اور مجھے ایمرجنسی وارڈ سے کمرے میں منتقل کردیا۔

پاکستان کی طرح وہاں کے اسپتالوں میں مریض کے ساتھ آنے والوں کو ان کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ صرف مخصوص اوقات میں مریض سے مل سکتے ہیں۔

مجھے ندامت بھی ہورہی تھی کہ اس شدید سردی میں بابا جان باہر وزیٹر روم میں بیٹھے ہوں گے یا پھر اسپتال کے کوریڈور میں ٹہل رہے ہوں گے۔

میرا بیگ اور بابا جان کا سوٹ کیس البتہ اسی کمرے میں موجود تھے۔

میں نے نرس...... سے نیند نہ آنے کی شکایت کی تو اس نے مجھے کھانے کے لیے دو گولیاں دے دیں۔ ظاہر ہے وہ خواب آور گولیاں تھیں۔ میں نے دونوں گولیاں مٹھی میں دبا کر انہیں حلق میں ڈالنے کی اداکاری کی اور فوراً پانی کا گلاس پی لیا۔

''اب آپ کو بہت پُرسکون نیند آئے گی مسٹر بابور! (بابر)'' اس نے کہا۔

''سسٹر! میرے فادر بھی میرے ساتھ تھے، وہ اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ وزیٹرز روم میں موجود ہیں لیکن ابھی آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ ڈرپ چیک کی جو مجھے کمرے میں منتقل کرنے کے بعد لگائی گئی تھی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آدھے گھنٹے تک مزید انتظار کیا۔ سسٹر اس دوران میں ایک مرتبہ پھر آئی اور مجھے بے خبر سوتا ہوا دیکھ کر چلی گئی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے وہاں رکھے ہوئے اپنے کپڑے اٹھائے اور اسپتال کا لباس اتار پھینکا۔

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور دبے پاؤں وہاں سے نکل کر اسپتال کے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ پارکنگ لاٹ سے گیٹ زیادہ دور نہیں تھا لیکن وہاں بھی گیٹ پر ایک گارڈ بیٹھا تھا۔

میں اس کی پروا کیے بغیر بہت پُراعتماد انداز میں اسپتال سے باہر نکلا۔ گارڈ نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر اونگھنے لگا۔

میں تیزی سے سڑک پر آیا اور کسی ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ فرینکفرٹ میں ٹیکسیاں ہر وقت مل جاتی

ہیں۔ مجھے بھی جلد ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں نے اس سے کسی ہوٹل چلنے کو کہا۔

مجھے خدشہ تھا کہ بابا جان نے اگر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تلاش کریں گے۔ اس لیے میں نے ایک عام سے ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔

ڈرائیور نے بیس منٹ میں مجھے معقول قسم کے ایک ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔

مجھے وہاں کمرا ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

میں جانتا تھا کہ بابا جان سوئے نہیں ہوں گے۔ میں نے سیل فون نکال کر ان کا نمبر ڈائل کیا تو انہوں نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی۔

''ہاں بابر!'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولے۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

مجھے اس وقت انتہائی شرمندگی اور ندامت ہورہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بابا جان...! میں بالکل ٹھیک ہوں... مجھے معاف کردیجیے گا۔ میری طبیعت تو خراب ہوئی ہی نہیں تھی۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا تھا۔ میں اب اس اسپتال سے جاچکا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے پلیز، مجھے غلط مت سمجھیے گا اور وہاں کوئی کارروائی بھی نہ کیجیے گا ورنہ میں کسی دوسری الجھن میں پڑ جاؤں گا۔ آپ پاکستان چلے جائیں۔ میں بھی انشاءاللہ مریم کو لے کر پاکستان آؤں گا۔''

''بے ہودہ، احمق لڑکے۔ تجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بابا جان! اس کے بغیر تو آپ مجھے امریکا میں چھوڑنے کو تیار بھی نہ ہوتے۔''

''جو تیرا دل چاہے کر۔'' وہ جھلا کر بولے۔ ''لیکن اتنا بتا دوں کہ اب اگر خدانخواستہ تو کسی چکر میں پھنسا تو میں بھی تجھے نہ بچا سکوں گا۔ بس اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

''آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا بابا جان اور مجھے اس حرکت پر معاف کردیجیے گا، فی امان اللہ۔'' میں نے کہا اور جلدی سے سلسلہ منقطع کردیا پھر میں نے اپنا سیل فون بھی آف کردیا۔

میں دوسرے دن بھی ہوٹل سے باہر نہ نکلا۔ کھانا اور ناشتا بھی کمرے ہی میں کیا۔

تیسرے دن میں وہاں سے نکلا اور براہِ راست کیلی فورنیا جانے کے بجائے لندن جانے کا فیصلہ کیا۔

فلائٹ میں میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک شعلہ جوالہ براجمان تھی۔ وہ انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ جدید فیشن کے لباس اور میک اپ نے اس کے حسن کو دوآتشہ کردیا تھا۔

میں نے کئی برس امریکا میں گزارے تھے اس لیے مجھے لڑکیوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی تھا اور ان کی نفسیات کو بھی خوب سمجھتا تھا۔

میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایک میگزین اٹھایا اور اس حسینہ کو نظرانداز کرکے میگزین کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

وہ حسینہ تھوڑی دیر تو پہلو بدلتی رہی، پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''اتنی طویل فلائٹ مجھے بور کردیتی ہے۔ لگتا ہے یہ جہاز بھی اڑنے کے بجائے رینگ رہا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی توجہ رسالے پر رکھی۔

وہ چند لمحے بعد براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''تم کہاں جارہے ہو؟''

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔

''اے مسٹر!'' وہ جھلا کر بولی۔ ''میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔''

''آں...'' میں نے چونک کر کہا۔ ''تم نے مجھ سے کچھ کہا۔''

اس کی رواں انگلش سے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے؟

''میں یہ پوچھ رہی تھی کہ تم کہاں جارہے ہو؟'' پھر وہ مسکرا کر خود ہی بولی۔ ''سفر اگر طویل ہو تو ہم سفروں سے گفتگو میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''یہ فلائٹ کہاں جارہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو لندن جارہی ہے۔'' اس نے خوامخواہ مسکرا کر کہا۔

''تو پھر میں بھی لندن ہی جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور یہ فلائٹ اتنی بھی طویل نہیں ہے کہ انسان یوں بور ہو جائے۔''

''تو فرینکفرٹ سے سوار ہوئے ہو، میں پاکستان سے آرہی ہوں۔ مسلسل آٹھ گھنٹے تک بیٹھنا مجھے بور کردیتا ہے۔''

''آپ اپنی سیٹ کھول کر اس پر لیٹ بھی سکتی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''امریکن تو بہت خوش مزاج ہوتے ہیں۔ تم اتنے اکھڑ کیوں ہو؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں امریکن ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا حلیہ، لباس، چہرہ، بال بھی کچھ تو امریکنوں کی

طرح ہے۔"
"تمہارا تعلق شاید پاکستان سے ہے؟"
"نو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا تعلق انڈیا سے ہے۔"
"لیکن تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم پاکستان سے آرہی ہو؟"
"اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ میں پاکستانی بھی ہوں۔"

وہ لڑکی خواہ مخواہ میرے گلے پڑ رہی تھی اور یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ خوب صورت لڑکیاں کسی سے اس بھونڈے انداز میں بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔

تھوڑی دیر بعد میں باتھ روم جانے کے لیے اٹھ گیا لیکن وہاں پہلے سے کوئی موجود تھا اس لیے میں فوراً ہی واپس آگیا۔

میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ لڑکی نے پھرتی سے اپنے ہینڈ بیگ سے کوئی چیز نکالی اور جھک کر میرے بیگ میں ڈال دی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

اس وقت تک باتھ روم جانے والا مسافر باہر نکل آیا تھا۔ میں دوبارہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس لوٹا تو وہ لڑکی آگے کی رو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو کوئی اشارہ کر رہی تھی۔

میں واپس پہنچا تو وہ مسکرا کر بولی۔ "کیا تم ٹوائلٹ میں سو گئے تھے؟"

"ہاں، اکثر مجھے بیٹھے بیٹھے نیند آجاتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یوں بھی میں دو راتوں کا جاگا ہوا ہوں اس لیے اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دیر نیند لے لوں۔"

"میں تو خود تم سے یہی بات کہنے والی تھی۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"

میں نے اپنی سیٹ کھولی اور اس پر نیم دراز ہو گیا۔ لڑکی بھی اس وقت اونگھ رہی تھی یا سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔

میرا ہینڈ بیگ اوپر کے خانے میں رکھا تھا۔ اگر نیچے ہوتا تو شاید مجھے اس لڑکی کی اس حرکت کا علم بھی نہ ہوتا۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ سردی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ذرا کمبل لے لوں۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کمبل نکالا اور اس کی آڑ میں اپنے بیگ میں سے اوپر ہی رکھا ہوا ایک خوب صورت سا ڈبّا نکال لیا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر کمبل کی آڑ میں وہ ڈبا کھول لیا۔ اس میں خوب صورت سی ایک رسٹ واچ تھی لیکن ڈبے کا وزن اس گھڑی سے زیادہ تھا۔ تھوڑی سی کوشش کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ اس ڈبّے کی دُہری تہ ہے۔

میں نے اوپری حصہ اٹھایا تو نیچے مجھے ایک پولیتھین بیگ دکھائی دیا۔ اس پولیتھین کی تھیلی میں سفید رنگ کا کوئی سفوف تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ ہیروئن ہے۔ وہ ٹالکم یا بورک پاؤڈر تو ہو نہیں سکتا تھا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکی مجھ سے اتنی بے تکلف کیوں ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں وہ ہیروئن نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پھر وہ کسی بھی بہانے سے مجھ سے وہ ڈبّا حاصل کر سکتی تھی۔

وہ لڑکی تنہا بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کم از کم ایک آدمی تو ضرور تھا۔ میں نے غور سے اس آدمی کا جائزہ لیا جسے لڑکی نے کوئی اشارہ کیا تھا۔

وہ درمیانی عمر اور قدوقامت کا شخص تھا۔ اس نے گرے کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے ہی سے جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ ممکن ہے اس لڑکی کے مزید ساتھی بھی اس فلائٹ میں ہوں۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

وہ رسٹ واچ تو اتنی بڑی نہیں تھی لیکن ڈبّا اس کی مناسبت سے کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ اس کے اندر کچھ اس انداز کا خانہ تھا کہ اس ڈبّے کا سائز اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ایک مرتبہ پھر باتھ روم جاؤں اور اس پولیتھین کی تھیلی کو فلیش میں پھینک دوں۔

وہ ڈبّا تو میرے کوٹ کی جیب میں نہیں آسکتا تھا۔ میں نے تھیلی اس میں سے نکالی۔ اس ڈبّے کو کمبل کے نیچے چھپایا اور ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "اگر بیئر زیادہ پی لی جائے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔"

میں دوبارہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

باتھ روم میں جا کر میں نے وہ تھیلی نکالی۔ اس کا وزن مشکل سے ڈیڑھ سو گرام ہو گا لیکن میں جانتا تھا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت بھی لاکھوں میں ہو گی۔

میں نے وہ تھیلی فلیش میں بہا دی اور دوبارہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی واقعی سو گئی۔ اس نے جس شخص کو اشارہ کیا تھا، وہ بھی اونگھ رہا تھا۔ یوں بھی اس شخص کی پشت

میری طرف تھی۔

میں آہستگی سے اٹھا۔ وہ ڈبّا دوبارہ اپنے بیگ میں رکھا اور اطمینان سے سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

پھر شاید مجھے بھی اونگھ آگئی۔ میری آنکھ اس اعلان سے کھلی کہ ہم چند منٹ بعد لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔

لڑکی بھی اٹھ بیٹھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "تم کیسے ہم سفر ہو؟ تم نے تو اب تک اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"تم نے تو شاید مجھے اپنا نام کئی بار بتایا ہے؟" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"میرا نام کانتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"میں بابر ہوں۔ بابر خان فرام پاکستان۔" میں بھی مسکرایا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تم... تم مسلمان ہو؟ یقین نہیں آرہا ہے کہ تم پاکستانی بھی ہو سکتے ہو۔ لیکن تمہارا پاسپورٹ تو امریکن ہے۔"

"تم نے میرا پاسپورٹ بھی دیکھ لیا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"جب تم نے اپنے فولڈر میں سے کسی کا وزیٹنگ کارڈ نکالا تھا تو میں نے تمہارا پاسپورٹ دیکھا تھا۔" اس نے کہا۔

مجھے یاد آگیا کہ میں نے اپنے لندن کے ایک دوست زاہد کا سیل نمبر دیکھنے کے لیے اس کا وزیٹنگ کارڈ نکالا تھا۔

"لندن میں کہاں ٹھہرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"لندن میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ اگر وہ مل گیا تو اس کے ساتھ قیام کروں گا ورنہ کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔"

"تمہارے ساتھ سفر بہت اچھا گزرا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اپنا سیل نمبر تو دے دو۔" اس نے یوں کہا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

میں نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا۔ اس نے آزمانے کے لیے کہ میں نے واقعی اسے درست نمبر دیا ہے، اس نمبر پر اپنے سیل فون سے کال کی۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ بولی۔ "میں نے مس کال اس لیے دی ہے کہ تم بھی میرا نمبر محفوظ کر لو۔"

جہاز زمین کو چھو چکا تھا، پھر وہ آہستگی سے رک گیا اور مسافر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ میں نے بھی اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور کارگو سے آنے والے سامان سے اپنا بڑا بیگ لے کر امیگریشن اور کسٹم لاؤنج میں پہنچ گیا۔

کانتا میرے ساتھ گویا چپکی ہوئی تھی۔ وہ کسٹم کاؤنٹر پر بھی میرے ساتھ ہی تھی۔

کسٹم افسر نے سرسری انداز میں میرے سامان کا جائزہ لیا۔ میرا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ اچانک اس کی نظر گھڑی کے اس خوب صورت ڈبّے پر پڑی۔ اس نے وہ ڈبّا نکال لیا۔ "یہ کیا ہے مسٹر؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

میں اس ڈبّے کو حیرت سے دیکھنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے کانتا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا کہ کہیں میں اس ڈبّے کی ملکیت سے انکار نہ کر دوں۔ ایسا ہونے کی صورت میں وہ کسٹم آفیسر اس ڈبّے کا بہ غور جائزہ لیتا اور فوراً ہی اس کا خفیہ خانہ تلاش کر لیتا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر ڈبّا کھولا اور ہنس کر بولا۔ "واؤ! بہت خوب صورت رسٹ واچ ہے۔"

"سر! اگر یہ آپ کو پسند ہے تو آپ میری طرف سے یہ گفٹ قبول کریں۔" میں نے کہا۔

"تھینک یو سر!" کسٹم آفیسر مسکرا کر بولا۔ "یہ گفٹ آپ جس کے لیے لائے ہیں اسی کو دیجیے گا۔" پھر اس نے سرسری انداز میں میرے بڑے بیگ کا جائزہ لیا اور مجھے کلیئر کر دیا۔

میں آپ کو شاید یہ بتانا بھول گیا کہ فرینکفرٹ سے میں نے ایک خوب صورت سا چمڑے کا ہینڈ بیگ لے لیا تھا تاکہ اس میں اپنے سفری دستاویزات سیل فون وغیرہ رکھ سکوں۔

کانتا کے پاس بھی چھوٹا سا ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ بھی فوراً ہی میرے پیچھے آگئی اور بولی۔ "تم تو بہت سخی ہو۔ اتنی خوب صورت اور قیمتی گھڑی اس کسٹم آفیسر کو گفٹ میں دے رہے تھے۔"

"اسے پسند آئی تو میں نے اسے آفر کر دی۔"

"اگر میں کہوں کہ وہ گھڑی مجھے بھی بہت پسند آئی ہے تو؟" اس نے بہت ناز سے مسکرا کر کہا۔

"تو میں تمہیں بھی وہی پیشکش کروں گا کہ اگر پسند ہے تو تم لے لو۔"

"تھینک یو ویری مچ بابر! مجھے وہ گھڑی واقعی بہت پسند آئی ہے۔" اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے اسے اس کا "مال" واپس مل جائے گا۔

"مجھے تو خود یاد نہیں آرہا ہے کہ میں نے وہ گھڑی کب خریدی تھی۔ ویسے میں اچھی گھڑیوں، پرفیومز وغیرہ کا شوقین ہوں۔ ممکن ہے میں نے یہ گھڑی بھی اسی ڈپارٹمنٹل اسٹور سے

لے لی ہو۔"

میں نے گھڑی کا ڈبّا نکالا اور کانتا کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے جلدی سے وہ ڈبّا میرے ہاتھ سے لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور بولی۔ "تم سے دوبارہ مل کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔" میں مسکرایا اور اس کی طرف ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

اسی وقت مجھے وہ شخص نظر آیا جسے کانتا نے اشارہ کیا تھا۔ وہ بہ غور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ساتھی سے بات کرنے لگا۔

اس کا ساتھی لحیم شحیم اور سرخ و سفید شخص تھا۔ شاید وہ میرا ہی ہم وطن تھا۔ اپنے چہرے اور آنکھوں کی بناوٹ سے تو وہ افغان ہی لگ رہا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور زاہد کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا سیل فون اس وقت آف تھا۔ میں نے دو تین دفعہ کوشش کی پھر جھنجلا کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"یس سر!" اس نے بہت ادب سے پوچھا۔

"مجھے کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں لے چلو۔" میں نے یہ کہہ کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

ٹیکسی رکی تو میرے سامنے لندن کے فائیو اسٹار ہوٹل رٹز کی شاندار عمارت تھی۔ ڈرائیور مجھے کروڑ پتی امریکن بزنس مین سمجھا تھا جو اس مہنگے ترین ہوٹل میں لے آیا تھا۔ ضروری خانہ پُری کے بعد ایک پورٹر نے میرا بڑا بیگ اور ہینڈ بیگ اٹھایا۔ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی پُرکشش حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ "روم نمبر سیون او سیوون سر!"

"کیا یہ کسی فلائٹ کا نمبر ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

جواب میں وہ حسینہ بھی کھل کر مسکرائی اور بولی۔ "سر! یہ آپ کے روم کا نمبر ہے۔"

وہ روم کیا، سوئٹ تھا۔ بیرونی حصے میں ایک صوفہ سیٹ، میز اور ایک راکنگ چیئر رکھی تھی۔ بیڈ روم انتہائی آرام دہ تھا۔

میں نے اپنے بیگ کا سامان الماری میں رکھا اور نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں کئی گھنٹوں سے جاگ رہا تھا اور اب ایک پُرسکون نیند سونا چاہتا تھا۔ غسل کرنے کے بعد میں نے روم سروس سے کافی اور کچھ ہلکا پھلکا ناشتا منگوایا اور اس سے فارغ ہو کر میں نے کھڑکیوں کے پردے کھینچے اور نرم و گداز بیڈ پر لیٹ گیا۔

میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔

میں اس وقت مریم کو خواب میں دیکھ رہا تھا، وہ مجھے چھیڑنے کے لیے مسلسل گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "مریم! اپنا یہ کھلونا اپنے ہونے والے بچے کے لیے رکھ دو اور مجھے سونے دو۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

مریم نے مسکرا کر ایک مرتبہ پھر گھنٹی کا بٹن دبایا۔

میں جھلّا کر اٹھ بیٹھا۔ گھنٹیاں واقعی بج رہی تھیں۔ وہ میرے سیل فون کی گھنٹی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اسے آف کیوں نہیں کیا۔

فون کی گھنٹی بج بج کر خاموش ہو چکی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا، ابھی مجھے لیٹے ہوئے صرف آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ اس میں پانچ مس کالز تھیں۔

میں سیل فون آف کرنے ہی والا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجنے لگی۔ سیل فون کی اسکرین پر کوئی نام نہیں تھا لیکن وہ نمبر مجھے غیر مانوس نہیں لگ رہا تھا۔ میرا کمپیوٹرائزڈ ذہن مسلسل کام کر رہا تھا کہ یہ نمبر اس سے پہلے میں نے کہاں دیکھا ہے۔

تیسری گھنٹی پر میں نے کال ریسیو کر لی اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیلو!"

"ہیلو مسٹر اسمارٹ!" دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر میں سلگ اٹھا۔ وہ کانتا تھی۔

"کیا پرابلم ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں ابھی ابھی سویا تھا اور تم نے مجھے ڈسٹرب کر دیا۔"

"زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ اس گھڑی کے ڈبّے کے نچلے خانے میں ایک پولیتھین بیگ تھا۔ وہ کہاں ہے؟" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"کس ڈبّے کی بات کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں اس ڈبّے کی بات کر رہی ہوں جو تم نے مجھے گفٹ کیا تھا۔" کانتا نے تڑخ کر کہا۔

"تو کیا میں نے تمہیں گفٹ دے کر غلطی کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ اب اس کی جھنجلاہٹ پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

"دیکھو بابر!" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میں پھر کہوں گی کہ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ ورنہ تم بہت بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ وہ پولیتھین بیگ شرافت سے میرے حوالے کر دو جو تم نے گھڑی کے اس ڈبّے سے نکالا ہے۔"

"تم نہ جانے کیا بکواس کر رہی ہو؟" میں نے درشت

لہجے میں کہا۔ مجھے اس کا دھمکی آمیز انداز پسند نہیں آیا تھا۔ "میں تو خود اس ڈبّے سے لاعلم تھا۔ کسٹم کاؤنٹر پر تم بھی تو موجود تھیں جب اس آفیسر نے وہ ڈبّا کھولا تھا۔ پھر میں نے فوراً ہی وہ تمہیں گفٹ کر دیا تھا۔"

"زیادہ چالاکی مت دکھاؤ۔ یہ مت سمجھنا کہ تم ہماری پہنچ سے دور ہو۔ ہم کسی بھی وقت تمہاری گردن دبوچ سکتے ہیں۔"

"ہم؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "یہ "ہم" کون ہے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں؟ میرے ساتھ پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ وہ لوگ اپنے "مال" کے سلسلے میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتے ہیں۔ اگر تم نے دو گھنٹے کے اندر اندر وہ پولیتھین بیگ واپس نہ کیا تو پھر انجام کے ذمے دار تم خود ہو گے۔"

"اب تم ایک بات میری بھی سن لو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "دو گھنٹے تک انتظار کر کے اپنا اور اپنے اس نیٹ ورک کا وقت برباد مت کرو۔ میرے پاس کوئی پولیتھین بیگ نہیں ہے اور آئندہ مجھے کال مت کرنا۔ امید ہے کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اپنے لوگوں سے کہو کہ مجھے تلاش کریں اور گولی مار دیں۔"

"گویا تم انکار کر رہے ہو؟"

"اگر تم کہو تو میں یہی بات، فرنچ اور جرمن میں بھی دہرا سکتا ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارا نیٹ ورک ہے تو میں بھی لاوارث نہیں ہوں۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ منقطع کرتے ہی فوراً سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ وہ دوبارہ مجھے کال کر رہی تھی لیکن میں نے سلسلہ منقطع کیا اور سیل فون آف کر کے پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کم بخت نے میری نیند اڑا دی تھی۔ میں دیر تک بیڈ پر لیٹا پہلو بدلتا رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب دوبارہ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میری آنکھ کھل جاتی تھی تو پھر بہت مشکل سے دوبارہ نیند آتی تھی۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ میں بابا جان سے بچ کر بھاگ تو آیا ہوں، میرے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے اور وہ کب تک میرے کام آسکتی ہے؟

کیلی فورنیا کے دو بینکوں میں میرا اکاؤنٹ تھا۔ میں نے سیل فون کے بجائے ہوٹل سے بینک ٹیلی فون کیا اور اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا کر منیجر سے بیلنس کے بارے میں معلوم کیا۔ میرے اس اکاؤنٹ میں اب صرف بیس ہزار ڈالرز تھے، دوسرے بینک میں رقم اس سے بھی کم تھی اور وہاں صرف بارہ ہزار ڈالرز ہی تھے۔

میں اچانک فکر مند ہو گیا۔ میں اب بھی بابا جان سے پیسے منگوا سکتا تھا لیکن میں ان سے کس منہ سے پیسے مانگتا؟

پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، میرے پاس کمرشل پائلٹ کا لائسنس ہے۔ مجھے کہیں بھی ملازمت مل جائے گی اور پہلے کی طرح شاہانہ انداز میں نہیں تو گزارے لائق تو اخراجات پورے کر ہی لوں گا۔

مجھے کچھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے روم سروس کو ٹیلی فون کر کے کھانا لانے کو کہا اور خود وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ روم سروس کا ویٹر ہوگا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

فوراً ہی دو آدمی مجھے دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔

ان دونوں نے چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہن رکھی تھیں۔ پیروں میں گرپ سول کے جوتے تھے اور چہروں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ دونوں کے جسم سانڈ کی طرح مضبوط تھے۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے ریوالورز تھے جن کی نال پر سائیلنسر فٹ تھے۔

"کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہم لوگ کون ہیں، اس بات کو چھوڑو۔ ہاں، وہ مال ہمارے حوالے کر دو جو تم نے کانتا سے لیا ہے۔"

"تم لوگ اس فیلڈ میں کب سے ہو؟" میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر پوچھا۔

"ہم لوگ!" ان میں سے ایک انتہائی بھونڈے انداز میں ہنسا۔ "ہم تو پیدا ہی اسی لائن میں ہوئے تھے۔"

"اگر تم اس لائن میں پرانے ہوتے تو کبھی ایسی حرکت نہ کرتے۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں یہاں اکیلا ہوں۔ یہ گھڑی دیکھ رہے ہو؟" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس گھڑی میں چھوٹی سی ایک ڈیوائس موجود ہے جس کے ذریعے میرا باس میری باتیں سن رہا ہوگا بلکہ اب تک اس کے

آدمی اس ہوٹل میں پہنچ بھی چکے ہوں گے۔ میں اگر اتنا کچا کھلاڑی ہوتا تو یوں بے فکری سے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ ٹھہرتا۔ تمہیں جس نے بھی یہاں بھیجا ہے، قربانی کا بکرا بنایا ہے۔'' میں نے انہیں دہشت زدہ کرنے کو کہا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میری باتوں سے اتنے حواس باختہ ہوجائیں گے۔ وہ تو عقل سے بالکل ہی پیدل تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں...

''ایک بات اور بتا دوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے باس نے اب تک علاقے کی پولیس کو بھی اطلاع دے دی ہو گی۔ لندن کی پولیس کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تم نے اگر مجھے مار بھی دیا تو بچ نہیں سکو گے۔ چلو اب مجھے گولی مارو اور یہاں سے نکل جاؤ۔'' میں نے یوں کہا جیسے گولی مارنے کی نہیں چائے پینے کی بات کررہا ہوں۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ دونوں چونک اٹھے۔

باہر سے آواز آئی۔ ''روم سروس سر!''

''اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لو۔'' میں نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یس کم اِن۔''

دروازہ کھلا تو روم سروس کا ایک ویٹر ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ اس دوران میں ان دونوں نے بوکھلا کر اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لیے تھے۔

''آپ لوگ کھانا کھائیں گے؟'' میں نے پوچھا جیسے وہ میرے مہمان ہوں۔

''نہیں، ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ میرے پُراعتماد اور پُرسکون انداز سے وہ دونوں بُری طرح بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے اور شاید میری اس بات پر یقین کر بیٹھے تھے کہ ہماری تمام گفتگو کہیں اور بھی سنی جارہی ہے اور کسی بھی وقت میرے آدمی وہاں پہنچ کر انہیں ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔

ویٹر کے جانے کے بعد نے پوچھا۔ ''ویسے تم لوگ ہو بہت ذہین۔ تم لوگوں نے اتنی جلدی میرا سراغ کیسے لگالیا؟''

''ہمارے باس نے آپ کی ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ اس نے بعد میں ٹیکسی والے سے آپ کے بارے میں معلوم کر لیا۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''ہمارا باس...''

ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی شخص اندر داخل ہوا جسے میں نے ائرپورٹ پر دیکھا تھا اور اپنا ہم وطن سمجھا تھا۔

اس کے ہاتھ میں بھی سائیلنسر والا ریوالور تھا اور چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ اس نے دروازہ بولٹ کیا اور درشت لہجے میں ان لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگوں کو یہاں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟ میں گزشتہ چالیس منٹ سے ہوٹل کے دروازے پر تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ ایک آدمی تمہارے قابو میں نہیں آیا۔ اس نے کچھ بتایا کہ وہ پولیتھین بیگ کہاں ہے؟'' وہ ان لوگوں سے پشتو میں بات کررہا تھا۔

میں اس کی زبان سن کر چونکا ضرور لیکن مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ شخص میرا ہم وطن ہوسکتا ہے۔

''بہت افسوس کی بات ہے مسٹر!'' میں نے بھی پشتو میں کہا۔

وہ بُری طرح اچھل پڑا۔ ''تم... تم... پشتو جانتے ہو؟ تم نے یہ زبان...''

''یہ زبان میں نے... سیکھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میری مادری زبان ہے۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ تم میرے ہی ہم وطن ہو کر مجھے ہی پھنسانے کی کوشش کررہے تھے۔''

''تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟'' اس کے لہجے میں اب وہ کرختگی نہیں تھی۔

''میرا تعلق افغانستان سے ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر اچھل پڑا۔ ''تم افغان ہو، تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟''

''میرا تعلق تو ایسے قبیلے سے ہے جس نے روسی فوجوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ میرے باپ کا نام آج بھی روسیوں کے لیے دہشت کی علامت ہے۔ اگر تم افغان ہو تو شاید تم نے بھی میرے باپ کا نام سنا ہوگا۔ میں سردار دلاور خان کا بیٹا ہوں۔''

وہ ہکا بکا ہو کر میری شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تمہاری اس خوب صورت حسینہ نے میرے بیگ میں جب وہ ڈبا رکھا تھا، میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا۔ میں نے وہ پولیتھین بیگ فلیش میں بہا دیا۔ بہرحال، میں تمہارا نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت کیا ہے؟ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں کیش دے دوں گا۔''

اس نے اپنا ریوالور میرے قدموں میں ڈال دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مجھے معاف کردیں سردار بابر خان! میں خود بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ مجھ سے انجانے میں بہت بڑی بھول ہوگئی۔ آپ چاہیں تو اس ریوالور کی تمام گولیاں

میرے جسم میں اتار دیں۔''

''سردار دلاور اور ان کے بیٹے کا ہاتھ کبھی اپنوں پر نہیں اٹھ سکتا۔'' میں نے باوقار انداز میں کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام گل شیر خان ہے لیکن میں جی ایس خان کے نام سے مشہور ہوں۔''

''تم نے بتایا نہیں کہ اس تھیلی کی قیمت کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے اتنا شرمندہ مت کریں سردار بابر خان۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اپنا جوتا اٹھائیں اور میرے سر پر ماریں۔ میں اسی قابل ہوں۔'' وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے اٹھ کر دونوں شانے پکڑ کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ ''ایک عرصے کے بعد تو مجھے میرا ہم وطن ملا ہے۔ تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا ہے، یہی بہت ہے۔'' میں نے اسے اپنے برابر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ جاؤ یہاں سے۔'' اس نے اپنے دونوں آدمیوں کو درشت لہجے میں حکم دیا۔

وہ دونوں فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔

میں نے کھانے کی ٹرالی اپنی طرف کھینچی اور اس سے کہا۔ ''آؤ گل شیر خان! پہلے کھانا کھالو۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔''

''آپ کے ساتھ کھانا تو میرے لیے ایک سعادت ہے بابر خان صاحب!'' اس نے کہا اور میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔

کھانے کے دوران میں بھی وہ بابا جان اور قبیلے کی باتیں کرتا رہا۔

''آپ سے مل کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی ہے۔'' گل شیر نے کہا۔ ''آپ میرا سیل نمبر لے لیں۔ اگر زندگی کے کسی بھی موڑ پر آپ کو میری ضرورت پڑے تو آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔''

اس نے اپنا سیل نمبر وہاں رکھے ہوئے پیڈ پر سے ایک کاغذ پھاڑ کر اس پر لکھا اور میرے حوالے کردیا۔

''میں نے اپنے تمام نمبرز اس پر لکھ دیے ہیں۔'' گل شیر نے کہا۔ ''سب سے اوپر میرا وہ نمبر ہے جو صرف میں مخصوص لوگوں کو دیتا ہوں۔''

وہ کافی پینے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اب اجازت دیں بابر صاحب! آپ کا سیل نمبر تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کبھی کبھی آپ سے بات کرلیا کروں؟'' اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھ سے روز بات کرسکتے ہو گل شیر خان!'' میں نے ہنس کر کہا۔

گل شیر خان نے رخصت ہوتے ہوئے مجھے ایک بار پھر سینے سے لگایا اور روانہ ہوگیا۔

اب مجھے کانتا یا کسی بھی غیر متوقع کال کی آمد کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے اپنا سیل فون ایک مرتبہ پھر آن کردیا اور دوبارہ بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں مریم کی تلاش کہاں سے شروع کروں؟

سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا اور بڑبڑایا۔

''اب کون ہے؟'' میں نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی تو بُری طرح چونک اٹھا... کال بابا جان کی تھی۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگایا اور بولا۔

''السلام علیکم بابا جان!''

''وعلیکم السلام۔'' بابا جان کا لہجہ نارمل تھا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو بابر؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں اس وقت فرانس میں ہوں، پیرس میں۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے جھوٹ پر ندامت محسوس کی۔ ''آپ تو خیریت سے ہیں بابا؟''

''ہاں، مجھے کیا ہونا ہے؟'' بابا جان نے کہا۔ ''میں خیریت سے ہوں لیکن تمہاری ماں تمہارے لیے بہت فکرمند ہے۔ میں گزشتہ ایک گھنٹے سے تمہارا نمبر ملا رہا تھا لیکن تمہارا سیل فون آف تھا۔ ہاں، میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم بھجوا دی ہے۔ مزید ضرورت پڑے تو مجھے بتا دینا۔ اور میں نے جاسوس ایجنسی اور کیپٹن رالف کو بھی ایک ایک ماہ کی پیشگی ادائیگی کردی ہے۔'' اماں اور بہن سے بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

پھر میں نے سوچا کہ یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے خود کیلی فورنیا جانا پڑے گا۔ یہ سوچنے کے بعد میں نے ایک ہوٹل کی ٹریول ایجنسی کو فون کرکے سیٹ کنفرم کرالی۔

سیٹ کرانے کے بعد میں کسل مندی سے پھر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔

کمرے میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔

میں نے نیٹ آن کیا تو مجھے خیال آیا کہ معلوم تو کروں کہ بابا جان نے میرے اکاؤنٹ میں کتنے روپے جمع کرائے ہیں۔

اپنا بیلنس دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بابا جان نے

میرے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ ڈالرز جمع کرائے تھے، جی ہاں پانچ لاکھ ڈالرز! میں تو چند گھنٹوں میں پاکستانی کرنسی میں کروڑ پتی ہوگیا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ رٹز ہوٹل، لندن کے بہترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے اردگرد کے مناظر بہت خوب صورت ہیں۔ ہوٹل میں ہر قماش کے شخص کی دلچسپی کا سامان ہے۔ وہاں بہت بہترین بار ہے جہاں دنیا بھر کی بہترین شرابیں موجود ہیں۔ جدید قسم کا ایک کیسینو ہے جہاں بہت بڑے پیمانے پر جوا ہوتا ہے، ہوٹل میں بہترین سوئمنگ پول اور جم ہے۔ وہاں رینٹ اے کار، ٹریول ایجنسی اور منی ایکسچینج کی سہولیات بھی میسر ہیں۔ غرض وہاں دنیا کی ہر چیز میسر ہے۔

جب سے بابا جان امریکا آئے تھے بلکہ اس سے بھی پہلے سے جب ایف بی آئی نے مجھے حراست میں لیا تھا، میں نے شراب اور سگریٹ نہیں پی تھی۔

اس وقت دل اتنا بے چین تھا کہ میں نے بیڈروم فریج کھول کر دیکھا تو اس میں شراب کی بوتلیں موجود تھیں۔

میں نے شیمپین کی ایک بوتل نکالی اور اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے روم سروس کو اسنیکس اور ہوانا کے معروف سگاروں کا آرڈر بھی دے دیا اور سگریٹ کے پیکٹ بھی منگوا لیے۔

میں نے ایک لارج پیگ بنایا اور اسے اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ ویٹر جب تک اسنیکس، سگار اور سگریٹ لے کر آیا، میں دو پیگ چڑھا چکا تھا۔

میں نے تیسرا لارج پیگ تیار کیا تو شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ یوں بھی میں نے کافی عرصے بعد اس ام الخبائث کو ہاتھ لگایا تھا اس لیے مجھے کچھ زیادہ ہی سرور آرہا تھا۔

میں نے تلے ہوئے کاجو اور مونگ پھلیاں منگوائی تھیں، ان کے ساتھ بادام بھی تھے۔ میں کاجو کھاتا رہا اور شراب پیتا رہا۔

پھر بیڈ پر نیم دراز ہوکر میں نے سگار سلگا لیا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ”یس!“

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر میری آنکھوں کے سامنے جو چہرہ آیا، میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ کانتا تھی۔

”ہیلو مسٹر بابر!“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”اوہو، اکیلے اکیلے پی رہے ہو؟“

میں سرور میں ضرور تھا لیکن مدہوش نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟ کیا وہ پوتھین بیگ؟“

”نہیں، میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم باس کے ہم وطن اور ایک وار لارڈ کے بیٹے ہو۔“

”کوئی بات نہیں کانتا۔“ میں نے کہا۔

وہ بہت ادا سے مسکرا کر بولی۔ ”لندن کا جوبن عروج پر ہے اور تم کمرے میں بند ہوکر پینے میں مصروف ہو۔“

”اس وقت میں کہیں بھی جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں اگر تم شراب کی عادی ہو تو میری طرف سے تمہیں بھی پینے کی آفر ہے۔“

”میں عادی تو نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی پی لیتی ہوں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تو پھر اپنی مدد آپ کرو۔“ میں مسکرایا۔ ”گلاس اٹھاؤ اور شروع ہوجاؤ۔“

کہاں تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ وہ کبھی کبھی پیتی ہے اور کہاں وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چار پیگ چڑھا گئی۔

میرا چوتھا پیگ ابھی کچھ باقی تھا۔

میں اتنی کبھی نہیں پیتا تھا کہ اپنے حواس میں نہ رہوں۔

کانتا کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرنے لگے تھے بلکہ وہ تو پوری کی پوری لہرا رہی تھی۔

وہ خمار آلود لہجے میں ہنسی پھر بولی۔ ”بابر! تم بہت ہینڈسم ہو۔ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔“

”تم بھی بہت خوب صورت ہو کانتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں جان بوجھ کر تمہیں نظر انداز کررہا تھا۔“

وہ لہراتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور میرے سینے پر گھونسا مار کر بولی۔ ”تم جانتے ہو، اس دن مجھے کتنی ذہنی کوفت ہوئی تھی؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔

کانتا نے لہرا کر کرسی کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو پائی اور مجھ پر ڈھیر ہوگئی۔

اس کا نرم و گداز بدن خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ میں خود بھی بہت ترنگ میں تھا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھر تو گویا میری چاروں طرف رنگ اور روشنیوں کی بارش ہوتی رہی اور میں اس پھوار میں بھیگتا رہا۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی میں ساڑھے آٹھ بج

رہے تھے۔

میرا سر بھاری بھاری ہورہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو میرا ہاتھ کسی نرم و گداز جسم سے ٹکرایا۔

میں نے چونک کر دیکھا، میرے نزدیک ہی کانتا لیٹی تھی۔

مجھے رات کے تمام واقعات یاد آگئے۔ مجھے خود سے ندامت سی محسوس ہوئی۔ مریم سے شادی کے بعد میں نے کسی لڑکی کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے، اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کم بخت کانتا نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ سوتے ہی میں اس کی گردن مروڑ ڈالوں، پھر میں نے سوچا کہ اس میں کانتا کا بھی کیا قصور تھا؟ میں بھی تو برابر کا شریک تھا۔

میں آہستگی سے بیڈ سے اتر کر باتھ روم میں چلا گیا اور نیم گرم پانی سے دیر تک نہاتا رہا۔ نہانے سے میری طبیعت خاصی ہشاش بشاش ہوگئی۔

میں باتھ روم سے نکلا تو کانتا بیڈ پر نیم دراز سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس وقت وہ اس ناقابلِ اعتراض حالت میں نہیں تھی جس میں اسے میں نے چھوڑا تھا۔ اس کے جسم پر پورا لباس تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا تو مجھے اس سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ وہ مسکراتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر میں نے روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا اور اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔

کانتا باتھ روم سے نکلی تو وہ خاصی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ وہ کم بخت بغیر میک اپ کے بھی انتہائی حسین اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ اس دوران میں ناشتا آگیا۔

وہ ناشتا کرتے ہوئے بولی۔ ”بابر! تم واحد مرد ہو جس نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔“

”تمہارے باس نے سن لیا تو وہ میرے ساتھ ساتھ تمہاری بھی کھال ادھیڑ دے گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”میرا باس!“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جی ایس خان! اس میں تو یہ حس ہی نہیں ہے۔ نہ جانے وہ کس مٹی سے بنا ہے کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔“

اس کی بات سے مجھے مزید شرمندگی ہوئی۔ گل شیر خان بُرا آدمی ضرور تھا لیکن وہ عیاش نہیں تھا۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ اس نے بہت ادا سے مسکرا کر پوچھا۔

”دس بجے جی ایس خان میرے پاس آئے گا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جائے گا۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کو جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔

وہ واقعی بوکھلا گئی اور بولی۔ ”یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اب چلتی ہوں۔ ویسے تم سے یہ ملاقات یادگار رہی۔ مجھے امید ہے کہ دوسری ملاقات اس سے بھی زیادہ یادگار ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہوائی بوسہ اچھالا اور لچکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ اسے گئے ہوئے دس ہی منٹ ہوئے تھے کہ گل شیر خان کی کال آگئی۔

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”بابر صاحب! کیسے ہیں آپ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”آج شام آپ کی کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آج شام!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں آج شام کی فلائٹ سے کیلی فورنیا جارہا ہوں۔ وہاں کچھ ضروری کام ہے۔“

”آپ ایک دن میری خاطر رک نہیں سکتے؟“ اس نے کہا۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”خاص ہی سمجھیں۔“ گل شیر نے کہا۔ ”ڈان مسعود خان آج تین بجے لندن آرہا ہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ اس سے آپ کی ملاقات ہوجائے۔ وہ بھی آپ کے والد کا بہت بڑا مداح ہے۔“

”میری سیٹ کنفرم ہے اور مجھے کل شاید کسی فلائٹ میں سیٹ نہ ملے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی آپ فکر مت کریں۔ میں کل صبح کی کسی فلائٹ سے آپ کی سیٹ کنفرم کرا دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ایسا ہوسکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج شام نہیں تو کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔“

”آپ کا بہت شکریہ بابر صاحب! تیار رہیے گا، میں ٹھیک چار بجے آپ کو لینے آؤں گا۔“

گھڑی نے چار بجائے ہی تھے کہ گل شیر خان کمرے میں داخل ہوا۔ میں بھی تیار تھا۔

"بابر صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مسعود خان، سردار دلاور خان کا بہت بڑا مداح ہے۔ وہ مجھ پر بھی اس لیے زیادہ اعتماد کرتا ہے کہ میرا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہے۔ میں نے آج تک اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ جب وہ آپ سے ملے گا تو میری عزت اس کی نظروں میں مزید بڑھ جائے گی۔" اس نے میرے ساتھ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ڈان مسعود خان چالیس، پینتالیس سال کا شخص تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ کن پٹیوں کے پاس اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ سر کے کچھ بال بھی سفید تھے۔ ان بالوں کی وجہ سے اس کی شخصیت میں مزید وقار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ مجھ سے یوں والہانہ انداز میں ملا جیسے کوئی اپنے برسوں سے بچھڑے ہوئے عزیز سے ملتا ہے پھر وہ گونج دار آواز میں بولا۔ "بابر صاحب! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اس عظیم شخص کے بیٹے سے ملاقات کر رہا ہوں۔ یہ بات میں نے گل شیر کو بھی نہیں بتائی کہ ایک مرتبہ تمہارے بابا نے میری جان بچائی تھی۔"

"آپ کی جان بچائی تھی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تم شاید اس وقت ڈیڑھ دو برس کے ہو گے۔ میں افغانستان سے پشاور کے راستے "مال" کا ٹرک لے کر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے پولیس نے گھیر لیا۔ میں ٹرک سے نکل کر بھاگا تو پولیس کی ایک گولی میری ٹانگ میں لگ گئی۔ اس وقت دلاور خان صاحب اپنی گاڑی میں وہاں سے جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے زخمی حالت میں دیکھا تو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں اس کی گولی سے زخمی ہوا ہوں۔"

دلاور خان صاحب نے کہا۔ "اب تم میری پناہ میں ہو۔ اطمینان رکھو، پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"اس وقت تک افغان، روس جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس پوری سرحدی پٹی میں دلاور صاحب کی دہشت تھی۔ پولیس کو علم تھا کہ میں دلاور صاحب کی گاڑی میں موجود ہوں لیکن ان کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ دلاور صاحب کی گاڑی کا راستہ روکتے۔

"میں نے بھی اس سے پہلے صرف ان کا نام سنا تھا۔ میں پہلے ہی ان سے متاثر تھا۔ اس واقعے کے بعد تو گویا میں ان کا مرید ہو گیا۔ انہوں نے مجھے اس وقت تک اپنا مہمان رکھا جب تک میرا زخم بھر نہ گیا۔"

"یہ تو پدرم سلطان بود والا معاملہ ہے مسعود خان صاحب! میرا باپ واقعی اس عزت و احترام کا مستحق ہے۔ لیکن میں کیا ہوں، صرف دلاور خان کا بیٹا!"

"ان کا بیٹا بھی میرے لیے قابلِ احترام ہے۔" مسعود خان نے کہا۔ "ویسے تو اللہ نہ کرے کہ آپ کو کوئی پریشانی ہو لیکن اگر کبھی کوئی ایسی بات ہو تو مجھے صرف ایک ٹیلی فون کر دیجیے گا۔ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوا، آپ تک پہنچ جاؤں گا۔ اب سے بیس بائیس سال قبل حالات کچھ اور تھے۔ اب میرے حالات کچھ اور ہیں۔ بھارتی حکومت اور وہاں کی انڈر ورلڈ کے لوگ میرے نام سے کانپتے ہیں۔" پھر مسعود خان کے ساتھ میں نے پُرتکلف ڈنر کیا اور اس سے اجازت چاہی۔ گل شیر نے مجھے بتایا تھا کہ صبح چھ بجے آپ کی فلائٹ ہے۔

فلائٹ میں کیلی فورنیا کی طرف سفر کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میں مریم کی تلاش میں مسعود خان سے بھی تو مدد لے سکتا ہوں۔ اس کا نیٹ ورک بہت وسیع ہے لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ نیک نام آدمی نہیں ہے۔ یہ بات امریکن ایف بی آئی کے علم میں بھی ہوگی۔ مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر انہیں ایک مرتبہ پھر مجھ پر شبہ ہو سکتا تھا اور مسعود خان پر بھی آفت آ سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں انتہائی مجبوری کی حالت ہی میں مسعود خان سے مدد لوں گا۔

کیلی فورنیا پہنچ کر میں سیدھا گھر پہنچا۔ وہاں سیکیورٹی ایجنسی کا اہلکار موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں تو کوئی نہیں آیا لیکن کچھ لوگ اس گھر کی نگرانی ضرور کر رہے ہیں۔

"نگرانی کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کون لوگ ہیں وہ؟"

"مجھے یقین ہے سر کہ وہ ایف بی آئی والے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب وہ میرے گھر کی نگرانی کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے یہ بات کیپٹن رالف کو بتائی؟"

"جی سر!" اس نے جواب دیا۔ "کیپٹن صاحب کا خیال ہے کہ وہ لوگ اب تک آپ پر شک کر رہے ہیں۔"

میں نے کچھ دیر گھر میں وقت گزارا پھر وہاں سے سیدھا پیٹرسن کے آفس پہنچا۔

وہ اس وقت کسی کلائنٹ کے ساتھ مصروف تھا اس لیے مجھے دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔

وہ انتہائی تپاک سے ملا اور مسکرا کر بولا۔ "ویلکم ہوم مسٹر بابر!"

"تھینک یو!" میں نے کہا۔ "مریم کے بارے میں کیا اپ ڈیٹ ہے مسٹر پیٹرسن؟"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ "مسز بابر کے اغوا میں یہاں کی انڈر ورلڈ کا ایک ڈان مورٹن ملوث ہے۔"

"تو پھر اس کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے سر! وہ..."

"مسٹر پیٹرسن! آپ کے منہ سے یہ سن کر مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اس لیے قانون کی پہنچ سے بالاتر ہے۔"

"اس کی پشت پر یہاں کے ایک ارب پتی جیکسن کا ہاتھ ہے۔ وہ یہاں کا اسٹیل کنگ کہلاتا ہے۔ یو ایس اے کی مختلف ریاستوں میں اس کی اسٹیل ملز ہیں۔ وہ یو ایس آرمی اور پولیس کو بڑے پیمانے پر اپنی مصنوعات فراہم کرتا ہے۔ اس کا ایک کزن ورجینیا کا سینیٹر بھی ہے۔ جیکسن کے تعلقات خود بھی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ حکام اور پولیس سے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کو بتانے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو مرعوب کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ مجھے اب تک مورٹن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ میں دن رات اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ مجھے اس کے خلاف کوئی ثبوت ملے اور میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں۔"

میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "مسٹر پیٹرسن! کیا ہم زندگی بھر اس انتظار میں بیٹھے رہیں گے کہ مورٹن کے خلاف کوئی ثبوت ملے تو اس پر ہاتھ ڈالا جائے؟"

"قانونی طریقہ تو یہی ہے مسٹر بابر۔" پیٹرسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں اتنا فرشتہ بھی نہیں ہوں۔ مورٹن کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو میں اسے ڈرا دھمکا کر حقیقت اس سے اگلوا لیتا لیکن..."

"مسٹر پیٹرسن!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے میرے لیے اتنی زحمت کی، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب..."

"اس میں شکر گزار ہونے کی بات کہاں سے آ گئی مسٹر بابر۔" پیٹرسن نے کہا۔ "لیکن یہ ایک بات ذہن میں رکھیے گا۔ آپ خود قانون ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ایف بی آئی والے اب بھی آپ کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے آپ کے اس مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

"ایک منٹ مسٹر بابر!" پیٹرسن نے کہا۔ "آپ کی طرف سے مجھے پورے ماہ کے اخراجات کا چیک موصول ہوا تھا۔ ابھی صرف تین دن ہی گزرے ہیں۔ میں آپ کے بقایا جات ادا کر دوں پھر چلے جائیے گا۔" اس نے انٹرکام پر کسی سے کہا۔ "مسٹر بابر خان کی فائل لے کر میرے کمرے میں آؤ۔"

پیٹرسن نے ادا شدہ رقم میں سے تین دن کے اخراجات کاٹنے کے بعد مجھے بقیہ رقم کا چیک لکھ دیا۔

میں اس سے رخصت ہونے لگا تو ایک مرتبہ پھر اس نے کہا۔ "مسٹر بابر! مجھے آپ کے جذبات کا اندازہ ہے لیکن میں پھر آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ قانون ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

"میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا، مسٹر پیٹرسن۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہاں سے واپسی پر مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ ایک گاڑی مسلسل میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ کیپٹن رالف اور اس کا گارڈ مجھے بتا چکا تھا کہ ایف بی آئی والے میری نگرانی کر رہے ہیں۔

میں وہاں سے گھر پہنچا تو مجھے خود بھی احساس ہوا کہ دو آدمی مسلسل میرے گھر کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ میں اس کی شکایت اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ سے کروں لیکن ان سے بھی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایف بی آئی والے ان کی مرضی کے بغیر تو میری نگرانی نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال، میں نے تمام چیزوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔

☆☆☆

میں سو کے اٹھا تو میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کیپٹن رالف کا نام تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو کیپٹن!"

"بابر صاحب! آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کی نگرانی ایف بی آئی کے لوگ نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ کوئی دوسری پارٹی ہے۔"

"دوسری پارٹی کون سی ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے تو پیٹرسن کو روک دیا ہے لیکن وہ میرے لیے اب بھی کام کر رہا ہے۔ اس کے ایک خاص آدمی نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کا ایف بی آئی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب آپ کو مزید محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"کیپٹن!" میں نے کہا۔ "میں بالکل نہتا ہوں۔ مجھے کوئی ریوالور یا پستول مل سکتا ہے؟"

"یہ آپ کا قانونی حق ہے بابر صاحب! آپ کل ہی اسلحے کے لائسنس کے لیے درخواست دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو فوراً ہی لائسنس مل جائے۔ اس محکمے میں کئی عہدے داروں سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔"

"او کے۔" میں نے کہا۔ "میں کل ہی درخواست دے دیتا ہوں اور اطلاع دینے کا شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن کچھ بھی بنانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، میں کسی ریسٹورنٹ میں جا کر ڈنر کر لوں۔

میں گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلا۔ گھر سے تقریباً چھ سات کلومیٹر کے فاصلے پر ایک صاف ستھرا ریستوران تھا۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انڈیا کے ایک مسلمان کا ریستوران تھا اور وہاں حلال گوشت ملتا تھا۔

میں اسی ریستوران میں پہنچ گیا اور خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔

میں گھر واپس پہنچا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

میرا اسکیورٹی گارڈ بہت محتاط تھا۔ اس نے لائٹ جلا کر جب تک مجھے اچھی طرح نہ دیکھ لیا، گاڑی کو اندر داخل نہیں ہونے دیا۔

☆☆☆

اس وقت میں گہری نیند میں تھا جب گھنٹی کی تیز آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر کان سے لگایا لیکن گھنٹی کی کرخت آواز دوبارہ سنائی دی تو مجھے علم ہوا کہ وہ سیل فون کی نہیں بلکہ میرے لینڈ لائن ٹیلی فون کی گھنٹی تھی۔ سیل فون تو سونے سے پہلے میں نے آف کر دیا تھا۔

میں نے جھلّا کر ریسیور اٹھا لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ "ہیلو!"

"بابر صاحب!" دوسری طرف سے میرے سیکیورٹی گارڈ کی آواز آئی۔ "میں ایڈی بول رہا ہوں۔"

"ہاں ایڈی۔" میں پریشان ہو گیا کہ اس وقت وہ مجھے کال کیوں کر رہا ہے۔

"سر! کوئی عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بہت روکا لیکن یہ کہہ رہی ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔"

"عورت؟" میں بڑبڑایا۔ "نام کیا ہے اس کا؟"

"یہ اپنا نام بھی نہیں بتا رہی ہے۔"

"سیل فون اسے دو۔" میں نے کہا۔

چند لمحے بعد سیل فون پر جو آواز سنائی دی، اسے سن کر میری ہڈیاں تک سلگ اٹھیں۔ وہ کانتا کی آواز تھی۔

"تم!" میں نے بھنا کر کہا۔ "تم رات کے اس پہر میرے گھر کے باہر کیا کر رہی ہو؟ اور تم..."

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بہت ضروری اطلاع ہے بابر!" کانتا نے جلدی سے کہا۔

میں نے گارڈ سے کہا کہ اسے اندر آنے دو۔

فوراً ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ کانتا فوراً اندر آ گئی۔

میں اسے بیڈ روم کے بجائے سٹنگ روم میں لے گیا اور بولا۔ "ہاں، اب بتاؤ... کیا ضروری اطلاع ہے؟"

"اتنے بداخلاق کب سے ہو گئے تم؟" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "کچھ پینے کو ہے تو مجھے دے دو۔ سردی سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

میں نے وھسکی کی بوتل اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔

دو پیگ پینے کے بعد وہ ترنگ میں آ گئی۔

"بتاؤ، کیا ضروری اطلاع ہے؟"

"تمہاری وائف کا نام کلارا ہے؟"

میں بُری طرح اچھل پڑا۔ "تم کلارا کو کیسے جانتی ہو؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم نے آج جس ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا، وہاں مورٹن کے دو آدمی بھی موجود تھے۔"

"تم مورٹن کو بھی جانتی ہو؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"مورٹن کیلی فورنیا میں ہمارا سب سے بڑا گاہک ہے۔ میں اس کے آدمیوں کو مال پہنچانے ہی آئی تھی۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "کلارا کون ہے اور یہ امریکن کون ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ امریکن نہیں بلکہ ایشیا کے کسی ملک کا مسلمان ہے۔ اب اس کی بیوی کلارا ہمارے قبضے میں ہے اور یہ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

"کیوں، اس کی بیوی تمہارے قبضے میں کیوں ہے؟ اور وہ ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

دوسرا آدمی غرا کر بولا۔ "اپنے کام سے کام رکھو بے بی۔"

"کام کی بات کرو کانتا!" میں مضطرب ہو کر بولا۔

"اس نے بتایا کہ اس ایشیائی کی بیوی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔" کانتا نے کہا اور مجھے اس کا پتا بتانے لگی جو میں نے جلدی جلدی رائٹنگ پیڈ پر لکھ لیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اب رات یہیں گزارے گی لیکن وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں اب چلتی ہوں۔ مجھے کیش فوری طور پر جی ایس خان کے حوالے کرنا ہے۔"

"تمہارا بہت شکریہ کانتا!" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "تم نے میری خاطر اتنی زحمت کی۔"

"چھوڑو ان باتوں کو... اب میں چلتی ہوں۔" اس نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کی، سر پر اونی ٹوپی چڑھائی اور گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر باہر نکل گئی۔

میں مورٹن کے اس آدمی کے ایڈریس کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ علاقہ کیلی فورنیا کا قدرے پسماندہ علاقہ تھا۔ وہاں زیادہ تر نچلے اور متوسط طبقے کے لوگ، ایشیا سے آنے والے تارکینِ وطن اور کم آمدنی والا طبقہ رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کل سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ اس شخص سے ملاقات کروں گا۔

میں لائٹ آف کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے ابھی پوری طرح نیند بھی نہیں آئی تھی کہ فائرنگ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

فائرنگ میرے ہی گھر کے قریب ہو رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ فائرنگ اس وقت تک تھم چکی تھی۔ میں نے یہ سمجھ کر دروازہ کھول دیا کہ باہر میرا گارڈ ہوگا۔

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور مجھے گن پوائنٹ پر لے لیا۔ وہ اپنے چہروں ہی سے تیسرے درجے کے گھٹیا بدمعاش لگ رہے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو ہم بعد میں بتائیں گے... پہلے تُو بتا، کلارا کہاں ہے؟"

"کیا تم نہیں جانتے کہ میں خود بھی اس کی تلاش میں ہوں؟"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" ایک آدمی غرا کر بولا۔ "اسے یہاں سے لے چلو۔ ابھی یہاں پولیس پہنچنے والی ہوگی۔"

وہ دونوں مجھے گن پوائنٹ پر باہر لائے اور ایک گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے سر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرے سر پر لگنے والی ضرب ایسی ہی تھی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں کسی بیڈ روم میں تھا۔

کمرے کی حالت کافی خستہ تھی۔ اس کی دیواروں سے نہ صرف رنگ اڑ گیا تھا بلکہ کئی جگہ سے پلاستر بھی جھڑ گیا تھا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی دونوں منحوس اندر داخل ہوئے جو گن پوائنٹ پر مجھے وہاں لائے تھے۔

ان میں سے ایک کا قد درمیانہ تھا لیکن جسم گٹھا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے مقابلے میں خاصا دراز قد تھا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ دونوں کے چہروں پر اس وقت پھٹکار برس رہی تھی۔

"تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم کون ہیں؟" دراز قد مکروہ انداز میں مسکرایا۔ "میں ہیکل ہوں اور یہ جیکل!" اس نے

کشمکش

"اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، جاوید؟"

"بات یہ ہے کہ پرسوں میں نے دو خط لکھے تھے۔ ایک خط اپنے دوست عمران کے نام لکھا تھا جس میں اس سے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ مجھے بیوقوف اور احمق سمجھتا ہے۔ دوسرا فرزانہ کے نام تحریر کیا تھا کہ کیا وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہے۔ آج کی ڈاک سے مجھے ایک خط موصول ہوا ہے جس پر لکھا ہے۔ "ہاں۔" اب مجھے خط بھیجنے والے کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا۔"

(پشاور سے محبت خان کی الجھن)

سوال، جواب

س: اس شخص کو جو محبت کے معاملے میں خوش قسمت ہو، کیا کہتے ہیں؟

ج: کنوارا۔

س: کیا نئی فلم کا انجام خوشگوار ہے؟

ج: ہاں، فلم ختم ہونے پر ہر شخص خوش ہو جاتا ہے۔

س: اگر میں اپنے آپ سے گفتگو کروں تو کیا مجھے احمق سمجھا جائے گا؟

ج: نہیں، بشرطیکہ آپ سنیں نہیں۔

(الحیان، جدہ)

پستہ قد کی طرف اشارہ کیا۔

''بڑی خوشی ہوئی تم دونوں سے مل کر۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ویسے تم ٹام اور جیری بھی ہوتے تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ مجھے تم لوگ یہاں کس خوشی میں لائے ہو؟''

''کلارا کہاں ہے؟'' ہیکل نے اچانک درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ تم مجھ ہی سے پوچھ رہے ہو کہ وہ کہاں ہے؟''

ہیکل نے میرے چہرے پر زور سے تھپڑ رسید کر دیا۔ ''بکواس مت کرو۔ رات ہم نے خود اسے تمہارے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔''

''رات تم نے اسے دیکھا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے دوسرا تھپڑ لگایا اور بولا۔ ''ہاں، رات وہ تمہارے پاس آئی تھی۔''

مجھے یاد آ گیا کہ رات کو تو کانتا میرے پاس آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ میری ایک دوست کانتا تھی۔''

اس نے اس دفعہ میرے پیٹ میں گھونسا مارا۔ ''تم اس کا نام کچھ بھی رکھ لو، وہ رہے گی تو کلارا۔ وہ کہاں ہے؟''

''میں نے بتایا تو ہے کہ وہ میری ایک دوست کانتا تھی۔'' میں نے درد کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھونسا ایک مرتبہ پھر میرے پیٹ میں دے مارا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری جان نکل رہی ہو۔ میرا سانس اکھڑ گیا اور جسم بے جان ہو گیا تھا۔ بہت مشکل سے سانس میرے سینے میں سمایا۔ میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ آخر یقین کیوں نہیں کرتے؟ اسے جب سے اغوا کیا گیا ہے میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔''

''دیکھو مسٹر بابر! ہم تمہیں سوچنے کے لیے دو گھنٹے دے رہے ہیں۔ اگر تم نے اس کے بعد بھی سچ نہ بتایا تو تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔'' ہیکل نے کہا پھر وہ جیکل سے مخاطب ہوا۔ ''آؤ، اب ہم بھی کچھ کھا پی آئیں۔ رات سے اس ویرانے میں پڑے ہیں۔'' وہ جاتے جاتے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر بابر! یہ ایک فارم ہاؤس ہے۔ اردگرد کئی میل تک آبادی کا نام و نشان بھی نہیں ہے اس لیے چیخ پکار کر کے اپنی توانائی ضائع مت کرنا۔ تمہارے شور شرابے سے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ پھر مجھے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی پھر وہ آواز بتدریج دور ہوتی گئی۔

نہ جانے وقت کیا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں تو اس وقت گھڑی بھی نہیں تھی۔ گھڑی ہوتی بھی تو میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان مردودوں نے مجھے اس انداز میں باندھا تھا کہ میرے دونوں شانوں سے لے کر پیروں تک ریشم کی باریک لیکن مضبوط رسّی بندھی ہوئی تھی۔ وہ رسّی میری جلد میں گڑی جا رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹوں؟ ان حرام زادوں کی قید سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں؟

کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی۔ وہ بھی اس وقت بند تھی اور کھلی بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا۔ میں تو کسی بستر بند کی طرح ایک رسّی میں لپٹا ہوا تھا۔

میں نے کمرے میں اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے اپنی دائیں طرف ایک میز نظر آئی۔ وہ میز میرے بیڈ کے بالکل نزدیک تھی۔ اس پر شراب کی ایک تقریباً خالی بوتل اور گلاس، سگریٹ کا ایک پیکٹ اور لائٹر رکھا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ... کسی طرح میں یہ لائٹر حاصل کر لوں' یہ ترکیب ذہن میں آتے ہی میں نے تگ و دو شروع کر دی اور بالآخر کئی کوششوں کے بعد لائٹر کو اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے لائٹر کو انگلیوں کے درمیان دبایا اور اسے روشن کر لیا۔ وہ ایسا گیس لائٹر تھا جو تیز ہوا میں بھی نہیں بجھتا ہے اور اس کا شعلہ عام لائٹر کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتا ہے۔

مجھے اب لائٹر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اندازے سے اسے رسی کی طرف کیا اور ایک مرتبہ پھر اسے روشن کر دیا۔

چند لمحے بعد مجھے اپنی دائیں ران میں شدید جلن کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ آگ اس کے بجائے میرے کپڑے میں لگ گئی ہے۔ میں نے بمشکل تمام ایک ہاتھ آزاد کرا لیا اور دوسرے ہاتھ کو بھی رسی کی گرفت سے چھڑا لیا۔

میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ اپنی ران پر مارا تو مجھے اپنی ہتھیلی میں جلن کا شدید احساس ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے گرد لپٹی ہوئی رسی کے بل مزید ڈھیلے ہو گئے۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو تیزی سے حرکت دی اور انہیں دائیں

بائیں گھمایا تو رسّی مزید ڈھیلی ہو گئی اور میری ذرا سی کوشش سے میرے دونوں پاؤں رسی کے ڈھیلے پڑنے والے بلوں سے باہر نکل آئے۔ میں پاؤں آزاد ہوتے ہی بستر سے نیچے آ گیا۔

میں تھوڑی دیر تک اپنی کلائیوں اور پنڈلیوں کو مسلتا رہا کیونکہ ریشمی رسّی جسم کے انہی حصوں میں زیادہ سختی سے پیوست ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میرا دورانِ خون نارمل ہو گیا۔

وہ وقت اپنی چوٹیں سہلانے کا نہیں تھا۔ وہ دونوں خبیث کسی بھی وقت واپس آ سکتے تھے۔ میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش میں اردگرد کا جائزہ لیا جس سے میں اپنا دفاع کر سکوں۔ مجھے وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ کمرے میں اس بیڈ کے علاوہ ایک میز اور دو پرانی سی سال خوردہ کرسیاں تھیں۔

میں نے ان ہی کرسیوں میں سے ایک کا پایہ پکڑ کر کھینچا تو وہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے کرسی کو احتیاط کے ساتھ دیوار سے لگا دیا تاکہ انہیں پہلی نظر میں یہ احساس نہ ہو سکے کہ کرسی کا ایک پایہ نہیں ہے۔ پھر میں نے بہت تیزی سے ٹوٹی ہوئی بوتل اور گلاس کے ٹکڑے سمیٹے اور انہیں بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔

میں نے وہ رسّی ایک مرتبہ پھر اپنے جسم کے گرد یوں لپیٹی کہ میرے دونوں ہاتھ آزاد رہیں۔ پھر میں کرسی کا ٹوٹا ہوا پایہ اپنے پہلو میں چھپا کر حتی الامکان پہلے کی طرح لیٹ گیا۔

تکلیف کے باوجود مجھے نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے صرف سنا تھا کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے اب ہو رہا تھا۔

میں اس وقت بھی ہلکی ہلکی غنودگی میں تھا جب میں نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ وہ آواز آہستہ آہستہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ پھر باہر سے مجھے گاڑی کے دروازے زوردار آواز کے ساتھ بند ہونے کی آواز آئی تو میں ذہنی طور پر اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے کرسی کے مضبوط پائے کو اپنے دائیں پہلو کے نیچے چھپا لیا۔

پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔

میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ یہ فائنل راؤنڈ تھا۔ اگر میں اس میں ناکام ہو جاتا تو پھر وہ لوگ نہ جانے مجھے زندہ بھی چھوڑتے یا نہیں۔

اچانک دروازہ کھلا تو میں نے آنکھیں موند لیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے ایسی آوازیں آئیں جیسے ان لوگوں نے میز پر کچھ رکھا ہو۔ شاپرز کی چرچراہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شاپرز میں کچھ لائے ہیں۔

پھر ہیکل کی آواز سنائی دی۔ ''یہ منحوس ہمیں بے آرام کرنے کے بعد کس مزے سے سو رہا ہے۔'' دوسرے ہی لمحے میرے چہرے پر ہیکل کا تھپڑ پڑا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھیے نواب صاحب!'' ہیکل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ یاد آیا یا پھر سارا وقت سوتے ہی رہے۔''

وہ میرے بالکل نزدیک آ گیا تھا اور کسی بھی وقت میرے کھلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جیکل اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ خوش کن بات یہ تھی کہ اس وقت ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔

ہیکل کی نظر اچانک میرے ہاتھوں پر پڑ گئی۔ وہ چیخ کر بولا۔ ''یہ کھل کیسے گیا؟''

میں نے اسی وقت کرسی کا پایہ نکالا اور خاصی قوت سے ہیکل کے سر پر دے مارا۔ وہ عین وقت پر کچھ پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کے باوجود پایہ اس کے سر پر لگا۔

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور اس پائے سے جیکل پر حملہ کر دیا۔ اس کے سر پر بھرپور ضرب لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے فرش پر آ گرا۔

ہیکل اس وقت تک سنبھل کر اپنا ریوالور نکال چکا تھا لیکن میں نے گھوم کے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پایہ رسید کر دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا گرا۔ اس نے تکلیف کی پروا کیے بغیر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے بوجھ سے میں فرش پر گر گیا اور پایہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

میں نے اس کی دونوں کلائیاں تھامیں اور اس کے چہرے پر پوری قوت سے ٹکر رسید کر دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر الٹ کر گرا۔ میں اب اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرسی کا پایہ دوبارہ اٹھایا اور خاصی قوت سے اس کے سر پر رسید کر دیا۔

پائے کی ضرب کے ساتھ ساتھ لکڑی کے چٹخنے کی سی آواز آئی۔ میری ضرب سے اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔ میں نے جیکل کو دیکھا، وہ بھی غیر فطری انداز میں فرش پر پڑا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

"مجھے... تھوڑا... سا۔پانی... پلادو۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ لوگ شاپرز میں اپنے ساتھ سینڈوچز، برگر اور شراب کی ایک بوتل لائے تھے۔

میں نے شراب کی بوتل کھول کر اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ اس نے دو تین گھونٹ پیے تو مجھے اس کی حالت کچھ بہتر لگی۔

"ہاں اب بتاؤ، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ... مر... رہا... ہوں... مجھے... فوراً ہاسپٹل..."

"میں تمہیں اسپتال لے جاؤں گا لیکن تم پہلے مجھے اس کا نام بتاؤ جس نے تمہیں بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے... اسٹی... فورڈ... نے... بھیجا... تھا... ہم... لوگوں ... نے ... کلارا کو ... اغوا... کیا تھا ... لیکن ... وہ... وہاں ... سے ... فرار ... ہونے ... میں ... کامیاب ہوگئی ... تھی ... اس ... کے ... باپ ... کا... خیال تھا... کہ... کلارا... تمہارے پاس... ضرور... پہنچے... گی... مجھے... ایک... گھونٹ... اور ... پلادو۔"

میں نے شراب کی بوتل پھر اس کے ہونٹوں سے لگا دی اور اس سے کہا۔ "لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ کلارا مورٹن کی قید میں ہے؟"

"مور... ٹن... کی... قید... میں... یہ... تو.. ہونا... ہی... تھا... اسٹی... فورڈ... اور... جیکسن... میں پچھلے... دنوں... کسی بات ... پر... شدید... لڑائی... ہو گئی ... تھی... اسٹی... فورڈ... نے... جیکسن... کے دفتر... جاکر... اسے... گالیاں... دی... تھیں... کلارا ... وہاں ... سے... فرار... ہو... ہوگئی ...تو... اسے ... مورٹن... کے... آدمیوں نے... پک... پکڑ..." یہ کہتے ہوئے اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

میں نے اس کی نبض دیکھی، وہ بالکل ساکت تھی۔ اس کی سانس بھی رک چکی تھی۔

میں نے جلدی جلدی ان دونوں کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ہیکل کی جیب سے مجھے گاڑی کی چابیاں اور پوائنٹ تھری کا ایک ریوالور ملا۔ اس کے پرس میں چند سو ڈالرز بھی تھے۔ اس کے علاوہ سیل فون اور کئی وزیٹنگ کارڈز تھے۔ [illegible] سیل فون اور کارڈز اپنی جیب میں رکھے، جیکل کا

سیل فون بھی نکالا اور اس کا ریوالور بھی نکال لیا۔ پھر میں نے حتی الامکان میز کی چادر سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں جہاں میری انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔

میں نے وہ لائٹر بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

پھر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر ان کی گاڑی موجود تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور اسے اندازے سے مین روڈ کی طرف لے گیا۔ مجھے یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس وقت میں کیلی فورنیا کے کس حصے میں ہوں؟ کیلی فورنیا میں ہوں بھی یا کسی اور شہر میں ہوں۔ بس میں تن بہ تقدیر ہو کر جا رہا تھا۔

وہ مین روڈ نہیں تھی بلکہ وہ سڑک تھی جو وہاں موجود مختلف فارم ہاؤسز کی طرف جاتی تھی۔

دس منٹ بعد میں موٹروے تک پہنچ گیا اور اندازے سے دائیں جانب ہی چلتا رہا۔

چند کلومیٹر چلنے کے بعد مجھے ایک بورڈ نظر آیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "کیلی فورنیا تیس کلومیٹر۔"

بورڈ دیکھ کر مجھ میں گویا ایک نئی توانائی سی آ گئی اور میں گاڑی تیزی سے دوڑانے لگا۔

میں نے تیس کلومیٹر کا وہ فاصلہ بارہ منٹ میں طے کر لیا۔ میں کیلی فورنیا میں داخل ہوا تو مجھے سب سے زیادہ فکر گاڑی کی تھی۔ میں اس گاڑی میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے اسٹیفرڈ کے مزید آدمی وہاں موجود ہوں۔ وہاں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہاں پولیس بھی موجود ہو گی۔ میں جلی ہوئی پینٹ اور زخمی ٹانگ کے ساتھ وہ گاڑی چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے پاس سیل فون بھی نہیں تھا کہ میں کیپٹن رالف، مولانا صاحب یا اپنے کسی اور ہمدرد سے رابطہ کرتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

سب سے بڑا مسئلہ پولیس کا تھا۔ پولیس مجھ سے ضرور سوال جواب کرتی۔ وہ لوگ مجھ سے پوچھتے کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ میں پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا تو وہ مجھے دہرے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیتے لیکن میں نے ان دونوں کو اپنے دفاع میں مارا تھا۔ میں فوری طور پر تو مصیبت میں پھنستا لیکن امریکا کا کوئی بھی قابل اور ذہین وکیل مجھے اس دہرے قتل کے الزام سے صاف بچا سکتا تھا۔

پھر میں نے پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتانے کا ارادہ کر لیا۔ میرے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ اس کی گواہی علاقے کے لوگ بھی دیتے اور سب سے بڑا گواہ تو کیپٹن رالف تھا۔ اس کا سیکیورٹی گارڈ نہ جانے کس حال میں تھا۔ وہ بے چارہ زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔ ہر صورت میں یہ کیس میرے ہی حق میں

تھا۔

میں نے گاڑی کا رخ گھر کے بجائے پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا تو وہاں موجود پولیس کے کئی افسروں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں سیدھا سارجنٹ جیف کے آفس میں پہنچا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "مسٹر بابر! آپ... آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"میرا حال آپ کے سامنے ہے آفیسر!" میں نے کہا۔ "میرے گھر پر رات کو اچانک کچھ لوگوں نے فائرنگ کی تھی۔"

"ہاں، کیپٹن رالف اس کی رپورٹ درج کرا چکا ہے۔ اس کا سیکیورٹی گارڈ ایڈی اس فائرنگ میں شدید زخمی ہوا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔"

"میں اسی واقعے کی رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے کمپیوٹر کے مانیٹر پر ایک نظر ڈالی پھر بولا۔ "جی بتائیے، میں آپ کا بیان لے رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے وکیل کو بھی طلب کر سکتے ہیں۔"

"سب سے پہلے تو مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میری ایک ٹانگ بری طرح جھلس گئی ہے۔"

"او کے!" اس نے کہا پھر گھنٹی بجا کر کسی کو طلب کیا اور کہا۔ "ایمبولینس کے لیے ٹیلی فون کرو۔ مسٹر بابر زخمی ہیں۔"

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں ایمبولینس وہاں پہنچ گئی۔

ڈاکٹر نے میرے زخم کا جائزہ لیا اور فوری طور پر مجھے اسپتال میں داخل کر لیا۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر! میں ابھی پولیس کو کسی بھی قسم کا بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس لیے اس پولیس سارجنٹ کو فوری طور پر یہاں سے روانہ کر دیں۔" میں اس وقت اسٹریچر پر تھا اور ڈاکٹر میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سارجنٹ جیف اور کیپٹن رالف کوریڈور میں کھڑے تھے۔

وارڈ بوائے مجھے کمرے میں لے گیا تو سارجنٹ جیف نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر نے کہا۔ "آفیسر پلیز! ابھی مریض اس حالت میں نہیں ہے کہ اس کے ذہن پر کسی بھی قسم کا دباؤ پڑے۔ آپ کو کم سے کم دو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔"

"او کے ڈاکٹر!" سارجنٹ نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "باہر میرے دوست کیپٹن رالف موجود ہیں، آپ انہیں میرے پاس بھیج سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد کیپٹن رالف میرے کمرے میں آ گیا اور بولا۔ "آپ زیادہ زخمی تو نہیں ہوئے مسٹر بابر؟"

"میں زخمی تو ہوں لیکن میری حالت خطرے میں نہیں ہے۔"

پھر میں نے اسے تمام واقعات تفصیل سے بتا دیے۔

"مسٹر بابر! آپ پریشان مت ہوں۔ میرا گارڈ بھی شدید زخمی ہے اور اس کی حالت خطرے میں ہے۔ اگر ایڈی مر گیا تو میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"مسٹر رالف! پہلے تو میں کسی بہت ذہین اور قابل وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ کا قانونی حق ہے مسٹر بابر! آپ کہیں تو میں پیٹرسن کو یہاں بلا لوں؟ وہ جاسوس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بہترین وکیل بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ پیٹرسن کو یہاں بلا لیں۔ میں اس سے مشورہ کرنے کے بعد ہی پولیس کو بیان دوں گا۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر پیٹرسن ایک وکیل کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

میں نے اس سے بھی کچھ نہیں چھپایا۔

"مسٹر بابر!" اس نے میری باتیں سننے کے بعد کہا۔ "کیا آپ کی وہ گرل فرینڈ کورٹ میں آ کر گواہی دے سکتی ہے کہ وہ آپ سے ملنے آئی تھی؟"

"یس!" میں نے وثوق سے کہا۔ "میری وہ دوست کورٹ میں گواہی دے سکتی ہے۔"

"آپ پولیس کو حرف بہ حرف یہی بیان دے دیں۔" اس کے ساتھ آنے والے وکیل نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ پیٹرسن نے اس کا تعارف ایڈووکیٹ ہنری براؤن کے نام سے کرایا تھا۔

"آپ مزید دیر مت کریں مسٹر بابر!" وکیل نے کہا۔ "اب آپ سارجنٹ جیف کو بلا کر اپنا بیان دے دیں۔"

"او کے مسٹر بابر!" پیٹرسن نے کہا۔ "بقیہ معاملات ہنری سنبھال لے گا۔ میں جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر کے جاتے ہی سارجنٹ جیف اندر آ گیا۔ اس نے ہنری سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "مسٹر ہنری! کیسے ہیں

آپ؟‘‘
’’بالکل ٹھیک۔‘‘ ہنری مسکرایا۔
’’مسٹر بابر!‘‘ سارجنٹ نے کہا۔ ’’آپ نے بہت بہترین ایڈووکیٹ کا بندوبست کیا ہے۔‘‘
میں نے اسے بھی شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔
’’آپ اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں جہاں وہ لوگ آپ کو اغوا کر کے لے گئے تھے؟‘‘
میں نے اسے اس فارم ہاؤس کا محلِ وقوع بتایا۔
سارجنٹ جیف ایک کاغذ پر اس مقام کا نقشہ بنانا چاہ رہا تھا۔
’’مسٹر بابر!‘‘ وہ مجھ سے بولا۔ ’’آپ کی وہ گرل فرینڈ کہاں رہتی ہے؟ اس کا ایڈریس لکھوایئے۔‘‘
’’وہ کیلی فورنیا میں نہیں رہتی ہے۔ اس کا موجودہ پتا تو میرے پاس نہیں ہے لیکن اس کا سیل نمبر ہے۔‘‘
’’اس کا سیل نمبر بتایئے۔‘‘ سارجنٹ نے کہا۔
’’وہ میرے سیل فون میں محفوظ ہے اور اگر گھر میں میرا سیل فون موجود ہوا تو وہ نمبر بھی آپ کو مل جائے گا۔ میرے اغوا سے پہلے تو سیل فون میرے بیڈروم میں موجود تھا۔‘‘
’’وہ دونوں سیل فون اور ریوالورز کہاں ہیں جو آپ نے ان لوگوں سے حاصل کیے ہیں؟ ہاں مجھے وہ لائٹر بھی چاہیے جس سے آپ نے وہ رسی جلائی تھی۔‘‘
’’دونوں سیل فون اور ریوالور تو اس گاڑی کے ڈیش بورڈ میں موجود ہیں جس میں، میں فارم ہاؤس سے فرار ہو کر پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔ لائٹر اور وزیٹنگ کارڈز میری پینٹ کی جیب میں موجود ہیں۔‘‘
سارجنٹ جیف نے اسی وقت ایک وارڈ بوائے کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ ’’مسٹر بابر کے کپڑے اور دوسرا سامان لے کر آؤ۔‘‘
تھوڑی دیر بعد وہ میری شرٹ، پینٹ اور دوسرا سامان لے کر آ گیا۔
اس میں وہ لائٹر ابھی موجود تھا اور وزیٹنگ کارڈز بھی جو میں نے ہیکل اور جیکل کی جیبوں سے نکالے تھے۔
اس نے مجھ سے کہا۔ ’’میں نے آپ کا بیان ریکارڈ کر لیا ہے۔ اسے ٹائپ کرا کے میں اس پر آپ کے سائن بھی لے لوں گا۔ اس وقت تو میں فارم ہاؤس کی طرف جا رہا ہوں۔‘‘
اس کے جانے کے بعد ہنری نے مجھ سے کہا۔ ’’بعد میں بھی اگر پولیس آفیسر آپ سے کچھ پوچھنا چاہے تو آپ میری عدم موجودگی میں اس کے کسی بھی سوال کا جواب مت دیجیے گا۔ یہ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لیں۔ اس پر میرے دونوں سیل نمبر، آفس کا نمبر اور گھر کا لینڈ لائن نمبر بھی ہے۔‘‘
اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے زخم میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میری تکلیف دیکھ کر نرس نے مجھے دو گولیاں کھانے کو دیں۔
اسی وقت ڈیٹکٹو ہال کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ’’مسٹر بابر! آپ جس گاڑی میں پولیس اسٹیشن آئے ہیں، اس میں سے نہ وہ ریوالور برآمد ہوئے ہیں اور نہ مقتولین کے سیل فون!‘‘
’’تو اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟‘‘ میں نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔ نرس نے شاید مجھے خواب آور گولیاں دی تھیں۔ پھر ہال نہ جانے کیا کہتا رہا، مجھے گہری نیند آ گئی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو سارجنٹ جیف میرے سر پر موجود تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ دوستانہ مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔
اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’مسٹر بابر! آپ کا بیان جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس فارم ہاؤس میں دو بوڑھے میاں بیوی اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ کل رات آپ نشے کی حالت میں فارم ہاؤس میں داخل ہوئے، ان دونوں میاں بیوی کو آپ نے ایک کمرے میں بند کیا۔ ان کی ملازمہ نے مداخلت کی کوشش کی تو آپ اسے اپنے ساتھ بیڈروم میں لے گئے۔ اس کے ساتھ زیادتی کی اور اسے قتل کر دیا پھر شراب پیتے ہوئے آپ اتنے مدہوش تھے کہ شراب کی بوتل اور گلاس نہ صرف آپ کے ہاتھ سے چھوٹے بلکہ شراب کی خاصی مقدار آپ کی پینٹ پر بھی گری۔ نشے کی حالت میں آپ نے سگریٹ سلگانے کی کوشش کی تو آپ لڑکھڑا گئے اور جلتا ہوا لائٹر آپ کی پینٹ سے ٹکرایا تو نہ صرف آپ کی پینٹ جلی بلکہ گرنے سے ٹوٹی ہوئی بوتل کے کچھ ٹکڑے آپ کے جسم میں بھی لگے اور آپ زخمی ہو گئے۔ آپ جس گاڑی میں آئے ہیں، اس میں سے بھی کچھ برآمد نہیں ہوا۔ نہ ریوالور، نہ سیل فون۔‘‘
’’یہ آپ مجھے کس فلم کی کہانی سنا رہے ہیں؟‘‘
’’یہ تو آپ کورٹ میں ثابت کیجیے گا کہ یہ فلم کی کہانی

ہے یا کسی ناول کا پلاٹ ہے۔‘‘ سارجنٹ جیف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’میں آپ کو جبراً مسٹر اور مسز مورس کے فارم ہاؤس میں داخل ہونے، ان پر تشدد کرنے، انہیں حبسِ بے جا میں رکھنے اور ان کی ملازمہ کیٹی کے ساتھ زیادتی اور تشدد کر کے قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اب آپ جو کچھ بھی کہیں گے، وہ بطور ثبوت آپ کے خلاف عدالت میں استعمال ہو سکتا ہے۔‘‘
’’میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ضرور کریں۔‘‘ سارجنٹ جیف نے کہا۔ ’’یہ آپ کا قانونی حق ہے لیکن آپ زیرِ حراست ہیں۔ یہاں سے کہیں جانے کی کوشش مت کیجیے گا۔‘‘ اس نے سرد مہری سے مجھے گھورا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔
میں اس کی باتوں پر بُری طرح چونک اٹھا۔ اب یہ مریم کے باپ کی کوئی نئی چال تھی۔ وہ کسی نہ کسی صورت مجھے قید میں رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میرا سیل فون بھی میرے پاس نہیں تھا کہ میں اپنے وکیل سے رابطہ کر سکتا۔ اس کا ٹیلی فون نمبر انکوائری سے معلوم ہو سکتا تھا لیکن مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میرا وکیل ہنری براؤن اور پیٹرسن وہاں پہنچ گئے۔
میں نے کچھ بتانے کی کوشش کی تو پیٹرسن نے مجھے روک دیا اور بولا۔ ’’مجھے صورتِ حال کی تبدیلی کا علم ہو چکا ہے لیکن آپ فکر مت کریں۔ یہ سب آپ کے دشمنوں کی سازش ہے۔ میں سب معلوم کر لوں گا۔‘‘
’’مسٹر بابر!‘‘ ہنری نے کہا۔ ’’کیا پولیس نے آپ کو باقاعدہ گرفتار کر لیا ہے؟‘‘
’’جی ہاں۔‘‘ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’ابھی تھوڑی دیر پہلے سارجنٹ جیف نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مجھے فارم ہاؤس کے مالک مسٹر مورس کی ملازمہ کیٹی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔‘‘
’’آپ جج کے سامنے بھی یہی بیان دیجیے گا۔‘‘ ہنری نے کہا۔ ’’آپ کا مکمل طبی معائنہ ہو چکا ہے۔ اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس کے مطابق آپ کی کلائیوں اور پیروں پر رسی کی بندش کے انتہائی گہرے نشانات ہیں۔ مقتولہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملتے ہی میں کورٹ میں جیف کی دھجیاں بکھیر دوں گا۔‘‘
’’میں ابھی مسٹر اور مسز مورس سے مل کر آ رہا ہوں۔‘‘
پیٹرسن نے کہا۔ ’’وہ تو قاتل کا حلیہ بالکل ہی مختلف بتا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو پہچانتے بھی نہیں ہیں۔‘‘
کورٹ کی بیزار کن اور مکمل کارروائی سنا کر میں آپ کو بور نہیں کروں گا۔ بس وہی باتیں بتاؤں گا جو ضروری ہیں۔
کیٹی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ قتل سے پہلے اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کی مٹھی میں کوٹ کا ایک بٹن دبا ہوا تھا جو غالباً قاتل سے مزاحمت کے دوران میں اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور میرے جسم پر اس وقت کوٹ نہیں تھا۔
پھر مسٹر اور مسز مورس کو لایا گیا۔ شناخت کے لیے مجھے دوسرے پانچ آدمیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ وہ سب میری طرح لمبے تڑنگے تھے۔ ان میں دو ایرانی تھے، ایک ترک تھا، ایک پاکستانی اور میں تھا۔
بڑے میاں نے بہت غور سے ہم سب کا جائزہ لیا بلکہ کئی دفعہ انہوں نے ایک ایک آدمی کو غور سے دیکھا، پھر انہوں نے ترک کی طرف اشارہ کر دیا۔
’’کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسی شخص نے آپ کے فارم ہاؤس پر قبضہ کیا تھا؟‘‘ جج نے پوچھا۔
’’میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا۔‘‘ مورس نے اس ترک کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن میرا خیال ہے کہ یہی شخص تھا۔‘‘
بڑی بی نے بھی اسی ترک پر شبہ ظاہر کیا۔
جج نے مسٹر اور مسز مورس کو جانے کی اجازت دے دی۔ سارجنٹ جیف نے میرا تین دن کا ریمانڈ لے لیا۔
اس کے بعد پولیس کا کیس بہت کمزور ہو گیا۔ ہنری نے مجھے یقین دلایا کہ آئندہ تاریخ پر وہ میری ضمانت کرا لے گا۔
مجھے پولیس دوبارہ لاک اپ میں لے گئی۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ یہ لوگ... مجھ پر تشدد کریں گے لیکن مسٹر اور مسز مورس کے بیان کے بعد سارجنٹ جیف کا رویہ بہت بدل گیا تھا۔
دوسرے دن پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ کیٹی کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا وقت گیارہ اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان میں تھا۔
اس وقت میں ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر لوٹا تھا۔ میں بارہ سوا بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا تھا۔ میری گھر سے روانگی اور واپسی کا گواہ سیکیورٹی ایجنسی کا گارڈ تھا۔ اس کی حالت

اب خطرے سے باہر تھی۔

میری سب سے بڑی گواہ کانتا تھی۔ اس نے میرے گھر پر دو گھنٹے گزارے تھے۔ یعنی رات کو دو بجے تک میں اپنے ہی گھر میں تھا۔

کانتا اور سیکیورٹی گارڈ کا بیان سننے کے بعد جیوری نے مجھے بےقصور قرار دے دیا اور تابوت میں آخری کیل اس گواہ نے ٹھونکی جس نے اس گاڑی سے ریوالورز اور سیل فونز نکالے تھے۔

وہ پولیس اسٹیشن کی پارکنگ لاٹ کا چوکیدار تھا۔

پیٹرسن نے اسے اس وقت اٹھایا جب وہ اپنی ڈیوٹی کے بعد گھر جا رہا تھا۔ پیٹرسن کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ ایک نامعلوم آدمی نے اسے اس کام کے دس ہزار ڈالرز دیے تھے۔

اس بیان کے بعد تو کسی بھی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش ہی نہ رہی اور کورٹ سے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

میں جیل سے باہر نکلا تو میرا استقبال کرنے والوں میں کیپٹن رالف، پیٹرسن...... ہنری اور کانتا کے علاوہ شیر دل خان بھی موجود تھا۔

شام کا وقت تھا اس لیے میں نے ان سب کو ڈنر کی دعوت دے دی۔ کانتا اور شیر دل خان کے علاوہ باقی افراد نے معذرت کرلی۔ ہنری کو اپنے ایک اہم کلائنٹ سے ملنا تھا۔ کیپٹن رالف اور پیٹرسن بھی بہت زیادہ مصروف تھے۔ وہ لوگ وہیں سے رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے کیپٹن رالف نے مجھے بتایا کہ میں نے تمہارے گھر پر اس مرتبہ دو سیکیورٹی گارڈز تعینات کیے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد خان نے مجھ سے کہا۔ ''کانتا بتا رہی تھی کہ بھابی مریم مورٹن کے قبضے میں ہیں؟''

''ہاں، اس نے مجھے بھی یہی بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مورٹن کوئی سڑک چھاپ بدمعاش نہیں ہے۔ اس کا گینگ بہت طاقتور ہے اور اسے جیکسن کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔''

''ہم بھی سڑک چھاپ نہیں ہیں۔'' خان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''گزشتہ کئی برس سے میں امریکی حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہوں۔ آپ فکر مت کریں بابر صاحب! مورٹن سے میں خوب واقف ہوں۔''

میں نے ڈنر انہی لوگوں کے ساتھ کیا، پھر میں اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ میں نے جو چیز جیسی چھوڑی تھی، وہ اسی حالت میں تھی۔ کسی نے میرے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اس پر حیرت بھی تھی لیکن میری یہ حیرت جلد ہی رفع ہو گئی۔ فائرنگ کے بعد وہاں پولیس پہنچ گئی تھی۔ شاید اسی لیے کسی نے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی، پھر وہ گھر میں گھستے بھی کیوں؟ مریم تو پہلے ہی غائب تھی، مجھے بھی وہ لوگ اغوا کر چکے تھے۔ گھر میں انہیں ملتا بھی کیا۔

اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا لیکن اس کی بیٹری جواب دے چکی تھی۔ میں نے اسے چارج پر لگا دیا اور خود کافی بنانے کچن میں چلا گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں مریم کو کہاں ڈھونڈوں؟ میں اس کے بغیر کسی بھی قیمت پر پاکستان جانے کو تیار نہیں تھا۔ کیپٹن رالف اور پیٹرسن نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ تم فی الحال کچھ دنوں کے لیے پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں تم پولیس اور ایف بی آئی دونوں کی نظروں میں کھٹک رہے ہو۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا تھا کہ میں مریم کو ساتھ لے کر پاکستان جاؤں گا یا پھر یہیں مر جاؤں گا۔

میں نے کافی بنائی اور بیڈ روم میں آ گیا۔ کمرے کی حالت ابتر تھی۔ مریم کی گمشدگی کے بعد میں نے گھر کی صفائی پر توجہ نہیں دی تھی۔

میں نے کافی کا مگ ختم کیا اور بیڈ پر بکھرے ہوئے کپڑوں کو سمیٹ کر ایک طرف ڈال کر نیم دراز ہو گیا۔

میں اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ سیل فون کی گھنٹی پر .... بری طرح اچھل پڑا۔

میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو مجھے کانتا کا نام نظر آیا۔

''ہیلو!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں کانتا! کیا بات ہے؟''

''میں اس وقت ہوٹل گرینڈ میلینیم کے سامنے والے کیسینو میں موجود ہوں۔ مجھے ابھی ابھی ان آدمیوں میں سے ایک یہاں دکھائی دیا ہے جو اس دن مریم کے بارے میں بات کر رہا تھا۔''

''مورٹن کا آدمی؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، وہی۔'' کانتا نے کہا۔

''میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس وقت تک اس آدمی پر نظر رکھو۔''

میں نے بہت عجلت میں کپڑے بدلے۔ نائٹ سوٹ اتار کے جینز اور جیکٹ پہنی، جوگرز پہنے اور گھر سے باہر نکل گیا۔

میں نے کانتا کو آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا تھا لیکن میں

پانچ منٹ پہلے ہی اس کیسینو پر پہنچ گیا۔ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد اپنے تعاقب کا دھیان رکھا لیکن مجھے ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی جس پر مجھے شبہ ہوتا۔

میں نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں ایسے رخ پر پارک کی کہ اگر مجھے ہنگامی طور پر وہاں سے نکلنا پڑتا تو میں بغیر کسی رکاوٹ کے نکل سکتا۔

کانتا مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آئی اور بولی۔ ''وہ آدمی اس وقت رولٹ ٹیبل پر موجود ہے۔''

''وہ اکیلا ہی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو اکیلا ہی ہے۔'' کانتا نے کہا۔

''کانتا! یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں اس سے پوچھ گچھ کرسکوں؟ میرا مطلب ہے کہ...''

''یہاں اسی طرح کے کئی دوسرے فارم ہاؤس بھی ہیں۔'' کانتا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''جیسے فارم ہاؤس میں تمہیں رکھا گیا تھا۔''

''میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ فارم ہاؤس پر تو کچھ لوگ رہتے بھی ہوں گے۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ ہمارے پاس ایک ایسا فارم ہاؤس ہے جو ایک طرح سے ہماری ملکیت ہے۔ وہاں کا چوکیدار بھی ہمارا ہی آدمی ہے۔''

''مسئلہ اسے وہاں تک لے جانے کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' کانتا نے کہا۔ ''وہ مجھے جانتا ہے اس لیے میں ابھی تک اس کے سامنے نہیں آئی ہوں۔ میرے کہنے پر تو وہ اندھے کنوئیں میں کودنے کو بھی تیار ہو جائے گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''تم اپنی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں اسے گاڑی تک لے کر آتی ہوں۔ ممکن ہے مجھے وہاں کچھ وقت لگ جائے، تم پریشان مت ہونا۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''لیکن تمہاری گاڑی پارکنگ لاٹ میں کس طرف ہے؟''

''مرکزی دروازے سے دائیں جانب پہلی ہی قطار میں ہے۔'' پھر میں نے اسے گاڑی کا رنگ اور نمبر بتایا اور کہا۔ ''میں نے گاڑی کا رخ مین گیٹ ہی کی طرف رکھا ہے۔''

وہ اپنی مخصوص دلکش چال چلتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں رولٹ ٹیبل تھی۔ اب تک جہاں ہم بیٹھے تھے، وہ کیسینو کا ریسٹورنٹ اور بار تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ٹہلتا ہوا باہر نکل آیا۔ کیسینو کے پورچ میں خاصی روشنی والا بلب لگا تھا لیکن میری گاڑی وہاں سے اتنی دور تھی کہ وہاں تک بہت کم روشنی پہنچ رہی تھی۔ میں نے پارکنگ لاٹ کے نگراں کی تلاش میں اردگرد نظر دوڑائی لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔

میں آہستگی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور دروازہ کھول کر عقبی نشست پر دبک گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گاڑی کی چابی تو میرے پاس ہے۔ میں نے چابی اگنیشن میں لگائی اور احتیاطاً کانتا کے سیل فون پر کال بھی کر دی۔

''یس مسٹر ڈی سوزا!'' اس نے کہا۔ شاید وہ اپنے شکار کے بالکل نزدیک تھی اس لیے اسے سنانے کو مجھے غلط نام سے مخاطب کر رہی تھی۔

''کانتا! میں تمہیں گاڑی کی چابیاں دینا بھول گیا تھا۔ گاڑی لاک نہیں ہے۔ میں نے چابی بھی اگنیشن میں لگا دی ہے۔''

''او کے مسٹر ڈی سوزا!'' کانتا نے انگریزی میں کہا۔ ''آج تو میں اپنے ایک بہت ہی بیسٹ فرینڈ کے ساتھ ہوں۔ سوری، آج آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

''ویری گڈ! بہت اچھی جا رہی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں مسٹر ڈی سوزا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''شاید کل بھی ملاقات نہ ہو سکے۔ میں دو چار دن کے لیے اپنے دوست کے ساتھ فارم ہاؤس پر جا رہی ہوں۔ نہیں، بس میں نکل رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میری نظر کیسینو کے مرکزی دروازے پر پڑی۔ کانتا ایک لمبے تڑنگے مکروہ صورت امریکن کے ساتھ باہر نکل رہی تھی اور اس وقت مجھے وہ مصرع بالکل درست معلوم ہو رہا تھا کہ پہلوئے حور میں لنگور... خدا کی قدرت۔

وہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے تو میں، عقبی نشست کے پائدان میں دبک گیا۔

وہ دونوں خراماں خراماں گاڑی تک آئے، پھر کانتا کی آواز آئی۔ ''شٹ! گاڑی کی چابیاں شاید میں نے کہیں گرا دیں۔''

''اپنی گاڑی کو یہیں چھوڑو بے بی!'' اس امریکن کی مکروہ بلغم زدہ آواز سنائی دی۔ ''میری گاڑی میں چلو۔''

''ایک منٹ۔'' کانتا نے کہا۔ ''چابی شاید میں نے اگنیشن میں لگی چھوڑ دی ہوگی۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا

ہے۔"

امریکن نے اچانک ٹارچ کے ذریعے روشنی گاڑی میں ڈالی اور بولا۔ "ہاں، چابی اگنیشن میں موجود ہے۔"

میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ اگر وہ ٹارچ کی روشنی عقبی نشست پر ڈالتا تو یقیناً مجھے دیکھ لیتا لیکن اس نے فوراً ہی ٹارچ آف کر دی اور بولا۔ "چلو، پھر جلدی کرو۔"

"تم ڈرائیونگ کرو ڈارلنگ۔" کانتا اٹھلا کر بولی۔ "میں نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔ مجھ میں ڈرائیو کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"اوکے، اوکے ہنی!" امریکن نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس عقل کے اندھے نے یہ بھی نہ سوچا کہ جب کانتا ڈرائیونگ کرنے کی حالت میں ہی نہیں تھی تو وہ اپنی گاڑی کی طرف آئی ہی کیوں؟ شباب کے سامنے تو بڑے بڑے پھسل جاتے ہیں۔ وہ تو پھر عقل سے پیدل ایک گھٹیا درجے کا بدمعاش تھا۔ اس میں کچھ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اگر تھوڑی بہت عقل ہو گی بھی تو وہ کانتا کے اشتعال انگیز حسن نے خبط کر دی تھی۔

کانتا بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تو اس نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی اسکریچنگ کرتی ہوئی باہر نکلی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "الو کا پٹھا! میری گاڑی کے ٹائروں کا ستیاناس کر رہا ہے۔"

☆☆☆

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ہمیں کیسینو سے روانہ ہوئے چالیس منٹ ہو چکے تھے اور اب ہم موٹروے پر تھے۔

ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے بلکہ گٹھڑی بنے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں اکڑ کر رہ گئے تھے۔

میں نے پوزیشن بدلنے کی کوشش کی تو وہ خبیث امریکن کانتا کے پہلو میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری خفیف سی جنبش سے وہ بری طرح چونک اٹھا اور اس نے کانتا کو چھوڑ کر اپنا ہاتھ جیکٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "خبردار! اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھو ورنہ گولی مار کے یہیں پھینک دوں گا۔"

اس نے اچانک بریک لگا دیے۔ بریک لگتے ہی زوردار جھٹکا لگا اور میں ڈرائیونگ سیٹ سے ٹکرا گیا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ میرا رخ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف نہیں تھا اس لیے میرا شانہ ڈرائیونگ سیٹ سے ٹکرایا۔ کانتا ڈیش بورڈ سے بری طرح ٹکرائی۔ امریکن نے پلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیا لیکن چوٹ لگنے کے باوجود کانتا نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کے ریوالور والے ہاتھ پر اپنا ہینڈ بیگ دے مارا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس نے اچانک دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ کیلی فورنیا کی پیسیفک کوسٹ ہائی وے تھی۔ رات کے اس پہر ٹریفک خاصا کم تھا۔

میں نے بھی دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی اور چیخ کر بولا۔ "رک جاؤ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔

امریکن بھاگتے بھاگتے یوں رک گیا جیسے چابی ختم ہونے پر کھلونا ساکت ہو جاتا ہے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ کانتا کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس نے میری طرف اچھال دیا۔

یہ شاید وہی ریوالور تھا جو امریکن کے ہاتھ سے گرا تھا اور کانتا نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ ریوالور اٹھا لیا تھا ورنہ میں تو بالکل نہتا تھا اور گولی مارنے کی محض دھمکی دے رہا تھا۔

"اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور واپس گاڑی کی طرف چلو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہم آدم خور ہیں اور امریکنوں کا گوشت روسٹ کر کے بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے ریوالور کانتا کو پکڑا کر اس کی اچھی طرح تلاشی لی۔ اس کے پاس ریوالور کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

"اب شرافت سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ بے چون و چرا کیے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

وہ جوں ہی گاڑی میں بیٹھا، میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ عقبی نشست پر ایک طرف لڑھک گیا۔

"اب اور کتنی دور جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔ فائر کی آواز دور تک گئی ہو گی۔ اس آواز پر کوئی پولیس پٹرول کار بھی اس طرف آسکتی تھی۔

"بس اب تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم دائیں طرف مڑ

جائیں گے۔ وہاں سے دس منٹ کا سفر ہے۔"

کانتا ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتی ہوئی دائیں طرف مڑ گئی۔ جلد ہی ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں فارم ہاؤس تھے اور ایک دوسرے سے کافی دور تھے۔

کانتا پندرہ منٹ کے اندر اندر مطلوبہ فارم ہاؤس تک پہنچ گئی۔ وہ فارم ہاؤس کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کافی دور تک کوئی دوسرا فارم ہاؤس نہیں تھا۔

میری نظریں اس منحوس امریکن پر جمی ہوئی تھیں جو کسی بھی وقت ہوش میں آسکتا تھا۔

فارم ہاؤس کا دروازہ بھاری بھرکم تھا اور اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے بہ یک وقت دو ٹرک آسانی سے گزر سکتے تھے۔ گیٹ پر دو مسلح گارڈ بھی موجود تھے۔ چہروں سے وہ ایشیائی لگ رہے تھے۔

ان میں سے ایک باہر آیا اور کانتا کو پہچان کر اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ کانتا گاڑی اندر لے گئی۔ فارم ہاؤس کا اقامتی حصہ مین گیٹ سے کافی فاصلے پر تھا۔

کانتا نے پورچ میں گاڑی روکی تو برآمدے میں ایک اور ایشیائی نظر آیا۔ وہ خاصا لمبا تڑنگا ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں کانتا کو سلام کیا۔

کانتا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک بے ہوش آدمی ہے نندو! اسے اٹھا کر اندر لے جاؤ، مجھے اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔"

نندو نے دروازہ کھولا اور امریکن کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا، پھر اس نے اس بھاری بھرکم امریکن کو اپنے کندھے پر ڈالا اور چل پڑا۔

"اس کے ہاتھ پیر باندھ دو اور اسے ہوش میں لاؤ۔" کانتا نے کہا۔

نندو نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ فارم ہاؤس کی حالت سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مستقل زیرِ استعمال ہے۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر اگرچہ بہت قیمتی نہیں تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ وہاں گرد کا ایک ذرّہ بھی نہیں تھا۔

کانتا اپنے لیے ڈرنک تیار کرنے لگی۔ میں نے صرف سوفٹ ڈرنک پر اکتفا کیا۔

ہم لوگ اپنے اپنے گلاس لے کر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک دے کر نندو اندر آگیا۔ اس نے مؤدب لہجے میں بتایا کہ قیدی کو ہوش آگیا ہے۔

"تم چلو، ہم آرہے ہیں۔" پھر وہ نندو سے بولی۔ "یہ مسٹر بابر ہیں، جی ایس خان کے بہترین دوست۔ آئندہ یہ اگر یہاں کسی کام سے اکیلے بھی آئیں تو ان کا خیال رکھنا۔"

"میں سمجھ گیا میڈم!" نندو نے کہا۔

ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں امریکن کو رکھا گیا تھا۔ کانتا کو دیکھتے ہی وہ اسے انتہائی فحش گالیاں دینے لگا۔

کانتا نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ "کتے کی طرح بھونکنا بند کر۔" کانتا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تو نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے کتیا؟" ایڈی غرایا۔ "تو شاید مجھے جانتی نہیں ہے۔"

کانتا نے اس مرتبہ اس کے منہ پر لات ماری تو وہ بیڈ سے لڑھک کر نیچے گر گیا۔ "میں نے کہا ہے کہ کتے کی طرح بھونکنا بند کر۔"

میں نے اسے اٹھا کر بیدردی سے بیڈ پر پھینک دیا اور بولا۔ "تم جتنی گالیاں بکو گے، اتنی ہی لاتیں اور تھپڑ پڑیں گے۔"

"تو کون ہے؟" وہ مجھے گھور کر بولا۔ "تو بھی شاید مجھے جانتا نہیں ہے ورنہ تیری جرأت نہ ہوتی کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کرے۔"

میں نے بھی زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا اور بولا۔ "میں جانتا ہوں، تو مورٹن کا آدمی ہے۔ پھر کیا کروں؟ تیری پوجا کروں؟ قدموں میں گر جاؤں؟ میں تو اس حرام زادے مورٹن کا بھی یہی حشر کروں گا۔" پھر میں نے اچانک پوچھا۔ "مریم کہاں ہے؟"

"مریم؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کون مریم؟"

"اسٹیفرڈ کی بیٹی۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔ "تو تم اسٹیفرڈ کے آدمی ہو؟"

"میں کسی کا بھی آدمی نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "مریم میری بیوی ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایسا بن گیا جیسے مجھے جانتا نہ ہو... اس کی بے نیازی پر میں نے بھنا کر کہا۔

"بتا مریم کہاں ہے؟"

"اس کے بارے میں صرف مورٹن جانتا ہے یا

ٹونی۔" اس نے کہا۔

میں نے اچانک اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ "میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس کے بارے میں تم بھی جانتے ہو۔"

"اگر معلوم کر سکتے ہو تو معلوم کر لو۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "ویسے ہاتھ پیر باندھ کر کسی کو مارنا پیٹنا کوئی مردانگی نہیں ہے۔"

"یہ بہت پرانا ڈائیلاگ ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "تمہارے لوگ بھی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ سیدھی طرح بتاؤ مریم کہاں ہے؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"باس! آپ مجھے صرف بیس منٹ دیں۔" نندو نے اچانک مجھے باس بنا دیا۔ "یہ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک پیش آنے والا ہر واقعہ آپ کو بتا دے گا۔"

"بیس منٹ۔" ایڈی استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "تم بیس دن بعد بھی میری زبان نہیں کھلوا سکو گے۔ تم شاید ابھی مجھے جانتے نہیں ہو۔ میرا نام ایڈی ہے اور کیلی فورنیا کے بڑے بڑے بدمعاش میرے نام سے کانپتے ہیں۔"

"اب تم میرے نام سے کانپو گے۔" نندو نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تیز دھار استرا، دو ڈبے اور اسٹرا تھی۔ وہ عام سی اسٹرا تھی جیسی عموماً کولڈ ڈرنک پینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

"کیا تم مجھے کوئی جادو دکھانے کی تیاری کر رہے ہو؟" ایڈی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ جادو ابھی تمہارے سر چڑھ کر بولے گا۔"

نندو نے وہ چیزیں ایک طرف رکھ دیں اور ایڈی کی جیکٹ کی زپ کھول دی۔ پھر اس نے جھٹکا دے کر اس کی ٹی شرٹ پھاڑی اور اسے اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا۔

نندو نے استرا کھولا اور اچانک اس کے سینے پر ہلکی سی ایک لکیر کھینچ دی۔ ایڈی کی سفید جلد پر خون کی ایک لکیر نمودار ہو گئی۔ اس نے دوسری لکیر کراس کی صوت میں کھینچی۔ وہ بہت ماہرانہ انداز میں چرکے لگا رہا تھا ورنہ کوئی اناڑی تو ایڈی کو گہرا زخم پہنچا سکتا تھا۔ اس نے کئی لکیریں ایڈی کے شانوں پر کھینچ دیں، مجھے تو اس کی قوتِ برداشت پر حیرت تھی۔ وہ ابھی تک ہونٹ بھینچے یہ کارروائی برداشت کر رہا تھا۔ اب مجھے اس کے جسم پر سرخ لکیروں کا ایک جال سا نظر آ رہا تھا۔ نندو نے اس استرے سے ایڈی کی جیکٹ کی بھی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

"میرے خیال میں بیس منٹ تو ہو چکے ہیں؟" ایڈی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"ابھی صرف ڈیڑھ منٹ ہوا ہے۔" نندو نے کہا اور اچانک ان ڈبوں میں سے ایک اٹھا لیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

اس نے ڈبا کھولا تو مجھے اس میں سفید رنگ کا ایک سفوف نظر آیا۔ اس نے وہ سفوف ایڈی کے زخموں پر چھڑک دیا۔

بے اختیار اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

"میں تم سے کچھ پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" نندو نے وہ سفوف ایڈی کے جسم پر چھڑکتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو نندو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ نمک ہے باس۔" اس نے جواب دیا۔ "اسے میں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے پیسنے کے بعد چھان بھی لیا ہے تاکہ اس کا پاؤڈر جیسا سفوف زخموں پر زیادہ اثر کرے۔ موٹا نمک اتنی جلدی اثر نہیں کرتا۔" اس نے ایڈی کے جسم کے ہر اس حصے پر نمک چھڑک دیا جہاں اس نے چرکے لگائے تھے۔ پھر وہ اس کے زخموں پر خاصی قوت سے نمک ملنے لگا۔ اس مرتبہ درد میں ڈوبی ہوئی کراہیں ایڈی کے منہ سے نکلیں پھر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اب بھی اپنی زبان کھول دو ایڈی!" میں نے کہا۔ "ورنہ نندو بہت سفاک آدمی ہے اور یہ تو ابتدا ہے۔ یہ اسی استرے سے تمہارے کان کاٹے گا، ناک کاٹے گا، ہاتھ پیر توڑے گا اور تمہیں ہمیشہ کے لیے معذور کرنے کے بعد کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دے گا۔"

پہلی دفعہ مجھے ایڈی کے چہرے پر خوف و تشویش کے تاثرات نظر آئے۔

نندو نے گھڑی دیکھی پھر بے نیازی سے بولا۔ "ابھی تو سولہ منٹ باقی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک ایڈی کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" ایڈی کے لہجے میں وحشت تھی۔ "مورٹن تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"مورٹن فی الحال تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسے کام کے آدمیوں کی ضرورت ہے، تم جیسے معذوروں کی نہیں۔"

نندو نے اچانک اس کے ایک کان کا نچلا حصہ کاٹ لیا۔ ایڈی کرب آمیز انداز میں چیخا لیکن نندو پر اس کی چیخ کا

کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے تھوڑا سا نمک اس کے کٹے ہوئے کان پر بھی چھڑک دیا۔

”زبان نہیں کھولو گے تو یہ تمہارا پورا کان کاٹ کر پھینک دے گا۔“

”میں نے زبان کھولی تو مورٹن مجھے ذبح کردے گا۔“ ایڈی تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔

نندو روبوٹ کی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے ایڈی کا کان دوبارہ پکڑا اور اسے ہلکا سا چرکا دیا۔ ایڈی یہی سمجھا کہ اس نے کان کاٹ لیا ہے۔

اس مرتبہ ایڈی کے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی دل خراش تھی۔

نندو نے اس کا دوسرا کان پکڑا اور اسے کاٹنے ہی والا تھا کہ ایڈی چیخ اٹھا۔ ”اسے روکو، میں سب کچھ بتا دوں گا۔“

نندو نے میری طرف دیکھا، میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔

”ابھی نو منٹ باقی ہیں باس۔“ نندو نے کہا۔

”اگر اب بھی اس نے زبان نہ کھولی تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ ہاں، تمہارا یہ وقت ان بیس منٹوں میں شمار نہیں ہو گا۔“ پھر میں ایڈی سے مخاطب ہوا۔ ”بتاؤ مریم کہاں ہے؟“

”مجھے فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔“ ایڈی نے کہا۔ اس کے کٹے ہوئے کان کی لو سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔

”تمہیں فرسٹ ایڈ بھی ملے گی لیکن میرے سوال کا جواب دینے کے بعد۔“ میں نے کہا۔

”مورٹن مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ ایڈی نے اذیت سے کراہتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، پھر مت بتاؤ۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا اور نندو کو اشارہ کیا۔

”بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔“ ایڈی چیخ کر بولا۔

”کلارا کیلی فورنیا میں نہیں ہے۔“ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ... وہ... لندن میں ہے...“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا پھر خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔ ”میرا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ مجھے... بہت... کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز!...“

”نندو!“ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے مریم کا پورا ایڈریس لے لو۔ یہ بھی معلوم کرلو کہ مریم وہاں کس کی قید میں ہے۔“ میں کانتا سے مخاطب ہوا۔ ”چلو، ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔“

”مسٹر بابر، پلیز!“ ایڈی کراہا۔ ”مجھے اس شخص کے حوالے کر کے مت جائیں۔ یہ...“

”اگر تم نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو نندو تمہیں فرسٹ ایڈ دے دے گا۔“ میں کانتا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد نندو کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس پر اس شخص کا نام، پتا اور سیل نمبر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔

”میڈم مریم اس ایڈریس پر موجود ہیں۔ ان کی نگرانی کے لیے سائمن کے علاوہ مورٹن کے مزید آدمی وہاں موجود ہیں۔“ نندو نے مجھے تفصیل بتائی۔

سائمن اس شخص کا نام تھا جو لندن میں رہتا تھا۔

میں دوبارہ ایڈی کے کمرے میں پہنچا تو نندو نے اس کی مرہم پٹی کر دی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”بابر صاحب! مجھے اگر پین کلر ٹیبلٹس اور تھوڑی سی وھسکی مل جائے تو درد کچھ کم ہو جائے گا۔“ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ ”اب تو میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”لیکن اس کی تصدیق تو وہاں جا کر ہی ہو سکتی ہے نا۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت تک تم یہیں رہو گے۔“

”میں اب واپس جانا بھی نہیں چاہتا۔ مورٹن اب کسی بھی قیمت پر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہتر ہے کہ آپ ہی مجھے گولی مار دیں۔“

”اس کا فیصلہ تو میں تمہارے بیان کی تصدیق کے بعد ہی کروں گا۔“ میں نے کہا پھر میں اردو میں نندو سے بولا۔ ”اسے درد رفع کرنے والی کوئی گولی دے دو اور اگر یہاں وھسکی ہو تو وہ بھی دے دو۔“

”میں اسے انجکشن دے دیتا ہوں۔“ نندو نے کہا۔ ”ورنہ یہ ساری رات پریشان کرتا رہے گا۔“

”ہاں، اب یہ تمہاری ذمے داری ہے۔“ اچانک کانتا کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کس وقت وہاں آ گئی تھی۔ ”ہم لوگ لندن جا رہے ہیں۔ ہماری واپسی تک یہ تمہاری نگرانی میں رہے گا۔“

”اوکے میڈم!“ نندو نے کہا۔ ”اس طرف سے آپ بے فکر رہیے۔“

ہم لوگ ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ میں نے کانتا سے کہا۔ ”میں پہلی فلائٹ سے لندن جانا چاہتا ہوں۔“

”ہم آج صبح ہی نکل سکتے ہیں۔“ کانتا نے کہا۔

”ہم؟“ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں ہم۔“ کانتا نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”تمہیں ساتھ لے جا کر تو میری پریشانیاں کم ہونے کے بجائے بڑھ جائیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا دھیان رکھوں گا یا...“

”مسٹر بابر!“ کانتا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اتنا ایزی نہ لیں۔ میں عام عورتوں کی طرح نازک اور چھوئی موئی نہیں ہوں۔ بہ یک وقت تم جیسے دو آدمیوں کو زیر کر سکتی ہوں۔“

”ضرور کر سکتی ہو گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ کانتا نے کہا۔ ”خان نے مجھے خاص طور پر یہ ذمے داری سونپی ہے۔“

”خان نے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”لیکن وہ خود کہاں ہے؟“

”وہ جہاں بھی ہے، تمہاری طرف سے بے خبر نہیں ہے۔“ کانتا نے کہا اور سیل فون پر کوئی نمبر ملانے لگی پھر ہنس کر بولی۔ ”ہیلو میگی! کیسی ہو؟... میں کیلی فورنیا ہی میں ہوں۔ مجھے آج ہی لندن کی فلائٹ میں دو سیٹیں چاہئیں... وھاٹ؟... نہیں بھئی میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے... اوکے، صبح ائرپورٹ پر ملاقات ہو گی... تم میری خاطر کچھ دیر رک جانا، اوکے سی یو۔“ کانتا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے گھر سے اپنا پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس کے علاوہ اپنی چیک بکس، اے ٹی ایم کارڈز، کریڈٹ کارڈز اور اپنی تمام ڈگریاں، مریم کا پاسپورٹ جو ابھی تک کلارا کے نام سے ہی تھا، اس کی تعلیمی اسناد اور تمام ضروری کاغذات ایک بریف کیس میں رکھے۔ میں نے اپنا اور مریم کا لیپ ٹاپ بھی ساتھ لے لیا اور اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔

کانتا بہت بے چینی سے میری منتظر تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس پہلے ہی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا تھا۔

ہم ائرپورٹ پہنچے تو پونے پانچ بج رہے تھے۔ ہم دونوں کے ٹکٹ تیار تھے، اگلے ہی لمحے ہم لندن کے لیے پرواز کر گئے۔ سات گھنٹوں کی فلائٹ کے بعد ہم لندن میں موجود تھے۔

لندن پہنچ کر کانتا نے ایک ٹیکسی روکی اور اسے کوئی ایڈریس بتانے لگی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ٹیکسی ایک بنگلے کے سامنے رکی۔ میں نے وہ راستہ سوتے جاگتے طے کیا تھا۔

وہ بنگلا بہت بڑا نہیں تھا، اس میں چھوٹا سا ایک لان تھا، چھوٹا سا کار پورچ تھا لیکن وہ دو منزلہ بنا ہوا تھا۔

گیٹ پر نیگرو گارڈ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں کانتا کے آدمیوں میں کسی امریکن کو دیکھ رہا تھا۔ گارڈ نے دروازہ کھولا اور برآمدے میں کھڑے ہوئے دوسرے ملازم نے ٹیکسی سے ہمارا سامان اتارا۔

رات بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اس وقت مجھ پر نیند کا شدید غلبہ تھا۔ ناشتا میں فلائٹ ہی میں کر چکا تھا۔ میری حالت دیکھ کر کانتا مجھے بیڈ روم میں لے آئی۔ میں نے جوتے اتار کر پھینکے اور کپڑے بدلے بغیر بیڈ پر گر گیا۔ میرا سر اس بری طرح چکرا رہا تھا کہ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی چار بجا رہی تھی۔ میں اب پوری طرح تازہ دم تھا۔ میں نے نیم گرم پانی سے غسل کیا تو ساری تھکن گویا پانی کے ساتھ بہہ گئی۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو کانتا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی لیکن اس وقت وہ مجھے کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”آپ تو ایسے سوئے مسٹر بابر کہ اب شام کی خبر لائے ہیں۔“

”پہلے تو جلدی سے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔“ میں نے کہا۔ ”بھوک کی شدت سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔“

”کھانا تیار ہے۔“ کانتا نے کہا۔ ”میں یہیں منگوا لیتی ہوں۔“

وہی ملازم جو صبح مجھے برآمدے میں نظر آیا تھا، اس وقت کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ بھی ایشیائی تھا۔

”اکمل!“ کانتا نے کہا۔ ”کھانے کے بعد کافی بھی یہیں دے جانا۔“

وہ چہرے سے کچھ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

اس نے پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد کہا۔ ”بابر! میں نے سائمن کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ اس کا محل نما گھر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارا ہوٹل ہل ویو، پریسٹن نیو روڈ پر ہے۔ اسی روڈ پر تقریباً آٹھ کلومیٹر

دور سائمن کا گھر ہے۔ وہ ایکسپورٹ امپورٹ کی ایک بہت بڑی فرم کا مالک ہے اور قیمتی پتھروں کا شوقین ہے۔''

''تمہیں یہ سب معلومات کہاں سے ملیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے دفتر کی ایک ملازم لڑکی سے۔'' کاتنا نے جواب دیا۔

میں یہ سوچنے لگا کہ کاتنا آخر اتنی دوڑ دھوپ اور محنت کس لیے کر رہی ہے؟ کیا یہ لوگ میری ذات سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

''کیا سوچنے لگے بابر؟'' کاتنا نے پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ تم میرے لیے آخر اتنی محنت کیوں کر رہی ہو؟ اب یہ مت کہنا کہ تم سے خان نے کہا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''مجھ سے واقعی خان ہی نے کہا تھا کہ تمہاری ہر ممکن مدد... کروں... لیکن... سچی... بات... تو... یہ... ہے بابر... کہ... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔''

''کیا؟'' میں چونک کر بولا۔

''میں جانتی ہوں کہ میری یہ محبت یک طرفہ ہے کیونکہ تم تو مریم کے عشق میں جنون کی حد تک مبتلا ہو۔ پھر مجھ جیسی جرائم پیشہ اور بدکردار لڑکی صرف چند لمحوں کی ساتھی تو ہو سکتی ہے، زندگی بھر کی نہیں۔''

''کاتنا! میں...''

''کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے بابر!'' اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''اپنے دل پہ تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ جب تم مریم کے لیے اتنی تکلیفیں اٹھا سکتے ہو تو کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی؟'' اس نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

اس نے اپنے آنسو خشک کیے، بیڈ روم فریج سے وسکی کی ایک بوتل نکالی اور شراب گلاس میں ڈال کر پانی یا سوڈا ملائے بغیر پی گئی۔

پھر وہ سنبھل کر بولی۔ ''ہم سائمن سے ملنے کے لیے قیمتی پتھر استعمال کریں گے۔''

''اور وہ قیمتی پتھر کہاں سے آئیں گے؟''

کاتنا میرے سوال پر مسکرائی، پھر بولی۔ ''میں نے کچھ بیش قیمت ہیروں، زمرد، نیلم اور یاقوت وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہماری فرم ''جیمز'' کا کاروبار کرتی ہے، ہیڈ آفس نیو یارک میں ہے اور ہم یعنی کاتنا اور شیکھر اس کے سیلز ایگزیکٹو ہیں۔''

''شیکھر کون ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''شیکھر تم ہو۔ تمہارا تعلق انڈیا سے ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ''کیا تم اسے اپنا اصلی نام بتاؤ گے؟ ممکن ہے اسے تمہارے بارے میں بریف کیا گیا ہو۔''

''لیکن میں تو قیمتی پتھروں اور جیمز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کاتنا نے کہا۔ ''سائمن سے ساری گفتگو میں کروں گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''یوں بھی سائمن پتھروں سے زیادہ خوب صورت اور پُرکشش لڑکیوں کا دیوانہ ہے۔ میں نے اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیا ہے۔ آج رات ساڑھے آٹھ بجے اس نے مجھے گھر پر بلایا ہے۔''

رات ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم سائمن کے وسیع و عریض محل کے دروازے پر کھڑے تھے۔

ہماری گاڑی رکی تو گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور اندر سے کسی نے جھانکا۔ میں نے اترنا چاہا لیکن کاتنا نے مجھے روک دیا اور خود گاڑی سے باہر نکل گئی۔

''میڈم کاتنا؟'' اندر سے جھانکنے والے نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں کاتنا ہوں۔'' اس نے رواں انگریزی اور باوقار انداز میں کہا۔

''مسٹر سائمن آپ کے منتظر ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے شاید کوئی لیور دبایا تو دروازہ آہستگی سے کھل گیا۔ آہنی گیٹ کی نچلی جانب پہیے لگے ہوئے تھے۔

میں نے گارڈ کے اشارے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''یہاں تو سیکیورٹی کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔'' کاتنا بڑبڑائی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے اعصاب اس وقت کشیدہ ہو رہے تھے۔

مرکزی دروازے سے پورچ کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ پورچ میں ایک مسلح محافظ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور مؤدبانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ کاتنا کے اترنے کے بعد وہ تیزی سے گھوم کر میری طرف آیا لیکن میں اس سے پہلے ہی دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔

وہ ہمیں لے کر برآمدے کی طرف بڑھا اور ایک کوریڈور میں گھوم گیا۔ کوریڈور کے دونوں اطراف میں کمرے تھے۔ کوریڈور کے آخری سرے پر گارڈ رک گیا اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

''یس!'' اندر سے ایک گونج دار آواز سنائی دی۔

گارڈ نے دروازہ کھولا اور آہستہ سے بولا۔ ''سر! مس کاتنا...''

''انہیں اندر لے آؤ۔'' وہی گونج دار آواز پھر سنائی دی۔

گارڈ نے ایک طرف ہٹ کر ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔

سامنے ہی صوفے پر باوقار سا ایک انگریز بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ صحت قابلِ رشک تھی اور جسم بھی ورزشی تھا۔

''ویلکم مس کاتنا اینڈ مسٹر شیکھر!'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

اس کا قد بھی تقریباً میرے ہی برابر تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ پھر اس نے آہستگی سے کاتنا کا ہاتھ تھام لیا اور گویا اسے چھوڑنا بھول گیا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

صوفے انتہائی آرام دہ اور قیمتی تھے۔ میں گویا صوفے میں دھنس گیا۔ کمرے کی ہر چیز انتہائی بیش قیمت تھی اور سائمن کے اعلیٰ ذوق کی علامت تھی۔ میرے ہاتھ میں جو بریف کیس تھا، اس میں ہزاروں پاؤنڈز کے قیمتی جواہرات تھے۔ ان کی مالیت کے بارے میں بھی مجھے کاتنا ہی نے بتایا تھا۔

سائمن نے بہ غور ہمارا اور خاص طور پر میرا جائزہ لیا، پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''کاروباری باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، آپ لوگ یہ بتائیں کہ کیا لیں گے... سوفٹ یا ہارڈ ڈرنک؟''

''کوئی فارمیلٹی نہیں مسٹر سائمن!'' کاتنا کھنک دار لہجے میں بولی اور اس نے عادت کے مطابق ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ جھٹکے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

''چلیے آپ کا اصرار ہے تو آپ ہمارے لیے کافی منگوا لیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

سائمن نے صوفے کے دائیں ہتھے کی جانب لگا ہوا سرخ بٹن دبا دیا۔ مجھے گھنٹی کی آواز تو سنائی نہیں دی لیکن فوراً ہی ایک باوردی ویٹر وہاں آگیا۔ سائمن نے اس سے کافی کے لیے کہا۔ وہ خود شراب سے شغل کر رہا تھا۔

''مسٹر سائمن!'' کاتنا نے عادت کے مطابق سر جھٹک کر کہا۔ ''اصل میں ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں ابھی مزید دو کلائنٹس سے ملنا ہے اس لیے اگر کافی کے ساتھ ساتھ بزنس کی بات بھی ہو جائے تو...''

''ضرور مس کاتنا!'' سائمن نے کہا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی چھوٹی میز ایک طرف کھسکا کر گلاس ٹاپ کی بڑی درمیانی میز آگے کھینچ لی۔

میں نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے مخمل کے چھوٹے چھوٹے کئی ڈبے نکال کر میز پر رکھ دیے۔

کاتنا نے ایک ڈبا اٹھا کر کھولا اور بولی۔ ''یہ دیکھیے مسٹر سائمن! یہ ہشت پہلو ہیرا ہے۔ یہ ایک تاریخی ہیرا ہے۔ یہ شاہانِ روس کے حوالے سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہیرا ہماری فرم تک کیسے پہنچا، اس کی بھی الگ کہانی ہے۔''

سائمن نے پُرشوق انداز میں ہیرا اٹھایا اور کوٹ کی جیب سے میگنا فائنگ گلاس نکال لیا۔ اس نے بہت ماہرانہ انداز میں ہیرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''بہت ہی خوب صورت اور نایاب ہیرا ہے۔'' اس نے وہ ہیرا ایک طرف رکھ دیا۔

پھر کاتنا نے اسے یکے بعد دیگرے زمرد، یاقوت، نیلم اور دوسرے قیمتی جواہرات دکھائے۔

''مسٹر سائمن!'' کاتنا نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''آپ امریکا تو اکثر جاتے ہی رہتے ہوں گے؟''

''ہاں، وہاں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔'' سائمن نے ہیرے کو میگنا فائنگ گلاس سے دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر وہ بولا۔ ''آپ اس ہیرے اور یاقوت کی قیمت بتائیے؟''

''ہیرے کی قیمت ہے ڈھائی ہزار پاؤنڈز...!'' کاتنا نے کہا تو سائمن بری طرح چونک اٹھا۔ ''اور یاقوت کی قیمت تین ہزار پاؤنڈز ہے۔''

''میں نے آپ کے تمام جیمز کی قیمت نہیں پوچھی ہے؟'' سائمن نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اور میں برسوں سے جواہرات کی خرید و فروخت کر رہا ہوں۔ اس ہیرے اور یاقوت کی اتنی قیمت؟''

''قیمت تو ان کی تاریخی اہمیت کی ہے۔'' کاتنا نے کہا۔ ''ہیرے کے بارے میں تو آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ یاقوت انڈیا کے مغل بادشاہ اکبر کی انگوٹھی کا ہے۔''

''اس کے باوجود اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔'' سائمن نے کہا۔

''قیمت تو بالکل مناسب ہے۔'' کاتنا نے بہت ادا سے مسکرا کر کہا۔ ''اور کوئی عام آدمی ان کا قدرداں ہو بھی نہیں سکتا۔'' پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''چلو شیکھر! یہاں بات نہیں بنے گی۔''

میں نے جواہرات کے ڈبے دوبارہ بریف کیس میں رکھنا شروع کر دیے۔

''مس کانتا! یہ کبھی نہیں ہوا کہ مجھے کوئی چیز پسند آئی ہو اور میں نے اسے حاصل نہ کیا ہو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ وہ دونوں پتھر لینے کے لیے تیار ہیں؟''

''ہاں، لیکن میں ان دونوں پتھروں کے ایک ہزار پاؤنڈز سے زیادہ نہیں دوں گا۔'' سائمن نے سنجیدگی سے کہا۔

''سوری مسٹر سائمن!'' کانتا کا لہجہ بھی سرد تھا۔ ''ہمارے جواہرات کے قدرداں بہت ہیں۔ ہمیں اب اجازت دیں۔'' کانتا اچانک کھڑی ہوگئی۔

''آپ کس ہوٹل میں قیام پذیر ہیں مس کانتا؟'' سائمن نے پوچھا۔ ''ممکن ہے میں آپ کو اتنی قیمت دے ہی دوں۔''

''مسٹر سائمن! فیصلہ کرنا ہے تو ابھی کریں کیونکہ ہم آج ہی فرینکفرٹ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

''آپ اتنے قیمتی جواہرات لے کر گھومتی ہیں، آپ کو خوف محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی آپ کو لوٹ بھی سکتا ہے؟''

''میں ان پتھروں کی حفاظت کرنا بھی جانتی ہوں مسٹر سائمن! اس سلسلے میں آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، میں یہاں صرف شیکھر کے ساتھ آئی ہوں۔ محل کے باہر میرے مسلح محافظ موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے کانتا نے اچانک اپنے ہینڈ بیگ سے ریوالور نکال لیا اور درشت لہجے میں بولی۔ ''اپنے بیڈ روم میں چلو سائمن!''

سائمن ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا، شاید اسے امید نہیں تھی کہ اتنی خوب صورت اور نازک اندام لڑکی یہ حرکت بھی کر سکتی ہے۔

وہ حیرت کے ابتدائی صدمے سے فوراً ہی سنبھل گیا اور مسکرا کر بولا۔ ''ویری نائس مس کانتا! آپ تو مذاق بھی بہت اچھا کر لیتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ اس بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے دبا کر اس نے ملازم کو بلایا تھا۔

میں نے اچانک اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور بولا۔ ''یہ مذاق نہیں ہے سائمن! اٹھ اور اپنی خواب گاہ میں چل۔''

کانتا لپک کر اس کے سر پر پہنچ گئی اور اس کی کنپٹی پر ریوالور کی نال رکھ دی۔ ''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ ورنہ...'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر زور سے ماری۔

سائمن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ صوفہ اتنا نرم و گداز تھا کہ سائمن گویا اس میں دھنسا ہوا تھا۔

میں نے اس کا کالر پکڑ کے اسے بے رحمی سے گھسیٹا اور کھڑا کر دیا۔ پھر اس کی گدی پر زوردار ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ ''بیڈ روم میں چلو۔''

وہ لرزتے قدموں سے بیڈ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔

''اگر تم نے کسی بھی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں کم سے کم تمہاری کھوپڑی میں تو سوراخ کر ہی دوں گی۔'' کانتا نے انتہائی سفاک لہجے میں کہا۔

سائمن لرزتے قدموں سے باہر نکلا۔ کوریڈور سنسان پڑا تھا۔

کانتا اس کے ساتھ یوں چل رہی تھی جیسے وہ سائمن سے خاصی بے تکلف ہو۔ اس نے سائمن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور مسکرا مسکرا کر اس سے کہہ رہی تھی۔ ''مسٹر سائمن! تم واقعی قیمتی پتھروں کے قدرداں ہو۔''

''تم لوگ آخر ہو کون؟'' سائمن نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اسی وقت اس کا ایک باوردی ملازم کوریڈور میں نمودار ہوا۔

''کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔'' وہ سرگوشی میں بولی پھر ہنستے ہوئے بلند آواز میں بولی۔ ''مسٹر سائمن! بلیک برن میں بلکہ پورے انگلینڈ میں آپ سے بڑھ کر جواہرات کا کوئی قدرداں ہو ہی نہیں سکتا۔''

باوردی ملازم نظریں اٹھائے بغیر مؤدب انداز میں ہمارے نزدیک سے گزر گیا۔

سائمن بڑے سے ایک ہال میں داخل ہوا اور ہال میں واقع ایک زینے کی طرف بڑھا۔ چکردار سیڑھیوں پر بھی انتہائی دبیز اور قیمتی کارپٹ تھا۔ سائمن اوپر پہنچا تو اس کا ایک اور ملازم نظر آیا۔

''ہمارے پاس مزید قیمتی اور تاریخی اہمیت کے جواہرات ہیں مسٹر سائمن!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کے باوردی ملازم نے سائمن کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور خود نظریں جھکا کر مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دروازہ خودکار انداز میں آہستہ سے بند ہو گیا۔

''اپنے اس ملازم سے کہو کہ جا کر آرام کرے۔'' کانتا نے سفاک لہجے میں سرگوشی کی۔

''وہ خود ہی چلا جائے گا۔ اس کا کمرا اس کوریڈور کے آخری سرے پر ہے۔ مجھے ضرورت پڑتی ہے تو میں گھنٹی بجا کر اسے طلب کر لیتا ہوں۔ ویسے وہ سمجھ جائے گا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں مہمانوں کو اپنے بیڈ روم میں کبھی نہیں لے جاتا۔''

''جھوٹ مت بولو سائمن!'' کانتا سرد لہجے میں بولی۔ ''تمہارے بیڈ روم میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی لڑکی ہوتی ہے۔''

''ہاں... لیکن... وہ...''

''اپنے ملازم کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ مسٹر شیکھر کو گیسٹ روم میں پہنچا دے۔ پھر تو تمہارے ملازم کو کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوگا؟''

''نہیں کانتا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ یہ بٹن دبا کر سیکیورٹی گارڈز کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ تم اس کا دھیان رکھو، میں خود ہی باہر چلا جاتا ہوں۔'' میں نے کانتا کو آنکھ ماری اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ ملازم واقعی وہاں نہیں تھا۔

میں کوریڈور کے سرے پر واقع کمرے کی طرف بڑھا تو اچانک ہی وہی ملازم کمرے سے نکل آیا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر مؤدب انداز میں بولا۔ ''سر! آپ... اس... طرف... کہاں...''

''کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''سائمن میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ گھنٹی بجا کر تمہیں بلانا چاہ رہا تھا لیکن شاید اس کا بٹن خراب ہو گیا ہے تو میں نے کہا کہ میں خود ہی تمہیں بلا لاتا ہوں۔''

''سر! اصل میں مسٹر سائمن کے بیڈ روم میں الیکٹرانک سسٹم ہے۔ بیل خراب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا فیوز اڑ گیا ہے۔ ایسا ہوا تو ان کا انٹرکام بھی کام نہیں کرے گا اور سیکیورٹی الارم بھی ناکارہ ہو گیا ہوگا۔ میں ابھی الیکٹرانک انجینئر کو کال کرتا ہوں۔''

''اوہو، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں خود بھی الیکٹرانک انجینئر ہی ہوں۔ میں ابھی فیوز ٹھیک کر دوں گا۔ مجھے دکھاؤ، وہ سسٹم کہاں سے آپریٹ ہوتا ہے؟''

''میرے ساتھ آیئے۔'' ملازم نے کہا اور کوریڈور کے دوسرے سرے پر جا کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوا اور ایک باکس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''اس باکس میں فیوز ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے باکس کھول دیا۔ اس میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے چھ فیوز لگے ہوئے تھے جیسے عموماً گاڑیوں کے اگنیشن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں نے یکے بعد دیگرے تمام فیوز نکال لیے اور ان کا جائزہ لینے لگا۔ فلائنگ کورس کے دوران میں مجھے الیکٹرانک آلات اور فیوز وغیرہ کو سمجھنے کے لیے بنیادی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔

''ان میں سے دو فیوز خراب ہیں۔'' میں نے کہا پھر اچانک اس سے کہا۔ ''میرے خیال میں تم سائمن کے پاس چلے ہی جاؤ۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!'' ملازم نے کہا۔

میں نے باکس بند کر کے تمام فیوز اپنی مٹھی میں دبا لیے اور ملازم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ملازم سائمن کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا اور دروازہ کھول کر پہلے خود اندر داخل ہوا پھر ملازم کو بھی بلا لیا۔ میں دروازے کے پاس ہی رک گیا۔ ملازم چند قدم آگے بڑھا تو میں نے پشت سے اس کی کھوپڑی پر مکّا رسید کر دیا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑایا اور گھوم کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے دوسرا گھونسا اس کی پیشانی پر مار دیا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا تو اسے اچھی خاصی چوٹ آتی۔ میں نے اس کی ٹائی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور اسے بے رحمی سے ایک طرف پھینک کر دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔

''تم لوگ شاید پیٹر کے آدمی ہو؟''

''ہم لوگ اپنے آدمی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، تم کس کے آدمی ہو؟''

''میں کوئی گینگسٹر نہیں ہوں، انگلینڈ کا ایک معزز شہری ہوں۔'' سائمن تھوک نگل کر بولا۔

''پھر جیکسن تمہارا آدمی ہوگا؟'' کانتا نے درشت لہجے میں کہا۔

سائمن بری طرح چونک اٹھا۔ ''جیک... سن... کون جیکسن؟'' وہ ہکلا کر بولا۔ ''تم... تم جیکسن کو کیسے جانتے ہو؟''

کانتا نے اچانک اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا باریک اور

لمبے پھل والا تیز دھار خنجر نکال لیا۔ وہ خنجر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ ''میں جھوٹ بولنے والوں کو یوں کاٹ دیتی ہوں۔'' اس نے سائمن کے بیڈ پر رکھے ہوئے تکیے کو بہت مہارت سے ڈبل روٹی کی طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

''تت... تمہیں... کتنی رقم چاہیے؟'' سائمن ہکلایا۔

''کلارا کہاں ہے؟'' میں نے اچانک کرخت لہجے میں پوچھا۔

سائمن کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹ کر رہ گئیں۔

''اب یہ مت کہنا کہ کون کلارا؟'' میں نے کہا۔ ''وہ کلارا جسے جیکسن نے تمہارے حوالے کیا ہے؟''

''کلارا سے میرا کیا تعلق؟'' سائمن نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ''جب کلارا سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر اسے یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''دیکھو... تم لوگ بہت زیادتی کر رہے ہو... تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ...''

میں نے اس کے منہ پر دوسرا تھپڑ مارا تو اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون رسنے لگا۔ ''یہ شرافت سے نہیں بتائے گا کانتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس پر وقت ضائع مت کرو۔ ذبح کر دو اسے۔''

''ہاں، اسے ذبح ہی کرنا پڑے گا۔'' کانتا نے سفاک لہجے میں کہا اور خنجر سے اس کے بازو پر چرکا لگایا۔

سائمن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

کانتا نے اس کی ٹائی پکڑ کر اسے گھسیٹا اور اس کی ناف پر گھٹنے سے زوردار وار کیا۔ وہ کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔ کانتا نے ایک گھٹنا اس کے سینے پر رکھا پھر مجھ سے بولی۔ ''شیکھر! ذرا اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو ورنہ مجھے اس کا گلا کاٹنے میں لطف نہیں آئے گا۔''

کانتا گلا کاٹنے کی بات یوں کر رہی تھی جیسے کیک کاٹنے جا رہی ہو۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

سائمن کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''دیکھو، میں دل کا مریض ہوں۔'' سائمن کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم لوگ...''

''شٹ اپ!'' کانتا نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ پیچھے کی جانب کیا اور بولی۔ ''اب تو نہ تمہارا دل رہے گا، نہ مرض۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر یوں سائمن کی طرف بڑھایا جیسے اس کے گلے پر پھیرنا چاہتی ہو۔

اس نے خنجر کی نوک سے اس کی گردن پر ہلکا سا چرکا لگایا ہی تھا کہ سائمن چیخ اٹھا۔ ''کلارا یہیں ہے، اسی محل میں۔''

کانتا نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

''مجھے تھوڑی سی وھسکی دے دو۔'' وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔

''اس محل کے کس حصے میں ہے کلارا؟'' کانتا نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''سب سے اوپر کی منزل پر۔'' سائمن نے جواب دیا۔ ''اوپر دس کمرے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کمرے میں کلارا موجود ہے۔''

''اگر تمہاری یہ بات غلط ثابت ہوئی تو میں جانے سے پہلے تمہیں کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دوں گی۔'' کانتا نے کہا اور اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی سے ہلکا سا وار کیا۔

وہ الٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔

کانتا نے بستر کی چادر سے دو پٹیاں کاٹیں اور سائمن کے ہاتھ پیر باندھ دیے، اس نے سائمن کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس نے اس ملازم کی خبر لی جسے میں نے باندھ کر ڈالا تھا۔ وہ آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ کانتا نے اس کی کنپٹی پر بھی ہلکی سی ایک ضرب لگائی، وہ پھر انٹا غفیل ہو گیا۔ کانتا نے اس کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ کر اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔

پھر اس نے سائمن کے بیڈروم کی تلاشی لی تو اس کے بیڈ کے سائڈ سے ایک ریوالور نکلا، کچھ کرنسی نوٹ تھے اور چار پانچ فائلیں تھیں۔ اس نے وہ ریوالور میرے حوالے کر دیا اور بولی۔ ''کلارا کی نگرانی پر جیکسن کے دو آدمی بھی ہیں۔ یہ رکھ لو، ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ پھر ہم لوگ بہت محتاط انداز میں کمرے سے باہر نکلے۔ کوریڈور اس وقت بھی سنسان تھا۔ ہم کوریڈور کے سرے پر ملازم کے کمرے تک پہنچے۔ وہاں سے وہ راہداری انگریزی کے حرف "L" کی شکل میں گھوم گئی تھی۔ اس کے سرے پر ایک دروازہ تھا۔

''میرے خیال میں یہی زینے کا دروازہ ہے۔'' کانتا

نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھا۔ اس نے اپنی جینز کی جیب سے مڑا تڑا ایک تار نکالا اور تالا کھولنے میں مصروف ہو گئی۔

دس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس نے تالا کھول لیا۔

ہم لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھے۔

زینے کے اوپر ایک اور دروازہ تھا۔ وہ بھی بند تھا۔ میری ناک نے سگریٹ کے دھوئیں کی بو محسوس کی۔ اسی وقت کانتا کا ہاتھ دروازے سے ٹکرا گیا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کوئی کرخت آواز میں بولا۔

''سائمن!'' میں نے حتی الامکان سائمن کی آواز بنا کر کہا۔

''سائمن صاحب!'' اندر سے آنے والی آواز میں حیرت تھی۔

پھر مجھے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ کانتا تو پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

دروازہ کھلنے سے پہلے زینے میں تیز روشنی کا ایک بلب روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

وہاں ایک لمبا تڑنگا نیگرو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا خوف ناک ریوالور تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے پہلے سامنے ہی دیکھا، بس وہی ایک لمحہ تھا۔ کانتا نے بیٹھے ہی بیٹھے اس کی ریوالور والی کلائی پر زوردار ضرب لگائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ بوکھلاہٹ میں نیگرو کے منہ سے غلیظ سی ایک گالی نکل گئی۔ کانتا اچھل کر اس کے سر پر جا پہنچی اور اس کے جبڑے پر زوردار لات رسید کی، پھر گھوم کر دوسری لات ماری۔

وہ نیگرو بھی خاصا سخت جان تھا کہ اتنی زبردست لاتیں کھانے کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑیں اور اسے آگے گھسیٹ لیا۔

اس کے گرنے سے خاصا زوردار دھماکا ہوا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سر پر اپنے بھاری بھرکم جوتے سے ٹھوکر ماری۔

فوراً ہی کوئی گرج دار آواز میں چیخا۔ ''کون ہے؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

اس آواز کے ساتھ ہی کسی بے آواز رائفل سے فائر کیا گیا۔ کانتا کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر گئی۔ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ مجھے کانتا کی موت کا شدید صدمہ تھا۔

فوراً ہی ایک دوسرا نیگرو کسی گوشے سے نکل کر سامنے آگیا اور گرج کر مجھ سے بولا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا، اپنا ریوالور پھینکو اور کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا۔''

میں نے ریوالور پھینک دیا اور آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنے منصوبے کی ناکامی اور کانتا جیسی مخلص دوست کی موت کا دُہرا صدمہ تھا۔

میں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوا تو وہ نیگرو مزید میرے نزدیک آگیا۔

پھر اچانک جیسے بجلی سی کوند گئی۔ کوئی چیز سنسناتی ہوئی نیگرو کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ کانتا کا مخصوص خنجر تھا جو دستے تک نیگرو کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹی اور وہ زمین پر گرنے لگا۔ اس حالت میں بھی اس نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔

میں نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا، کانتا وہاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''اب ایسے ہونقوں کی طرح کیا کھڑے ہو؟ ان دونوں کی جیبوں کی تلاشی لو۔ کلارا کا کمرا لاک ہو گا۔ اس کی چابی انہی دونوں میں سے کسی کے پاس ہو گی۔''

میں جھک کر اس نیگرو کی تلاشی لینے لگا جسے پہلے بے ہوش کیا تھا۔ اس نے اچانک میرے منہ پر گھونسا مار دیا۔ اس کا بھاری بھرکم گھونسا میری پیشانی پر پڑا۔

میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے رقص کرنے لگے اور میں پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔ نیگرو برق سرعت سے اٹھا اور میری گردن دبوچنا چاہی لیکن وہ یوں رک گیا جیسے بیٹری سے چلنے والے کسی کھلونے کی بیٹری کمزور ہو جاتی ہے۔

اس کا سبب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔ وہ اوندھے منہ گرا تو مجھے اس کی پشت میں بھی کانتا کا خنجر دستے تک دھنسا ہوا نظر آیا۔ کانتا نے بجلی کی سی تیزی سے مرنے والے نیگرو کے سینے سے خنجر کھینچ کر اس کی پشت میں گھونپ دیا تھا۔

وہ بُری طرح تڑپا، پھر ساکت ہو گیا۔

وہاں خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ کانتا کے کپڑے اور ہاتھ بھی خون آلودہ تھے اور کچھ خون میرے کپڑوں پر بھی لگ گیا تھا۔

کانتا نے انتہائی مہارت سے اس نیگرو کی تلاشی لی جسے اس نے پہلے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے دوسرے مرنے والے کی تلاشی لی تو مجھے اس کی جیب سے تین چابیوں کا ایک کی رنگ ملا۔ کانتا نے ان دونوں کے ریوالورز پر بھی قبضہ کرلیا اور اس نیگرو کی رائفل بھی اٹھالی۔ اپنا خنجر وہ پہلے ہی مردہ نیگرو کی پشت سے نکال چکی تھی۔

وہ سرگوشی میں مجھ سے بولی۔ ''ممکن ہے یہاں کوئی اور گارڈ بھی ہو۔ اس کا امکان بہت کم ہے لیکن پھر بھی ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمروں کی طرف بڑھ گئی۔

اوپر جتنے بھی کمرے تھے، ان سب کو دیکھنے میں تو صبح ہوجاتی۔

ایک کمرے کے دروازے کی درز سے روشنی کی ایک مدھم سی لکیر باہر نکل رہی تھی۔ کوریڈور میں تیز روشنی کا بلب روشن تھا اس لیے وہ روشن لکیر پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

میں نے اسی کمرے کو کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا دروازہ لاک تھا۔ میں نے نیگرو کی جیب سے نکلنے والی چابی تالے میں لگائی تو لاک نہیں کھلا۔

اچانک مجھے سیڑھیوں پر آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ آواز کانتا نے بھی سن لی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''میں زینے کے دروازے کی طرف جارہی ہوں۔ تم لاک کھولنے کی کوشش کرو۔'' وہ تیزی سے باہر کی طرف چلی گئی۔

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے دوسری چابی لگائی تو لاک کھل گیا۔ میں نے بے تابی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں نیلگوں روشنی والا سیور روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے مریم دکھائی دی۔ وہ خوف زدہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ والہانہ انداز میں بیڈ سے اٹھی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو مریم؟'' میں نے جذبات سے تھرتھراتی آواز میں پوچھا۔

مریم میرے سینے سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ ابھی خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں نے مریم سے کہا۔ ''مریم پلیز! اب رونا دھونا بند کرو۔ ہم لوگ اس وقت شدید خطرے میں ہیں۔'' میں نے اسے اپنے سینے سے علیحدہ کیا اور بولا۔ ''بس اب چلنے کی تیاری کرو۔ اپنا کوٹ اور جوتے پہن لو۔''

مریم نے انتہائی عجلت میں جوتے پہنے اور کوٹ پہن کر چلنے کو تیار ہوگئی۔

میں نے دروازے کے پاس جا کر باہر کی سن گن لی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔

مجھے کانتا کی سرگوشی سنائی دی۔ ''بابر! خطرہ ٹل گیا ہے، باہر آجاؤ۔''

میں محتاط انداز میں باہر نکلا۔ مریم میرے پیچھے پیچھے تھی۔

اس نے ایک ریوالور میرے حوالے کیا اور خود دونوں ہاتھوں میں ریوالورز لے کر زینے کی طرف بڑھی۔ رائفل اس نے شانے پر لٹکالی تھی۔

اس کے ہاتھ میں جو ریوالورز تھے، ان کی نال ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لمبی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ان ریوالورز پر سائیلنسر فٹ ہیں۔

''یہ کون ہے بابر؟'' مریم نے پوچھا۔ اس کا اشارہ کانتا کی طرف تھا۔

''اس کا تفصیلی تعارف میں بعد میں کراؤں گا۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ اسی کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔''

کانتا پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی زینے سے اتر رہی تھی۔

ہم جونہی زینے سے اترے، دو آدمی ہمارے سامنے آگئے۔ وہ دونوں محل کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، کانتا نے بے آواز فائر کر کے پلک جھپکتے میں ان دونوں کو ڈھیر کردیا۔

''چلو، اب باہر کی طرف چلو۔'' کانتا نے کہا۔

اب سب سے بڑا مسئلہ وہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ ہماری گاڑی پورچ میں تھی لیکن اگر برآمدے میں سائمن کا کوئی ملازم ہوتا تو ہمارے ساتھ مریم کو دیکھ کر چونک اٹھتا۔

''میں سائمن کے بیڈ روم سے بریف کیس لے کر آتی ہوں۔'' کانتا نے کہا۔

وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں بریف کیس لے کر واپس آگئی۔ اس نے بریف کیس مریم کے حوالے کردیا کیونکہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

ہم بہت محتاط انداز میں باہر نکلے۔ پہلے میں نے مریم کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر میں اور کانتا بھی لپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مریم عقبی نشست پر تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ عقبی نشست کے پائدان میں دبک جائے۔

کانتا نے رائفل شانے سے اتار کر میرے حوالے کر

دی تھی۔ میں نے اسے اپنے پہلو کے ساتھ لگا کر یوں رکھا تھا کہ وہ باہر سے کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ کانتا نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے سست روی سے چلاتی ہوئی مرکزی دروازے کی طرف بڑھی۔

میرے اعصاب سخت کشیدہ تھے۔ میں نے دونوں ریوالور سیٹ پر اپنے نیچے دبا کر رکھ لیے تھے۔ میں انہیں فوری طور پر نکال بھی سکتا تھا۔

ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر مین گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ مستعد ہوگئے۔

کانتا نے گاڑی کی رفتار بہت کم کردی۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈز نے لیور دبا کر نہ صرف دروازہ کھولا بلکہ ہم دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے سلام بھی کیا۔ جواب میں کانتا نے بھی سر ہلایا اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا۔

دوسرے ہی لمحے ہم اس ..... محل سے باہر تھے۔

باہر نکلتے ہی کانتا گاڑی کو جیٹ فائٹر کے انداز میں دوڑانے لگی۔

میں نے مریم سے کہا۔ ''اب تم بھی آرام سے سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔'' پھر میں کانتا سے مخاطب ہوا۔ ''اتنی برق رفتاری مت دکھاؤ۔ یہاں کی ہائی وے پولیس بہت مستعد ہے۔ کسی پٹرول کار نے ہماری تیز رفتاری دیکھ لی تو ہم خوامخواہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

کانتا نے گاڑی کی رفتار کم کردی۔

میں نے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''بلیک برن ائرپورٹ کی طرف۔'' اس نے جواب دیا۔

''ائرپورٹ؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کسی فلائٹ میں سیٹیں بھی بک کرالی تھیں؟''

''میں نے ایک چھوٹا طیارہ سیسنا پہلے ہی چارٹر کرلیا تھا۔'' کانتا نے کہا۔ ''ہم فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں ورنہ سائمن فوراً ہی شہر کی ناکا بندی کرادے گا۔''

''تو کیا تمہیں یقین تھا کہ ہم مریم کو وہاں سے لانے میں کامیاب ہوجائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے وہ طیارہ تین دن کے لیے چارٹر کیا ہے۔'' کانتا نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ ہم آج نہیں تو کل یا پرسوں اپنے مشن میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

ائرپورٹ پہنچ کر کانتا نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑی۔ تمام اسلحہ اس نے راستے میں مختلف جگہوں پر پھینک دیا تھا۔

وہاں پہنچ کر مجھے اچانک یاد آیا کہ میرا تمام سامان تو ہوٹل ہی میں رہ گیا ہے۔ اس میں میرے اور مریم کے پاسپورٹ سمیت تمام ضروری کاغذات بھی تھے۔

''کانتا!'' میں نے کہا۔ ''ہمیں ہوٹل جانا پڑے گا۔''

''کیوں؟'' کانتا نے پوچھا پھر مسکرا کر بولی۔ ''سامان کی فکر مت کرو، ہمارا سب سامان یہاں پہنچ چکا ہے۔'' اس نے سیل فون نکال کر کسی کا نمبر ملایا اور بولی۔ ''سردار جی! آپ کہاں ہیں؟ اچھا... ویری گڈ... ہم اسی طرف آرہے ہیں۔'' سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ مجھ سے بولی۔ ''بابر! ہمارا سامان یہاں پہنچ چکا ہے اور سردار جی لاؤنج میں ہمارا انتظار کررہے ہیں۔''

ہم لاؤنج کی طرف بڑھے۔ مریم بالکل خاموش تھی۔ وہ بس مشینی انداز میں ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ لاؤنج میں ایک سردار جی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔

سردار جی نے بہت مؤدب انداز میں کانتا کو سلام کیا، کانتا نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

کانتا نے مجھ سے کہا۔ ''بابر! یہ سردار گرمیت سنگھ ہیں۔ بہت زبردست آدمی ہیں۔''

سردار نے دانت نکال دیے اور بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ میرے دونوں سوٹ کیس اور بریف کیس ایک ٹرالی میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے بریف کیس سے اپنا اور مریم کا پاسپورٹ نکالا اور جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں سامان کی ٹرالی لے کر ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہوگیا۔

تمام مراحل سے فارغ ہونے کے بعد ہم پیدل ہی اس طیارے کی طرف پہنچے جو کانتا نے چارٹر کیا تھا۔ وہ واقعی چھوٹا سا سکس سیٹر طیارہ تھا۔ اس کا پائلٹ بھی نزدیک ہی کھڑا تھا۔

''ہیلو مسٹر جارج!'' کانتا نے خوش دلی سے اسے مخاطب کیا۔

''ہیلو!'' جارج نے بھاری آواز میں کہا۔

''کیا تم پرواز کے لیے تیار ہو؟''

''یس میم!'' اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

وہ درمیانے قد اور بھاری بھر کم جسم کا آدمی تھا۔

''کہاں چلنا ہے میم؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے ٹیکسی اور رکشا والے پوچھتے ہیں۔

''بریڈ فورڈ!'' کانتا نے جواب دیا۔

جارج اچک کر اوپر چڑھ گیا اور اس نے چھوٹی سی ایک سیڑھی جہاز سے لگا کر باہر رکھ دی۔ اس سیڑھی کی مجھے یا کانتا کو ضرورت نہیں تھی لیکن شاید مریم کو اوپر چڑھنے میں تکلیف ہوتی۔ میں نے پہلے مریم ہی کو اوپر چڑھایا، پھر اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے۔ کانتا نے اپنا سوٹ کیس اور میرے دونوں بریف کیس اٹھالیے۔

چند منٹ بعد اس سکس سیٹر طیارے کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ تیزی سے رن وے پر دوڑنے لگا۔ پھر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔

☆☆☆

بریڈ فورڈ میں کئی فائیو اسٹار ہوٹل بھی تھے لیکن ہم غیر معروف سے ایک ہوٹل گرین ویلی میں مقیم تھے۔

ہمیں بریڈ فورڈ پہنچے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ہم تینوں وہاں الگ کمروں میں مقیم تھے اور ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق تھے۔

سائمن کے محل میں ہونے والی واردات نے پورے ملک میں ایک سنسنی پھیلا دی تھی۔ سائمن نے الزام لگایا تھا کہ کانتا نامی ایک انڈین لڑکی اپنے ساتھی شیکھر کے ساتھ کچھ جواہرات دکھانے کے بہانے میرے محل میں آئی، مجھے گن پوائنٹ پر کمرے میں بند کیا پھر اس نے نہ صرف میرے لاکھوں پاؤنڈز کے نایاب جواہرات لوٹے بلکہ پچاس ہزار پاؤنڈز کیش بھی لے گئی۔ ان دونوں نے میرے چار گارڈز کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

برطانوی پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سرگرم ہو چکی تھیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں اس جہاز کا پائلٹ پولیس کو یہ نہ بتا دے کہ ہم بریڈ فورڈ کی طرف گئے ہیں۔ اس کا امکان بہرحال تھا کہ پولیس جہاز کے پائلٹ تک پہنچ جائے۔

پولیس کو ایک بھارتی جوڑے کی تلاش تھی۔ یعنی ایک عورت اور ایک مرد۔ تیسری عورت کو بھی پولیس ہماری معاون سمجھ سکتی تھی۔

کانتا یہاں پہنچنے کے فوراً بعد کہیں چلی گئی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ ہم بریڈ فورڈ میں بری طرح پھنس کر رہ گئے ہیں۔

تین گھنٹے بعد کانتا لوٹی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک سوٹ کیس بھی تھا۔

''تم بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئی تھیں؟'' میں نے اس سے یوں پوچھا جیسے وہ میری ملازمہ ہو۔

''کیوں؟'' کانتا چونک کر بولی۔ ''کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟''

''تم نہیں جانتیں کہ اس وقت اسکاٹ لینڈ یارڈ اور برطانیہ کی پولیس ہمیں تلاش کر رہی ہے۔''

''وہ ہمیں بلیک برن میں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' کانتا نے ہنس کر کہا۔

''انگلینڈ کی پولیس بہت برق رفتاری سے کام کرتی ہے۔ یہ تو امریکی پولیس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ انہوں نے اس پائلٹ سے اب تک سب کچھ اگلوا لیا ہوگا۔''

''کس پائلٹ سے؟'' کانتا مسکرا کر بولی۔ ''جو ہمیں بلیک برن سے یہاں تک لایا تھا؟'' کانتا مسکرائی۔ ''وہ پائلٹ نہیں ہمارا آدمی تھا۔ اصل پائلٹ تو لندن کے ایک فلیٹ میں ہے۔ اسے ہمارے ہی آدمیوں نے اغوا کیا تھا۔''

''تمہارا آدمی؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''انگلینڈ میں بھی تمہارے آدمی موجود ہیں؟''

''ہمارا نیٹ ورک تو پوری دنیا میں ہے۔'' کانتا نے کہا۔

''تم اس وقت کہاں گئی تھیں؟''

''مریم قانونی طور پر یہاں نہیں آئی تھی اس لیے قانونی طور پر یہاں سے جا بھی نہیں سکتی۔'' کانتا نے کہا۔

میں اس کی بات پر چونک اٹھا۔ واقعی مریم یہاں قانونی طور پر نہیں آئی تھی۔ اس کا پاسپورٹ تو میرے پاس تھا۔ ظاہر ہے جب ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے تو امیگریشن حکام مریم کو روک لیتے۔ اس سے پہلا سوال یہی کیا جاتا کہ وہ برطانیہ میں کب اور کیسے آئی؟

یہ بات سن کر مریم بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''بابر! اب کیا ہوگا؟ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے آج نہیں تو کل ہمارے بارے میں معلوم کر لیں گے۔ میری وجہ سے تم بھی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ کم سے کم تم تو یہاں سے نکل جاؤ۔''

''ان لوگوں کی قید میں رہ کر تمہارا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''کیا میں اسی لیے آیا تھا کہ تمہیں پہلے سے بھی زیادہ بڑی مصیبت میں ڈال کر یہاں سے فرار ہو جاؤں؟''

''تو پھر کیا کر سکتے ہیں ہم؟''

''ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں مریم!'' کانتا نے کہا۔ ''ہم آج ہی یہاں سے برطانیہ کی ایک بندرگاہ ساؤتھل کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں ہمارا ایک مال بردار بحری جہاز لنگر انداز ہے۔ اس جہاز کے ذریعے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے کانتا!'' میں نے کہا۔

''ہاں، اس میں کچھ مشکلات تو ضرور ہیں لیکن ناممکن نہیں ہے۔ بنیادی مسئلہ ہے مریم کو اس بحری جہاز میں پہنچانے کا۔ ہم ایک دفعہ برطانیہ کی حدود سے باہر نکل گئے تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس دفعہ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ہم سب کو اپنا حلیہ بدلنا پڑے گا۔ میں چہرے میں تبدیلی کے لیے کچھ چیزیں لے کر آئی ہوں۔''

''یہ تم کیسی فلمی باتیں کر رہی ہو کانتا؟'' مریم نے منہ بنا کر کہا۔ ''فلموں میں تو کردار اپنا گیٹ اپ بھی بدل لیتے ہیں اور چہرہ بھی۔ عملی زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''سب کچھ ممکن ہے۔'' کانتا نے کہا۔ ''کچھ دیر صبر کرو، ابھی سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔'' کانتا یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''یہ بھی عجیب لڑکی ہے۔'' اس کے جانے کے بعد مریم نے کہا۔ ''انتہائی پُراعتماد اور نڈر!''

میں نے اس دوران میں مریم کو کانتا کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔ اس تفصیل میں یہ شامل نہیں تھا کہ کانتا مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس کی بعض حرکات سے مریم کو خود ہی شبہ ہوا تھا کہ کانتا مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔

''اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا کہ یہ نازک اندام لڑکی اتنی نڈر بھی ہوگی.... سائمن کے محل میں اس نے کس بے خوفی سے چار آدمیوں کی جان لے لی۔''

''وہ اکیلی نہیں ہے جان! اس کے ساتھ ایک بین الاقوامی گینگ ہے جس کا نیٹ ورک دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔''

''لیکن وہ گینگ تم پر اتنا مہربان کیوں ہو گیا؟ کیا تم بھی کسی دہشت گرد تنظیم کے لیے کام کرتے ہو؟ کیا ایف بی آئی کا الزام درست تھا؟'' مریم نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو مریم!'' میں نے کہا۔ ''تم میری تمام مصروفیات سے اچھی طرح واقف ہو۔ ان لوگوں سے تو حادثاتی طور پر ملاقات ہو گئی ہے۔'' پھر میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کانتا سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔

''یہ لوگ تو بہت خطرناک ہیں بابر!'' مریم نے کہا۔

''یہ مت بھولو مریم کہ انہی کی وجہ سے آج تم میرے ساتھ ہو۔''

''اچھا، اب اپنا موڈ تو ٹھیک کرو۔'' مریم نے میرا موڈ خراب دیکھ کر فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

اسی وقت کانتا دستک دے کر کمرے میں آئی اور بولی۔ ''بابر! ہمیں فوراً یہاں سے چیک آؤٹ کرنا ہے۔'' یہ اطلاع دے کر وہ فوراً واپس چلی گئی۔

''مریم! تم چیک آؤٹ کرو، پھر دس منٹ بعد میں بھی آجاؤں گا۔''

اسی وقت کانتا پھر آئی اور بولی۔ ''تم لوگ باہر آؤ گے تو میں تمہیں ہوٹل کے باہر ملوں گی۔'' وہ پھر واپس چلی گئی۔

میں ہوٹل سے باہر نکلا تو کچھ فاصلے پر ایک سیڈان کھڑی تھی۔ اس میں سے ہاتھ ہلا کر کسی نے مجھے اشارہ کیا۔

میں ٹہلنے والے انداز میں سیڈان کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے دیکھ کر سیڈان کا ڈرائیور نیچے اترا اور میرے ہاتھوں سے سوٹ کیس لے کر گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیے۔ مریم اور کانتا پہلے ہی گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھی تھیں۔

میرے بیٹھتے ہی گاڑی تیز رفتاری سے ایک سمت روانہ ہو گئی۔

میں نے ڈرائیور کا جائزہ لیا۔ وہ بھی کوئی ایشیائی ہی تھا اور چہرے سے پاکستان یا بھارت کا باشندہ لگ رہا تھا۔

اس نے کچھ دیر تک گاڑی بلامقصد مختلف جگہوں پر گھمائی، پھر تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے غالباً وہ یہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ کوئی ہماری گاڑی کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد گاڑی چھوٹے سے خوب صورت ون یونٹ بنگلے کے سامنے جا رکی۔ ڈرائیور نے اتر کر گیٹ کھولا اور گاڑی کو اندر لے جانے کے بعد دوبارہ بند کر دیا۔

کانتا نے اپنا سامان اتروایا اور ڈرائیور سے کہا کہ اب تم واپس چلے جاؤ۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ پورچ میں ایک گاڑی پہلے سے موجود تھی۔

ڈرائیور کے جانے کے بعد کانتا نے مین گیٹ بند کیا اور ہم سامان اٹھا کر بنگلے میں داخل ہو گئے۔

''پولیس کو کہیں سے سن گن مل گئی ہے کہ ہم لوگ بلیک برن سے بریڈ فورڈ کی طرف آئے ہیں۔'' کانتا نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے فوری طور پر ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بنگلا...''

''یہ بھی تمہاری ملکیت ہے۔'' میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

میری بات پر کانتا بے ساختہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ''ہاں، یہی سمجھ لو۔''

اچانک ڈور بیل بجنے کی آواز آئی تو میں بُری طرح

چونک اٹھا۔ ”یہ کون آ گیا؟“ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پُرتشویش انداز میں کانتا کی طرف دیکھنے لگا۔

مریم بھی ایک دم پریشان ہوگئی۔

کانتا ہنس کر بولی۔ ”ارے، تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟ پروفیسر بیگ آیا ہے۔ اسے میں نے ہی بلایا تھا۔“ پھر اس نے انٹرکام پر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”پروفیسر بیگ مادام!“ باہر سے کوئی بولا۔

کانتا نے بٹن دبا کر آٹومیٹک لاک کھول دیا۔

اس کے باوجود میری بے چینی کم نہ ہوئی۔

اچانک دروازہ کھلا اور درمیانے قد کا فربہی مائل ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پر بڑے بڑے بال تھے جنہیں اس نے پونی کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ چالیس اور پینتالیس سال کی عمر کا ہنس مکھ آدمی تھا۔

کانتا نے خوش دلی سے کہا۔ ”آیئے پروفیسر صاحب! میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ کیسے ہیں آپ؟“

”میں بالکل پہلے جیسا ہوں مادام۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ان سے ملیں۔“ کانتا نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ”میرے دوست بابر اور یہ ان کی بیگم!“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ پروفیسر ایاز بیگ ہیں۔ یہ نام کے نہیں بلکہ کام کے بھی پروفیسر ہیں۔ ابھی تم ان کا کمال دیکھنا۔“

میرے دل میں تو آیا کہ پوچھوں، کیا ٹوپی میں سے خرگوش برآمد کر لیں گے یا ابھی کھڑے کھڑے خود غائب ہو جائیں گے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی دل آزاری کے خیال سے میں خاموش رہا۔

”پروفیسر! آپ اپنا کام شروع کریں۔“ کانتا نے کہا۔

پروفیسر کے ہاتھ میں بڑا سا ایک بریف کیس بھی تھا۔

کانتا بھی اپنا ایک بیگ اٹھا لائی اور بولی۔ ”کچھ سامان اس میں بھی ہے۔ آیئے، آپ مجھ ہی سے کام شروع کریں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ لوگ اس وقت تک دوسرے بیڈروم میں آرام کریں۔“

”ارے یار، کتنا آرام کریں گے؟“ میں نے کہا۔ ”بلیک برن سے آنے کے بعد آرام ہی تو کر رہے ہیں۔“ میں مریم کے ساتھ ایک بیڈروم میں چلا گیا۔

”بابر! یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اس ملک سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے زمین کی تہ میں سے مجرموں کو نکال لیتے ہیں۔“

”ہم مجرم نہیں ہیں اور دوسری بات یہ کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے کہ سیدھے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”کون ہیں آپ؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”میرا نام انجیلا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اس بنگلے کی مالک ہوں۔ آپ لوگ مجھ ہی سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہوں؟“ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔ ”آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہیں؟“

”وہ... دراصل... ہم کانتا کے مہمان ہیں؟“

”کون کانتا؟“ وہ درشت لہجے میں بولی۔ ”میں کسی کانتا کو نہیں جانتی۔ آپ غیر قانونی طور پر میرے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ میں ابھی پولیس کو ٹیلی فون کرتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ مریم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

وہ عورت اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں بُری طرح چونک اٹھا۔ وہ آواز کانتا کی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے بالوں کا اسٹائل اور رنگ مختلف تھا۔ اس کی آواز مختلف تھی، چہرے کی رنگت میں بھی وہ شادابی نہیں تھی اور چہرے کے نقوش بھی خاصے مختلف تھے۔

”دھوکا کھا گئے نا؟“ کانتا نے مسکرا کر کہا۔ ”یہی پروفیسر بیگ کا کمال ہے۔ اب میرے خیال میں مریم کو ان کے پاس بھیج دو۔“ اس نے مریم کو جانے کا اشارہ کیا۔

مریم کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”یہ پروفیسر تو واقعی باکمال آدمی ہے۔“

”یہ پہلے ممبئی میں تھا، وہاں فلم انڈسٹری میں میک اپ آرٹسٹ تھا۔ پھر یہ بالی ووڈ چلا گیا۔ وہاں اس نے کئی بڑے بڑے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کیا۔ گزشتہ اٹھارہ سال سے پروفیسر یہی کام کر رہا ہے۔ باس نے اس کی فنی مہارت دیکھی تو اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی۔ پروفیسر بھاری معاوضے پر راضی ہو گیا۔“

”لیکن یہ قابلِ اعتبار بھی ہے یا...“

”ہمارے پیشے میں رازداری پہلی شرط ہوتی ہے۔ جو لوگ ہم سے غداری کرتے ہیں، وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہتے۔ یہ بات پروفیسر بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ گزشتہ

پانچ سال سے ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔ آج تک اس کی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔“

”کیا تم یہ کپڑے بھی اپنے ساتھ لائی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں نے آج ہی تو مختلف لباس اور دوسرا سامان خریدا ہے۔“ کانتا نے جواب دیا۔

اچانک کمرے میں ایک سیاہ فام عورت داخل ہوئی۔ اس نے چست جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں اور آنکھوں کا رنگ بھی چہرے کی طرح سیاہ تھا لیکن جسم انتہائی خوب صورت اور سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول اٹھی۔ ”میں کیسی لگ رہی ہوں بابر؟“

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”مریم! یہ... تم ہو؟“

”ہاں لیکن میں کانتا کی طرح اپنی آواز نہیں بدل سکتی۔“ مریم ہنس کر بولی تو اس کی سیاہ رنگت پر سفید سفید دانت عجیب سے لگے۔

اس کے جسم کا ہر حصہ سیاہ تھا یا ممکن ہے صرف چہرہ، گردن اور ہاتھ ہی سیاہ ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھا۔ اس کی جلد واقعی ایسی سیاہ لگ رہی تھی جیسے وہ پیدائشی سیاہ فام ہو۔

میں اس بیڈروم کی طرف بڑھ گیا جہاں پروفیسر بیٹھا تھا۔

”مسٹر بابر! میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی نیگرو بنا دوں۔“ پروفیسر نے کہا۔

”مجھے آپ نیگرو بنائیں یا اطالین، بس کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔“

”اوکے!“ پروفیسر نے کہا پھر مجھے ایک بوتل دے کر بولا۔ ”آپ یہ بوتل لے کر باتھ روم میں چلے جائیں۔ اس میں ایسا لوشن ہے جو آپ کی جلد دس منٹ کے اندر اندر سیاہ کر دے گا۔ اسے آپ اپنے پورے جسم پر لگا لیں۔ بعض اوقات صرف چہرہ، ہاتھ اور جسم کے کھلے حصے سیاہ کرنے سے بھی کام چل جاتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کا میک اپ پرفیکٹ ہو۔“

میں وہ بوتل لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اس بوتل میں شہد کی طرح گاڑھا محلول تھا۔ میں نے اسے اپنے چہرے، گردن، بازوؤں، پیروں، غرض جسم کے ہر حصے پر اچھی طرح مل لیا۔

میں باتھ روم سے نکلا تو مکمل طور پر سیاہ فام تھا۔

پروفیسر نے مجھے اس اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے پہلے میرے براؤن بالوں کو سیاہ کیا پھر کوئی لوشن لے کر میرے بالوں پر لگایا اور سر کی مالش کرنے لگا۔

چند منٹ میں میرے بال بھی نیگروز کی طرح گھنگرالے ہو گئے۔ اس نے مجھے ایک ہائی نیک دی اور جینز پہننے کو کہا۔ اس پر میں نے براؤن کلر کا پرانا سا کوٹ پہن لیا جس کی کہنیوں پر چمڑا لگا ہوا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں سیاہ رنگ کے لینس بھی لگا دیے۔ اب کوئی بھی مجھے بابر خان کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

”اور اگر ہم اس میک اپ کو ختم کرنا چاہیں تو؟“

اس نے ایک اور بوتل نکالی اور بولا۔ ”اس سے آپ کی جلد صاف ہو جائے گی لیکن اسے انتہائی مجبوری کے عالم میں استعمال کیجیے گا کیونکہ اس سے آپ کی جلد میں سوزش بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد دو تین دن تک آپ کو شدید تکلیف بھی محسوس ہو گی۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ آپ آواز بھی کسی حد تک بدل سکتے ہیں۔“

”کوشش کر سکتا ہوں۔“ میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

”ویری گڈ!“ پروفیسر ہنس کر بولا۔ ”اب آپ مادام کے پاس جا سکتے ہیں۔“

”پروفیسر صاحب۔“ میں نے ہنس کر بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک بات بتایئے، آپ کا چہرہ اصلی ہے یا آپ نے بھی کوئی میک اپ کر رکھا ہے؟“

”اس وقت تو میں اسی چہرے کے ساتھ ہوں جیسا اللہ نے مجھے بنایا ہے۔“ پروفیسر ہنس کر بولا اور ایک مرتبہ پھر مجھے ان لوشنز کے بارے میں بتانے لگا۔

میں وہاں سے باہر نکل کر مریم کے پاس پہنچا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

”اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟“ میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم کیا سمجھتی تھیں کہ جیکسن اتنا بے بس ہے؟“

”مذاق چھوڑو بابر!“ مریم نے کہا۔ ”میں تو...“

”بابر!“ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کہاں ہے بابر؟ اگر وہ مجھے مل جائے تو پہلے تو میں...“

”بکواس بند کرو۔“ مریم نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ”مجھ پر تو پہلے ہی چار آدمی کے قتل کا الزام ہے۔ تمہیں قتل

کر کے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹالیا۔

''ارے... رے... فائر مت کرنا۔'' میں گھبرا کر اپنی اصل آواز میں بولا۔

مریم اور کانتا بے اختیار ہنسنے لگیں۔ ان دونوں کے چہرے میک اپ کی وجہ سے اتنے دلکش نہیں رہے تھے لیکن آواز میں اب بھی نغمگی تھی۔

''تمہارے پاس یہ ریوالور کہاں سے آیا؟'' میں نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔ ان دونوں کے ہنسنے پر مجھے غصہ آگیا تھا۔

''تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میں بے وقوف بن جاؤں گی؟'' مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ ریوالور تو مجھے کانتا نے دیا ہے۔''

دروازے پر دستک دے کر پروفیسر بیگ اندر آگیا۔

''مادام! اب مجھے اجازت دیں۔ میں نے میک اپ کے بارے میں بابر صاحب کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔''

''اوکے پروفیسر!'' کانتا نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

پروفیسر اپنا بریف کیس اٹھا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''اب تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کرو۔'' کانتا نے کہا۔

''ہمیں کیا تیاری کرنا ہے؟'' مریم نے جواب دیا۔ ''چلو، ہم تیار ہیں۔''

''ہم یہاں سے پورٹ ساؤشل جائیں گے۔ وہاں سے ایک مال بردار بحری جہاز میں یہاں سے نکل جائیں گے۔''

ہم نے سوٹ کیس وہیں چھوڑے اور اپنا سامان بڑے بڑے تین سفری بیگ میں بھرلیا۔ ایسے بیگ عموماً سیاح اپنی پشت پر لادے پھرتے ہیں۔

میں نے مریم کا بیگ جان بوجھ کر ہلکا رکھا تھا۔ وہ اتنی مشقت کی عادی نہیں تھی۔ ہمارے پاس صرف تین ریوالور اور ان کے فاضل راؤنڈز تھے۔ یہ ریوالور بھی غالباً کانتا نے بریڈفورڈ آنے کے بعد ہی حاصل کیے تھے۔

ہم اپنے بیگ اٹھا کر باہر نکل گئے۔ بنگلے کے پورچ میں ایک گاڑی کھڑی تھی لیکن کانتا نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ باہر بھی کوئی گاڑی ہو گی لیکن باہر بھی کوئی گاڑی نہیں تھی۔

''ہمیں یہاں سے کچھ دور پیدل چلنا پڑے گا۔'' کانتا نے کہا۔

پھر ہم لوگ پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گئے۔ کانتا ہم سے کچھ فاصلے پر چل رہی تھی۔ میں مریم کے ساتھ تھا۔

پانچ منٹ بعد ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ وہیں سڑک کے کنارے ڈاٹسن کی ڈبل کیبن پک اپ کھڑی تھی۔

کانتا اس پک اپ کی طرف بڑھ گئی۔ پک اپ میں ڈرائیور بھی موجود تھا۔ وہ کانتا کو دیکھ کر پھرتی سے نیچے اتر آیا اور اس کا بیگ لے لیا۔ پھر وہ میری طرف بڑھا اور میرے دونوں بیگ بھی لے لیے۔ وہ پک اپ کے پچھلے حصے میں بیگ رکھ کر واپس آیا تو کانتا نے کہا۔ ''ہمیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں میڈم!'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ بالکل صحیح وقت پر آئی ہیں۔ آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ اس کے پچھلے حصے میں پانی، کافی اور سینڈوچز بھی ہیں۔''

کانتا نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر پہلے مریم کو بٹھایا، پھر دوسری سمت کے دروازے سے خود بیٹھی۔ ہم نے کافی اور سینڈوچز کھائے، پھر کانتا روانگی کے لیے تیار ہو گئی۔

میں نے ڈرائیور کو غور سے دیکھا تو مجھے اس کے جسم پر مخصوص یونیفارم دکھائی دی۔ مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ یونیفارم کس ادارے کی ہے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے ایک سمت روانہ ہو گئی۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ڈرائیور کا تعلق کس ملک سے ہے۔

گاڑی مسلسل ڈیڑھ گھنٹے سے محوِ سفر تھی۔ اب مجھے فضا میں سمندر کی مخصوص بو، نم ہوا اور مچھلیوں کی بساند محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی بو جو بندرگاہ کے نزدیک پہنچنے پر آتی ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور نیچے اتر گیا۔ میں بھی بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا اس لیے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے میں بھی نیچے اتر گیا۔

''میڈم!'' ڈرائیور نے کہا۔ ''آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہو تو مجھے دے دیں۔ ہم ہاربر کی حدود میں داخل ہونے والے ہیں۔ کوئی اس گاڑی کی تلاشی تو نہیں لے گا لیکن بعض اوقات کوئی نیا آدمی ڈیوٹی پر ہو تو تلاشی لے بھی لیتا ہے۔''

کانتا نے اپنا اور مریم کا ریوالور اس کے حوالے کر دیا۔ میں نے بھی اپنا ریوالور نکال کر اسے دے دیا۔

ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ ہٹائی تو مجھے اس کے نیچے ایک خفیہ خانہ دکھائی دیا۔ اس نے ہمارے ریوالورز اور ان کے فالتو راؤنڈز ایک کپڑے میں باندھ کر خفیہ خانے میں رکھے اور اس پر دوبارہ سیٹ جما دی۔

میں نے سوچا، اس گاڑی کی تلاشی کیوں نہیں ہوتی؟ پھر میں نے پہلی دفعہ غور سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت تو میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے بونٹ پر کسی ادارے کا مخصوص مونوگرام تھا۔

میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کانتا نے کچھ بتایا نہیں تھا اور ڈرائیور سے کچھ پوچھنا فضول تھا۔ میں نے سوچا، اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئی۔ دس منٹ بعد وہ ایک چیک پوسٹ پر پہنچی۔ وہاں رکاوٹ لگی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی وہاں روکی تو چیک پوسٹ سے نکل کر ایک شخص باہر آیا اور ڈرائیور کو دیکھ کر بولا۔ ''ہیلو جان! کیا حال ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔''

''ہمارے کیا حال چال۔'' گارڈ نے کہا۔ ''وہی روزانہ کا کام۔'' پھر اس نے چیک پوسٹ کی طرف رخ کر کے کسی کو اشارہ کیا اور سڑک پر لگا ہوا بیریئر فوراً اوپر کی طرف اٹھ گیا۔

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اب بھی خاموش رہا۔ آگے جا کر ہمیں ایک دوسری چیک پوسٹ پر رکنا پڑا۔ وہاں رکاوٹ کے لیے بڑے بڑے آہنی دروازے تھے۔

وہاں کا گارڈ بھی زیادہ چاق و چوبند اور اکھڑ مزاج تھا۔

''کہاں جا رہے ہو جان؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کہاں جا سکتا ہوں؟'' جان نے بھی سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''یہ لوگ کون ہیں؟''

''یہ مسٹر کارٹر کے مہمان ہیں۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''گاڑی میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے نا؟'' سنتری نے پہلی دفعہ مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں، کچھ گولہ بارود اور آتش گیر مادہ ہے۔'' ڈرائیور بھی مسکرایا۔ ''تم خود ہی تلاش کر کے نکال لو۔''

''تم تو خوب بولنا سیکھ گئے ہو۔'' گارڈ نے کہا اور ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا۔

''یہ مسٹر کارٹر کون ہیں؟'' میں نے سوچا۔

میں نے ڈرائیور سے یہ سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پھر دس منٹ تک ہماری گاڑی جیٹی پر دوڑتی رہی۔ آخر اس سفر کا بھی اختتام ہوا۔

ہم لوگ وہاں اتر گئے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر بڑا سا ایک بحری جہاز کھڑا تھا۔

کانتا نے کہا۔ ''ہمیں اس جہاز پر جانا ہے۔''

میں نے سامان اٹھانے کی کوشش کی تو کانتا نے کہا۔ ''تم سامان کی فکر مت کرو۔ ہمارا سامان جہاز پر پہنچا دیا جائے گا۔''

جیٹی سے جہاز خاصے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے رسے کی ایک سیڑھی لگی تھی۔ اس پر چلنا بھی ایک مسئلہ تھا کیونکہ اس میں اچھی خاصی لچک تھی۔ مریم کے لیے تو اس رسے کی سیڑھی پر چڑھنا بہت ہی مشکل تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تم پشت سے میری جیکٹ مضبوطی سے پکڑ لو۔'' یہ کہہ کر میں نے اس پر قدم رکھ دیا۔

رسے کی وہ سیڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔ میں نے بہت مشکل سے اپنا توازن برقرار رکھا۔ مریم کی وجہ سے بار بار میرا توازن بگڑتا تھا۔ بالآخر ہم جہاز پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے کانتا اور جان بھی آ گئے۔

مسٹر کارٹر درمیانی عمر کا صحت مند امریکن تھا۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ چہرے کے نقوش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق امریکا سے ہے۔

اس نے پرتپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ کانتا نے اس سے ہمارا تعارف کرایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''مسٹر بابر! آپ نے میک اپ بہت غضب کا کیا ہے۔ میں تو میڈم کانتا کو بھی پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا۔''

''مسٹر کارٹر! یہ میرا نہیں بلکہ کانتا کے ایک دوست کا کمال ہے۔''

''سر! مجھے اجازت دیں۔'' جان نے کہا۔

''آپ کا بہت شکریہ مسٹر جان!'' میں نے انگلش میں کہا۔

''شکریہ کس بات کا؟'' جان نے شستہ اردو میں کہا۔ ''میں اس کام کا معاوضہ لیتا ہوں، اللہ حافظ۔''

''آپ مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''لیکن آپ کا نام...''

''میرا نام جان محمد ہے۔'' وہ مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر

رخصت ہو گیا۔

"آپ لوگ آرام کریں۔ میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔" کارٹر نے کہا اور روانہ ہو گیا۔

کانتا ہمیں ایک آرام دہ کیبن میں لے گئی اور بولی۔ "ہمیں کچھ دیر یہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ ہمیں اسی بحری جہاز سے سفر کرنا ہے۔"

"ہمیں ابھی ایک دوسرے بحری جہاز پر جانا ہے۔"

جہاز کا ایک ملازم لڑکا ہمارے لیے کافی، سینڈوچز، بسکٹ اور چکن بروسٹ وغیرہ لے کر آ گیا۔ کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ہم نے گزشتہ کئی گھنٹوں سے سوائے ایک سینڈوچ اور کافی کے کچھ بھی نہیں کھایا پیا ہے۔

کھانے کا سامان اتنا تھا کہ ہم تینوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اس کے بعد کافی نے تو گویا ایک نشہ سا طاری کر دیا۔

کیبن کافی آرام دہ تھا۔ مریم دیوار میں فکس بیڈ پر لیٹی تو اسے نیند آ گئی۔ میں نے اسے سونے دیا۔ وہ بے چاری یوں بھی بہت ہلکان ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت میک اپ کی وجہ سے سیاہ تھی لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے میں عجیب سی کشش تھی اور وہ سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہی تھی۔

میں نے آہستگی سے کیبن کا دروازہ بند کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ چھوٹا سا ایک کوریڈور تھا۔ اس کے سامنے جہاز کا وسیع و عریض عرشہ تھا۔ وہاں مجھے کانتا نظر آئی۔ وہ عرشے پر کھڑی خلا میں تک رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ تیز ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

وہ اپنی سوچ میں اتنی محو تھی کہ اسے میرے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ "کانتا!"

وہ بری طرح چونک اٹھی اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب ویرانی دکھائی دی۔

"کیا سوچ رہی ہو کانتا؟" میں نے کہا۔

"اب سے کچھ دن بعد ہمارا ساتھ ختم ہو جائے گا۔" کانتا نے افسردگی سے کہا۔ "اس کے بعد تو شاید تم مجھ سے ملنا بھی گوارا نہیں کرو گے۔"

"تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "تم نے نہ صرف میری بلکہ مریم کی بھی جان بچائی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے محسنوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں بابر!" کانتا نے کہا۔ "تم ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ تم تو مجھ جیسی جرائم پیشہ لڑکی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے۔"

اسی وقت جہاز کا ملازم لڑکا آیا اور بولا۔ "میڈم! کارٹر صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

ہم وہاں سے کارٹر کے کیبن میں پہنچے تو وہ پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "مسٹر بابر! آپ کو ابھی اور اسی وقت روانہ ہونا ہے۔ آپ یہاں شدید خطرے میں ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کس خطرے کی بات کر رہے ہیں؟"

"آپ کی مسز کے باپ اسٹیفر ڈ اور جیکسن میں صلح ہو گئی ہے۔ جیکسن نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایک جوڑے نے بلیک برن میں اس کے دوست سائمن کے گھر پر حملہ کر کے نہ صرف اس کے چار آدمیوں کو ہلاک کر دیا بلکہ وہ مسٹر اسٹیفر ڈ کی بیٹی کلارا کو بھی اغوا کر کے لے گئے۔ کلارا سیر و تفریح کی غرض سے لندن گئی تھی اور اس کے ایک دوست سائمن کے گھر میں مقیم تھی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ "لیکن اسٹیفر ڈ نے تو اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی۔" میں نے کہا۔

"اس نے وہ رپورٹ واپس لے لی ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا ہے کہ میری بیٹی کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی تھی۔ وہ جیکسن کے گھر اکثر جاتی رہتی تھی۔ جیکسن میرا بہت بہترین دوست ہے۔ اس نے کلارا کو سمجھا بجھا کر میرے پاس واپس بھیجنے کی کوشش کی لیکن کلارا اس وقت شدید غصے میں تھی۔ اس نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا۔ جیکسن نے اسے سیر و تفریح کے لیے بلیک برن بھیج دیا۔ وہاں سے وہ کچھ دن بعد سوئٹزرلینڈ جانے والی تھی۔"

"اس نے کلارا کی شادی کا ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں، کسی بھی اخبار میں اس کی شادی کا تذکرہ نہیں ہے۔" کارٹر نے کہا۔ "امریکی حکومت نے برطانوی حکومت سے درخواست کی ہے کہ کلارا کو بازیاب کرائے۔ اسٹیفر نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ کلارا کو ایک پاکستانی نوجوان بابر خان نے اغوا کیا ہے۔ یہ بابر خان وہی نوجوان ہے جسے ایف بی آئی نے چند ماہ قبل دہشت گردی کے شبہے میں گرفتار کیا تھا لیکن ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے رہا کر دیا تھا۔"

مارے غصے کے میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے دانت

پیس کر کہا۔ "یہ کیا قانون کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں؟ میں ان خبیثوں کو دیکھ لوں گا۔"

"تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے مسٹر بابر! جیکسن سینیٹر ہے اور اسٹیفر ڈ کے تعلقات اس کے علاوہ دوسرے سینیٹرز اور اعلیٰ حکام سے ہیں۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "تمہیں ابھی ایک گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔"

میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا جو بیٹری لو ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو مریم جاگ چکی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور بولی۔ "کہاں چلے گئے تھے بابر؟"

"میں تو یہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "تم سو گئی تھیں اس لیے کچھ دیر کے لیے عرشے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔"

ہمارے بیگ بھی اسی کیبن میں پہنچا دیے گئے تھے۔ میں نے اپنے بیگ سے چارجر نکالا اور سیل فون چارجنگ پر لگا دیا۔

دس منٹ میں وہ اتنا چارج ہو گیا کہ میں اسے استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے مریم سے کہا۔ "تم آرام کرو، میں ایک دو ضروری کالز کر کے آتا ہوں۔"

میں ایک مرتبہ پھر عرشے پر آ گیا اور کیپٹن رالف کا نمبر ملایا۔

اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ "بابر! کہاں ہو تم؟"

"میں اس وقت آسٹریلیا میں ہوں۔"

"تم فوراً یہاں پہنچو، بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"وہی خبریں سن کر تو میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے خدشہ ہے کہ کیلی فورنیا پہنچتے ہی مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"کس الزام میں؟" کیپٹن رالف نے پوچھا۔ "کلارا کے اغوا کے الزام میں؟"

"ہاں، حالات تو کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"کلارا... سوری مریم تمہاری قانونی بیوی ہے۔ تم نے امریکی قانون کے مطابق اس سے شادی کی ہے۔ پھر تم نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کرائی ہے۔ یہ سب باتیں ریکارڈ پر ہیں۔ تم فوراً کیلی فورنیا پہنچو، چاہو تو پیٹرسن سے بھی مشورہ کر لو۔"

"او کے۔" میں نے کہا۔ "میں اس سے بات کر کے تمہیں ٹیلی فون کرتا ہوں۔"

میں نے سلسلہ منقطع کر کے پیٹرسن کا نمبر ملایا۔ لائن ملتے ہی اس کی آواز آئی۔ "مسٹر بابر! تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں اور اس وقت آسٹریلیا میں ہوں۔ کیپٹن رالف نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں فوراً واپس آ جاؤں۔"

"میں بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا۔"

"لیکن اسٹیفر ڈ اور جیکسن... ان دونوں نے مجھ پر اغوا کا الزام لگایا ہے اور اب تو وہ لوگ چار آدمیوں کا قتل بھی میرے کھاتے میں ڈال دیں گے۔"

"انہیں خواب دیکھنے دو۔" پیٹرسن نے کہا۔ "کس کی مجال ہے کہ تمہیں گرفتار کر سکے۔ جیکسن کو تو یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ کلارا واقعی بلیک برن میں تھی۔ میں اور کیپٹن رالف نے کلارا (مریم) کی گمشدگی سے لے کر اس کے اغوا ہونے تک ہر ائرلائن کا ریکارڈ چیک کر لیا ہے، امیگریشن آفس سے بھی معلوم کر لیا ہے۔ کلارا یا مریم کیلی فورنیا یا کسی بھی امریکی ریاست سے لندن یا بلیک برن نہیں گئی۔ پہلے تو جیکسن کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ کلارا اس کے پاس تھی۔ اگر اس کے پاس تھی تو اس نے اسٹیفر ڈ کو اطلاع کیوں نہیں دی۔ گمشدگی کی خبریں اخبارات میں بھی آئی تھیں اور ٹی وی چینلز پر بھی۔ اس کے باوجود جیکسن نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی کہ کلارا اس کے پاس ہے پھر اس نے کلارا کو بلیک برن کیوں بھجوایا؟ اور اگر بھجوایا تو کب اور کیسے بھجوایا؟ اس کا پاسپورٹ بھی یقیناً تمہارے پاس ہو گا اور ظاہر ہے کہ اس پر نہ برطانیہ کا ویزا ہو گا، نہ برطانوی امیگریشن کے ریکارڈ میں اس کی کوئی انٹری ہو گی۔ تم بے فکر ہو کر آؤ مسٹر بابر! اس کے باوجود میں احتیاطاً تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کرا لوں گا۔ بس تم فوراً کیلی فورنیا پہنچو... گڈ لک۔"

صورتِ حال اچانک بدل گئی تھی۔ میں نے فوری طور پر امریکا واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو بابر؟" کانتا نے کہا، میں اسے ساری صورتِ حال بتا چکا تھا۔ "تم خود دوبارہ موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو؟"

"مجھے کچھ نہیں ہو گا کانتا!" میں نے کہا۔ "میں امریکی شہری ہوں اور امریکا کا قانون ابھی اتنا بے بس نہیں ہے کہ وہ جیکسن اور اسٹیفر ڈ جیسے جھوٹے لوگوں کی بے سروپا کہانی پر یقین کر لے۔"

"تم نے تو واقعی واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔" کانتا نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں؟"

''کانتا! میں نے بہت غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم نے مریم سے بھی بات کرلی ہے؟'' کانتا نے پوچھا۔

''مریم میرے فیصلے کی مخالفت نہیں کرے گی۔ تم خود سوچو، ہم لوگ اگر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ بھی جاتے تو کیا اسٹینفرڈ اور جیکسن ہمیں وہاں چین سے رہنے دیتے؟ ہم ساری زندگی خوف کے سائے میں گزارتے۔ تم سے بس ایک ہی درخواست ہے کہ...''

''بابر پلیز!'' کانتا نے کہا۔ ''ایسی غیروں والی باتیں مت کرو۔ پھر مجھے تو خان نے یہ حکم دیا ہے کہ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں۔ بتاؤ، اب کیا چاہتے ہو؟''

''کیا تم کسی طرح مریم کو دوبارہ امریکا پہنچا سکتی ہو؟''

''بس اتنی سی بات؟'' کانتا نے کہا۔ ''ہم ابھی یہاں سے دبئی کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ تم تو قانونی طور پر لندن آئے تھے۔ آسانی سے دبئی پہنچ جاؤ گے۔ میں مریم کو بحری جہاز کے ذریعے دبئی لے جاؤں گی۔ وہاں اس کا پاسپورٹ بھی بن جائے گا اور دیگر قانونی کاغذات بھی۔''

''لیکن وہ کاغذات کسی فرضی نام سے بنوانا۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ مریم تو امریکا سے باہر ہی نہیں نکلی، پھر بلیک برن کیسے پہنچ گئی؟''

''گڈ آئیڈیا!'' کانتا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''پھر میں مریم کو اسی گیٹ اپ میں دبئی سے امریکا لے آؤں گی۔''

''کیا یہ کام بریڈ فورڈ یا لندن میں نہیں ہو سکتا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو تو سکتا ہے۔'' کانتا نے جواب دیا۔ ''لیکن امریکی حکومت کی وجہ سے برطانیہ کے سیکیورٹی ادارے اور پولیس بہت الرٹ ہو گی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے سائمن کے گھر سے انگلیوں کے نشانات ضرور اٹھائے ہوں گے۔ ہم لوگوں نے تو دستانے پہن رکھے تھے لیکن مریم کی انگلیوں کے نشانات تو ہوں گے پھر خوامخواہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم بحری جہاز کے ذریعے بہت آسانی سے دبئی پہنچ جائیں گے۔ ہاں، اس میں وقت کچھ زیادہ لگ جائے گا۔''

''خطرہ تو میرے لیے بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سائمن نے پولیس کو میرا حلیہ ضرور بتایا ہوگا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' کانتا نے کہا۔ ''تم بابر خان ہو اور لندن کے ہوٹل میں مقیم تھے۔ ہوٹل کی رسیدیں میں کل ہی منگوا لوں گی۔''

''لیکن تم تو آج ہی دبئی جا رہی ہو؟''

''میں دبئی جا رہی ہوں لیکن یہاں ہمارے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو مسٹر کارٹر ہی ہیں۔ وہ نہ صرف تمہیں لندن تک پہنچا بھی دیں گے بلکہ ہوٹل میں قیام کی رسیدیں بھی مہیا کر دیں گے۔''

''تم مسٹر کارٹر سے بات کرلو۔ میں اس وقت تک مریم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے مریم کو پوری بات تفصیل سے بتائی تو وہ حیرت انگیز طور پر بلا حیل و حجت راضی ہو گئی اور بولی۔ ''میں خود بھی یہی سوچتی تھی بابر کہ ہم پاکستان جا کر بھی ہمیشہ پریشانیوں میں گھرے رہیں گے۔ ہم قانونی طور پر پاکستان جائیں گے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہو گی۔ کیپٹن رالف اور پیٹرسن نے بہت مناسب مشورہ دیا ہے۔ ٹھیک ہے، میں فی الحال دبئی چلی جاتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کانتا مجھے وہاں سے بہ حفاظت امریکا پہنچا دے گی۔''

''تم اس وقت تک خود کو ظاہر نہیں کرو گی جب تک میری طرف سے تمہیں گرین سگنل نہ ملے۔'' میں نے کہا۔

''میں اب تک تمہارے ہی گرین اور ریڈ سگنلز پر چل رہی ہوں۔'' مریم مسکرائی اور بے اختیار میرے سینے سے لگ گئی۔

میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے پوری قوت سے بھینچ لیا۔

پھر ہمیں ہوش اس وقت آیا جب کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازے پر کانتا کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مریم سے کہو کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر تیار ہو جائے۔ مسٹر کارٹر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ باہر ہی سے واپس چلی گئی۔

مریم کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی اور اس کا میک اپ زدہ سیاہ چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ خوب صورتی کا تعلق سفید یا سیاہ رنگت سے نہیں ہوتا بلکہ یہ تو انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔

مریم مسکراتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں سے تیار ہو کر نکلی تو ایک مرتبہ پھر میرے گلے کا ہار بن گئی۔

میں مریم کے ساتھ اس جہاز تک گیا جس کے ذریعے اسے سفر کرنا تھا۔ میں نے پروفیسر بیگ کے دیے ہوئے تمام لوشن اس کے حوالے کر دیے تھے۔ میں نے تھوڑا سا وہ لوشن لیا تھا جو میک اپ ختم کرنے کے کام آتا۔ اس بحری جہاز تک

ہمیں کارٹر ہی لے گیا۔

پھر میں کارٹر کے ساتھ واپس آ گیا۔ اب مجھے ہر شے اداس اور ویران لگ رہی تھی۔ وہی بحری جہاز تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے رنگ و نور میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا، اب وہاں وحشت و ویرانی کا راج تھا... کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے جانے سے، سب موسم ہیں دل کھلنے اور دل مرجھانے سے۔

میں نے کارٹر کو بتا دیا تھا کہ میں اپنا میک اپ ختم کر رہا ہوں کیونکہ میں اپنے اصل روپ میں لندن سے دبئی جانا چاہتا تھا۔

میں نے وہ لوشن پہلے احتیاطاً چہرے، ہاتھوں اور جسم کے ان حصوں پر لگایا جو عموماً کھلے رہتے ہیں، اس خیال سے کہ لوشن کم نہ پڑ جائے۔

لوشن لگاتے ہی میرے چہرے، گردن، ہاتھوں اور پیروں میں اتنی شدید سوزش ہوئی، گویا میں نے اپنے جسم پر تیزاب مل لیا ہو۔ تکلیف کی شدت سے میں پسینے پسینے ہو گیا۔ میں نے بقیہ جسم پر لوشن لگانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

مجھے شدید قسم کی اس اذیت سے آدھے گھنٹے تک گزرنا پڑا۔ پھر آہستہ آہستہ تکلیف کی شدت میں کمی واقع ہونے لگی لیکن سوزش پوری ختم نہیں ہوئی۔

میں نے باتھ روم کے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ یہی حال میرے ہاتھوں اور پیروں کا تھا۔ پروفیسر بیگ نے کہا تھا کہ دو گھنٹے میں سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ میں نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے پھر مجھے بالوں کا خیال آیا۔ میں نے اپنے سر پر تو وہ لوشن استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے اس لوشن سے سر کی اچھی طرح مالش کی تو ایک بار پھر مجھے اسی اذیت سے گزرنا پڑا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے سر میں بے شمار سوئیاں چبھو رہا ہو۔

تکلیف کچھ کم ہوئی تو میں نے شیمپو سے اچھی طرح سر دھویا اور دیر تک نہاتا رہا۔

اب باتھ روم کے آئینے میں مجھے وہی بابر خان نظر آ رہا تھا جو امریکا سے بلیک برن آیا تھا۔

کارٹر بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''مسٹر بابر! آپ تو بہت ہینڈسم ہیں۔ اگر میں لڑکی ہوتا تو پہلی ہی نظر میں آپ پر عاشق ہو جاتا۔''

''شکر ہے کہ آپ لڑکی نہیں ہیں ورنہ مجھے ایک دو دن مزید یہاں رکنا پڑ جاتا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

کارٹر بھی بے ساختہ ہنسنے لگا۔

دوسرے دن ہم وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے لندن پہنچے اور کارٹر نے شیرٹن ہی میں قیام کیا۔ شام تک اس نے مجھے اسی تاریخ سے ہوٹل کی رسیدیں دے دیں جس دن میں لندن پہنچا تھا۔

اس نے دوسرے دن برٹش ائرویز کے طیارے میں دبئی کے لیے میری نشست بھی کنفرم کرا دی اور دبئی کے لیے پاسپورٹ پر ویزا بھی لگوا دیا۔

☆☆☆

میں بغیر کسی پریشانی کے دبئی پہنچ گیا۔ اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا۔ میں نے سیل فون پر مریم کو بتا دیا تھا کہ میں دبئی کے ہوٹل تاج پیلس میں مقیم ہوں۔ کانتا اور کارٹر نے میرے انکار کے باوجود مجھے اچھی خاصی رقم دے دی تھی۔ مجھے اس رقم کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ میرے پاس کریڈٹ کارڈز موجود تھے۔

میں نے ہوٹل کے رینٹ اے کار سے ایک گاڑی لے لی تھی اور دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا۔

اس دن میں ہوٹل واپس پہنچا تو میرا دل چاہا کہ بابا سے بات کروں۔ دل تو اس سے پہلے بھی چاہتا رہا تھا لیکن میں مریم کی بازیابی تک ان سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اپنے اغوا، پولیس اور کورٹ کے چکر میں مجھے بابا سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے بابا کا سیل نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ اچانک دوسری طرف سے بابا کی آواز آئی۔ ''تو کہاں ہے بابر؟''

''السلام علیکم بابا!'' میں نے کہا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں لیکن تو کیسا ہے بیٹا؟'' بابا نے پوچھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں بابا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اماں اور مہوش کیسی ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں لیکن مجھے تیری فکر ہے۔ میں نے ٹی وی چینلز پر تیرے بارے میں بہت تشویش ناک خبریں سنی ہیں۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ آج کل میڈیا کتنا برق رفتار ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود تو مجھ سے اپنے حالات چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں کل کی فلائٹ سے کیلی فورنیا پہنچ رہا ہوں۔''

''بابا! میں کیلی فورنیا میں نہیں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں اس وقت دبئی میں ہوں۔''

''دبئی میں کیا کر رہا ہے؟'' بابا نے پوچھا۔
''دبئی ایک ضروری کام سے آیا تھا بابا! دو چار دن میں لوٹ جاؤں گا پھر انشاءاللہ مریم کو لے کر پاکستان آؤں گا۔''
''تو واقعی دبئی میں ہے؟'' بابا نے پوچھا۔
''جی بابا!'' میں نے کہا۔ ''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟''
''اچھا ٹھیک ہے، پھر میں کل صبح دبئی آجاتا ہوں۔'' بابا نے کہا۔ ''تو بتا، وہاں کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟''
مریم بھی ایک دو دن میں وہیں آنے والی تھی۔ بابا اسے اس حلیے میں دیکھتے تو نہ جانے کیا سمجھتے۔ میں نے انہیں روکنے کے لیے کہا۔ ''بابا! آپ فضول میں زحمت کریں گے۔ میں انشاءاللہ اسی مہینے پاکستان آنے کی کوشش کروں گا۔''
''میری زحمت کو چھوڑ۔'' بابا نے کہا۔ ''یا پھر مجھے صاف صاف بتا کہ تو کہاں ہے؟''
''بابا! آپ یقین کیوں نہیں کرتے؟ میں واقعی دبئی میں ہوں۔ میں یہاں ہوٹل ہلٹن میں ٹھہرا ہوا ہوں، آپ کس وقت آئیں گے؟ میں آپ کو ائرپورٹ سے لے لوں گا۔''
''تو میری فکر چھوڑ، میں پہنچ جاؤں گا۔'' بابا نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ واقعی غصے میں تھے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات کی تھی، نہ یوں اچانک فون بند کیا تھا۔
میں نے وہیں سے ہلٹن ہوٹل کا نمبر ملایا اور ان سے ایک ڈبل روم بک کرنے کو کہا۔
''سوری سر!'' کلرک نے کہا۔ ''اس وقت ہوٹل میں کوئی بھی ڈبل روم خالی نہیں ہے۔ ہاں، سنگل روم مل سکتا ہے۔''
میں نے سنگل روم ہی بک کرا لیا اور وہاں سے سیدھا ہلٹن ہوٹل پہنچ گیا۔
میں نے استقبالیہ کلرک کو اپنا نام بتایا تو وہ مسکرا کر بولی۔ ''سر! آپ کے لیے کمرا نمبر پانچ سو سات بک ہو چکا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''آپ کو شاید ڈبل روم کی ضرورت تھی؟''
''ضرورت تو تھی لیکن...''
''سر! آپ کو ڈبل روم مل سکتا ہے۔ ابھی ابھی ایک کمرا خالی ہوا ہے۔''
''تو پھر وہی بک کر دیں۔'' میں نے کہا۔
استقبالیہ کلرک نے ایک رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا اور بولی۔ ''سر پلیز! اس میں اپنا نام وغیرہ لکھ دیں۔''
میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں ضروری اندراجات کیے اور اس سے کمرے کا نمبر پوچھا۔
''روم نمبر سکس او ون!'' اس نے مسکرا کر کہا۔
میں نے کمرا نمبر چھ سو ایک کی چابی لی۔ کمرے کی تین دن کی پیشگی ادائیگی کی اور لفٹ کے ذریعے اوپر چلا گیا۔ ہوٹل کا ایک روم سروس بوائے بھی میرے ساتھ تھا۔ کمرے میں اس وقت ہوٹل کا عملہ صفائی میں مصروف تھا۔ میں نے چابی دوبارہ استقبالیہ پر دی اور باہر نکل آیا۔ میں عجیب صورتِ حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مریم اور کانتا بھی ایک آدھ روز میں پہنچنے والی تھیں اور کل صبح کی فلائٹ سے بابا بھی آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب کانتا آئے گی تو میری غیر موجودگی کی صورت میں وہ مجھ سے سیل فون پر رابطہ کرے گی۔ میں نے اس دوران میں اپنے لیے، مریم کے لیے اور کانتا کے لیے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔ اس کے لیے مجھے دو سوٹ کیس خریدنا پڑے تھے۔ میں نے اپنی ضرورت کا سامان اور کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھے۔ اس میں اپنے بیگ کا تمام سامان منتقل کیا اور اپنی دستاویزات، پاسپورٹ، ڈرائیونگ لائسنس، مریم کا پاسپورٹ اور اس کی تمام اسناد ایک بریف کیس میں رکھیں جو میں نے یہیں سے خریدا تھا۔ پھر میں بقیہ سامان تاج پیلس کے اسی کمرے میں رکھ کر ہلٹن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پورٹر نے میرا سامان اٹھا لیا۔ ہوٹل کا ایک ملازم میری طرف بڑھا اور بولا۔ ''سر! گاڑی کی چابی مجھے دے دیں تاکہ میں اسے پارک کر دوں۔''
میں نے اسے چابی دی اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میں نے کمرے کی چابی لیتے ہوئے استقبالیہ کلرک سے کہا۔ ''کل صبح میرے والد یہاں آ رہے ہیں۔ انہیں میرے کمرے میں بھیج دیجیے گا۔ وہ میرے ساتھ ہی قیام کریں گے۔''
میں کمرے میں آیا تو ہوٹل کے عملے نے اس کی صفائی کر دی تھی۔ اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر مریم کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ میں نے بٹن دبا کر جلدی سے کال ریسیو کر لی۔ ''ہاں مریم!''
''ہم لوگ دبئی پہنچ چکے ہیں۔'' مریم نے کہا۔ ''تم وہیں تاج پیلس میں ہو نا؟''
''ہاں، میں نے مسز کانتا شرما کے نام سے تاج پیلس میں ایک ڈبل روم بک کرا دیا ہے۔ تم لوگ وہیں پہنچ جانا۔''
''کانتا شرما؟'' مریم نے پوچھا۔

''ہاں، کانتا کو بھی بتا دو۔ کمرا اسی نام سے بک ہے۔''
سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں نے روم سروس سے کافی منگوائی اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر شاید میری آنکھ لگ گئی تھی یا پھر نیم بیداری کے عالم میں تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔
میں نے اٹھتے ہوئے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس میں سوا آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں ڈیڑھ گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔
میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''
''روم سروس سر!'' باہر سے آواز آئی۔
میں نے سوچا کہ روم سروس والوں کو اس وقت یہاں کس نے بلایا ہے؟
اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کانتا کا نام دیکھ کر میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔
میری آواز سنتے ہی کانتا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بابر! تم اس وقت کہاں ہو؟ ہم لوگ یہاں پہنچ چکے ہیں، تم اپنے کمرے میں تو نہیں ہو؟''
''میں ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔''
''تم ہو کہاں بابر؟'' کانتا نے پوچھا۔ ''تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔''
''میری زندگی خطرے میں ہے؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ ''لیکن اب مجھے کیا خطرہ ہے؟''
''خطرہ ہے بابر!'' کانتا نے کہا۔ ''امریکا کی ایک بدنامِ زمانہ پرائیویٹ جاسوس ایجنسی نے سراغ لگا لیا ہے کہ تم اس وقت دبئی میں ہو اور...''
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی لیکن یہ دستک کسی بھی طور شریفانہ نہیں تھی۔ میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کون ہے بھئی؟''
''روم سروس سر!''
کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کے ملازمین اتنے بدتہذیب نہیں ہوتے کہ وہ اپنے ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو اس انداز میں مخاطب کریں۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''گیٹ لاسٹ! میں نے روم سروس کو کسی بھی چیز کا آرڈر نہیں دیا۔''
''کون ہے بابر؟'' کانتا نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''روم سروس والا ہے اور انتہائی جاہلانہ انداز میں دروازے پر دستک دے رہا ہے۔''
''دروازہ مت کھولنا بابر!'' کانتا نے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''
''میں اس وقت ہوٹل ہلٹن کے کمرا نمبر چھ سو ایک میں ہوں۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔ میں فوری طور پر اپنے آدمیوں کو وہاں بھیجتی ہوں۔ تم کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ بھی کر لو۔''
میں نے ہوٹل کے فون پر روم سروس کا نمبر ڈائل کیا اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں نے جب روم سروس کو کوئی آرڈر ہی نہیں دیا ہے تو پھر یہ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟''
''سر! یہاں سے تو کسی کو نہیں بھیجا گیا۔''
''پھر یہ میرے دروازے پر کون ہتھوڑے برسا رہا ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ خود کو روم سروس والا کہہ رہا ہے۔''
''سوری سر!'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی ہوٹل سیکیورٹی کو بھیجتی ہوں۔''
ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دروازے پر بہت مہذب انداز میں دستک دی گئی۔
''یس!'' میں نے پوچھا۔
''سیکیورٹی سر!'' باہر سے آواز آئی۔
میں نے دروازہ کھول دیا۔
سامنے ہی چیف سیکیورٹی آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری سر! میں نے...''
''سوری!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا یہاں گیسٹ کو اسی طرح پریشان کیا جاتا ہے؟''
''سر! یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔'' اس کے جواب پر میں بھنا گیا۔
''اس کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا سر! میں تو...''
''میں ہوٹل کے منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''او کے سر!'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔
ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر میں نے دروازہ بند کیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ ''یس!''
''سر! مسٹر حسن آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' استقبالیہ کلرک کی آواز آئی۔
''کون مسٹر حسن؟'' میں نے کہا۔
''میں نہیں جانتی سر!'' کلرک نے جواب دیا۔

"اوکے، انہیں بٹھاؤ۔ میں خود نیچے آرہا ہوں۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں چند منٹ بعد کمرے سے باہر نکلا۔ اچانک عقب سے کسی نے میری گردن پر کوئی چیز رکھ دی اور مجھے غراہٹ نما آواز سنائی دی۔ "خاموشی سے کمرے میں واپس چلو ورنہ میرا پسٹل بے آواز چلتا ہے۔" بولنے والے کا لہجہ امریکی تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لیا اور کمرے کی طرف مڑا تو پستول بردار بھی میرے ساتھ ساتھ گھوم گیا۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بہت مہارت سے میری تلاشی لی اور میری پشت پر لات رسید کردی۔

میں لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ چوٹ کی پروا کیے بغیر میں جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ دروازے کے پاس مجھے ایک کے بجائے دو آدمی نظر آئے۔ دونوں ہی امریکن تھے۔ ان کے چہروں پر سفاکی تھی۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے کہا۔ "اور کیا چاہتے ہو؟"

"ہم موت کے فرشتے ہیں اور تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔" وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ یہ اس آدمی کی آواز نہیں تھی جس نے میری گردن پر پستول رکھا تھا۔

"فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ "اس کا کام تمام کرو اور یہاں سے نکل چلو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" پہلے آدمی نے جواب دیا اور اپنی جیب سے ایک خنجر نکالا جو چمڑے کے کور میں تھا، کور علیحدہ کیا تو خنجر کا پھل جھلملانے لگا۔

اسی وقت میں نے آہستگی سے دروازے کو کھلتے دیکھا۔ وہاں مجھے ایک دراز قامت شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی، اس کی نال معمول سے کچھ زیادہ ہی لمبی تھی۔

وہ اچانک گرج کر بولا۔ "خبردار! اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ ہم لوگ تمہیں چھلنی کردیں گے۔ اپنے پستول پھینکو اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو... جلدی کرو۔"

اس نے ایک فائر بھی کردیا۔ گولی ان دونوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی صوفے کی پشت میں پیوست ہوگئی۔

ان دونوں نے بوکھلا کر اپنے پستول پھینک دیے اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہوگئے۔

نو وارد لب و لہجے سے مجھے کسی ایشیائی ملک کا باشندہ لگ رہا تھا۔

"مسٹر بابر! آپ ان دونوں کے پستول اٹھالیں۔" اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے جھپٹ کر ان دونوں کے پستول اٹھالیے۔ ان لوگوں نے بھی پستول پر سائیلنسر لگا رکھے تھے۔ میں نے وہ خنجر بھی اٹھالیا جو بوکھلاہٹ میں خنجر بردار کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

نو وارد نے ماہرانہ انداز میں باری باری ان دونوں کی تلاشی لی اور ایک ایک پستول مزید برآمد کرلیا۔

میں نے آگے بڑھ کے خنجر بردار کے چہرے پر بھرپور تھپڑ رسید کردیا۔ "الو کے پٹھے! اب بتا تو کون ہے؟ یہ بات یاد رکھنا کہ اب موت کے فرشتے ہم ہیں۔"

نو وارد نے بالکل اسی انداز میں پشت سے اسے زوردار لات رسید کی جیسے اس نے مجھے مارا تھا۔ وہ میرے قدموں میں آگرا۔

میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور کہا۔ "بتا تجھے کس نے بھیجا ہے؟"

"آپ جائیں بابر صاحب!" نو وارد نے کہا۔ "میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"لیکن آپ ہیں کون؟ میں ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

"میں حسن ہوں۔" نو وارد نے کہا۔ "مجھے میڈم کانتا نے بھیجا تھا۔ آپ نے مجھے اوپر آنے کی اجازت نہ دی تو مجبوراً مجھے خود ہی آنا پڑا۔"

"کانتا نے مجھے آپ کا نام بھی تو نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "سوری مسٹر حسن! میں..."

"نو سر!" اس نے جلدی سے کہا۔ "سوری کی ضرورت نہیں ہے۔" اس دوران میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان دونوں سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ جانتے ہیں یہ کون ہیں؟"

"نہیں، میں انہیں پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ دونوں شارپ شوٹر اور کرائے کے قاتل ہیں۔ میں ان دونوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہیں جیکسن اور اسٹنیر ڈ نے یہاں بھیجا ہے۔"

"ان میں سے جو شخص کھڑا ہوا تھا، وہ بے نیازی سے بولا۔ "اب تمہیں معلوم ہی ہے تو سن لو۔ ہاں، ہمیں مسٹر جیکسن نے بھیجا تھا۔ اور تم ہمیں پولیس کی دھمکی مت دو۔ ہم شاہی مہمان ہیں۔"

"اچھا؟" حسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ تم کس کے مہمان ہو؟ میرا تعلق بھی شاہی خاندان سے ہے۔ تم نے یہاں کی پولیس کا صرف نام سنا ہوگا۔ یہ لوگ تو لاک اپ میں بند کرکے بھول جاتے ہیں اور تم جیسے جرائم پیشہ لوگوں پر تو وہ بالکل بھی رحم نہیں کھاتے۔"

میں نے دیکھا، امریکن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے حسن سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسٹر بابر بھی شاہی مہمان ہیں ورنہ..."

"ورنہ تم ان کے احترام میں یہاں سے واپس چلے جاتے؟" حسن نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے پندرہ سال امریکا میں گزارے ہیں، میں جانتا ہوں کہ وہاں تم نے کتنے لوگوں کو قتل کیا ہے، کس کے کہنے پر کیا ہے اور اس کا معاوضہ کیا لیا ہے۔"

امریکن اچانک حسن کی طرف جھپٹا لیکن اس نے منہ کی کھائی۔ حسن پھرتی سے دائیں طرف ہٹ گیا اور وہ اپنے ہی زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔

حسن نے اس کی گدی پر ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پولیس کو کال کرتا ہوں۔" اس نے دوسرے امریکن کو لات ماری۔ "تم بھی اٹھ کر صوفے پر بیٹھو اور تم دونوں اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لو۔"

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"مسٹر بابر!" وہی امریکن بولا جو اب تک بات کرتا رہا تھا۔ "کیا ہمارے درمیان کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا؟"

"ہوسکتا ہے۔" حسن نے کہا۔ "تم لوگ معاوضے کی وہ رقم مسٹر بابر کے حوالے کردو جو تمہیں جیکسن سے ملی ہے۔ لیکن جھوٹ مت بولنا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں کتنی رقم ملی ہے۔"

"ابھی صرف آدھی رقم ملی ہے... پانچ لاکھ ڈالرز۔" اس نے یوں کہا جیسے پانچ سو روپے کی بات کر رہا ہو۔

"اب تم لوگ اتنے کنگال بھی نہیں ہو کہ پوری رقم نہ دے سکو۔ جلدی فیصلہ کرو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

امریکن کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھے منظور ہے لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ ہمارے ہوٹل چلنا پڑے گا۔ ہماری چیک بک اور کریڈٹ کارڈ وغیرہ تو وہیں ہیں۔"

"اوکے!" حسن نے کہا۔ "میرے آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے۔" اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کرکے عربی میں تیزی سے کچھ بولنے لگا۔ پھر وہ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد بولا۔ "میں نے اپنے دو آدمیوں کو بلایا ہے۔ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہارے ساتھ بالکل رعایت نہیں کروں گا۔"

"تم شاہی مہمان ہو تو ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو حسن صاحب سے بلف کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم کسی کے بھی مہمان نہیں ہیں۔"

حسن نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور عربی میں کچھ بولا۔ مجھے صرف اپنا نام اور کمرے کا نمبر ہی سمجھ میں آیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

دو، تین منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے کوئی عربی میں بولا۔

حسن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دو چاق و چوبند آدمی اندر آگئے لیکن اپنے چہروں سے وہ بھی مقامی نہیں لگ رہے تھے۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو چونک اٹھا۔ وہ کال بابا کی تھی۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "السلام علیکم بابا!"

"وعلیکم السلام بیٹا! میں دبئی نہیں آرہا۔ یہاں فوری طور پر دو تین بہت ضروری کام نکل آئے ہیں۔ تم دبئی میں کب تک ہو؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا بابا!" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم مریم کو لے کر جلد از جلد پاکستان آنے کی کوشش کرو۔" بابا نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے طویل سانس لی۔

حسن اچانک مجھ سے پشتو میں بولا۔ "کیا ہوا بابر صاحب! خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہے۔ دراصل میرے بابا یہاں آنے والے تھے لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے انہوں نے فی الحال یہاں آنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔" میں نے پشتو ہی میں جواب دیا۔

☆☆☆

حسن کے دونوں آدمی ڈاٹسن کی ڈبل کیبن پک اپ میں آئے تھے۔

وہ دونوں امریکن، پک اپ کے عقبی حصے میں تھے۔ حسن بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ حسن کا ایک آدمی پک اپ کے اس حصے میں چلا گیا جو سامان رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر حسن کا دوسرا آدمی تھا۔ میں پسنجر سیٹ پر تھا۔

پک اپ انتہائی تیز رفتاری سے روانہ ہوگئی۔

ان دونوں میں سے ایک امریکن چونک کر بولا۔ ''یہ تم کہاں جارہے ہو مسٹر حسن؟ ہمارا ہوٹل تو دوسری طرف ہے۔''

''خاموش بیٹھو۔'' حسن نے کہا اور اپنا پستول نکال لیا۔

گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ ہم لوگ آبادی سے نکل آئے تھے۔ ویرانہ شروع ہوگیا تھا۔ مجھے اس خوفناک بلکہ جنونی ڈرائیور سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ گاڑی کی رفتار مسلسل بڑھا رہا تھا۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ کسی طرف سے کوئی اونٹ نکل کر سڑک پر نہ آجائے۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں شیخوں کے اونٹ کھلے پھرتے ہیں اور اکثر ہائی وے پر بھی آجاتے ہیں۔ سڑک کے بہت سے حادثے اونٹوں کی وجہ سے ہوتے تھے۔

چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ روشنی اس وقت ہوتی تھی جب کوئی گاڑی ہم سے بھی زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے نزدیک سے گزرتی تھی۔

ایک گھنٹا چلنے کے بعد گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ دائیں طرف ایک کچے راستے کی طرف مڑ گئی۔

اب ہر طرف تاحدِ نظر صحرا تھا۔ مجھے اس صحرا سے بھی خوف آرہا تھا۔

اچانک سیل فون پر کانتا کی کال آگئی۔ میں اسے کال کر کے بتا چکا تھا کہ میں حسن کے ساتھ جارہا ہوں، دونوں امریکن بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

''ہیلو بابر!'' کانتا سلسلہ ملنے پر بولی۔ ''کہاں ہو تم لوگ؟''

''ہم اس وقت صحرا میں نہ جانے کہاں ہیں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''ہاں بابا کی کال آئی تھی۔ فوری طور پر انہوں نے دبئی آنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔''

پھر چند رسمی باتوں کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اچانک گاڑی بھی رک گئی۔ میں گھبرا گیا کہ شاید گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ حسن گاڑی سے نیچے اتر چکا تھا۔ اس کا وہ آدمی بھی چھلانگ مار کر نیچے اتر چکا تھا جو گاڑی کے کھلے حصے میں تھا۔

حسن نے دونوں امریکیوں کو بھی نیچے اتار لیا۔

''یہ... یہ... تم... ہمیں کہاں... لے آئے ہو؟''

''تم کیا سمجھتے ہو میرا تعلق شاہی خاندان سے ہے؟''

حسن نے اچانک کہا۔ ''میرا شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب جلدی سے خدا کو یاد کرلو۔''

''کک... کیا مطلب؟'' ایک امریکی بوکھلا کر بولا۔

''کیونکہ میں تم دونوں کو گولی مارنے والا ہوں۔''

حسن نے اچانک اپنے پستول کا رخ امریکن کی کھوپڑی کی طرف کر دیا۔

''دیکھو... تم... وعدہ خلافی...'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

حسن کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور وہ دونوں امریکی ریت پر گر کے تڑپنے لگے۔ حسن نے ان دونوں کی کھوپڑیوں میں ایک ایک گولی مزید اتار دی اور ان کی لاشیں وہیں چھوڑ کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

جاتے وقت تو مجھے وقت کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن واپسی میں صحرا سے ہائی وے پر آتے آتے ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ان دونوں کو جیکسن نے بھیجا ہے؟''

''جیکسن نے پہلے ایک دوسرے آدمی سے بات کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس آدمی نے مجھے بتایا تھا کہ جیکسن کسی بابر نامی آدمی کو قتل کرانے کے لیے دو کرائے کے قاتل دبئی بھیج رہا ہے۔''

''لیکن جیکسن کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں دبئی میں ہوں؟'' میں نے کہا۔

''وہ آپ کے بابا کے تمام لینڈ لائن اور سیل نمبر پر آنے والی کالز کو ریکارڈ کرا رہا تھا۔ آپ نے ان سے بات کی تو جیکسن کو فوراً علم ہوگیا کہ آپ دبئی میں ہیں۔''

دبئی پہنچتے پہنچتے ہمیں صبح کے چار بج گئے۔ اس دوران میں کئی دفعہ کانتا اور مریم کی کالز بھی آئیں۔ میں ان سے یہی کہتا رہا کہ میں بھی دبئی پہنچنے والا ہوں۔

حسن کا تعلق ایران سے تھا۔ وہ بھی کانتا کے گینگ کا آدمی تھا۔ ظاہر ہے کوئی جرائم پیشہ ہی اتنی معلومات رکھ سکتا ہے۔ شاید امریکا اور لندن میں مقیم کانتا کے گینگ کا ہر آدمی میرے نام سے واقف تھا اسی لیے حسن نے فوری طور پر کانتا کو اطلاع دے دی۔ اس وقت وہ خود بھی دبئی آرہا تھا۔

جس وقت میں بابا کے لیے ہوٹل میں کمرا بک کرا رہا تھا تو میرے قاتل امریکا سے روانہ ہو چکے تھے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی موت انہیں دبئی کی طرف کھینچ رہی ہے۔

میں ہوٹل پہنچا تو کانتا اور مریم دونوں جاگ رہی تھیں۔

مریم، کانتا کا خیال کیے بغیر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی رنگت ابھی تک سیاہ فام تھی اور وہ مجھے خاصی کمزور لگ رہی تھی۔ شاید وہ سمندری سفر کی عادی نہیں تھی۔

کانتا ہنس کر بولی۔ ''میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔ تم بھی خیال رکھنا مریم کہ کوئی تمہیں بابر کے ساتھ نہ دیکھے۔''

اس کے جانے کے بعد مریم ایک مرتبہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ مریم بیڈ پر نہیں تھی۔ میں سمجھا کہ شاید وہ کانتا کے کمرے میں چلی گئی ہے لیکن اسی وقت مریم باتھ روم سے نکلی۔ رات کے مقابلے میں اس وقت وہ نسبتاً تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اب اس کی سیاہ فام رنگت سے الجھن ہونے لگی تھی لیکن ابھی کچھ دن مزید برداشت کرنا تھا۔

مریم ہنس کر بولی۔ ''بابر! یہ تم بلیک اینڈ وائٹ کیوں بنے ہوئے ہو؟''

میں نے چونک کر اپنے جسم پر نظر ڈالی، پھر شرٹ پہنتے ہوئے بولا۔ ''سیاہ فام رنگت ختم کرنے میں تو مجھے شدید تکلیف ہوئی تھی اس لیے میں نے جسم کے صرف اس حصے پر لوشن لگایا تھا جو عموماً کھلا رہتا ہے۔''

سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے بیڈ کے سائڈ ریک پر رکھا ہوا سیل فون اٹھا لیا۔ کانتا کا ٹیلی فون تھا۔

''ہیلو کانتا!'' میں نے کہا۔

''ہیلو، اب اپنی اس کلو پری کو یہاں بھیج دو۔ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جارہا ہے۔''

''تم بھی یہاں آجاؤ نا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں۔'' کانتا سنجیدہ ہوگئی۔ ''روم سروس والا تین آدمیوں کے لیے ناشتا لائے گا تو یقیناً چونکے گا۔ ہم ناشتے کے بعد آجائیں گے۔''

میں نے مریم کو کانتا کے پاس بھیج دیا اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ مریم اور کانتا آگئیں۔ کانتا نے بتایا کہ میں نے اپنے ایک آدمی کو کل رات ہی ٹیلی فون کر دیا تھا کہ مجھے ایک پاسپورٹ بنوانا ہے۔ وہ جعلی پاسپورٹ اور دستاویزات بھی اتنی مہارت سے بناتا ہے کہ کوئی ان کاغذات کو اس وقت تک غلط ثابت نہیں کر سکتا جب تک اسے شبہ نہ ہو۔ وہ رات ہی اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے مریم کی ایک تصویر بھی لے گیا تھا۔ شاید اس نے کام کر بھی لیا ہو۔'' کانتا نے سیل فون پر کوئی نمبر ملایا اور بولی۔

''ہاں ارجن! کیا صورتِ حال ہے... اچھا... ویری گڈ... ہاں، ایک بات اور اس پاسپورٹ پر تمام ضروری مہریں اور اندراجات بھی ہونے چاہئیں... ویری گڈ! میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''ارجن سے... یہی وہ آدمی ہے جو مریم کا برٹش پاسپورٹ بنا رہا ہے۔ وہ اس پر ملٹی پل ویزا بھی لگا دے گا اور امریکا کا ویزا بھی لگا دے گا۔''

ہم لوگ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

کانتا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولی۔ ''ہاں... میں اپنے کمرے ہی میں ہوں... تم آجاؤ۔'' وہ سلسلہ منقطع کر کے مجھ سے بولی۔ ''ارجن پاسپورٹ لے آیا ہے۔ چلو مریم! میرے کمرے میں چلو، وہ وہیں آرہا ہے۔''

☆☆☆

دوسری پیشی کے موقع پر مریم ڈرامائی انداز میں عدالت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ مریم نے بتایا کہ مجھے پہلے مسٹر اسٹینیر ڈ نے اغوا کرایا، میں کسی نہ کسی طرح وہاں سے فرار ہوئی تو جیکسن کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں ابھی اس کی قید سے فرار ہو کر یہاں پہنچی ہوں۔ اس وقت اس کا لباس گرد آلود، بالوں میں بھی گرد کی تہیں تھیں اور حلیے سے واقعی وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے کہیں سے فرار ہو کر آئی ہو۔

مریم کی نشاندہی پر پولیس نے وہ جگہ بھی دیکھ لی جہاں اسے قید رکھا گیا تھا۔

وہ بنگلا اصل میں جیکسن ہی کی ملکیت تھا لیکن کانتا کے ایک آدمی نے کرائے پر لیا تھا۔ اس بنگلے پر چھاپا مارا گیا تو وہاں سے بھی جیکسن کے کچھ لوگ پکڑے گئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ انہوں نے جیکسن ہی کے کہنے پر مس کلارا کو اغوا کیا تھا۔ وہ بھی دراصل کرائے کے آدمی تھے جنہیں کانتا نے بھاری رقم دے کر یہ جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا تھا۔

جیکسن نے لاکھ انکار کیا کہ یہ میرے آدمی نہیں ہیں اور وہ بنگلا بھی میں نے کرائے پر دیا تھا لیکن وہ اس کا بھی کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا۔

اغوا کے جرم میں اسے سات سال کی سزا ہوگئی۔ اسٹینیر ڈ اس اغوا میں شریک نہیں تھا اس لیے اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔ مجھے بھی باعزت بری کر دیا گیا۔

اسٹنیر ڈ نے بے اختیار مریم کو پکارا۔ ”کلارا!“

”سوری، میں مریم ہوں مسٹر اسٹنیر ڈ!“ اس نے کہا۔

”کلارا تو بہت دن پہلے مرچکی ہے۔“

اس دن ہم لوگ راستے ہی میں تھے کہ کانتا کا فون آیا۔ ”ہیلو بابر! آج میں تمہاری کامیابی کا جشن منانا چاہتی ہوں اس لیے شام کو ہوٹل میریٹ کے کمرا نمبر سات سو آٹھ میں پہنچ جاؤ۔ دیکھو، اکیلے ہی آنا۔“

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں بابر! بس تم پہنچ رہے ہو۔“ اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

”کون تھا؟“ مریم نے پوچھا۔

”کیپٹن رالف تھا۔“ میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”وہ آج شام مجھے بلا رہا ہے۔“

”تو چلے جانا۔“ مریم نے کہا۔ ”میں بھی مولانا صاحب اور عبدالسلام صاحب کی بیگم سے مل لوں گی۔“

مولانا صاحب تو مجھے کورٹ میں بھی نظر آئے تھے۔ جب جج نے فیصلہ سنایا، اس وقت بھی وہ کورٹ میں موجود تھے لیکن جب میں مریم کے ساتھ باہر نکلا تو وہ موجود نہیں تھے۔

☆☆☆

کانتا اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔ میں جانتا تھا کہ جشن کس نوعیت کا ہوگا۔ لہٰذا کانتا نے جشن منایا۔ ظاہر ہے وہ اکیلی تو جشن نہیں منا سکتی تھی اس لیے ایک دو پیگ میں نے بھی پی لیے۔

پھر تو میں رنگوں اور خوشبوؤں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے ہوش آیا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

میں نے کانتا کو الوداع کہا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

مریم اس وقت تک جاگ رہی تھی۔

”بہت دیر لگادی کیپٹن رالف کے پاس؟“ اس نے کہا۔

میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر کان سے لگایا تو ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”مسٹر بابر! میں اسٹنیر ڈ کا ملازم پیٹر بول رہا ہوں۔ کلارا بے بی کو بتادیں کہ مسٹر اسٹنیر ڈ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”کیا...!“ میں نے چونک کر پوچھا۔
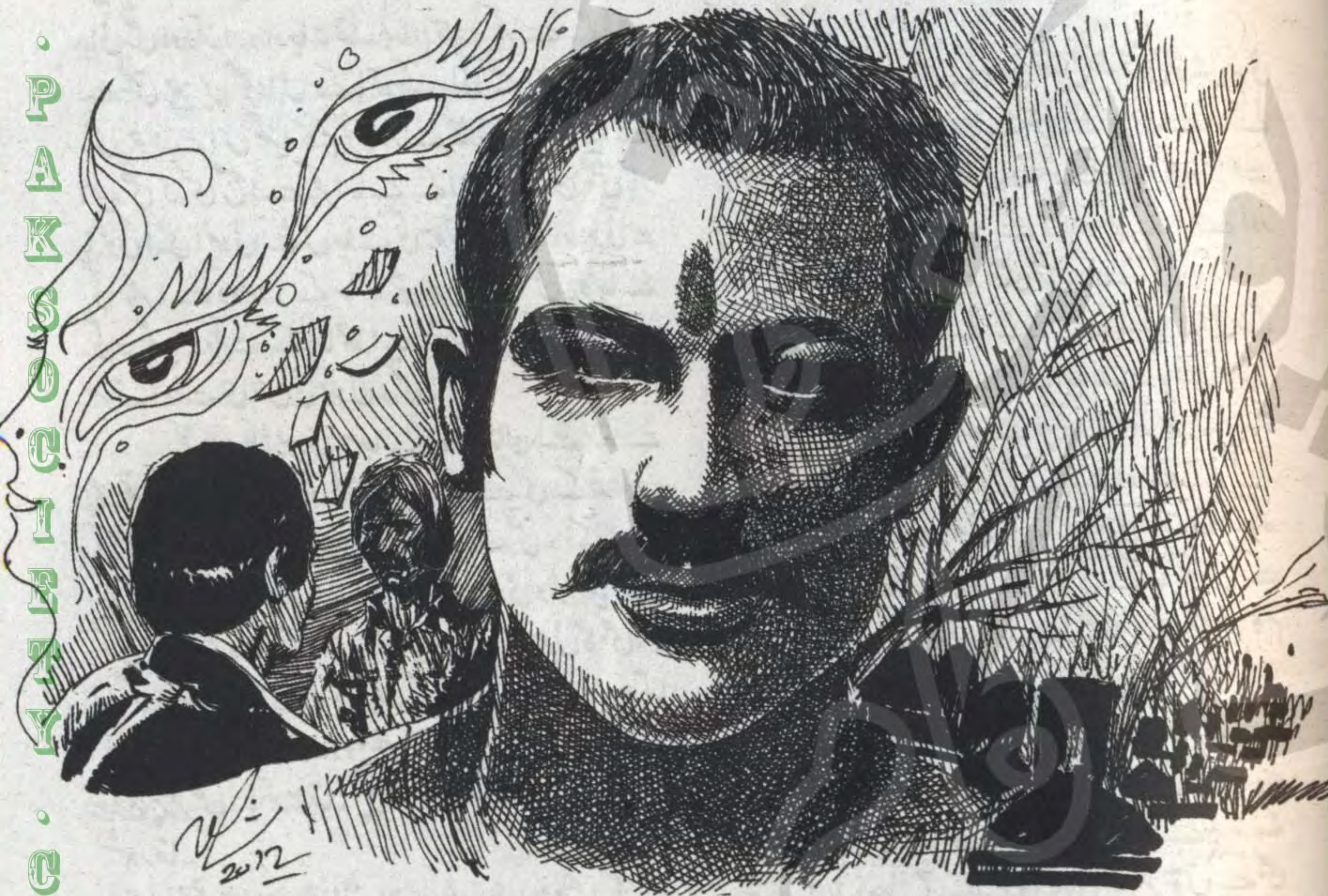
”یس سر!“ پیٹر نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”آج کورٹ سے واپسی پر انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہم نے انہیں اسپتال پہنچادیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا انتقال ہوگیا ہے۔“

میں نے مریم کو یہ خبر سنائی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسٹنیر ڈ بہر حال اس کا باپ تھا۔

ہم لوگ اسی وقت اسٹنیر ڈ کے گھر روانہ ہوگئے۔ پرانے ملازمین مریم کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مریم ان سے زیادہ رو رہی تھی۔

وہ ساری رات اور دوسرا پورا دن ہم دونوں نے وہیں گزارا۔

انتقال کے تیسرے دن اسٹنیر ڈ کے وکیل نے اسٹنیر ڈ کے دور و نزدیک کے تمام رشتے داروں کے سامنے اسٹنیر ڈ کی وصیت پڑھ کر سنائی۔ اس نے اپنے تمام ملازمین کو ایک ایک لاکھ ڈالرز اور رشتے داروں کو دو دو لاکھ ڈالرز دینے کی وصیت کی تھی۔ اس کی بقیہ تمام جائداد مریم کے نام تھی۔ اس جائداد کی مالیت کروڑوں ڈالرز میں تھی۔

اس میں ایک شرط بھی تھی کہ اگر اس کی بیٹی دوبارہ مریم سے کلارا بن جائے تو یہ جائداد اسے دے دی جائے۔ ورنہ ٹرسٹ کے حوالے کردی جائے۔

مریم نے حقارت سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور وکیل سے بولی۔ ”مسٹر ایڈووکیٹ! اگر ایسی چار جائدادیں بھی ہوتیں تو میں ان پر ٹھوکر مار دیتی۔ اور جائداد ہی کیا اگر دنیا بھر کی تمام دولت بھی مجھے اس شرط پر دی جائے کہ میں اسلام کو چھوڑ دوں تو میں اس آفر کو بھی ٹھوکر مار دوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ عدالت سے باہر آگئی۔

میں نے مریم کا ہاتھ تھاما اور اس سے کہا۔ ”وہ ہمارا ماضی تھا... اب ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

☆☆☆

اماں نے مریم کو یوں گلے لگایا جیسے وہ ان کی بچھڑی ہوئی بیٹی ہو۔ بابا جان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

انہوں نے کہا۔ ”بابر خان تُو نے ثابت کردیا ہے کہ تُو واقعی میرا بیٹا ہے۔ تُو اگر ضد نہ کرتا تو اس وقت میری بہو میرے پاس نہ ہوتی۔“ انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا پھر مریم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

مجھے اس وقت ہر طرف خوشیوں کے رنگ دکھائی دے رہے تھے اس گھناؤنے جال در جال سے نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ مریم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں مستقبل کے حسین خواب!

دستِ قاتل

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

شہرت و نام وری کی چاہ بڑے بڑے کام کروا دیتی ہے... اس مجہول و کم حیثیت شخص کے من میں بھی اپنے آپ کو منوانے کا سودا سمایا ہوا تھا... سرمستی و بے خودی کی کیفیت اس سے ہر وہ قدم اٹھوا رہی تھی جو اس کی زندگی کو دشوار گزار بنادے...

جرم... محبت اور شہرت کی مثلث کا سنگین احوال

ممبا دیوی کی ساحلی پٹی پر واقع، ممبئی کے پُرفضا مقام گوا میں ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ فضا میں ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔

راجو بوری نے کینوس کا خالی تھیلا کندھے پر ڈالا، ترشول سے مشابہ آہنی آنکڑا ہاتھ میں پکڑا اور اپنی جھگی سے نکل کر قبرستان والے جنگل کی طرف چل پڑا۔

اس کا نام رمیش بھوجوانی تھا، قصبے کے لوگوں نے اسے کچرا چنتے ہی دیکھا تھا۔ اس کے کاندھے پر ہر وقت پڑی رہنے والی کچرے کی بوری نے اس کا نام بھی رمیش بھوجوانی سے بدل کر راجو بوری رکھ دیا تھا۔

اس کی عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ تھی۔ مجہول سے نظر آنے والے راجو بوری کی زندگی روکی پھیکی تھی۔

اس نے جوانی کے زمانے میں مختلف قسم کے کام کیے تھے مگر پس انداز کچھ نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب بڑھاپے میں اسے یہ گھٹیا قسم کا کام کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ کچرے کے ڈھیر سے کارآمد چیزیں نکالتا اور انہیں بازار میں فروخت کر دیتا تھا۔ اس کام سے اسے مناسب آمدنی ہو جاتی تھی اور گزارہ ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات کچرے کے ڈھیر سے قیمتی چیزیں بھی اس کے ہاتھ لگ جاتی تھیں اور یہی وجہ تھی جو اسے اس گھٹیا کام کو چھوڑنے نہیں دیتی تھی۔ اسے امید تھی کہ کسی صبح اسے کچرا خانے کے اندر سے کوئی قیمتی ہار یا کوئی ایسی انمول شے مل جائے گی جو نوادر میں شمار ہوتی ہو گی پھر اسے دولت کے ساتھ شہرت بھی حاصل ہو جائے گی۔ گویا دولت کے ساتھ اسے شہرت کی بھی تمنا تھی۔ صرف دولت ہی اس کی منزل نہ تھی۔

کچرے کی بوری سنبھالے وہ قبرستان سے گزرنے لگا۔ تھوڑا آگے بڑھا تو درختوں کے نیچے سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہاں کافی دھند تھی۔ ایک ہیولا اچانک ہی نمودار ہوا۔ ابتدا میں تو راجو بوری دہل گیا کہیں کوئی مُردہ زندہ ہو کے تو نہیں اٹھ آیا قبر سے۔ ماحول کا بھی اثر تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا کیونکہ وہ اسے جانتا تھا۔ وہ چیتن داس تھا۔ قصبے کے لوگوں کو بیاج پر قرض دیا کرتا تھا۔ پکی عمر کا تھا اور داس کے نام سے مشہور تھا۔

"نمستے داس جی!" راجو بوری نے پرنام کیا۔ "صبح کی سیر ہو رہی ہے۔"

داس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "سیر ہی سمجھو... ویسے میں اسی خیال سے ادھر آ گیا تھا کہ شاید مجھے بھی وہ سفید لبادے والی چڑیل نظر آ جائے۔"

اچانک ہی راجو بوری کو یاد آیا کہ چند ہفتوں سے قصبے میں ایک سفید لبادے والی چڑیل دیکھے جانے کا بہت چرچا تھا۔ سب سے پہلے کھوکھا پان والے رمضو نے اس سفید لبادے والی چڑیل دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا اُس کے بعد تو جیسے ہر شخص کو وہ سفید لبادے والی چڑیل نظر آنے لگی تھی۔

کچھ لوگوں نے تو یہ تک دعویٰ بھی کر رکھا تھا کہ وہ کوئی چڑیل نہیں بلکہ خلا سے بھاگی ہوئی کوئی ایلین قسم کی بلا ہے اور جو سفید لبادہ ہے وہ کفن نہیں بلکہ اس کا چاندی کا چمکنے والا خلائی لباس یا کھال ہے۔

بھارت کے ہر شہر میں کیا، ہر قصبے سے ایک اخبار نکلتا ہے۔ اس قصبے سے بھی ایک اخبار "پریتم" نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر شری رام واستو کا ناک میں دم آ گیا تھا۔ اس کو ہر تیسرا فون اس خلائی مخلوق کے بارے میں موصول ہوتا تھا۔

"اگر تمہیں وہ خلائی مخلوق نظر آ بھی گئی تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" راجو بوری نے ہنس کر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ شری واستو اب اس کے بارے میں کوئی خبر شائع نہیں کرے گا۔"

"اگر مجھے وہ ایلین یا خلائی مخلوق نظر آ گئی تو میں شری واستو کے پاس جانے کے بجائے ممبئی کے کسی بڑے رسالے کو بھی خبر دے سکتا ہوں۔ شری واستو کے اخبار کی اشاعت ہی کتنی ہو گی اور سچ پوچھو تو مجھے رمضو کھوکھے والے اور دوسرے لوگوں کے دعوؤں پر یقین نہیں ہے۔"

"رمضو کھوکھے والے کے ذکر سے یاد آیا کہ اس کے بھائی کا کچھ پتا چلا؟" راجو بوری نے اچانک دریافت کیا۔

داس نے دوبارہ کندھے اچکائے اور بولا۔ "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہاشم کو اس کے اپنے دوست نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی دوست مومی میں ہاشم دلچسپی رکھتا تھا مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے بھائی کی بے جا سختیوں سے گھبرا کر گھر سے شہر بھاگ گیا ہے۔ فلموں میں بھی تو کام کرنے کا شوق تھا اسے۔"

"دونوں ہی باتیں صحیح ہو سکتی ہیں، حالانکہ محمودہ (مومی) اور ہاشم میں پہلے سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ ویسے مومی کا بھی نہیں پتا چلتا تھا۔ وہ شوخ لڑکی قصبے کے ہر لڑکے سے ہی گھل مل جاتی تھی۔ ہاشم کو اس کی ان حرکتوں سے بھی سخت نفرت تھی۔ مومی کی وجہ سے اس کا قصبے کے اکثر لوگوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔"

داس رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "یہ بظاہر شوخ اور چنچل لڑکی اندر سے بڑی خطرناک ہے۔ نوجوانوں کی تو بات ہی الگ ہے، اس نے مجھ جیسے بڈھے کو بھی گدھا بنا دیا تھا۔ تم بھی ذرا محتاط رہنا۔"

بوڑھے راجو بوری کے ہونٹوں پر عجیب کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی، وہ بولا۔

"میری ایسی قسمت کہاں ہے، میں تو گدھا بننے کے

لیے بھی تیار ہوں۔"

بیاج خور چیتن داس نے سکہ اچھالنے کے انداز میں انگوٹھے کو حرکت دی پھر بولا۔ "سب پیسے کا کھیل ہے میاں! پیسا پھینکو اور تماشا دیکھو۔ اس قسم کی بلبلیں دولت کی جھنکار پر ناچتی ہیں۔"

راجو بوری سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس روز اسے کچرے خانے سے خالی ڈبوں اور بوتلوں کے علاوہ چند سائنس فکشن میگزین بھی مل گئے۔ جب اس کا تھیلا بھر گیا تو وہ واپس چل پڑا۔ اسے سائنس فکشن میگزین پڑھنے کا بہت شوق تھا، اس لیے وہ بہت خوش ہوا۔ چند روز کی تفریح کا سامان اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔

واپسی میں اس نے مختصر راستہ اختیار کیا جو جھاڑیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ ایک جگہ پر اسے چمڑے کا ایک ٹکڑا زمین میں دبا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا فقط ایک کنارا نکلا ہوا تھا۔ راجو نے اسے پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ نکل آیا۔ وہ چمڑے کا بیلٹ تھا اور اس کے پیتل کے بکل پر "ایچ" لکھا ہوا تھا۔ راجو کو یاد آیا کہ اس قسم کا بیلٹ اس نے رمضو کے بھائی ہاشم کے پاس دیکھا تھا۔ اس روز وہ سادہ پان لینے گیا تھا، بڑا بھائی نہ تھا۔ چھوٹا ہاشم ہی تھا جسے اس کام سے نفرت تھی مگر اسے یہ کام کرنا پڑتا تھا۔

راجو بوری نے باریکی سے بیلٹ کا معائنہ کیا۔ اگرچہ مٹی میں دبے رہنے سے وہ کچھ خراب نظر آتا تھا مگر اس کی حالت اتنی بُری نہیں تھی کہ اسے پھینک دیا جاتا۔ پن کا سیاہ نشان ظاہر کرتا تھا کہ ہاشم آخری سوراخ پر بکل لگاتا تھا لیکن سوراخ کچھ زیادہ ہی کشادہ تھا جیسے پن لگانے کے بعد بیلٹ کو پوری قوت سے کھینچا گیا ہو۔

گھر پہنچ کر... راجو بوری نے بیلٹ کو الماری میں رکھ دیا۔ وہ اس کے پیتل کے بکل کو چمکا کر فروخت کر سکتا تھا۔ پھر اس نے تھیلے میں سے سائنس فکشن میگزین نکالے اور بستر پر لیٹ کر ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کبھی کبھی ردی رسالوں اور کتابوں سے ایک آدھ نوٹ بھی نکل آتا تھا لیکن ان رسالوں میں سے کوئی نوٹ نہیں نکلا۔

بالآخر خلائی مخلوق ایلین سے متعلق ایک کہانی نے راجو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

کہانی پڑھتے ہوئے ایک منصوبہ اس کے ذہن میں تشکیل پانے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ایلین دیکھنے کا دعویٰ کرے اور اس کے نام سے خبر چھپ جائے تو شاید اس کی شہرت پانے کی مراد بر آ جائے۔ کم از کم شہرت تو حاصل ہو ہی جائے گی۔ ممکن ہے کچھ انعامی یا اعزازی رقم بھی مل جائے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ قصبے کے واحد اخبار "پریتم" کے دفتر پہنچا اور ایڈیٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ استقبالیہ ڈیسک پر موجود لڑکی نے قدرے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ وہ کس سلسلے میں ایڈیٹر سے ملنا چاہتا ہے۔

"میں ایک اہم خبر لے کر آیا ہوں۔" راجو بوری نے کہا۔ "اور یہ خبر میں صرف ایڈیٹر کو ہی بتا سکتا ہوں۔"

استقبالیہ کلرک نے خاصے تامل کے بعد ایڈیٹر سے انٹرکام پر رابطہ کیا اور کہا۔

"سر! رمیش نامی ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ایک بڑی اہم خبر ہے۔"

"اسے بٹھاؤ۔" ایڈیٹر نے کہا۔ "میں خود اس کے پاس آتا ہوں۔"

لڑکی نے انٹرکام بند کرنے کے بعد کہا۔ "بیٹھو، شری واستو خود یہاں آ رہے ہیں۔"

پانچ منٹ کے بعد شری واستو کمرے میں نمودار ہوا۔ وہ تیس، پینتیس سال کا ایک خوش شکل اور اسمارٹ شخص تھا۔ استقبالیہ کلرک اسے دیکھ کر قدرے پریشان نظر آنے لگی کہ کہیں اسے ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے لیکن ایڈیٹر نے تسلی دینے والی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھ بھی دبائی پھر وہ بوڑھے راجو بوری کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں مسٹر... کیا نام بتایا...؟"

"رمیش بھوجوانی۔" راجو بوری نے ذرا اکڑ کر اپنا اصل نام بتایا۔

"ہاں، تو مسٹر بھوجوانی! آپ ہمارے لیے کون سی اہم خبر لائے ہیں؟"

"شری واستو جی! میں نے ادھر قبرستان والے جنگل میں سفید پوش چڑیل دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی خلائی مخلوق ایلین قسم کی بلا ہے۔"

"کیا تم نے بھی..."

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" راجو بوری نے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے صرف اسے ہی نہیں دیکھا بلکہ اسے کسی آدمی پر حملہ آور ہوتے بھی دیکھا ہے۔"

"کیا...؟" شری واستو نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! اس نے سفید کفن جیسا چمک دار لباس پہن رکھا

تھا۔ زمین سے چند انچ بلندی پر بھی میں نے اسے متحرک دیکھا۔ اس نے کسی آدمی کو بھی دبوچ رکھا تھا۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی جدھر موی کو بھی نظر آئی تھی وہ سفید چڑیل جیسی ایلین بلا۔“

”میرا خیال ہے کہ محمودہ نے خواب دیکھا تھا۔“

”اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ موی نے کچھ دیکھا تھا یا نہیں۔“ راجو بوری نے کہا۔ ”لیکن واستو جی! میں نے اس ایلین بلا کو درختوں سے قدرے اوپر فضا میں معلق دیکھا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے منہ سے بہت معمولی آواز خارج ہو رہی تھی۔“

”او کے رمیش! میں تمہارے بیان کو نوٹ کرلوں گا۔“

”کیا تم اس کی خبر شائع نہیں کرو گے؟“

”ابھی نہیں، میں کسی ثبوت کے بغیر یہ خبر شائع نہیں کر سکتا۔ تمہیں کیا پتا، میرے پاس سفید چڑیل یا ایلین دیکھنے والے کتنے لوگ آئے ہیں۔ اگر میں ان سب کے بارے میں خبریں شائع کرنے لگوں تو کسی دوسری خبر کے لیے اخبار میں جگہ نہ بچے۔ تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ اگر تمہیں دوبارہ وہ نظر آئے تو کوئی ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کرنا... کوئی ٹھوس ثبوت، او کے؟ نمستے مسٹر رمیش بھوجوانی صاحب!“

بوڑھا راجو بوری خمیدہ کندھوں کے ساتھ واپس چل دیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اسے شری واستو اور استقبالیہ کلرک کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ اس کا مذاق اڑا رہے تھے کیونکہ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اگر وہی خبر کسی باحیثیت شخص ...... کی طرف سے ہوتی تو نمایاں سرخی کے ساتھ صفحۂ اول پر چھپ جاتی۔

راجو بوری نے سوچا کہ گزشتہ روز اس نے جو کہانی پڑھی تھی، اس میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ کہانی میں جس شخص نے چمکتے لبادے والی ایلین بلا کو دیکھا تھا، وہ اس پر جھپٹی بھی تھی اور اس نے اس کے شکنجے سے بچ کر نکل بھاگنے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ اسے راتوں رات دولت اور شہرت حاصل ہو گئی تھی، اسے ٹی وی پر بھی پیش کیا گیا تھا۔ کئی رسالوں میں اس کے انٹرویو چھپے تھے۔ ایک رسالے نے لاکھوں روپے میں اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات شائع کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ ایک فرضی کہانی تھی تاہم ناممکن نہیں تھی۔ دنیا میں اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔

”ٹھیک ہے واستو جی!“ راجو بوری نے دل میں کہا۔ ”تمہیں ثبوت چاہیے نا؟ اب میں ثبوت کے ساتھ ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم کیسے خبر شائع نہیں کرتے۔“

وہ کئی روز تک سائنس فکشن میگزین کی مدد سے منصوبہ ترتیب دیتا رہا۔ بالآخر ایک رات جب آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا، وہ ضروری ساز وسامان کے ساتھ جنگل میں پہنچ گیا۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا اور پورے قصبے میں سناٹے کا راج تھا۔

راجو بوری نے درختوں کے درمیان ایک کھلی اور ہموار جگہ کا انتخاب کیا۔ اس جگہ پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ راجو بوری نے اس جگہ کے وسط میں ایک دائرہ بنایا اور اس دائرے کے اندر گھاس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دائرے کے اندر کی ساری گھاس جل گئی، تب راجو نے اس دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ بنایا اور پھاوڑے سے اس کی کھدائی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے اندر اس نے ایک گڑھا بنا دیا۔ پھر اس نے بڑے دائرے کے گرد چار مساوی جگہوں پر چار چوکور نشانات بنائے اور انہیں کھود کر قدرے گہرا کر دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے تھیلے سے پیتل کے تین چمک دار ٹکڑے نکالے اور انہیں تین مختلف جگہوں پر پھینک دیا۔ اس سارے کام میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت صرف ہو گیا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی، کچھ آرام کیا اور چمڑے کا وہ بیلٹ نکال کر چمکانے لگا جو اسے جنگل سے ملا تھا۔ نصف گھنٹے کی محنت کے بعد بیلٹ بالکل نیا معلوم ہونے لگا۔ پیتل کا بکل شیشے کی طرح چمکنے لگا تھا۔

طلوعِ آفتاب سے چند منٹ پہلے اس نے حسبِ معمول کینوس کا تھیلا کندھے پر ڈالا، آہنی آنکڑا ہاتھ میں پکڑا اور اپنے مکان سے نکل کر جنگل کی طرف چل دیا۔ اس کے پاس ایک تیسری چیز بھی تھی اور وہ تھا چمڑے کا بیلٹ۔ جنگل میں پہنچ کر اس نے اپنے کام کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا اور پھر اچانک قصبے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ راستے میں کئی بار گرا، جس سے اس کے گھٹنے زخمی ہو گئے۔

قصبے میں پہنچتے ہی اس نے گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

نصف گھنٹے کے اندر جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو گیا۔

لوگ حیرت سے اس قطعۂ زمین کو دیکھنے لگے جہاں بہ قول راجو بوری کے اس نے سفید چڑیل یعنی ایلین کو ایک

اڑن طشتری کے ذریعے زمین پر اترتے دیکھا تھا۔ رسالے کی کہانی میں بھی ایسا ہی تھا، اس لیے اس نے اڑن طشتری کا اضافہ کیا۔

تماشائیوں میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اور لوگ راجو بوری سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ بالآخر راجو بوری کو وہ شخص نظر آیا جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ وہ مقامی اخبار کا ایڈیٹر شری واستو تھا۔ اس کے ساتھ ایک اسٹاف رپورٹر اور ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔

شری واستو نے آنکھیں پھیلا کر جلی ہوئی گھاس اور چھوٹے سے گڑھے کا معائنہ کیا۔ فوٹو گرافر اس کی ہدایت پر تصویریں اتارنے لگا۔

شری واستو تیزی سے چلتا ہوا اس جگہ پر پہنچا جہاں راجو بوری لوگوں کے درمیان کھڑا ان کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ راجو بوری نے شری واستو کو بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔

”مسٹر رمیش! میں نے سنا ہے کہ تم نے کوئی عجیب چیز دیکھی ہے؟“ شری واستو نے پوچھا۔

”اوہو... عجیب چیز...“ راجو بوری طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”... لیکن میرا خیال ہے کہ تم اسے عجیب چیز بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ اڑن طشتری میں اتری تھی، جی ہاں! وہی سفید لبادے والی ایلین بلا... مسٹر شری واستو!“

”تم نے چند روز پہلے بھی یہی دعویٰ کیا تھا؟“ ایڈیٹر نے کہا۔ ”لیکن اس روز اس قسم کا کوئی نشان دیکھنے میں نہیں آیا تھا؟“

راجو بوری یہ سوال سن کر لمحہ بھر کے لیے گھبرایا پھر بولا۔ ”تم نے میری بات غور سے کب سنی تھی۔ اس روز میں نے سفید خلائی مخلوق کو فضا میں معلق دیکھا تھا۔ پھر مجھے دیکھ کر وہ فضا ہی سے لوٹ گئی تھی۔“

”لیکن مسٹر رمیش! اس نے تم پر حملہ کیوں نہیں کیا؟ جیسا کہ اس کے بارے میں مشہور تھا؟“

”میں کیا جانوں؟“ راجو بوری نے مختصراً کہا۔ وہ شاید اس کے سوالات سے گھبرا رہا تھا۔

دفعتاً ایک تماشائی نے پیتل کا ٹکڑا ایڈیٹر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”واستو جی! مجھے یہ دھات کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔“

یہ وہی ٹکڑا تھا جو راجو بوری نے وہاں پھینکا تھا۔

”اس کا اڑن طشتری سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً وہ سفید چڑیل کوئی خلائی مخلوق ہے جو اڑن طشتری کے ذریعے یہاں اترتی ہے۔“

اسی طرح ایک اور شخص نے بھی دو ٹکڑے دکھائے۔

ایڈیٹر شری واستو نے ان ٹکڑوں کا بہ غور معائنہ کیا اور اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ ان ٹکڑوں کی تصویریں اتار لے پھر وہ راجو بوری کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا۔ ”مسٹر رمیش بھوجوانی! کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اس خلائی مخلوق اور اس کی اڑن طشتری کو زمین پر اترتے یا اُڑتے دیکھا تھا؟“

”اس وقت خاصی دھند چھائی ہوئی تھی۔“ راجو بوری نے کہا۔ ”جب میں قبرستان کے قریب پہنچا تو میں نے اس جگہ پر زبردست گرد اڑتی دیکھی۔ میں حیران ہوا کہ جنگل میں صبح صبح گرد کہاں سے آ گئی۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا اور میں تیز تیز چلتا ہوا اس جگہ پر پہنچا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تب ہی میری نظر ایک چمک دار اور حیرت انگیز اڑن طشتری پر پڑی۔ اس کا سائز اس دائرے سے کہیں زیادہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے ہیں اور تب ہی میں نے اس کے اندر سے اس سفید چڑیل کو چمکتے ہوئے لباس میں باہر تیرنے کے انداز میں نکلتے دیکھا۔“

”کیا یہ وہی خلائی مخلوق ایلین تھی جو چند ہفتوں سے دیکھی جا رہی تھی جسے سفید کفن پوش چڑیل سمجھا جا رہا تھا؟“

”ہاں، لگی تو ویسی ہی جیسا اور لوگوں نے بھی دیکھا۔“

”اس اڑن طشتری کے اندر اور بھی کوئی تھا؟“

”ہاں!“ راجو بوری نے پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا۔

”اندر میں نے قصبے کے ایک نوجوان کو بیٹھے دیکھا تھا۔“

اسی لمحے ایک بھورے بالوں والا نوجوان ہجوم کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا اور کندھے پر کیمرا لٹک رہا تھا۔

”مسٹر رمیش! میں انڈیا ٹائمز کا نمائندہ ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا نام جنید ہے۔ تم نے یہی کہا ہے کہ تم نے قصبے کے ایک نوجوان کو اڑن طشتری کے اندر دیکھا تھا؟“

”ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔“

”کیا تم اس نوجوان کے بارے میں بتاؤ گے؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ ہاشم تھا، رمضو پان والے کا چھوٹا بھائی... ہاشم۔“

”ہاشم؟“

بیک وقت کئی لوگوں کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔

''کیا تم اسی ہاشم کی بات کر رہے ہو، جو تین ماہ قبل روپوش ہو گیا تھا؟''

''ہاں، میں اسی ہاشم کی بات کر رہا ہوں۔''

ایڈیٹر شری واستو بولا۔ ''مسٹر رمیش! تم ایک ناممکن بات بتا رہے ہو۔''

''اس دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے واستو جی!'' راجو بوری نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ میں ایک عجیب بات بتا رہا ہوں لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے۔ سچ پوچھو تو پہلے مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر ہاشم واقعی اڑن طشتری کے اندر موجود تھا اور مجھے پورا یقین ہے۔ جیسا کہ خلائی مخلوق ہم جیسے انسانوں کو اغوا کر کے لے جاتی ہیں اور ان پر تجربات کر کے اپنے جیسا بنا دیتی ہیں، اسے بھی یعنی ہاشم کو بھی انہوں نے...''

اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ انڈیا ٹائمز کے جنید نے پوچھا تو راجو بوری نے، جو پہلے ہی ایسے سوال کی توقع اور ''انتظار'' میں تھا جس کی ''تیاری'' بھی وہ کر چکا تھا، جھٹ سے اپنی جیب سے چمڑے کا بیلٹ نکالا اور لوگوں کو دکھایا اور بولا۔ ''یہ ثبوت ہے، میرے پاس۔ جب طشتری اوپر اٹھنا شروع ہوئی تو اس نے یہ بیلٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ غالباً وہ مجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اسے خلائی مخلوق نے قیدی بنا رکھا ہے۔''

ایڈیٹر شری واستو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے بیلٹ کو ہاتھ میں لیا اور بکل پر لکھے ہوئے حروف ''ایچ'' کو گھورنے لگا۔

ایک نوجوان بولا۔ ''یہ واقعی ہاشم کا بیلٹ ہے، میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔''

ایڈیٹر بولا۔ ''یہ ناممکن ہے... مم... میرا خیال ہے کہ اڑن طشتری کی کھڑکیاں کھل نہیں سکتیں۔''

ایک شخص نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''آپ تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے آپ اڑن طشتری میں سفر کر چکے ہیں۔''

راجو بوری بولا۔ ''میں اڑن طشتری کی کھڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے اس میں موجود ہاشم کا چہرہ دیکھا اور اسے یہ بیلٹ باہر پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''میرا تو خیال ہے کہ یہ بیلٹ تمہیں کچرے کے ڈھیر سے ملا ہوگا۔'' شری واستو نے کہا۔ ''اس قصبے میں کئی لوگوں کے نام کے ابتدائی حروف ''ایچ'' سے ہو سکتے ہیں۔''

''ایچ... نام کا یہی بیلٹ ہے جو ہاشم نے میرے سامنے خریدا تھا، میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' بیلٹ شناخت کرنے والے نوجوان نے اس بار بھی پورے یقین سے کہا تو مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''شری واستو جی! مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' راجو بوری نے اس سے کہا۔

شری واستو چمک دار بیلٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ بیلٹ میرے پاس چھوڑ دو۔ میں ہاشم کے بڑے بھائی سے پوچھوں گا، میں اسے جانتا ہوں۔''

راجو بوری بیلٹ واپس لیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ بیلٹ ہاشم کا ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تو تمہیں یہ خبر شائع کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔''

''خبر تو بہرحال چھپ جائے گی لیکن...''

''لیکن کیا واستو جی؟''

''نن... نن... نہیں کوئی خاص بات نہیں۔''

''خبر تو بہرحال چھپے گی۔'' انڈیا ٹائمز کے نمائندے جنید نے کہا۔ ''اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس سلسلے میں تم مزید معلومات کو فی الحال روکے رکھو۔''

راجو بوری اس کا مدعا سمجھ گیا اور مزید سوالات کے جواب دینے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

راجو بوری کا خواب پورا ہو گیا۔

اگلے روز ہی مقامی اخبار کے علاوہ انڈیا ٹائمز میں بھی اڑن طشتری کی خبر چھپ گئی۔ دونوں اخبارات نے راجو بوری کی تصویر بھی شائع کی تھی۔ سارا دن مختلف لوگ راجو بوری سے ملنے آتے رہے۔ دوپہر کے بعد اسے اپنا حلیہ ٹھیک کرنے کا خیال آیا۔ یہ بہت ضروری تھا کیونکہ وہ ٹی وی کے نمائندوں کی آمد کی توقع بھی کر رہا تھا۔ اس نے اپنی جمع پونجی میں سے کچھ رقم نکالی اور قصبے کے شاپنگ سینٹر میں جا پہنچا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آیا تو بالوں کی آرائش اور نئے لباس کی وجہ سے اس کی شخصیت ہی بدلی ہوئی تھی۔

شام کے وقت اسے شری واستو سے ملنے کا خیال آیا۔ جب اس نے اخبار کے دفتر میں قدم رکھا تو وہ اسے دروازے پر ہی مل گیا۔

''نمستے رمیش بھوجوانی صاحب!''

اس نے چہک کر کہا۔ ''میں تمہاری طرف ہی جا رہا تھا۔ آج تو تم بالکل مختلف آدمی لگ رہے ہو۔''

''میں خود ہی حاضر ہو گیا ہوں۔'' راجو بوری نے کہا۔ اس نے شری واستو کو اتنی خوش دلی سے بات کرتے کبھی نہیں سنا تھا۔

''میں نے تمہیں تین ٹی وی پروگرامز کے لیے سائن کرنے کی بات کی ہے۔''

راجو بوری نے آنکھیں پھیلائیں اور بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ مجھے ٹی وی پر پیش کیا جائے گا؟''

''ہاں۔'' شری واستو گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''پہلا پروگرام اب سے دو گھنٹے کے بعد ریکارڈ کیا جائے گا، میں تمہیں گھر سے ساتھ لے لوں گا۔''

راجو بوری خوشی سے پھول گیا۔ شہرت کا دروازہ کھل گیا تھا... اس نے سوچا کوئی عجب نہیں کہ چند روز کے اندر دولت کا دروازہ بھی کھل جائے، کوئی پبلشر اسے کتاب لکھنے کے لیے بھی کہہ سکتا تھا۔ غالباً یہ کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں تھا۔ پبلشر کے پاس ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زبان و بیان کی غلطیاں درست کر دیتے ہیں۔ گویا اس کے برسوں پرانے خواب کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ شہرت اور دولت اس کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی۔ اب وہ بہترین بنگلے میں رہے گا اور شان دار کار میں سواری کرے گا اور یہ سب کچھ اس کی عمدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

ٹی وی پروڈیوسر نے راجو بوری کو ساری بات اچھی طرح سمجھا دی بلکہ تھوڑی ریہرسل بھی کرا دی۔ اس موقع پر شری واستو بھی وہاں موجود تھا۔

''ہم نے ہاشم کے بھائی محمد رمضان اور ان کی بیگم کو بھی مدعو کیا تھا۔'' پروڈیوسر نے کہا۔ ''لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے شرکت سے انکار کر دیا۔''

''عجیب لوگ ہیں۔'' شری واستو نے کہا۔ ''انہیں اپنے بھائی کی گمشدگی کا بہت صدمہ ہے۔ وہ ایسے کسی پروگرام میں شرکت کرنا پسند نہیں کرتے جس سے ان کے زخم تازہ ہوں۔''

اشوک نامی کیمرا مین نے پروڈیوسر کے کان میں کچھ کہا۔ ''وہ لوگ شری واستو کی وجہ سے نہیں آئے۔ ان کا خیال ہے کہ ہاشم کی گمشدگی میں شری واستو کا ہاتھ ہے بلکہ وہ تو یہ تک سمجھتے ہیں کہ شری واستو نے ہی ہاشم کو قتل کیا ہے۔''

''کیا؟''

''میں اس معاملے پر آپ سے بعد میں بات کروں گا۔'' اشوک نے کہا۔

حق تلفی

انگلستان میں ایک نئی نئی بیوہ نے بیمہ کمپنی میں جا کر اپنے شوہر کے بیمے کی رقم طلب کی۔ منیجر نے اخلاقاً کہا:

''محترمہ مجھے آپ کے شوہر کی موت کا دلی صدمہ ہے۔'' ابھی وہ یہ کہنے ہی پایا تھا کہ وہ خاتون جھٹ بولیں۔

''ہاں، یہی تو تم مردوں کا قاعدہ ہے، جہاں عورتوں کو کوئی فائدہ ہونے لگا انہیں اس کا صدمہ ہونے لگتا ہے۔''

(فاطمہ سعید قریشی، کراچی)

پاگل کی گالی

ایک شخص نے اپنے ماحول میں کوئی نمایاں کام انجام دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ اسے سراہیں گے لیکن اس کے برعکس اس پر تنقید اور ملازمت کی بھرمار ہو گئی۔ وہ ان حملوں کو نہایت صبر و استقلال سے برداشت کرتا رہا۔ اس کے کسی مخلص دوست نے پوچھا۔ ''میں حیران ہوں کہ تم ملامت اور تنقید کرنے والوں کے زہریلے حملوں کو برداشت کس طرح کر رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بالکل اسی طرح جس طرح کوئی ذی ہوش انسان پاگل خانے کے پاگلوں کی گالیاں برداشت کر لیا کرتا ہے۔''

(کراچی سے رخشندہ ندیم کا جوابی حملہ)

''میرا خیال ہے کہ انہیں محمودہ نے روک دیا ہوگا۔'' راجو بوری نے اپنا خیال پیش کیا۔

''اڑن طشتری تو اس نے بھی دیکھی تھی مگر مسٹر واستو نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور خبر شائع نہیں کی، ورنہ اس کرسی پر آج مومی بیٹھی ہوتی۔''

پروڈیوسر آگے جھکتے ہوئے بولا۔ ''یہ مومی کون ہے؟''

''مومی کا اصل نام محمودہ ہے، وہ ہاشم کے بڑے بھائی محمد رمضان کی بیوی سلمٰی کی چھوٹی بہن ہے۔ عمر تو اس کی اٹھارہ سال ہے مگر لگتی چوبیس پچیس سال کی ہے۔ اور جہاں تک حسین نظر آنے کی بات ہے تو قصبے کا کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اس کی طرف نہ دیکھتا ہو۔''

پروڈیوسر ایک آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ ''اس کا

مطلب ہے کہ وہ دیکھنے کی چیز ہے۔"
شری واستو نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ہم بغیر ثبوت کے کوئی خبر شائع نہیں کر سکتے۔"
لیکن پروڈیوسر کو مومی کا ذکر کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔ وہ بولا۔ "جس انداز سے تم مومی کا ذکر کر رہے ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی آزاد خیال ہے۔"
"آزاد خیال تو بہت ہے مگر اسے آزادی حاصل نہیں ہے۔" راجو بوری بولا۔
"اس کا باپ عبدالرحمٰن کریانے کی دکان کرتا ہے۔ نہایت قدامت پسند اور سخت مزاج آدمی ہے۔ اگر اس نے مومی کو کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔"
پروڈیوسر اکشے... دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ "آج کل کی لڑکیاں والدین کی پابندیوں کی پروا نہیں کرتیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس لڑکی کا انٹرویو بھی نشر کر سکتے ہیں۔"
شری واستو جو مومی کے ذکر سے خاصی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا، بولا۔ "اس کا باپ اس بات کی اجازت نہیں دے گا، اسے پبلسٹی پسند نہیں ہے۔"
اشوک کیمرا مین نے شری واستو کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مومی اپنے باپ کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ چند روز پہلے وہ ممبئی جانے کی بات کر رہی تھی، کسی نے اسے فلموں میں کام دلانے کا جھانسا دیا ہے۔"
"مومی شروع سے ہی خواب دیکھنے کی عادی ہے۔" شری واستو نے برہمی سے کہا۔
"اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے گھر میں سکون نہیں ہے۔ ایسے گھروں کی لڑکیاں عموماً فرار کی راہیں تلاش کرتی ہیں۔"
پروڈیوسر اکشے کمار نے آنکھیں پھیلا کر پہلے اپنے کیمرا مین اور پھر اخبار کے ایڈیٹر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں اس لڑکی کو کافی قریب سے جانتے ہو۔"
شری واستو اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "او کے حضرات! میں اب چلتا ہوں، دفتر میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔" وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد پروڈیوسر اکشے نے اپنے کیمرا مین اشوک سے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ شری واستو جی کو مومی کا ذکر پسند نہیں آیا۔"
اشوک بولا۔ "کوئی بھی اپنی محبوبہ کا سرِ عام ذکر پسند نہیں کرتا۔"
"محبوبہ؟" پروڈیوسر نے پوچھا۔ "کس کی محبوبہ؟"
"مومی کا شری واستو کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔" اشوک نے کہا۔
"لیکن... شری واستو تو شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔"
"عشق کرنے والے بیوی بچوں کی کب پروا کرتے ہیں اور پتا نہیں مومی نے اسے جھانسے میں ہی رکھا ہو۔ بہت چالاک اور چلتا پرزہ ہے۔ دامن بھی بچاتی ہے کام بھی نکلوا لیتی ہے۔" اشوک نے مزید بتایا۔ "حقیقت یہی ہے کہ شری واستو نے مومی کو ممبئی کی فلم انڈسٹری میں کام دلانے کا فریب دے رکھا ہے۔ جب تک ہاشم زندہ تھا، دونوں بہت محتاط تھے۔"
"مطلب ہاشم بھی مومی میں دلچسپی رکھتا تھا؟"
"ہاں، مومی تو اس کے بھائی کی سالی تھی۔ ہاشم اور مومی میں دوستی بھی تھی مگر ہاشم اس پر اپنا حق جتاتا رہتا تھا، اس پر حکم چلاتا تھا۔ مومی کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ تو آزاد پرندہ ہے ابھی اونچا اڑنا چاہتی ہے۔ ہاشم بھی مومی پر نظر رکھتا تھا اور اسے باپ سے شکایت کرنے کی دھمکی بھی دیا کرتا تھا۔ مومی کو اپنے سخت گیر اور قدامت پسند باپ سے بہت ڈر لگتا تھا، اس لیے بھی وہ ہاشم سے دبتی تھی۔ کسی طرح اسے مومی اور شری واستو کے معاشقے کا پتا چلا تو ہاشم نے اس کے دفتر جا کر واستو کو دو تھپڑ بھی مارے تھے۔ گویا ہاشم مومی شری واستو کے معاشقے کے بیچ سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ بعد میں ہاشم کی پراسرار گمشدگی یا قتل کے بعد... محمد رمضان نے اپنے بھائی کے قتل کا الزام شری واستو پر لگایا مگر وہ اپنے الزام کو ثابت نہ کر سکا۔"
"وہ ثابت کیسے کرتا؟" راجو بوری نے کہا۔ "ہاشم کو تو خلائی مخلوق اغوا کر کے لے گئی ہے۔"
"او کے..." پروڈیوسر نے کہا۔ "ہمیں پروگرام ریکارڈ کرنا چاہیے۔"
تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔
"یہ پروگرام نشر نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے کہا۔ "پولیس اس بڈھے سے بات کرنا چاہتی ہے۔"
"کک... کیا مطلب...؟" راجو بوری نے غصے سے پوچھا۔
"مطلب یہ کہ... جس نوجوان کو تم نے خلا میں بھیجا

تھا، اس کی لاش زمین سے برآمد ہو گئی ہے۔" یہ سنتے ہی راجو بوری کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ باہر نکلا تو دو پولیس والے جن میں ایک وردی سے افسر نظر آتا تھا، اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔
"میں انسپکٹر ونود ہوں، یہ میرا ساتھی سپاہی وجے ہے۔ کیا تم ہی رمیش بھوجوانی عرف راجو بوری ہو؟" افسر نظر آنے والے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ہاں۔" راجو بوری کے حلق سے بمشکل آواز برآمد ہوئی۔
"میں نے سنا ہے کہ تم نے ہاشم کو کسی خلائی مخلوق کے ساتھ اڑن طشتری کے اندر دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے؟"
"ہاں۔"
انسپکٹر ونود نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیلٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ وہ بیلٹ ہے جو تمہارے دعوے کے مطابق ہاشم نے اڑن طشتری کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا؟"
"ہاں، یہ وہی بیلٹ ہے۔"
"تم نے ہاشم کو کب دیکھا تھا؟"
"یہ... یہ کل صبح کی بات ہے۔"
انسپکٹر ونود نے آنکھیں پھیلا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا پھر بولا۔
"غالباً تمہیں اس بات پر زیادہ تعجب نہ ہوگا کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے ہاشم کی لاش دریافت کی ہے اور میڈیکل ایگزامنر کا اندازہ ہے کہ لاش کم از کم تین ماہ پرانی ہے۔"
"مم... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جس نوجوان کو میں نے اڑن طشتری میں دیکھا تھا، وہ ہاشم کا کوئی ہم شکل بھی ہو سکتا ہے۔"
"قصبے میں ہاشم کے علاوہ کوئی اور نوجوان روپوش نہیں ہے اور نہ ہی ہاشم کا کوئی ہم شکل تھا۔ تاہم اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو اس بیلٹ کے متعلق تم کیا جواز پیش کرو گے؟"
انسپکٹر ونود کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اس کا ساتھی وجے بھی اسی لہجے میں بولا۔
"اگر آدمی ہم شکل ہو سکتا ہے تو بیلٹ کیوں نہیں ہو سکتا... بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس ہم شکل کا نام بھی ہاشم ہوگا کیونکہ بیلٹ پر "ایچ" سے یہی نام بنتا ہے۔"
انسپکٹر ونود نے آخر میں سرد نظروں سے گھورتے ہوئے راجو بوری سے کہا۔
"مسٹر رمیش بھوجوانی عرف راجو بوری... ہم تمہیں ہاشم کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتے ہیں۔"
راجو بوری کے بدن میں خوف کی ایک لہر اسرایت کر گئی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ بات اس حد تک بھی آگے جا سکتی ہے۔ گویا سستی شہرت الٹا اس کے گلے پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز اخبارات میں قتل کی نمایاں خبر شائع ہوئی۔
"نوجوان کو اڑن طشتری میں دیکھنے کا دعوے دار قاتل نکلا، لاش کو قبرستان میں دفن کرنے کے تین ماہ بعد مشہور کر دیا کہ مقتول ہاشم کو خلائی مخلوق نے اغوا کر لیا ہے۔"
پولیس نے قتل کا کیس درج کر کے راجو بوری کو جیل میں بند کر دیا۔ اگرچہ قتل کا کوئی محرک پولیس کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا مگر ہاشم کے بیلٹ کا برآمد ہونا راجو بوری کے خلاف جاتا تھا۔ گرفتاری کے بعد راجو بوری کا ارادہ تھا کہ وہ پولیس کے سامنے اصل حقیقت بیان کر کے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے گا لیکن گرفتاری والی رات شری واستو اس سے آ کر حوالات میں ملا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے اڑن طشتری والے بیان میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔
"میں تمہارے لیے وکیل کا انتظام کر رہا ہوں۔"
اس نے راجو بوری کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "خلائی مخلوق اپنی ماورائی قوتوں کی وجہ سے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ انہوں نے ہاشم کو قتل کر دیا ہو اور اس کا کوئی ہم شکل بنا لیا ہو۔"
شہرت کا متمنی راجو بوری اس کی باتوں میں آ گیا اور پولیس کے سامنے حقیقت کا اظہار نہیں کیا۔
پولیس نے اس کے خلاف خاصا مضبوط کیس بنایا۔ سرکاری وکیل نے عدالت کو بتایا کہ راجو بوری نے اپنا جرم چھپانے کے لیے ایک عجیب و غریب کہانی گھڑ لی تھی۔ اس کا مقصد تو اپنا جرم چھپانا تھا اور دوسرا مقصد شہرت حاصل کرنا تھا۔
شری واستو اسے جیل میں ملا اور کہا۔ "رمیش! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ میں نے جس وکیل سے بات کی تھی، وہ بہت زیادہ فیس مانگ رہا ہے اور میرے مالی حالات آج کل اتنے اچھے نہیں ہیں۔"
راجو بوری نے حیرت سے شری واستو کو گھورا۔ "کوئی بات نہیں واستو جی! مجھے شہرت کی تمنا تھی، سو وہ مجھے مل گئی ہے۔ اب مجھے اور کیا چاہیے... لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ہاشم کو قتل کس نے کیا تھا اور عین اس رات اس کی لاش کیسے برآمد ہو گئی، جس رات میرا انٹرویو ریکارڈ کیا

جانے والا تھا؟"

"کسی نے پولیس کو فون کر کے ہاشم کے مدفن کی نشاندہی کر دی تھی۔"

یہ بات سن کر راجو بوری کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ پولیس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا، نہ ہی ایسی کوئی خبر اخبار میں چھپی تھی۔

اگلے روز اس نے انسپکٹر ونود کو بلایا اور کہا کہ وہ کیس کے بارے میں سچ بولنا چاہتا ہے۔

انسپکٹر ونود نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔ "کیا تم اقبالِ جرم کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، تم اسے اقبالِ جرم بھی کہہ سکتے ہو۔"

اس کے بعد راجو بوری نے اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ کس طرح اس کے دل میں دولت اور شہرت کی خواہش پیدا ہوئی۔ کس طرح اس نے جنگل میں اڑن طشتری کے فرضی نشانات بنائے اور جنگل میں ملنے والے بیلٹ کو ثبوت کے طور پر استعمال کیا۔

انسپکٹر ونود نے پوچھا۔

"تم نے شروع میں یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟"

"مجھے شری واستو نے منع کر دیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہترین وکیل کر کے مجھے بری کرا لے گا۔ لیکن کل وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ وہ وکیل بہت زیادہ فیس مانگ رہا ہے اس لیے وہ وکیل کا انتظام نہیں کر سکتا۔"

"لہٰذا تم نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا؟"

"شری واستو نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو کسی نے گمنام فون کے ذریعے لاش کے بارے میں بتایا تھا۔ میں رات بھر یہ سوچتا رہا ہوں کہ فون کرنے والے کو لاش دفن کرنے کے بارے میں کیسے پتا چلا اور اس نے پہلے یہ اطلاع کیوں نہیں دی؟"

انسپکٹر ونود کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ حیرت سے راجو بوری کا چہرہ تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات تھے۔ وہ بولا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گمنام فون والی بات تمہیں شری واستو نے ہی بتائی ہے؟"

"میرا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہے جو کسی کی کہی ہوئی بات بھول جاؤں۔"

انسپکٹر ونود نے راجو بوری کو دوسرے کمرے میں بھجوا دیا اور اپنے اسسٹنٹ وجے کو ہدایات دینے لگا۔

نصف گھنٹے بعد خوف زدہ شری واستو وجے کے ہمراہ انسپکٹر ونود کے سامنے تھا۔

انسپکٹر ونود نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

"کیا تم نے راجو بوری سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کے لیے وکیل کا انتظام کرو گے؟"

"ہاں۔" وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے بے سہارا سمجھ کر اس کی مدد کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن..."

انسپکٹر ونود اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کیا تم نے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اڑن طشتری والی کہانی پر قائم رہے اور کوئی دوسرا بیان نہ دے؟"

"یہ مشورہ میں نے اس کی بہتری کے لیے دیا تھا۔"

"کیا یہ بات تم نے اسے بتائی تھی کہ کسی نے گمنام فون کے ذریعے لاش کی نشاندہی کر دی ہو گی؟"

شری واستو گھبرا کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ حقیقت بھی یہی ہے۔"

انسپکٹر ونود اٹھتے ہوئے بولا۔ "شری واستو! میں تمہیں ہاشم کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔"

"مم... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ ہے کہ گمنام فون کرنے والی بات یا تو میں جانتا ہوں یا وہ شخص جس نے فون کیا تھا۔ اسے یہ بات بہ خوبی معلوم تھی کہ ہاشم کی لاش کہاں دفن ہے کیونکہ اسی نے اسے قتل کر کے وہاں دفن کیا تھا۔ اس نے مناسب موقع دیکھ کر مجھے فون کیا تھا اور وہ شخص تم ہو۔ میں نے یہ بات ابھی تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ تم نے جب دیکھا کہ سادہ لوح راجو بوری مقتول کے بیلٹ سے ایک عجیب و غریب کہانی منسوب کر کے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو تم نے سوچا کہ کیوں نہ ہاشم کا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ یوں تمہارا دستِ قاتل ایک بار پھر حرکت میں آیا مگر تم یہ بات بھول گئے کہ مقتول کے بھائی محمد رمضان نے اپنے بھائی ہاشم کی گمشدگی کے سلسلے میں تمہارے خلاف رپورٹ درج کروائی تھی اور موی کے معاملے میں تمہارا ہاشم کے ساتھ دو تین بار جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اب میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں نے راجو بوری کو چارے کے طور پر گرفتار کیا تھا۔ وہ سیدھا سادہ آدمی قتل کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم اقبالِ جرم کر لو تو ہم اور تم بہت سی بدمزگی سے بچ جائیں گے۔"

شری واستو کے کندھے ڈھلک گئے، وہ دل شکستہ انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔
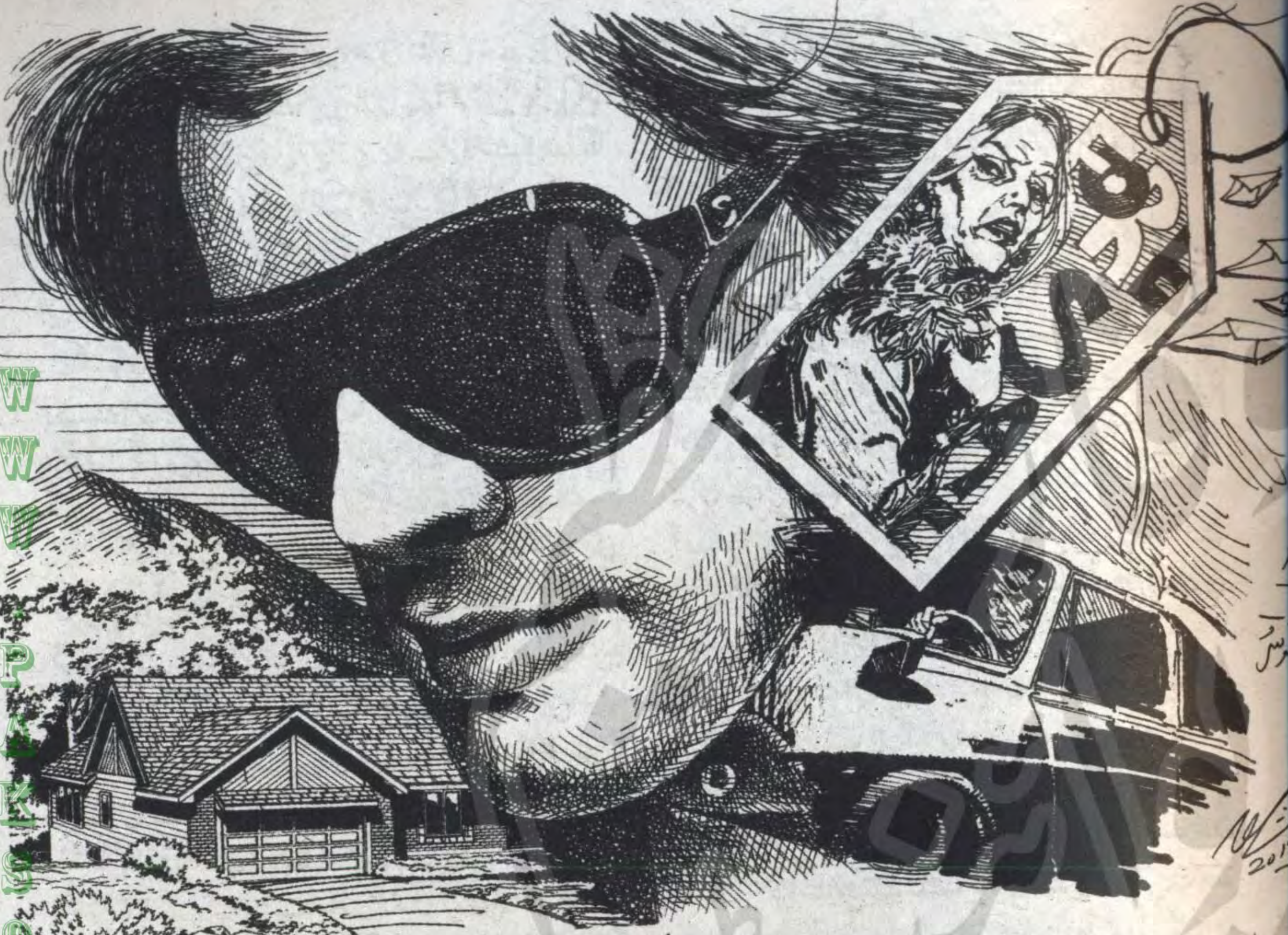
خریدار

بابر نعیم

اچھے پڑوسی قسمت سے ملتے ہیں... اور اب تو یہ بات بھی خوابوں خیالوں کی معلوم ہوتی ہے... گزرتے دور میں اب کسی ہمسائے کو اپنے پڑوسی سے کسی قسم کا واسطہ نہیں... ایک ایسے ہی پڑوسی کی مشکل جو کسی صورت اپنے ہمسائے کے گھر کو آباد دیکھنا نہیں چاہتا تھا...

ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی فنکاری جو ہر حال میں اپنا فائدہ چاہتا تھا...

جارج بلنگ نے ہاتھ بڑھا کر پسنجر سیٹ پر پڑا ہوا پلاسٹک کا ڈبا اٹھایا اور اس میں سے ایک سینڈوچ نکال کر کھانے لگا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی اور وہ جس مشن پر اس علاقے میں آیا تھا، اس کی تکمیل میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔ اسے ہر حال میں یہ کام آج ہی پورا کرنا تھا لہٰذا اس نے وقت گزرنے کے احساس کو ذہن سے جھٹک دیا اور پوری یک سوئی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔

نمبر پانچ، کینلے اسٹریٹ، سرخ اینٹوں سے بنا ایک کشادہ مکان تھا جو غالباً انیسویں صدی کے آخر میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے باغ کی بیرونی دیوار پر برائے فروخت کا بورڈ لگا تھا جو دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا اور وہ اسے حسرت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے گزر جاتے تھے کیونکہ ایسا عالی شان مکان خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ کچھ عرصے سے ایسے واقعات پیش آرہے تھے جن کی وجہ سے اس مکان کی فروخت میں مشکل ہوگئی تھی۔۔۔۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے اپنے بروشر میں اس مکان کو ایک مثالی رہائش گاہ قرار دیا تھا لیکن جارج جانتا تھا کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

گوکہ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن پہلی منزل پر واقع بیڈروم میں روشنی ہورہی تھی۔ جارج اپنی پرانی فورڈ کار میں کھڑکی پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا اور اسے۔۔۔ بیڈروم میں کسی غیر معمولی سرگرمی کے شروع ہونے کا انتظار تھا۔

مقامی اخبار میں اشتہار دینے کے بعد اسے کام ملنے لگا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اشتہار کا مضمون تیار کیا تھا۔ ''مکمل ذہنی سکون صرف دو سو پچاس پاؤنڈز میں (بشمول ٹیکس)۔۔۔۔'' گوکہ اس نے ساری زندگی ٹیکس نہیں دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح اس کے گاہکوں پر اچھا تاثر قائم ہوگا اور وہ ایک قانون پسند شہری سمجھ کر اس سے رجوع کریں گے۔

اپنے اس کاروبار کا آئیڈیا اسے سابقہ بیوی کے بھائی فرینک کو دیکھ کر آیا۔ اس نے قبرستان کے برابر میں ایک فلیٹ خریدا تھا جہاں دن بھر خاموشی چھائی رہتی لیکن رات ہوتے ہی یہ علاقہ منشیات کے عادی افراد کی آماج گاہ بن جاتا۔ فرینک اس صورتِ حال سے بہت عاجز تھا اور وہ کئی بار جارج کے سامنے اپنا دکھڑا رو چکا تھا۔ اس کی مسلسل شکایتیں سن سن کر جارج کے دماغ میں اس کاروبار کا خیال سر اٹھانے لگا۔ اس وقت مارکیٹ میں کوئی بھی اس نوعیت کا کام نہیں کررہا تھا اور جارج کے لیے کامیابی کے کافی امکانات تھے۔

جارج نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ گزشتہ شب اس وقت تک سڑک سنسان ہوچکی تھی البتہ ایک طوائف اپنے گاہک کے ساتھ ضرور آئی تھی اور ان دونوں نے عارضی ٹھکانے کے طور پر سات نمبر مکان کی باڑھ کا عقبی حصہ منتخب کیا تھا۔ جارج نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس واقعے کا ذکر بھی مسٹر فیلڈ کو دی جانے والی رپورٹ میں کرے گا جو پانچ نمبر کے ممکنہ خریدار تھے اور انہوں نے ہی جارج کو اس علاقے کی صورتِ حال جاننے کے لیے منتخب کیا تھا۔

جارج نے سینڈوچ ختم کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا تبھی ایک کار آئی اور سڑک کے دوسری جانب رک گئی۔ جارج نے غور سے دیکھا۔ اسے کار میں تین مرد بیٹھے نظر آئے۔ اس نے اپنی ٹانگیں مزید پھیلائیں اور اپنی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔

کار کی روشنیاں بجھ گئی تھیں جبکہ تینوں افراد گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ان میں سے دو اگلی نشستوں اور ایک پچھلی سیٹ پر براجمان تھا۔ جارج نے مشروب کی بوتل نکالی لیکن اسے ڈر تھا کہ اس کی کوئی بھی حرکت کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کرسکتی ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی نظر میں آئے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لوگ تنگ آکر وہاں سے چلے جائیں لیکن انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید وہ بھی جارج کی طرح سڑک کی نگرانی کررہے تھے۔

جارج نے ان کے بارے میں سوچنا شروع کردیا کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ اگر وہ منشیات کا لین دین کررہے تھے تو ایسی صورت میں اسے اپنا سر جھکا لینا چاہیے تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا لیکن اس کے علاوہ اور بھی امکانات ہوسکتے تھے۔ جارج نے کینلے اسٹریٹ کے رہنے والوں کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، وہ کافی اہم تھیں اور ان میں سب سے اہم وہ خبر تھی جو مقامی اخبارات میں شائع ہوچکی تھی۔

مسٹر فیلڈ جو مکان خریدنا چاہ رہے تھے، وہ ایک ریسرچ سائنس داں جولین البرٹ کی ملکیت تھا۔ جارج اس حقیقت سے واقف ہوچکا تھا کہ البرٹ کو جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والے انتہا پسندوں کی جانب سے دھمکیاں مل رہی ہیں اور اس نے کینلے اسٹریٹ کے بارے میں حاصل کردہ معلومات کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیا تھا۔

یہ بہت ضروری تھا کہ اس کے کلائنٹ مسٹر فیلڈ کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ مکان نمبر پانچ کے مالک کو دھمکیاں مل رہی ہیں۔ جارج کو شبہ تھا کہ طوائف والے واقعے کے ساتھ جب یہ بات بھی گاہک کو معلوم ہوگی تو ممکن ہے کہ وہ اس مکان کو خریدنے کا ارادہ ترک کردے۔

مسٹر فیلڈ مکان نمبر پانچ اور اس کے مکینوں کے بارے میں ایک ایک بات جاننا چاہتا تھا اور اس کی یہ غیر معمولی دلچسپی جارج کو کھٹک رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود بھی جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیم کا رکن ہو اور مسٹر البرٹ کے لائف اسٹائل اور عادات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا ہو لیکن اسے اس بارے میں تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے اس خدمت کے عوض معقول معاوضہ دے رہا تھا لہٰذا اس نے بھی زیادہ سوالات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کار کی نشست پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس کا دایاں پیر اکڑنے لگا تھا۔ اس نے اپنی نظریں کار پر جمائیں اور ذرا سا اپنے آپ کو اوپر اٹھایا لیکن کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ تینوں افراد اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ جارج نے آہستہ آہستہ اپنے پیر کو ہلانا شروع کیا تاکہ خون کی گردش بحال ہوسکے پھر اس کی نظر مکان نمبر پانچ کی پہلی منزل پر واقع بیڈروم کی کھڑکی پر گئی۔ اسے وہ عورت دوبارہ وہاں نظر آئی جو یقیناً مسز البرٹ ہوگی۔ وہ کھڑکی تک آئی، اس نے ایک نظر باہر کا جائزہ لیا اور کھڑکی کا پردہ برابر کردیا۔ اس طرح کمرے کے اندر کا منظر جارج کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جارج کو شدت سے ڈرنک کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ اس نے برابر والی سیٹ پر رکھی ہوئی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مخالف سمت میں کھڑی کار کا دروازہ کھلا اور عقبی نشست پر بیٹھا ہوا شخص کار سے باہر آگیا۔ جارج یہ منظر دیکھتے ہی بالکل ساکت ہوگیا اور اس کے ذہن سے وہ تمام خیالات بھاپ بن کر اڑ گئے جو چند سیکنڈ پہلے اس عورت کے بارے میں گردش کررہے تھے۔

کار سے اترنے والا شخص اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں اعتماد تھا۔ جب وہ قریب آیا تو جارج نے دیکھا کہ وہ جوان اور مضبوط جسم کا مالک ہے اور ایسے شخص کے ساتھ کسی قسم کی بحث کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس نے قریب آکر جارج کی طرف والی کھڑکی کے شیشے پر دستک دی۔ جارج کو تھوڑا سا تامل ہوا، ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ انجن اسٹارٹ کرے اور گاڑی بھگا کر لے جائے لیکن جب اس شخص نے پولیس کارڈ دکھایا تو جارج نے تیزی سے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ غلط جگہ گاڑی پارک کرنے کی وجہ سے اس کا چالان ہوسکتا ہے۔

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں آفیسر؟'' اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک قانون پسند شہری ہے اور پولیس سے پوری طرح تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

جارج کے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا کارڈ نکالا اور اپنا بزنس کارڈ اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ''مکان نمبر پانچ برائے فروخت ہے اور میرا کلائنٹ اسے خریدنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس نے مجھے یہ ذمے داری سونپی ہے کہ علاقے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرکے اسے رپورٹ کروں۔''

''تمہارا کلائنٹ کون ہے؟'' پولیس آفیسر نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''کیا میں اس کا نام جان سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں۔۔۔۔ کیوں نہیں۔ اس کا نام مسٹر فیلڈ ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا بھی دے سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور اپنے کلائنٹ کا بزنس کارڈ نکال کر پولیس والے کے حوالے کردیا۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اپنی ڈائری میں پتا نوٹ کیا اور کارڈ جارج کو واپس کردیا۔

جارج نے تھوڑا سا سکون محسوس کیا اور اپنے اندر اعتماد پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہے، میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ اس علاقے میں رہنے والے ایک سائنس داں کو دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''یہ معمول کی بات ہے۔'' پولیس والے نے تیزی سے جواب دیا۔ ''سوری، میں نے تمہیں زحمت دی۔''

آفیسر نے تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن جارج نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ میں ان دھمکیوں کا ضرور ذکر کرے گا۔ اس کی رائے میں ان وجوہات کی بنا پر مکان نمبر پانچ کو خریدنا مناسب نہ تھا۔

جارج کا خیال تھا کہ پولیس کار اپنی نگرانی جاری رکھے گی لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ کچھ دیر بعد وہ کار وہاں سے روانہ ہوگئی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مرکزی شاہراہ پر جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ جارج اپنی نشست پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور برابر والی سیٹ پر جھک کر اس نے ڈرنک کی بوتل اٹھالی۔ پھر اس نے وقت گزاری کے لیے ریڈیو آن کردیا اور مقامی اسٹیشن کی نشریات سننے لگا۔

گیارہ بج رہے تھے اور جارج کی نظریں باہر سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی نشے کا عادی، طوائف، دہشت گرد یا کوئی اور سماج دشمن شخص علاقے کا سکون غارت کرنے تو نہیں آگیا۔ اس نے مکان نمبر پانچ کے بیڈروم کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پردے سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ جولین البرٹ کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔

ریڈیو پر ہلکی ہلکی موسیقی بج رہی تھی اور وہ سحر انگیز دھنوں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اچانک ہی موسیقی تھم گئی اور ایک عورت نے مقامی لہجے میں گیارہ بجے کی خبروں کا اعلان کیا۔ جارج ہمہ تن گوش ہوگیا اور اس نے ریڈیو کی آواز بڑھا

دی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی۔

"پولیس نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ مقامی سائنس داں جولین البرٹ کو ایک اور جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی ہے اور یقین کیا جا رہا ہے کہ یہ دھمکی جانوروں کا تحفظ کرنے والی تنظیم کی جانب سے دی گئی ہے۔ ڈاکٹر البرٹ کو منع کیا گیا تھا کہ وہ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں جانوروں پر تجربات کرنا چھوڑ دیں لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی جس کی وجہ سے انہیں گزشتہ ایک سال سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔"

جارج سمجھ گیا کہ پولیس اس علاقے میں باقاعدگی سے کیوں گشت کر رہی تھی اور اس علاقے میں اس کی موجودگی سے پولیس والوں کے ذہن میں شبہات جنم لے سکتے تھے کہ وہ نصف شب کے قریب اپنی کار میں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ پولیس والے کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور انہیں بالکل بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ایک درمیانی عمر کا آدمی دہشت گردوں کا ساتھی ہو سکتا ہے۔

نیوز کاسٹر اب دوسری خبروں کی تفصیل بتا رہی تھی جن سے جارج کو کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر اچانک ہی اس نے ایک چونکا دینے والی خبر پڑھنا شروع کر دی جس کے مطابق پولیس ابھی تک اس شخص کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جس نے گزشتہ ہفتے ایک عورت کو اس کے گھر میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ پولیس اس قتل کا تعلق بھی تین میل دور پیش آنے والے ایسے ہی واقعے سے جوڑ رہی تھی۔ جارج نے ایک جھرجھری لی اور ریڈیو بند کر دیا۔

جیسے ہی جارج نے باہر کی جانب دیکھا، اسے وہاں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ ایک سایہ اس باڑھ سے نمودار ہو رہا تھا جو مکان نمبر پانچ کے بیرونی باغ اور سڑک کے درمیان واقع تھی۔ جارج نے اپنی سانس روک لی اور نظریں اس پر جما دیں۔

☆☆☆

کیرن البرٹ نے جب نیچے سیڑھیوں پر آواز سنی تو وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی۔ وہ ڈبل بیڈ کے کنارے پر بیٹھی کان لگا کر سننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دوبارہ کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید کوئی بلی کودی ہو گی۔ اس نے اپنے پیروں میں سلیپر ڈالے اور دروازے کی طرف چل دی۔ وہ اپنے طور پر اطمینان کر لینا چاہ رہی تھی۔ جب سے دھمکی آمیز خطوط ملنا شروع ہوئے تھے، وہ خاصی محتاط ہو گئی تھی۔ گو کہ پولیس نے ان کے گھر کی نگرانی کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ ہر ایک گھنٹے بعد پٹرول کار بھیجنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ محض ایک رسمی کارروائی تھی۔

اس نے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ جولین کی غیر موجودگی میں ایسا ہی ہوتا تھا، گھر یا باغ میں ہونے والی ہلکی سی آواز بھی اس کا دل دہلا دیتی تھی۔ خاص طور پر جب سے دھمکی آمیز خطوط کا سلسلہ شروع ہوا تھا، صورتِ حال اور بھی گمبھیر ہو گئی تھی۔ اس نے زینے کے جنگلے کو پکڑ کر ہال میں جھانکا۔ بیرونی دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہاں اسے کچھ نظر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی آواز سننے میں آئی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ واپس مڑی اور اپنے بیڈروم کی طرف چل دی۔ اب اسے نیند آ رہی تھی۔ جولین کو صبح واپس آنا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہتی۔ لیکن جیسے ہی وہ بیڈروم کے دروازے تک پہنچی، ایک زوردار دھماکے نے رات کی خاموشی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، وہ چکرا کر فرش پر گر گئی اور اس نے سر کو بچانے کے لیے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔

وہ خوف کے عالم میں کچھ دیر تک بے سدھ پڑی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ ہو۔ اسے گھر کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے اعضا کو چیک کرنے کے لیے جسم کو تھوڑی سی حرکت دی۔ اس کا جسم سخت ہو گیا تھا لیکن زمین پر گرنے سے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ اسے آگ کا شعلہ یا اڑتی ہوئی مٹی نظر آئے گی مگر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اس نے اپنی ساری قوت مجتمع کی اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اسے باہر نکل کر دیکھنا تھا کہ سب کچھ صحیح سلامت ہے اور کوئی بڑا نقصان تو نہیں ہوا۔

وہ چوروں کی طرح سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئی تو اس نے دیکھا کہ مرکزی دروازے میں لگا ہوا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور اس کے ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے لائٹ جلانے ہی والی تھی کہ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ممکن ہے کہ حملہ آور یہیں کہیں چھپے ہوں اور روشنی ہو جانے پر وہ بہ آسانی ان کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ہلکے سلیپر پہن رکھے تھے اس لیے وہ بکھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کے درمیان سے گزر کر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ وہ آدھے راستے میں رک کر اگلے قدم کے

بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک بڑے سے پتھر پر گئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا کہ معاملہ صرف پتھر تک ہی محدود رہا ورنہ دھمکی آمیز خطوط میں تو اس سے بھی زیادہ خطرناک چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک وارننگ ہو۔ اس بار پتھر آیا ہے، اگلی مرتبہ بم بھی مارا جا سکتا ہے۔

کیرن مڑی اور دوبارہ اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگی تاکہ پولیس کو فون کر سکے پھر اس نے ڈور بیل کی آواز سنی۔ کوئی شخص دروازے پر کھڑا بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "مسز البرٹ! تم ٹھیک تو ہو؟"

اسے لگا کہ یہ کسی پولیس والے کی آواز ہے جو دھماکے کی آواز سن کر آ گیا ہے لیکن احتیاط ضروری تھی لہٰذا وہ چند لمحے سیڑھیوں پر خاموش کھڑی رہی۔ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "مسز البرٹ! سب ٹھیک ہے۔ حملہ آور جا چکا ہے۔ میں نے خود اسے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ مسز البرٹ! کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟"

وہ پُرسکون ہو گئی۔ یہ آواز اس کے پڑوسی بل سے ملتی جلتی تھی جو بے حد مصروف شخص تھا اور کسی سے نہیں ملتا جلتا تھا۔ بس کبھی کبھی آتے جاتے، ہیلو ہائے ہو جاتی تھی پھر بھی وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ شاید بل نے چند روز پہلے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر جا رہا ہے لیکن اسے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ گزشتہ ہفتے باغ کی عقبی دیوار پر کھڑے ہو کر ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر دیتی تھی کیونکہ وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتا تھا۔ وہ ایک بار پھر جوتے بدلنے اوپر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ بل کو اندر بلانے کے بعد وہ پولیس کو فون کرے گی۔

☆☆☆

جارج کا خیال تھا کہ کیرن اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ جائے گی لیکن اس نے ایک اجنبی کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال تھا کہ دروازے پر میرا پڑوسی ہے۔"

پھر اس نے سر سے پاؤں تک جارج کو دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اس شخص کا جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس نے مضبوطی سے گاؤن کو اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسز البرٹ! میرا نام جارج بلنگ ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور اس شخص کے لیے کام کر رہا ہوں جو یہ مکان خریدنا چاہ رہا ہے۔ اسی لیے مجھے تمہارا نام بھی معلوم ہے۔"

مسز البرٹ کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا تو جارج اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس مکان کے ممکنہ خریدار مسٹر فیلڈ علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہیں یہ بھی فکر ہے کہ رات کے وقت جرائم پیشہ لوگ شور شرابا یا لوٹ مار تو نہیں کرتے۔ میں نے ایک لڑکے کو تمہارے دروازے پر پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا تو تمہاری خیریت معلوم کرنے چلا آیا۔"

یہ کہہ کر جارج چند لمحوں کے لیے رکا پھر فرش پر پڑے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں ان کی صفائی کرنے کے لیے مدد کی ضرورت ہے؟"

"میں پہلے پولیس کو فون کرنا چاہ رہی تھی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی اپنے موبائل فون کے ذریعے انہیں اطلاع دے چکا ہوں۔"

"شکریہ، یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ جارج سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک اس پر بھروسا کرنے کے بارے میں تذبذب میں مبتلا ہے۔

مسز البرٹ کے چہرے پر ایک کمزور سی مسکراہٹ آئی اور وہ بولی۔ "بہتر ہو گا کہ تم اندر آ جاؤ۔"

اس نے ہال میں قدم رکھا تو اس کے بھاری بوٹوں کے نیچے شیشے کے ٹکڑے چرچرانے لگے۔

"میرا شوہر دروازہ دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ ہم نے اسے اس کی اصل حالت میں برقرار رکھنے کے لیے کافی رقم خرچ کی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ انشورنس کی رقم سے تمہارا نقصان پورا ہو جائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اگر تمہارے پاس کوئی لکڑی یا کارڈ بورڈ کا ٹکڑا ہو تو میں اسے یہاں لگائے دیتا ہوں۔ اس حالت میں یہ دروازہ تمہارے لیے غیر محفوظ ہے۔"

"کیوں نہ ہم پولیس کا انتظار کر لیں۔ ان کے آنے سے پہلے کچھ کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ میں خود بھی پولیس میں رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس سلسلے میں تمہارا بیان ہی کافی ہو گا۔ ضروری نہیں کہ وہ جائے واردات کو اصل حالت میں دیکھنا چاہیں۔"

اس نے چاند کی روشنی میں مسز البرٹ کے چہرے کے

تاثرات دیکھے۔ یہ جان کر کہ وہ سابق پولیس مین ہے، اس کی پریشانی کافی حد تک دور ہوگئی تھی اور یہ ایک اچھی علامت تھی۔

''کیا میں ہال کی لائٹ جلادوں؟'' کیرن نے پوچھا۔

''نہیں، ممکن ہے کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کہ ہم عقبی حصے کی طرف چلتے ہیں۔ تم کچن میں جا کر دیکھو کہ ایک کپ چائے مل سکتی ہے۔''

وہ اسے لے کر کچن کی طرف چلی گئی اور وہاں کی لائٹ آن کردی۔ اب وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے تصور سے زیادہ پُرکشش تھی۔ سیاہ بالوں اور بائیں گال پر تل سے اس کا حسن نکھر گیا تھا۔ تیس سال کی عمر میں بھی اس کا جسم بے حد متناسب تھا اور باریک سلک کے گاؤن سے اس کے خدوخال واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کسی عورت کو دیکھنا بداخلاقی ہے لہٰذا اس نے کچن کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ ایک کونے میں اسے گتے کے بہت سے ڈبے رکھے ہوئے نظر آئے جن میں بہت سا سامان پیک کردیا گیا تھا جس سے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ لوگ گھر بدلنے کی تیاری کررہے ہیں۔ سنک میں گندے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور دائیں جانب راہداری میں ایک اسٹینڈ پر مسز البرٹ کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

''مجھے افسوس ہے کہ گھر کی یہ حالت ہورہی ہے۔'' وہ اپنی شادی کی انگوٹھی انگلی میں گھماتے ہوئے بولی۔ ''میں چائے کا پانی گرم کرنے کے لیے رکھ دیتی ہوں۔ پولیس کے آنے تک ہم چائے پر ہی گزارہ کریں گے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ اس کے لیے پیشگی شکریہ قبول کرو۔''

جملہ ختم کرتے ہی وہ اچانک گھوما اور بولا۔ ''یہ کیسی آواز ہے؟''

''میں نے تو کچھ نہیں سنا۔'' وہ کان لگاتے ہوئے بولی۔ ''شاید پولیس آگئی ہو۔''

''نہیں، میں ان کے قدموں کی آواز پہچانتا ہوں۔ یہ وہی شخص ہوسکتا ہے جس نے پتھر مار کر تمہارا شیشہ توڑ دیا تھا۔ اب وہ کوئی اور حرکت کرنے والا ہے۔ تم یہیں رکو۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔''

جیسے ہی وہ ہال کی طرف جانے کے لیے مڑا، کیرن نے اس کا بازو پکڑ لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''ہوشیار رہنا۔ وہ بہت خطرناک شخص معلوم ہوتا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم کچن میں ہی چھپی رہو۔ میں تمام روشنیاں بجھا دیتا ہوں تاکہ اندھیرے میں انہیں کچھ نظر نہ آئے۔''

وہ کچن کی کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ جارج نے لائٹ آف کی تو پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ کیرن کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔

☆☆☆

پیٹر فیلڈ اپنے آپ کو دہشت گردی کی وارداتوں میں بہت تجربہ کار سمجھتا تھا لہٰذا اس نے پہلے پتھر مارنے سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ جب دروازے کا شیشہ ٹوٹنے پر بھی کوئی ہلچل نہیں ہوئی، کوئی لائٹ نہیں جلی تو وہ سمجھ گیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ پھر اس نے گھوم کر مکان کا چکر لگایا۔ اسے عقبی حصے میں بھی کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا کیونکہ گھر خالی ہونے کی صورت میں کسی کی جان جانے کا خطرہ نہیں تھا اور اس کے نتیجے میں تنظیم کو کسی ردِعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ورنہ دوسری صورت میں لوگ تنظیم سے بدظن ہوجاتے اور حیران ہوتے کہ جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیم کس طرح کسی انسان کی جان لے سکتی ہے۔ ڈاکٹر جولین البرٹ کو سبق سکھانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ تھا کہ اس کے گھر کو نقصان پہنچایا جائے کیونکہ وہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود اپنے تجربات کے لیے معصوم جانوروں کی جان لینے سے باز نہیں آرہا تھا۔

فیلڈ کو اس علاقے کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ اس نے جارج بلنگ کی خدمات یہ کہہ کر حاصل کی تھیں کہ وہ البرٹ کا مکان خریدنا چاہ رہا ہے لیکن اس سے پہلے علاقے اور وہاں پر ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں جاننا چاہ رہا ہے۔ جارج کو زیادہ سوال کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اسے تو بس اپنے معاوضے سے غرض تھی چنانچہ اس نے علاقے کی مسلسل نگرانی کرکے فیلڈ کو رپورٹیں دینا شروع کردیں کہ مکان نمبر پانچ میں رہنے والوں کی کیا سرگرمیاں ہیں۔ وہاں کن لوگوں کا آنا جانا ہے۔ پڑوس اور قرب و جوار میں کون کون رہتا ہے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد سڑک پر کس طرح کے لوگوں کی آمدورفت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جارج کی خدمات حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ فیلڈ ذاتی طور پر نگرانی کا خطرہ مول لینے سے بچ گیا کیونکہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہ رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ جارج نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔

اسے تمام معلومات حاصل ہوگئی تھیں اور اب عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ گھوم کر مکان کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ کچن کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر اس نے جیب سے درمیانے سائز کی ایک بوتل نکالی جس میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بوتل سے اتنی تباہی ضرور پھیلے گی کہ ڈاکٹر البرٹ دہشت زدہ ہوکر یہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس نے دوسری جیب سے ماچس نکالی اور بوتل کو آگ دکھانے ہی والا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ریوالور کے دستے کی ضرب سے وہ تیورا کر گرا اور اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ جارج نے آگے بڑھ کر کھڑکی میں جھانکا اور کیرن کو آہستہ سے آواز دی۔ وہ وہیں اندر کی جانب دبکی بیٹھی تھی۔ پھر اس نے کیرن کی مدد سے فیلڈ کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

فیلڈ کو ہوش آیا تو وہ پولیس والوں کے نرغے میں تھا۔ سامنے کرسی پر جارج اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور اس کے برابر میں کیرن چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ فیلڈ نے باری باری سب کو دیکھا اور شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

''بہتر ہوگا کہ تم خود ہی پولیس کو اپنے کارناموں کی تفصیل بتادو تاکہ مجھے تمہارا کچا چٹھا بیان کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔''

''میں نے کچھ بھی نہیں کیا بلکہ تم نے مجھے دھوکے سے یہاں بلا کر مجھ پر حملہ کردیا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟'' جارج اس کے ڈھیٹ پن پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ میں نے ہی تمہیں یہاں بلایا تھا تو آتش گیر مادے کی بوتل بیچ میں کہاں سے آگئی؟ اس پر تو یقیناً تمہاری انگلیوں کے نشانات مل جائیں گے۔''

فیلڈ لاجواب ہوگیا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی زبان بند رکھی۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر پولیس آفیسر بولا۔ ''ہم بلاوجہ ہی وقت ضائع کررہے ہیں۔ اسے پولیس اسٹیشن لے چلتے ہیں، وہاں یہ سب کچھ خود ہی اگل دے گا۔ تم اور مسز البرٹ صبح آکر اپنا بیان ریکارڈ کروا دینا۔''

''ٹھیک ہے، میں نے اس شخص کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان سے تمہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

''کیسی معلومات؟ کیا تم پہلے سے اس شخص کے بارے میں جانتے تھے؟''

''ہاں، جب اس نے مجھ سے پہلے اس علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیا تو میں بخوشی اس کام کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے دو تین دن نگرانی کرنے کے بعد اپنی رپورٹ اسے دے دی۔ اس کے باوجود یہ مطمئن نہیں ہوا اور بار بار جانوروں کے حقوق کا... تحفظ کرنے والی تنظیم کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کرتا رہا۔ اس کی تکرار سن کر مجھے شک گزرا اور میں نے اس تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ انٹرنیٹ پر ایسی کسی تنظیم کا وجود نہیں تھا۔ میں نے اخبارات کے دفتروں اور پولیس ہیڈکوارٹر سے اس تنظیم کے دفتر کا پتا جاننا چاہا لیکن کسی کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ بس وہ اتنا جانتے تھے کہ تنظیم کی جانب سے مسٹر البرٹ کو دھمکی آمیز خطوط بھیجے جارہے ہیں۔ میں نے ایک رپورٹر دوست کی مدد سے ایک خط کی کاپی حاصل کرلی۔ میں نے مسٹر فیلڈ سے جو معاہدہ کیا تھا، اس پر اس نے اپنے ہاتھ سے بھی ایک نوٹ تحریر کیا تھا۔ جب میں نے خط کی تحریر کو اس سے ملایا تو یقین ہوگیا کہ یہ خطوط مسٹر فیلڈ کی طرف سے بھیجے جارہے ہیں۔ جب اس بارے میں مزید چھان بین کی تو پتا چلا کہ یہ اس کا پرانا دھندا ہے۔ جب بھی اسے کسی قابلِ فروخت مکان کے بارے میں پتا چلتا ہے، یہ ایسے حالات پیدا کردیتا ہے کہ مالک اونے پونے داموں اپنا مکان اس کے ہاتھ فروخت کردے۔ مسٹر البرٹ کے مکان پر عرصے سے اس کی نظر تھی اور وہ اسے خریدنا چاہ رہا تھا لیکن مسٹر البرٹ نے صاف انکار کردیا۔ تب اس نے ایک فرضی تنظیم کے نام سے دھمکی آمیز خطوط بھیجنے کا سلسلہ شروع کردیا تاکہ مسٹر البرٹ تنگ آکر اپنا مکان اس کے ہاتھوں فروخت کردیں۔ داد دینی چاہیے ہماری پولیس کی فرض شناسی کی کہ انہوں نے معاملے کی تحقیقات کرنے کے بجائے ڈاکٹر کی حفاظت کے لیے محض ایک پٹرول کار بھیجنا ہی کافی سمجھا۔ اگر آج میں بروقت نہ پہنچ جاتا تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا ہوتا۔ کل صبح مسٹر البرٹ کانفرنس سے واپس آتے تو مکان کے عقبی حصے کو ملبے کی صورت میں دیکھ کر پریشان ہوجاتے اور پھر ان کے لیے یہاں سے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ پہلے میرا یہاں رکنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن مسز البرٹ کی پُرکشش شخصیت کو دیکھ کر مجبور ہوگیا کہ پولیس کے آنے تک ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے سے دل بہلاؤں۔''

اس کا آخری جملہ سن کر کیرن شرما گئی اور بے اختیار اس کی نظریں ہال میں لگی ہوئی ڈاکٹر البرٹ کی تصویر کی طرف چلی گئیں۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

اکتیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھار اجو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر... ایک للکار ہے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ مجھے پکوڑا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر

زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے، میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ ہم بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جواب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر عمران نے ایک انگریز افسر اینڈرسن کو قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ وہ راضی ہو گیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک آفتاب پر فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور اللہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں ہمیں پکڑ کر اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعدازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر میں نے اچانک ثروت کی بہن نصرت کو دیکھ لیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ثروت نظر آ گئی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ پھر میں نصرت سے ملا اور ثروت کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا پتا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرون ملک کر دیا۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ "خاص چیز" کیا ہے۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ اسے بھی اس اہم شے کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ ڈاکٹر مہناز کو ہم پر شک ہو گیا تھا کہ ہم جو نظر آ رہے ہیں، وہ نہیں ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اسے بعد میں حقیقت بتا دوں گا۔ پھر میری آنکھوں نے جلالی اور مہناز کی قربت کا منظر دیکھا۔ عمران کی جانوروں میں دلچسپی کے باعث وہ جلالی صاحب کے تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ جلالی صاحب نے 23 مارچ کی چھٹی پر نہر کنارے باربی کیو کا اہتمام کیا۔ واپسی پر ہم جب فارم ہاؤس پہنچے تو پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے وہاں دھاوا بول کر سب کچھ تہس نہس کر ڈالا ہے۔ ایک گارڈ مارا گیا اور کئی ملازمین زخمی ہوئے۔ دو ملازماؤں کی آبروریزی کی گئی۔ پھر عمران نے اس واقعے کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور ہم جاوا کے گرگے سلطان کے اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں کافی لڑائی ہوئی اور عمران نے نادرٹی کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہم نے وہاں پیش آنے والے واقعات کی ویڈیو بنالی تھی۔ ہم واپس فارم ہاؤس پہنچ گئے اور جلالی کو ویڈیو دکھائی۔ ایرانی بلی کے بچنے کی خوش خبری بھی سنائی۔ جلالی صاحب میرے اور عمران کے حوالے سے شبہے میں پڑ گئے۔ تاہم عمران انہیں اعتماد میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اب یہاں ہماری حیثیت خاص اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ سیکیورٹی کے معاملات میں بھی ہمارا دخل ہو گیا تھا تاہم اس حوالے سے چند لوگوں کو اس کا علم تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے باغیچے میں فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے فتح پر شک تھا۔ وہ وہاں سے چلا تو میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے چار پانچ آدمیوں کو شدید زخمی کر دیا مگر انہوں نے مجھے قابو کر لیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا بعدازاں ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے سیکریٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ اس نے مجھے آفر دی کہ میں عمران کو بہانے سے کوٹھی سے باہر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بلاؤں تو میری جان بچ سکتی ہے پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں عمران کو فون کر کے بلاؤں اور اسے شک نہ ہو۔ میں جاوا کے گارڈ کی رائفل کی زد پر تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ میں نے اس کے کہے پر عمل نہ کیا تو میری موت یقینی ہے۔ اس نے سفاک لہجے میں گنتی گننا شروع کر دی۔

✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲

وہ قیامت کے لمحے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جاوا کی فیصلہ کن آواز کوٹھری میں گونج رہی تھی۔ پانچ... چھ... سات...

رائفل کا رخ میرے سر کی طرف اور رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ میں نے جاوا... کی دم بدم سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانکا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے اس شخص کے حوالے سے رسک نہیں لینا چاہیے۔

جاوا... کی گنتی "نو" پر پہنچی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو جاوا گرجا۔ "نہیں... ایک لفظ نہیں... نہ میں سنوں گا، نہ تم بولو گے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو عمران کا نمبر ڈائل کرو اور اسے میری بتائی ہوئی جگہ پر بلاؤ۔ اگر وہ تفصیل میں جائے تو تمہیں فوراً پہلے فون بند کرنا ہے۔"

میں نے سیل فون پر عمران کا نمبر پریس کیا۔ میرے اردگرد موجود کچھ چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ عمران کے نمبر پر بیل گئی۔ دوسری بیل پر ہی کال اٹینڈ ہو گئی۔ عمران کی جاں بخش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہیلو... کون؟"

"میں تابش بول رہا ہوں عمران۔"

"تابی... یہ کیا بے غیرتی کی ہے یار تم نے؟ کہاں ہو تم؟ کم از کم مجھے تو بتا کر جانا تھا۔ یہاں سب پریشان ہیں اور یہ کس کے نمبر سے کال کر رہے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے چھوٹا سا وقفہ لیا اور پھر تیز اور صاف لہجے میں کہا۔ "عمران... جاوا کے بندے فارم کے چاروں طرف موجود ہیں۔ تم کو باہر نہیں نکلنا۔ وہ تمہیں قتل کر دیں گے..."

ابھی آخری دو لفظ پوری طرح ادا نہیں ہوئے تھے کہ جاوا نے جھپٹا مار کر فون میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک فولادی گھونسا میرے جبڑے پر پڑا اور میں اچھل کر دیوار سے ٹکرایا... پھر کئی گارڈز وحشیوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے اچانک ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ رائفلوں کے بٹ، ٹھوکریں، گھونسے، ہر طرح کی کاری ضرب مجھے لگائی جا رہی تھی۔ مارنے والوں میں یقیناً جاوا بھی شامل تھا۔ اس کی دہاڑوں اور غلیظ گالیوں سے اس زمین دوز کوٹھری کے در و دیوار گونجنے لگے۔ دو تین منٹ میں ہی میں زخم زخم ہو گیا۔ تب مجھے اپنی ایک ٹانگ میں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ میرا سر پہلے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر ہوا میں معلق ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے الٹا لٹکایا جا رہا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد میں تہ خانے کی چھت سے الٹا جھول رہا تھا۔ میرا سر فرش سے قریباً پانچ فٹ بلند تھا۔ میرے جسم اور چہرے سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ سیاہی مائل فرش پر گرنے لگا۔

جاوا دہاڑا۔ "مارو کتے کو۔ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کی گندی ناک کے راستے باہر آ جانا چاہیے۔"

دو تنومند گارڈز نے اپنی چرمی بیلٹ اپنی پتلونوں سے نکالیں اور مجھ پر پل پڑے۔ ان بیلٹوں کے ساتھ بھاری آہنی بکل بھی موجود تھے۔ میرے پورے جسم پر انگارے دہکنے لگے۔ ہر دفعہ جب شڑاپ کی آواز آتی۔ مجھے لگتا کہ کسی نے آگ میں دہکائی ہوئی سلاخ میرے جسم پر رکھ دی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ میں صرف ایک ٹانگ کے ذریعے چھت سے جھول رہا تھا۔ ٹانگ کے جوڑ اکھڑتے محسوس ہو رہے تھے اور یہ وہی ٹانگ تھی جس پر لڑائی کے دوران میں، میں نے ایک شدید چوٹ سہی تھی۔ میری دوسری ٹانگ...... زنجیر کی بندش سے آزاد تھی، عجیب بے ڈھنگے انداز میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔

ہر انسان میں تکلیف برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے اور میں کوشش و مشق سے اس حد کو کافی آگے لے جا چکا تھا لیکن پھر بھی ایک حد تو موجود تھی۔ یہ حد کافی دیر سے آئی لیکن آ گئی۔ گارڈز کی وحشیانہ ضربوں نے میری تکلیف کو عروج پر پہنچایا اور پھر... میرا ذہن ایک گھٹن زدہ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ میں بے ہوش ہو گیا... لیکن نہیں... یہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کی کیفیت تھی۔ مجھے اپنی مدھم کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور جاوا کی دہاڑیں بھی۔ پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ باہر نکل گئے اور یہ بہت برا حال تھا۔ جیسے کسی شکار کیے ہوئے پرندے کے جسم پر کٹ لگا کر اور ان کٹس میں مرچ مسالا بھر کر اسے انگاروں پر بھونا جا رہا ہو۔ مجھے لگا جیسے میری ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور میں اس ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ ہی جھول رہا ہوں۔

میرا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اس خون کو اپنے چہرے پر رینگتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔ کوئی آواز سماعت تک پہنچتی تھی تو وہ جیسے کسی اتھاہ کنوئیں سے برآمد ہوتی تھی۔ اس کنوئیں کی گہرائی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا... تو کیا میں مر رہا ہوں؟ ثروت کا چہرہ ایک بار پھر نگاہوں میں آیا۔ ایک سہانی شام یاد آئی۔ ہم پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک وعدے کی طرح... ایک پیمان کی صورت۔ "ثروت! ہم کبھی جدا تو نہیں ہوں گے نا؟" میں نے کہا۔

"نہیں تابش! اب تو واپسی کا راستہ ہی نہیں ہے۔"

"لیکن اگر کوئی اونچی دیوار رستے میں آ گئی تو؟"

"میں اس دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اسے توڑ دوں گی یا پھر اپنی جان دے دوں گی۔"

"وعدہ؟"

"ہاں وعدہ۔" اس نے میرے ہاتھ کو ہولے سے دبایا تھا اور چلتے چلتے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔ جیسے وہ صرف اپنی زبان سے نہیں، اپنے پورے جسم کے ساتھ وعدہ کر رہی ہے۔

تب ساون کی ایک طویل جھڑی کا منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اپنے گھر کی بالکونی میں ہم پاس پاس کھڑے تھے۔ بارش کی چھینٹیں جسم میں ایک جاں فزا گدگدی پیدا کر رہی تھیں... "ثروت! مجھے ڈر کیوں لگتا ہے... کیوں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہم کہیں بچھڑ نہ جائیں؟"

"پیار کرنے والوں کو دھڑکا تو ہوتا ہی ہے۔"
"اس دھڑکے کو کیسے ختم کریں؟"
"بچھڑ جائیں... تم از کم دھڑکا تو ختم ہو جائے گا۔" وہ شوخی سے بولی۔

"ثروت کی بچی..." میں نے اس کی چٹیا پکڑنا چاہی، وہ ایک دم جھکائی دے کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی چھت پر چلی گئی۔ اس نے برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کرنا چاہا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا چھت پر آ گیا۔ بارش نے ہمیں سرتاپا بھگو دیا۔ میں نے ایک کونے میں اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر بارش کے ساتھ ساتھ پیار کی بارش بھی ہونے لگی۔

"بس کریں۔" اس نے تیز سرگوشی کی۔
"اس طرح کیوں کہا؟"
"چلو کہہ دیا لیکن اتنی سزا کافی ہے۔" وہ بدستور شوخ تھی۔

"اچھا... یہ سزا ہے؟" میں نے اسے کچھ اور بھی جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں... پیار سے... اب چھوڑیں... چھوڑیں بھی... امی آوازیں دے رہی ہیں۔"

امی واقعی پکار رہی تھیں۔ "یہ امیوں کو ایسے موقعوں پر پتا نہیں کیسے خبر ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آنچل لپیٹتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

وہ دن رات ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور شوخیوں سے عبارت تھے...

میں چھت سے الٹا لٹکا رہا۔ میرے زخموں سے خون بہتا رہا اور میرے جسم میں موت کی سردی داخل ہوتی رہی۔ پھر میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک لق و دق صحرا ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہے۔ گرم ریت پاؤں جھلسا رہی ہے۔ میرے گلے میں پیاس کے کانٹے اترے ہوئے ہیں۔ میں آبلہ پا ایک جگہ پہنچتا ہوں۔ یہاں چند گھنے چھتاور درختوں کے نیچے ثروت پُرسکون کھڑی ہے۔ اس کے حسین جسم پر جھلملاتا عروسی لباس ہے، اس کے ہونٹوں پر لالی اور آنکھوں میں کاجل ہے۔ میں چلاتا ہوں۔ "ثروت! یہ کیا ہے؟ تم نے تو کہا تھا... میں دیوار کو توڑ دوں گی یا اس سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گی۔ تم نے کیوں نہ توڑی دیوار؟ تم نے یہ آگ کا لباس کیوں پہن لیا؟"

وہ بالکل خاموش کھڑی رہتی ہے۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں جیسے میرے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ میں پھر پکارتا ہوں... "ثروت! یہ لباس اتار دو... اسے بدل ڈالو۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم دلہن نہیں ہو۔ دلہن کوئی اور ہے۔ تم خود کو رسموں رواجوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔ توڑ ڈالو یہ جھوٹ کی زنجیریں۔ ہم اب بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ اب بھی گئے وقت کو آواز دے سکتے ہیں۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ کسی بت کی طرح بے حس کھڑی رہتی ہے۔ میری آواز کا دم خم ختم ہو جاتا ہے۔ بدن میں اترتی ہوئی موت کی نقاہت کچھ اور گہری ہونے لگی ہے... میں اندر سے سسک اٹھتا ہوں۔ ایک دم مسمار ہو جاتا ہوں۔ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہوں۔ عاجز لہجے میں کہتا ہوں... "میں اب زیادہ دیر کا مہمان نہیں ہوں ثروت... میں مر رہا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا؟ میں جلتے صحرا میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تم تک پہنچا ہوں۔ کیا تم اسی طرح بت بنی کھڑی رہو گی؟ رسموں رواجوں کے حصار میں بند رہو گی؟ میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟ پلیز ثروت... پلیز میری طرف دیکھو... مجھے یوں بے موت نہ مارو۔"

ثروت پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ لاتعلق کھڑی رہتی ہے۔ ایک طرف سے ایک بے چہرہ ہیولا برآمد ہوتا ہے۔ ایک نوجوان... وہ ثروت کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لگاتا ہے اور پھر اسے لے کر درختوں کی ٹھنڈی تاریک چھاؤں میں اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں اسے پکارتا رہتا ہوں مگر وہ مڑ کر نہیں دیکھتی۔ مایوسی اور صدمے کی بے پناہ شدت سے میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس یہی ہوا کہ میں اسی طرح تہ خانے کی چھت سے الٹا لٹک رہا ہوں۔ میرے جسم کا رہا سہا خون میرے سر اور سینے میں جمع ہو چکا تھا۔ میری ایک ٹانگ بالکل سن ہو چکی تھی اور دوسری... نہایت تکلیف دہ زاویے سے بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سہ پہر سے بعد کا وقت ہے۔ کہیں پاس ہی کوئی اپنے موبائل فون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز واضح طور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا اور پہچان لیا۔ یہ سلطان چٹے کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نہیں جاوا صاحب! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ فارم سے نکلے گا تو ہماری نظروں میں ضرور آئے گا۔ پوری پوری ناکا بندی ہے جی۔"

غالباً دوسری طرف سے پوچھا گیا کہ کیا اندر کی اطلاع نہیں مل سکتی؟

سلطان چِٹّا بولا۔ "جناب! اندر کی اطلاع تو ندیم ہی دے سکتا تھا اور اب وہ واپس فارم ہاؤس میں نہیں جا سکتا۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ اس حرامی کے لیے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ وہ باہر نکلا نہیں اور ہمارے ہتھے چڑھا نہیں..."

گفتگو یقیناً عمران کے متعلق ہی ہو رہی تھی۔ میرے سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ اسے مارنے کا پکا پکا پروگرام بنا چکے تھے اور اس کے لیے پوری تیاری بھی ہو چکی تھی۔ میں نے فون پر اسے آگاہ کرنے کی اپنی سی کوشش تو کی تھی، پتا نہیں کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی تھی۔

جاوا.... سے گفتگو ختم کرنے کے بعد سلطان کسی دوسرے بندے سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے یہ آواز بھی پہچان لی۔ یہ ندیم کی تھی۔ وہ بے پروائی سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے نزدیک میں ابھی تک بے ہوش تھا۔ ندیم نے کہا۔ "ایک طریقہ تو یہ بھی ہے کہ اس ماں کے ہیرو کو "اس چمچے تابی" کی آہ و بکا سنائی جائے۔ وہ جب فون پر اسے چلاتا سنے گا تو اس کی دُم میں ضرور آگ لگے گی۔ اس سے کہا جائے کہ اگر وہ تابی کو اس عذاب سے نکالنا چاہتا ہے تو فلاں جگہ پر پہنچ جائے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا پکا یارانہ ہے اور میرا تو خیال ہے کہ یہ یارانہ ضرور کام دکھائے گا۔"

"یہ بات جاوا صاحب کے ذہن میں بھی آئی تھی۔" سلطان نے کہا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہیرو اکیلا نہیں آئے گا۔ اس کے درجنوں مسلح ساتھی بھی ساتھ ہوں گے۔ ایسے میں کافی خون خرابا ہو سکتا ہے۔"

چند سیکنڈ بعد ندیم کی آواز آئی۔ "تو پھر دوسرا راستہ تو انتظار کا ہی ہے۔ ویسے مجھے اس کتے تابی پر غصہ بہت ہے۔ سویرے اس نے بڑی حرامزدگی کی ہے۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک دم وہ فقرہ بول دے گا۔ وہ فقرہ اگر اس "ماں کے ہیرو" نے پورا سن لیا ہے تو پھر اس نے جلدی اپنے بل سے باہر نہیں نکلنا۔"

سلطان نے مجھے غائبانہ... گالی دی اور بولا۔ "چلو اگر فقرہ بولا ہے تو اس کا مزہ بھی تو چکھا ہے نا خبیث نے۔ قسائی کی دکان پر بکرے کی طرح لٹکا ہوا ہے۔"

"دیکھنا تھا کہیں پار ہی نہ ہو گیا ہو۔" ندیم نے کہا۔

"نہیں، بڑا سخت جان ہے۔ بڑی موٹی کھال ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے ہیں تم نے؟ لگتا ہے لوہے کے ڈھلے ہوئے ہیں، پتا نہیں کیا کرتا رہا ہے ان کے ساتھ۔ اتنی درگت کسی اور کی بنی ہوتی تو اب تک مر کر بو چھوڑ گیا ہوتا۔"

"لیکن بو تو آ رہی ہے۔" ندیم بولا۔

"وہ اس کے یار فتح محمد صاحب کی ہے۔"

میں نے غور کیا۔ بو واقعی میرے نتھنوں میں بھی گھس رہی تھی۔ ہلکی تھی لیکن محسوس ہو رہی تھی۔ میری پلکوں پر خون جما ہوا تھا۔ میں نے بمشکل پلکیں کھولیں اور نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ فرش پر میرا اپنا ہی خون لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر فتح محمد کی نیم عریاں لاش موجود تھی۔ گرمی کے سبب لاش نے خراب ہونا شروع کر دیا تھا۔ توند پہلے سے بڑی نظر آ رہی تھی اور چہرے پر بھی سوجن محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد چار پانچ افراد کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سلطان اور ندیم بھی شامل تھے۔ میری ٹانگ سے بندھی ہوئی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی گئی۔ پہلے میرا سر خون آلود فرش سے لگا پھر کندھے، پھر باقی جسم بھی فرش پر ڈھے گیا۔ کسی نے کہا۔ "ہوش میں ہے، مکر کر رہا ہے۔"

کسی نے میرے کندھے پر ٹھوکر رسید کی۔ ایک گارڈ نے قریب میرے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن پلکوں پر میرا اپنا ہی خون جما ہوا تھا۔ میں بس آنکھوں کو نیم وا ہی کر سکا۔ مجھے اپنے اردگرد دھندلے چہرے نظر آئے۔ کم از کم دو رائفلیں اب بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میرے زخمی ہونٹ خشک تھے اور زبان چمڑے کا سوکھا ٹکڑا بنی ہوئی تھی۔ مجھے چند گھونٹ پانی پلایا گیا تاکہ میں بولنے کے قابل ہو سکوں۔

میں نے اپنے جسم کو محسوس کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو تولا۔ کیا میں اچانک جھپٹ کر کسی گارڈ کے ہاتھ سے رائفل چھین سکتا ہوں؟ اس کا جواب میری زخمی ٹانگ نے انکار کی صورت میں دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگ بالکل سن ہے۔ یہ میرے جسم کا بوجھ نہیں سہار سکتی اور بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو میرا باقی جسم بھی زخموں سے چُور تھا اور میرے پاؤں میں آہنی زنجیر تھی۔ میں اپنی مزاحمت کو کہاں تک لے جا سکتا تھا۔

سلطان نے بڑی بے رحمی سے میری گردن پر پاؤں رکھا اور دباؤ بڑھانے لگا۔ میری سانس رکنے لگی۔ وہ پھنکارا۔ "تم دونوں اس موٹے سؤر ریان ولیم کے لیے کام کر رہے ہو۔ تم دونوں کے علاوہ اس نے اور کتنے کتے پالے ہوئے ہیں، ان کے نام بتاؤ۔ اور "حرام گوشت" کا وہ پہاڑ خود کہاں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے؟"

مجھ سے جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے میری گردن پر سے پاؤں کا دباؤ کچھ کم کیا... میری سانس کی آمدورفت بہتر ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے بھی اپنی خاموشی دہرادی۔ اس نے گردن پر اپنے پاؤں کا سفاک دباؤ پھر بڑھادیا۔ ''ریان ولیم کا ٹھکانا بتاؤ۔ ورنہ ابھی دومنٹ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

میری سانس بند ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے چہرے دھندلاتے چلے گئے۔ سلطان کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں...... سے آرہی تھی۔ ''ہمیں پتا ہے وہ سؤر لاہور میں ہے... لیکن کہاں ہے؟ اس کا فون نمبر کیا ہے؟ کیسے رابطہ کرتا ہے تم سے؟ بتاؤ... بتاؤ۔''

جب میری سانس بالکل بند ہوگئی تو میں نے اپنے زخمی ہاتھوں سے سلطان کی پنڈلی دبوچی اور زور لگا کر اس کا منحوس پاؤں اپنی گردن سے ہٹا دیا۔ وہ لڑکھڑایا لیکن گرنے سے بچ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ سلطان خود بھی اس کارِخیر میں شریک ہوگیا۔

وہ وقفوں وقفوں سے مجھے مارتے رہے اور سوالات کرتے رہے۔ وہ عمران کے حوالے سے بھی معلومات چاہ رہے تھے لیکن میں نے اپنے ہونٹوں پر برداشت کا قفل لگالیا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد انہوں نے میری زنجیر کھینچی اور مجھے پھر سے الٹا لٹکا دیا۔ تاہم اس بار ایک اور غیرمعمولی ستم ظریفی بھی کی گئی۔ فتح محمد کی ایک ٹانگ کو بھی زنجیر کیا گیا اور اسے بھی میرے ساتھ الٹا لٹکایا گیا۔ یہ ایک لاش کی سفاکانہ بےحرمتی تھی۔ فتح کی لاش سے اٹھنے والی بو تیز ہوتی جارہی تھی اور وہ مجھ سے صرف تین چار انچ کے فاصلے پر جھول رہا تھا۔ پھر میری اذیت میں اضافہ کرنے کے لیے پلاسٹک ٹیپ کا ایک بڑا رول لایا گیا اور اس کی لاش کو ٹیپ کے ذریعے میرے ساتھ پیوست کردیا گیا۔ ٹیپ کو کئی بل اس طرح دیے گئے کہ فتح کی لاش سرتاپا مجھ سے پیوست ہوگئی۔

یہ بےپناہ اذیت کی گھڑیاں تھیں۔ وہ حد بھی شاید گزرنے والی تھی جو اذیت اور صدمے کو میرے لیے پُرلطف بناتی تھی۔ میں مسلسل کراہ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ دل چاہتا تھا کہ بس جلدی سے بےہوش ہو جاؤں... یا پھر ویسے ہی قیدِحیات سے آزادی نصیب ہو جائے۔

لاش کا پھولا ہوا زخمی چہرہ میرے چہرے سے جڑا ہوا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ ناقابلِ بیان بو کا بھبکا میرے نتھنوں میں داخل ہوتا تھا اور رگ وپے میں کراہت کا دریا بہنے لگتا تھا۔ یہ کراہت میری جسمانی اذیت کو کئی گنا بڑھا رہی تھی۔ میں نے ابکائیاں لیں مگر معدے میں کچھ ہوتا تو باہر نکلتا۔ ہر ابکائی کے ساتھ جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور درد کی لہریں بلندتر ہوگئیں۔ درد... درد... اور بس درد...!

...اور پھر اچانک درد کا عاشق بارونداجیکی بیسا[illegible] کے سہارے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ ادھورے جسم والا ہڈیوں کا ڈھانچا جس کو درد سے لڑنا اور[illegible] آگیا تھا۔ وہ مسکرایا اور اس کی تصوراتی آواز میرے کا[illegible] سے ٹکرائی۔ ''کیا بات ہے؟ کہیں درد کے حوالے سے تم[illegible] یقین ڈانواں ڈول تو نہیں ہورہا۔ یاد رکھو، درد بےوجہ [illegible] ہوتا اور نہ بےصلہ ہوتا ہے۔ یا ہم اس کا صلہ حاصل کر[illegible] ہوتے ہیں، یا ہمیں صلہ حاصل ہونے والا ہوتا ہے۔ [illegible] زیادہ دکھ درد... اتنا زیادہ صلہ... تو پھر دکھ درد سے ڈ[illegible] کیسا... یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس میں گھاٹا ہو ہی نہ[illegible] سکتا۔ خدا کا شکر کرو۔ اس نے تمہاری زندگی کو روکھا پھیکا ا[illegible] بےعمل نہیں رکھا۔ یہ گہری تاریکیاں، صبحِ نو کی نوید ہو[illegible] ہیں۔''

''مجھ سے برداشت نہیں ہورہا۔'' میں نے دل ہی دل [illegible] پکارا۔

''تم اپنی تربیت کا پہلا سبق ہی بھول رہے ہو۔ [illegible] کے اندر ڈوب جاؤ۔ اس کی حقیقت اور اس کے حجم پر غو[illegible] کرو۔ اردگرد کی کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ۔ مت سوچو کہ تمہا[illegible] جسم زخموں سے چُور ہے۔ مت سوچو زخم کھل رہے ہیں، خو[illegible] بہہ رہا ہے۔ مت سوچو کہ تم الٹے لٹکے ہوئے ہو۔ بس یہ دیکھ[illegible] درد کتنا ہورہا ہے... بس درد پر غور کرو۔''

میں نے درد کی اصل شدت پر غور کرنا شروع کیا ا[illegible] حیرت انگیز طور پر درد کم ہونے لگا۔ کم ہوتا چلا گیا۔

وہ جادواثر باتیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ[illegible] بچھڑ چکا تھا لیکن کڑے وقتوں میں وہ میرے آس پاس آ[illegible] موجود ہوتا تھا۔ اس کا تصور اتنی طاقت سے میری نگاہوں [illegible] سامنے ابھرتا تھا کہ زندگی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ مسکرارہا تھا[illegible] اس نے مجھے شاباشی کی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''میں[illegible] چکا ہوں لیکن تم میری نشانی کے طور پر یہاں موجود ہو۔ تم [illegible] تسلسل ہو، میری اضافت ہو۔ مجھے تم سے بڑی امید[illegible] ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کرو جو میں نہ کرسکا... تم در[illegible] پسپا کرتے ہوئے آخری حدوں تک لے جاؤ... ناقابل[illegible] بن جاؤ۔ اور تمہاری کارکردگی بری نہیں ہے۔ تم نے میرا [illegible] ٹھنڈا کیا ہے۔ تم نے بھانڈیل میں اس شخص کو جہنم واصل [illegible]

ہے جس نے میری شکنتلا چھینی اور میری زندگی برباد کی۔ ہاں تابش! مجھے تم پر فخر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آنے والی ہر گھڑی میں میرے اس فخر میں اضافہ ہو۔''

اس کا ہیولا اوجھل ہوگیا لیکن میرے اندر ہمت اور برداشت کی ایک نئی جوت جگا گیا۔ میں ششدر تھا۔ میرا درد نمایاں حد تک کم ہوچکا تھا۔ اب صرف کراہت تھی اور یہ کراہت اس بو سے پیدا ہورہی تھی جو فتح کے مردہ جسم سے اٹھ رہی تھی اور اس بند کوٹھری میں پھیلتی.... جارہی تھی۔

پتا نہیں... کتنی دیر اس عالم کراہت اور اذیت میں گزر گئی۔ تکلیف کی گھڑیاں ویسے بھی طویل ہوتی ہیں۔ فتح ایک جیتا جاگتا شخص تھا تو میں اس کی جان بچانے کی کوشش کررہا تھا۔ لیکن اب وہ ایک لاش تھا اور اس لاش کی جبری قربت میرے لیے شدید ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھی۔ شاید یہ لوگ اس طرح مجھے ذہنی طور پر مفلوج و بےبس کرنا چاہ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو میری زبان کھلوانے کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کررہے تھے۔

میرا دھیان رہ رہ کر عمران کی طرف جاتا تھا۔ مجھے پتا تھا... اگر وہ جان گیا کہ میں کہاں ہوں تو پھر اسے مجھ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ وہ ہر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر میری طرف آئے گا اور ایک بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا۔ شاید بہت سے لوگوں کی جان چلی جائے اس ہنگامے میں۔ ہمیشہ یہی سنا ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اس روز انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی کے بند بودار تہ خانے میں چھت سے الٹا لٹکے ہوئے مجھ پر اس محاورے کی ازلی صداقت ثابت ہوئی۔ بےپناہ ذہنی اور جسمانی تناؤ کے باوجود مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میرے احساسات کند ہوتے چلے گئے اور میں اپنے اردگرد سے بیگانہ ہونے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ رات دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ تہ خانے سے باہر کہیں کوٹھی کے احاطے سے رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی کمرے میں ڈسکو میوزک بج رہا تھا اور تہ خانے کے اندر ٹیوب لائٹ کی پھیکی روشنی پھیلی ہوئی تھی... اچانک میری نظر اس تہ خانے کے تیسرے مکین پر پڑی۔ یہ وہی نشئی تھا جسے میں نے صرف سوتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ وہ اب بھی فرش پر دراز تھا۔ اگر سویا ہوا نہیں تھا تو کم از کم غنودگی میں ضرور تھا۔ اس کے جسم پر پھٹی پرانی پتلون اور چیک دار شرٹ تھی۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

یہ کون تھا؟ اور کس پاداش میں یہاں پایا جارہا تھا؟ کیا میرے اور عمران کی طرح اس کا تعلق بھی کسی طور ریان ولیم سے تھا... یا پھر یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ میرے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے دماغ میں کئی سوال سر اٹھانے لگے۔

قریباً 30 گھنٹے سے میرے معدے میں کچھ نہیں گیا تھا... اس کے علاوہ خون بھی کافی مقدار میں نکل چکا تھا۔ ایک عجیب سی نقاہت رگ وپے میں اتری ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ پر بار بار غنودگی سی طاری ہوتی .... اور میں اردگرد سے بالکل بےخبر ہوجاتا تھا۔ مجھے یاد آیا، میں نے آخری کھانا کل دوپہر عمران کے ساتھ فارم ہاؤس میں ہی کھایا تھا اور دوپہر کا کھانا پورے بارہ بجے کھالیا جاتا تھا۔ چار بجے کی چائے میں نے نہیں پی تھی۔ اس حساب سے یقیناً کم وبیش تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

غنودگی کے ایک ایسے ہی وقفے کے بعد میں اپنے حواس میں آیا تو میں نے محسوس کیا کہ ایک بار پھر میرے پاؤں کی زنجیر کو ڈھیل دی جارہی ہے اور میں فتح کی بدبودار لاش سمیت آہستہ آہستہ نیچے آرہا ہوں۔ میں نے سر گھما کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ مجھے یوں آہستہ آہستہ نیچے اتارنے والا کوئی اور نہیں، وہی بوسیدہ پینٹ شرٹ والا شخص تھا جسے میں نے اب تک بس سوتے ہوئے ہی پایا تھا۔ اس بےڈھنگے شخص کے بارے میں، میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کسی نشے کے زیرِاثر اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ میلا کچیلا چہرہ ورم زدہ سا تھا۔ ویسے اس کے نقوش تیکھے تھے۔ اپنی دبلی پتلی جسمانی ساخت کی وجہ سے وہ اٹھائیس تیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔

ہم فرش سے لگ گئے تو اس شخص نے میری اور فتح محمد کی زنجیریں چھوڑ دیں۔ تب اس نے جلدی جلدی وہ طویل ٹیپ میرے جسم سے علیحدہ کیا جس نے مجھے فتح کی لاش سے پیوست کر رکھا تھا۔ مجھے خوفناک بو کی سزا دینے کے لیے جاوا کے کارندوں نے وہ سلاخ دار کھڑکی بھی بند کر رکھی تھی جس میں سے تہ خانے کا دوسرا پورشن دکھائی دیتا تھا۔ غالباً اسی بند کھڑکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص نے مجھے نیچے اتارا تھا اور فتح کی لاش سے علیحدہ کیا تھا۔

بےشک بو بڑی شدید تھی۔ وہ معدے میں گھس گئی تھی اور پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ مجھے نیچے اتارنے والے شخص کا چہرہ بھی بو کی وجہ سے مکدر تھا۔ وہ گاہے بگاہے اپنی شرٹ کے کالر سے اپنی ناک ڈھانپنے کی کوشش کرتا تھا۔ لاش کی حالت بھی اب کافی خراب نظر آتی تھی۔ وہ پھول رہی

تھی۔ ورم زدہ پپوٹوں کے نیچے سے سرخی مائل مادہ رِس رہا تھا۔ مجھے لاش کے ساتھ پیوست کر دینے والی سزا واقعی بہت کڑی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں چند گھنٹے مزید اس حالت میں رہتا تو میرا دماغ مختل ہو جاتا اور ہمت جواب دے جاتی۔

شرٹ والے شخص نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟''

''کس طرح؟'' میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''تم... بڑے چنگے وقت پر یہاں آئے ہو۔ میں یہاں سے نکلنے کا پروگرام تقریباً فٹ کر چکا ہوں اور آج موقع بھی زبردست ہے۔ آج اوپر کوئی شراب پارٹی ہے۔ دو تین فلمی ''ڈانسریں'' بھی آئی ہوئی ہیں۔ ڈھول ڈھمکے کی ہلکی سی آواز آ رہی ہے نا تمہیں بھی؟''

وہ ڈسکو میوزک کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں زندہ تو کسی صورت میں نہیں چھوڑنا۔ میں نے ان کی ساری گل بات سنی ہے۔ اگر جان بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مل کر کرلو۔''

''پر کیسے؟'' میں نے اپنی مفلوج ٹانگ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ٹخنے پر ابھی تک زنجیر کا حلقہ موجود تھا اور اس حلقے نے ٹخنے کو بری طرح زخمی کیا ہوا تھا۔

''میں نے کہا ہے نا کہ تم بڑے چنگے ویلے پر آئے ہو۔ پچھلے ایک مہینے سے میں جو محنت کر رہا تھا، اس کا پھل اب بالکل تیار ہے۔ شاید میں ایک ڈیڑھ ہفتے اور صبر کر لیتا، پر ان کنجروں نے اس لاش کی بو سے ہمارے ساہ (سانس) روک دیے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔''

''تم کس محنت کی بات کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ تم ذرا اپنی اس ٹانگ کو چالو کرلو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بالکل سن ہو چکی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا اور ایک بار پھر ٹانگ پر وزن ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے سہارنے سے بالکل انکار کر دیا۔

وہ شخص میری ٹانگ کو ہلانے جلانے لگا۔ میں نے بھی کوشش کر کے ٹانگ کو تھوڑی بہت حرکت دی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد ٹانگ پر کسی حد تک بوجھ پڑنے لگا۔ جسم کے سارے جوڑ جیسے اکھڑ کر رہ گئے تھے۔ کئی زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا، فرش پر گرنے والا خون اب سوکھ کر سیاہ ہو چکا تھا۔

''تم ہمت والے ہو۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر ستائشی انداز میں کہا۔ ''اور اس کے ساتھ ساتھ سخت جان بھی ہو۔ جتنی ''کٹ'' تمہیں پڑی ہے، کسی اور کو پڑی ہوتی تو اب تک اوپر کا ٹکٹ کٹا چکا ہوتا۔ کہیں تم کوئی کھلاڑی شلاڑی تو نہیں رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ جوڈو کراٹے یا باکسنگ شاکسنگ...''

''یہ تم کیوں کہہ رہے ہو؟''

''تمہاری سخت ہڈی دیکھ کر۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ اس کی نگاہیں میرے سیاہی مائل ہاتھ پاؤں پر تھیں۔

''تمہارا اندازہ کسی حد تک درست ہے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''لیکن تم نے مجھے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''نام میں کیا رکھا ہے، اصل شے تو کام ہوتی ہے۔ ویسے اگر تم چاہو تو مجھے گوہر کے نام سے بلا سکتے ہو۔''

''میرا نام تابش ہے۔ تابی بھی کہتے ہیں۔''

''مجھے پتا ہے۔ وہ کمینے کے تخم تمہیں اسی نام سے بلا رہے ہیں۔''

''لیکن تم تو سارا وقت سوئے پڑے رہتے تھے؟''

''کبھی کبھی ایک آنکھ سے سوتا تھا، دوسری کھلی رکھتا تھا۔'' وہ عیارانہ انداز میں بولا۔

''یہ نہیں بتاؤ گے کہ ان کتوں کے چنگل میں کیسے پھنسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ لمبی اسٹوری ہو جائے گی اور ابھی ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔''

باہر سے آنے والی ڈسکو اور پاپ میوزک کی آواز ایک دم کچھ تیز ہو گئی۔ شاید چند سیکنڈ کے لیے کوئی دروازہ کھلا تھا۔ اس میوزک کے ساتھ تیز شوخ نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ ویسی ہی سریلی آوازیں تھیں جو تیز ٹیمپو کے ڈانس کے دوران میں نکالی جاتی ہیں۔ اوپر ڈانس پارٹی اور شراب پارٹی عروج پر تھی۔ یقیناً ایشوریا رائے ثانی اور کرشمہ کپور ثانی جیسی لڑکیاں بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔

ایک طرف زندگی کی خوشبودار رنگینی تھی اور دوسری طرف بدبودار بے ثباتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی لاش کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ گوہر... یا جو بھی اس کا نام تھا، اب میرے پاؤں کے کڑے کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے کڑے کو پکڑ کر تھوڑا سا زور لگایا تو وہ کھل گیا۔ اس میں کوئی لاک وغیرہ نہیں تھا۔ وزنی زنجیر میرے پاؤں

سے علیحدہ ہوئی تو ٹانگ کو حرکت دینے میں آسانی ہو گئی لیکن وہ اب بھی صرف تیس چالیس فیصد ہی کام کر پا رہی تھی۔ میں نے اس گوہر نامی شخص کے کندھے کا سہارا لے کر تہ خانے میں دس پندرہ قدم اٹھائے۔ درد کی ٹیسوں نے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ اس درد کی پروا کیے بغیر میں گوہر کے ساتھ تہ خانے کے شمالی حصے کی طرف گیا۔ یہ جگہ انگریزی کے حرف ''L'' جیسی تھی۔ یہاں مجھے لکڑی کی ایک چھ سات فٹ اونچی الماری نظر آئی۔ تہ خانے کے اس حصے میں نیم تاریکی سی تھی۔ ایک چوتھائی حصہ تو تقریباً تاریک تھا۔ گوہر نامی اس جواں سال شخص نے بڑی احتیاط سے الماری کو اس کی جگہ سے ہلایا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں چونکا۔ الماری کے عقب میں قریباً دو مربع فٹ جگہ سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔

''کچھ نظر آیا؟'' گوہر نے اینٹوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی ذرا دھیان سے دیکھا تو صورتِ حال واضح ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس پختہ دیوار میں کم از کم تین اینٹیں ایسی تھیں جن کی درزوں میں سیمنٹ موجود نہیں تھا۔ کوئی نوکدار دھاتی چیز استعمال کی گئی تھی اور افقی رخ پر لگی ہوئی ان اینٹوں کی درزوں کو مسلسل کھرچ کھرچ کر ان کے اندر سے سیمنٹ نکال دیا گیا تھا۔

''زبردست۔'' میں نے ستائشی انداز میں گوہر کی طرف دیکھا۔ ''لیکن... دوسری طرف کیا ہے؟''

''میرا اندازہ ہے کہ گڈیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ مطلب کہ تہ خانے کی پارکنگ شارکنگ۔ پر میں نے ابھی دیکھا کچھ نہیں۔''

اس نے الماری کے ایک تاریک خانے میں ہاتھ ڈالا اور کچھ دیر تک ٹٹولنے کے بعد اندر سے ایک چھوٹا لیکن مضبوط پیچ کس نکال لیا۔ سیمنٹ کھرچنے والا صبر آزما کام اس نے یقیناً اسی پیچ کس سے کیا تھا۔ اس نے پیچ کس کو ایک اینٹ کی درز میں داخل کیا۔ وہ قریباً چار انچ تک اندر داخل ہو گیا۔ گوہر نے مجھے پیچ کس دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو، یہ اتنا اندر گیا ہے اور اتنی ہی اینٹ کی چوڑائی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب دوسری طرف بس دیوار کا پلستر ہی ہے۔ یہ پلستر میں نے جان بوجھ کے رہنے دیا ہے۔ اب ہم ذرا سی کوشش کریں تو یہ اینٹیں، باہر کی طرف یا اندر کی طرف نکل سکتی ہیں۔''

گوہر نامی یہ بندہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ننانوے فیصد کام مکمل کر چکا تھا لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا یہاں سے نکل کر ہم واقعی کوٹھی سے بھی نکل سکیں گے؟ وہ کہہ رہا تھا کہ دوسری طرف کوٹھی کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ ہے اور وہ دیوار سے کان لگا کر گاڑیوں کی آوازیں سنتا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یقیناً ہم یہاں سے نکل کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ تک پہنچ جاتے۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے گوہر! یہاں سے نکل کر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''ہم بس تھوڑا سا چل کر کوٹھی کے باہر والے گیٹ تک پہنچ جائیں گے... اس طرف بس ایک چوکیدار ہوتا ہے۔ کبھی اس کے پاس رائفل ہوتی ہے، کبھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے سنبھالنے میں ہمیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ اس کے بعد اگر قسمت نے کوئی خرابی نہ دکھائی تو ہم چالی فٹ کی روڈ پر پہنچ جائیں گے۔ ہم سامنے کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کی پچھلی طرف نکلیں گے اور کھیتوں میں گھس جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''قسمت کی خرابی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کوئی اور خطرہ بھی تمہارے ذہن میں ہے؟''

اس نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''خطرے تو ایسے کاموں میں ہوتے ہی ہیں، اگر تمہارے دل میں ڈر ہے تو پھر رہنے دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نکلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اگر کہتے ہو تو تمہیں واپس اسی طرح لٹکا دیتا ہوں... ویسے ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ ان لوگوں نے تمہیں بڑی بری طرح مارنا ہے۔ ایسی موت مرنے سے کہیں چنگا ہے کہ بندہ کچھ ہاتھ پاؤں چلا کر مرے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے... لیکن...'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وہ مجھے گھور کر بولا۔ ''تم نے جتنی ہمت سے ان لوگوں کی مار کھائی ہے، مجھے لگا تھا کہ تم دل گردے والے بندے ہو لیکن اب لگا ہے کہ شاید...''

''ایسی بات نہیں ہے گوہر! میں تمہاری توقع سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں لیکن ہمیں ہر چیز کو سامنے رکھنا چاہیے۔ تم... میری ٹانگ کی حالت دیکھ رہے ہو، یہ میرا بوجھ نہیں سہار رہی۔ اگر بھاگ دوڑ کی نوبت آئی تو شاید میں... بھرپور طریقے سے تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تو پھر پانچ چھ دن انتظار کر لیتے ہیں... تاکہ تمہاری ٹانگ فٹ فاٹ ہو جائے۔ پھر تم زندہ ہوئے اور میں بھی ہوا تو ایک اور کوشش کر لیں گے۔''

اس کا طنز سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہاں

بدترین صورتِ حال میری منتظر تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ یہاں سے نکل کر باہر کے حالات کا سامنا کرلیا جاتا۔ اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی سنگین مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے گوہر! میں تمہارے ساتھ نکلوں گا لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا۔''

''کیا؟'' وہ کڑے لہجے میں بولا۔

''اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم مجھے اپنے ساتھ نہیں گھسیٹو گے۔ اپنی جان بچاؤ گے...''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا، چلو دیکھ لیں گے... لیکن... اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، یہ شراب پارٹی ختم ہونے سے پہلے پہلے کرنا ہے۔''

ہم مصروف ہو گئے۔ اسکریو ڈرائیور کے ساتھ باہر کا پلاستر توڑنے اور پہلی اینٹ نکالنے میں تقریباً آدھ گھنٹا لگ گیا۔ یہ اینٹ ہم اندر کی طرف کھینچنے میں کامیاب رہے تھے۔ باہر سے ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی تہ خانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی بے ہنگم موسیقی کا شور بھی کچھ واضح ہو گیا۔ یہ ڈرمنگ میوزک تھا۔ ساتھ میں بدمست آوازے بھی سنائی دیتے تھے۔

صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ گوہر کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ دوسری طرف انڈر گراؤنڈ پارکنگ ہے۔ ہمیں چودہ پندرہ کے قریب، قیمتی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ یقیناً یہ محفل کے شرکا کی گاڑیاں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ کچھ گاڑیاں اوپر لان اور پورچ میں بھی ہوں۔ گاڑیوں کے آس پاس ہمیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ ہم نے باقی اینٹیں دس پندرہ منٹ کے اندر نکال لیں۔ ان اینٹوں کو ضرب لگانے کے لیے سب سے پہلے نکالی گئی اینٹ استعمال کی گئی۔ اب اتنا رستہ بن گیا تھا کہ ہم اس میں سے رینگ کر اس زمین دوز عقوبت خانے میں سے باہر نکل سکیں۔ ہتھیار کے نام پر ہمارے پاس صرف وہی پیچ کس تھا جو اب تک گوہر کے استعمال میں رہا تھا۔ دستے سمیت اس کی لمبائی آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھی تاہم اس کا سرا مسلسل استعمال سے بہت نکیلا ہو چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ضرورت پڑنے پر گوہر اسے چاقو کی طرح کامیابی سے استعمال کرے گا۔ میرے اب تک کے اندازے کے مطابق گوہر ایک نڈر اور اسلحہ شناس شخص تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہر طرح کی مار دھاڑ بھی کرسکتا تھا۔ بے شک اس کے کپڑوں اور جسم سے چرس کی تیز بو آتی تھی، اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی... اور حرکات و سکنات سے کسی طرح کی سستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ عقوبت خانے سے باہر نکل آئے۔ میرے زخموں سے تازہ خون رسنے لگا۔ میں بری طرح لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ قریباً 70 ضرب 100 فٹ کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ تھی..... پیچ کس گوہر کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ہم گاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ گوہر مجھ سے دو تین قدم آگے تھا... اس کی چال ڈھال میں شکاری جانور کی سی چوکسی تھی۔ ہم پارکنگ کی بیرونی ڈھلوان کی طرف بڑھ رہے تھے اور گوہر کی معلومات کے مطابق یہیں ہمارا واسطہ کم از کم ایک گارڈ سے پڑنے والا تھا۔

اچانک گوہر ٹھٹک کر رک گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''کباڑا... خبیثوں نے پارکنگ کا دروازہ بند کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ باہر سے تالا لگا ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''بس یہی قسمت کی خرابی ہوتی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ہم محتاط قدموں سے اس آہنی پھاٹک نما دروازے تک پہنچے۔ کان لگا کر باہر سے سن گن لینے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ گوہر نے تپے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ یہ بھوتنی دا بھی رنگ بازی کے لیے اوپر چلا گیا ہے۔''

اس نے پھاٹک نما دروازے کو ایک دو بار ہلا جلا کر دیکھا۔ تب دو تین بار مدھم دستک بھی دی۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہم اس آہنی پھاٹک کو توڑ کر، کھول کر باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ یہیں کہیں تاریکی میں چھپ کر دروازے کے کھلنے کا انتظار کیا جائے۔ پھر کوٹھی سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ڈھونڈا جائے۔ یہاں رک کر انتظار کرنے میں اس امر کا شدید اندیشہ موجود تھا کہ عقوبت خانے میں ہماری غیر موجودگی کا پتا چل جاتا اور پوری کوٹھی میں خطرے کی گھنٹیاں بج جاتیں۔ اور یہ بھی امکان تھا کہ یہ دروازہ ساری رات ہی نہ کھلتا... اور جب کھلتا تو گاڑیاں نکالنے کے لیے کئی افراد دروازے کے سامنے موجود ہوتے۔

''آؤ میرے پیچھے۔'' گوہر نے سرگوشی کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بائیں طرف بڑھا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے حدود اربع سے بخوبی واقف ہے اور شاید کچھ عرصہ یہاں آزاد حیثیت سے بھی گزار چکا ہے۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جو ٹانگ کی شدید تکلیف کے باوجود مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ کسی وقت مجھے ایک ہاتھ سے گاڑیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر جدوجہد کا موقع آیا تو میں اس حالت میں کس حد تک گوہر کا ساتھ دے سکوں گا۔

چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے دروازے تک آ گئے۔ گوہر نے اس آہنی دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر نیلی وردی والا ایک گارڈ نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وھسکی کی کوارٹر بوتل اور دوسرے میں سگریٹ تھا۔ غیر متوقع طور پر اس شخص نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم اس کے پاس سے گزر کر ایک کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ شیشے کی ایک بڑی کھڑکی کی دوسری جانب جھلملاتی روشنیوں میں لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی محورقص نظر آئی۔ رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے لیکن یہاں بالکل آزاد شاعری ہورہی تھی۔ یہ رقص سے زیادہ ایک واہیات تماشا تھا۔ نشے میں مخمور مرد و زن ایک دوسرے کو بڑے بھونڈے طریقے سے ''دریافت'' کررہے تھے۔ میری نگاہ سیکریٹری ندیم پر پڑی۔ وہ ایشوریا ثانی کے ساتھ پیوست تھا اور ہر حد سے گزرا ہوا نظر آتا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایشوریا کی ہم شکل لڑکی کو بازوؤں میں اٹھایا اور اسے لے کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

یہاں مجھے ایک اور ایسی لڑکی بھی محورقص دکھائی دی جس کی شکل کسی اور انڈین ایکٹریس سے ملتی تھی۔ مجھے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ یہ کس سے مل رہی ہے۔ تب اچانک میری نگاہ درِشہوار پر پڑی۔ یہ وہی درمیانی عمر کی ماڈرن عورت تھی جو کچھ دن پہلے رنگین چڑیوں کا تحفہ لے کر جلالی صاحب کو رجھانے آئی تھی مگر جلالی صاحب کا پارا اچانک چڑھ جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھی سمیت دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ درِشہوار جاوا کی سابقہ رکھیل رہی ہے۔ اس وقت وہ نشے میں ٹن تھی اور ایک درمیانی عمر کے گنجے کے ساتھ رقص کررہی تھی۔

میں اور گوہر کھڑکی کے سامنے سے گزر کر ایک برآمدے کی طرف آ گئے۔ یہاں بھی دو گارڈز بڑے ایزی موڈ میں فرش پر بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی رائفل سامنے ستون سے ٹکی نظر آرہی تھی۔ مجھے گوہر نامی اس شخص کی پھرتی اور دیدہ دلیری کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ بلی کی چال چلتا گیا اور گارڈز سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر پہنچ کر رائفل اٹھائی اور واپس پلٹ آیا۔

''آ جاؤ شہزادے۔'' اس نے سہارے کے لیے مجھے اپنا کندھا پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گراسی لان کی طرف بڑھے۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں روشنی ہے لیکن اگر ہم کسی طرح یہ جگہ پار کر گئے تو سیدھے گیٹ پر پہنچیں گے۔''

''گیٹ پر بندے نہیں ہوں گے؟'' میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں گے تو ضرور... پر ہوسکتا ہے کہ آج انہوں نے بھی کڑوا پانی پیا ہوا ہو... ایسے جشن میلے میں ہر کسی کی مت ماری جاتی ہے۔ ویسے بھی اب ہمارے پاس یہ دو سو بائیس کی رائفل آ گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ فائدہ تو اس کا بھی ہوگا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ گوہر خطرے میں حواس برقرار رکھنے والا شخص ہے۔ وہ یہاں سے نکلنے کے حوالے سے کافی پُرامید نظر آرہا تھا۔ ہم دیوار کے سائے سائے چلتے ہوئے مین گیٹ سے قریب تر ہو گئے۔ اچانک میرے رگ و پے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی... مجھے رکھوالی کے کتوں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ وہ بھگٹٹ بھاگے آرہے ہیں۔ بمشکل دو سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ ایک جسیم کتے نے گوہر پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا پھولدار پودوں میں گرا۔ زوردار دھماکے سے رائفل نے شعلہ اگلا اور میں نے کتے کی چلاتی ہوئی آواز سنی۔ غیر متوقع طور پر گولی کی زوردار آواز نے دوسرے کتے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اب کچھ فاصلے پر بے تاب گردش کرنے لگا اور اپنی پُرہول آواز میں مالکوں کو خبردار کرنے لگا۔ کتے کا یہ انداز روٹین سے ہٹ کر تھا۔

دو تین افراد دوڑتے ہوئے ہماری طرف لپکے... لیکن جب گوہر نے اوپر تلے تین چار فائر کیے تو وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مختلف چیزوں کی آڑ لے لی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے پوری کوٹھی گونج اٹھی۔ موسیقی تھم گئی۔ ہر طرف ہلچل کے آثار نظر آئے۔ ہم دونوں ایک بڑے سنگی فوارے کی اوٹ میں تھے۔

''آؤ۔'' گوہر نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"نہیں گوہر! میں نکل نہیں سکوں گا، تم جاؤ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم ایک بار تو اصرار کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور وقت کے مطابق اس نے ٹھیک ہی کیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ ٹرپل ٹو رائفل بالکل ریڈی تھی اور اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ جھک کر بھاگ رہا تھا۔ کتا پھر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے اسے ڈرانے کے لیے فائر کیا۔ اسی دوران میں ایک بڑے مور پنکھ کے عقب سے ایک سائے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ گوہر اور وہ اوپر نیچے گرے۔ ایک بار پھر گولی چلی لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ گولی کسی کو لگی نہیں۔ کم از کم تین مزید افراد گوہر پر پل پڑے۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب رہا۔ کبڈی کے کسی تیز رفتار کھلاڑی کی طرح وہ ایک بار پھر گیٹ کی طرف لپکا۔ ایک بار تو لگا کہ وہ نکل جائے گا مگر پھر کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ کئی افراد نے اسے دبوچ لیا اور بری طرح مارنے لگے۔ دو مسلح افراد نے میرے سر سے بھی رائفلیں لگا دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زخمی کان والا سلطان چتا نمایاں تھا۔ اس نے مجھے ایک زوردار ٹھوکر لگائی پھر پھنکار کر اپنے کسی ساتھی سے بولا۔ "پتا کرو۔ یہ دونوں تہ خانے سے نکلے کیسے ہیں؟ دونوں دروازے تو باہر سے بند تھے۔"

ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے ہانپتے لہجے میں سلطان کو بتایا۔ "ادھر پارکنگ کی دیوار میں سیندھ لگائی گئی ہے جی۔ کافی بڑا مورا نظر آ رہا ہے۔"

"پکی دیوار توڑی ہے انہوں نے؟" سلطان نے بہت حیرت سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور گوہر کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ کمرا برآمدے کے پاس ہی واقع تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا اور دو مسلح گارڈز وہاں کھڑے ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ ہمیں دوبارہ اسی بدبودار تہ خانے میں بھیج دیا جاتا جہاں فتح کی بے گور و کفن لاش موجود تھی... لیکن وہاں چونکہ دیوار توڑی جا چکی تھی لہٰذا ہمارے لیے عارضی طور پر یہ کمرا منتخب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اور ایک دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کھڑکی میں بھی مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ فرنیچر نام کی کوئی شے یہاں موجود نہیں تھی۔ فرش پر ایک بوسیدہ سا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر جوہی چاولہ کی تصویر تھی۔

گوہر کو خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی شرٹ تار تار ہو چکی تھی ..... پیچ کس گوہر کی جیب سے نکال لیا گیا تھا۔ دروازہ لاک کرنے سے پہلے میری بھی اچھی طرح تلاشی ہوئی تھی۔ سلطان اور ندیم وغیرہ اس بات پر حیرت زدہ نظر آتے تھے کہ ہم تہ خانے کی نو انچ موٹی پختہ دیوار توڑ کر نکلے ہیں۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہم دونوں سے سوال جواب کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف وہ اپنی محفل بھی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ "مکمل تفتیش" کا کام کل پر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ یقیناً اب ایک بار پھر بوتلوں کے ڈھکن کھلنے تھے اور جسموں نے تھرکنا تھا۔ کوشش ہونی تھی کہ محفل کو ایک بار پھر رنگ پر لایا جائے۔ کھڑکی سے باہر کھڑے گارڈز ہمیں خونی نظروں سے گھور رہے تھے۔

☆☆☆

جیسے تیسے وہ زخموں سے چور درد بھری رات گزر گئی۔ گوہر کو کافی چوٹیں آئی تھیں لیکن جب وہ میری چوٹیں دیکھتا تھا اور ان چوٹوں کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی دیکھتا تھا تو اسے حوصلہ ہوتا تھا۔ اگر گوہر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں پھنسا ہوتا تو یقیناً میرے دل و دماغ پر بوجھ ہوتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گوہر نے اپنے طور پر نکلنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوا۔

اب ہم ایک بار پھر قید و بند کی صعوبت کا شکار تھے اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک گارڈ گاہے بگاہے کھڑکی سے جھانک کر ہمیں دیکھ لیتا تھا کہ کہیں ہم سلیمانی ٹوپی پہن کر یہاں سے نکل نہ گئے ہوں۔ گوہر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ پارکنگ والا گیٹ کھلا مل جاتا تو شاید اس ویلے ہم لاہور میں ہوتے۔"

"لیکن اب تو شاید لاہور دیکھنے کی حسرت ہمارے ساتھ ہی چلی جائے۔ ان لوگوں کے ارادے ہمارے بارے میں اچھے نہیں ہیں۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس طرح کے کاموں میں پھر اس طرح تو ہوتا ہی ہے... آر یا پار۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب مرنے کی تیاری کر لیں؟"

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجا کر بولا۔ "مرنے کے لیے تو ہر ویلے تیار رہنا چاہیے... یہ گل ہماری مسجد کے امام صاحب کہا کرتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "پتا نہیں اب زندگی ساتھ دے یا

دے۔ اب تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ کہاں سے آئے ہو اور کیسے پھنسے ہو ان خبیثوں کے چنگل میں؟"

"اس سے کیا فائدہ ہونا ہے؟ جب مر ہی جانا ہے تو پھر جاننے سے فائدہ۔ ہاں اگر زندہ بچ گئے تو پھر لاہور کے کسی باغ میں بیٹھ کر تمہیں ضرور بتاؤں گا اور تم سے پوچھوں گا بھی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

عجیب منطق تھی اس کی۔ اسی دوران میں گارڈ کھڑکی میں کھڑا ہو کر ہمیں گھورنے لگا اور ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ "اوئے بدبختو! کوئی مرہم پٹی ہی کر دو۔" گوہر نے اپنی زخمی آنکھ کو دباتے ہوئے کہا۔

گارڈ نے بڑی نفرت سے تھوکا۔ یہ تھوک آہنی گرل میں سے گزر کر سیدھا گوہر کے ہاتھ پر پڑا۔ گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ "اسے لگا اپنی چوٹوں پر۔ اگر پھر بھی آرام نہ آئے تو اس میں تھوڑا سا پیشاب بھی ملا لینا۔" وہ بکتا جھکتا آگے چلا گیا۔

گوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے ہاتھ کی پشت قالین سے رگڑ کر صاف کی اور دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

میں بھی لیٹ گیا۔ کوٹھی میں مکمل سکوت تھا۔ لگتا تھا کہ رات بھر کی رنگین مصروفیات کے بعد سارے مہمان لمبی تان کر سوئے ہوئے ہیں۔ میرے بازو اور ٹانگ کے دو تین زخم بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور میں ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا۔ کیا واقعی یہ کوٹھی میرے لیے فتح محمد کی طرح موت کا پنجرہ ثابت ہونے والی ہے؟ میں نے بڑے کرب سے سوچا... اگر میں یہاں مر گیا تو عمران مجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا؟ فرح اور عاطف پر کیا گزرے گی؟ بالو مکمل طور پر بے سہارا ہو جائے گا... اور ثروت؟ کیا ثروت کو ایک آخری بار چھونے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی؟

میں نیم غنودگی میں لیٹا رہا۔ اسی دوران میں ایک بار آنکھوں کی درز سے گوہر کی طرف دیکھا تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ غالباً اسے نشے کی طلب ہو رہی تھی... اور یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، چرس نہ وھسکی وغیرہ۔ وہ اپنی ٹانگیں کھجا رہا تھا اور سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں جو ہی چاولہ کی مختصر لباس والی گرما گرم تصویر لگی تھی۔ وہ للچائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ للچائی ہوئی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ ایک آنکھ تو سوج کر اور نیلی ہو کر کیا بن چکی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منشیات کی طرح عورت کا بھی رسیا ہے۔

نہایت سنگین حالات تھے۔ اس کے باوجود گوہر نامی شخص جس طرح فلمی تصویر کو دیکھ رہا تھا، میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا۔ "یار! اتنی مار پڑی ہے پھر بھی تمہاری طبیعت میں کچھ نرمی نہیں آئی۔"

"کیا مطلب؟" اس نے مجھے گھور کر پوچھا۔

"اتنی پیاری لڑکی ہے اور تم ایسے دیکھ رہے ہو جیسے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔"

وہ میری بات سن کر بے ڈھنگے انداز میں مسکرایا۔ "قسائی تو ذبح کرنے کے لیے دیکھتا ہے، ہم ذبح ہونے کے لیے دیکھتے ہیں۔ ویسے کڑی بڑی ٹیٹ ہے۔" اس کی اکلوتی آنکھ میں جنسی بھوک لشکارے مار رہی تھی۔

اس نے "ٹیٹ" کا لفظ اپنی گفتگو میں شاید ایک یا دو بار پہلے بھی استعمال کیا تھا۔ یہ لفظ مجھے کچھ یاد دلا رہا تھا لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا یاد دلا رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ ہم ایک طرح سے اپنی اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ گوہر میری برداشت کی صلاحیت سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "گوہر! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رات کو ایک کتے نے تو تم پر فوراً حملہ کر دیا اور تم نے اسے گولی بھی ٹھوک دی لیکن دوسرا کتا جو زیادہ زہریلا لگتا تھا، تم سے دور دور رہا۔ حالانکہ وہ قد کاٹھ میں بھی پہلے سے ڈیوڑھا تھا۔"

"وہ مجھے جانتا تھا۔" گوہر نے کہا۔

"کیسے؟" میں نے کراہتی آواز میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "میں نے اس کی سکھائی کرائی تھی۔"

"یعنی... تم نے ٹریننگ دی تھی اسے؟ تم کتوں کو "ٹرینڈ" کرتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے بے پروائی سے سر ہلایا اور ایک بار پھر اکلوتی آنکھ سے جوہی چاولہ کا ایکسرے کرنے لگا۔

"تو تم کتوں کو ٹرینڈ کرنے کے لیے یہاں آئے تھے مگر پکڑے کیسے گئے؟"

"یار! تم کنڈم باتوں میں اپنا ویلا (وقت) خراب کر رہے ہو۔ اگر دماغ کو تکلیف دینی ہے تو پھر جان بچانے کے بارے میں کچھ سوچو۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ آج شام تک ہمیں زندہ رہنے دیں گے..."

ایک دم میرے ذہن میں کوندا سا لپکا... گوہر کے بار بار بولے ہوئے "ٹیٹ" نے میرے اندر جو کھد بد شروع کی تھی، وہ ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ یہ شخص کتوں کو تربیت دیتا تھا۔ چھریرے جسم کا مالک تھا اور وسطی پنجاب کا رہنے والا تھا... عمران نے اپنی روداد میں جس راجے کا ذکر کیا تھا، وہ بھی تو وسطی پنجاب کا تھا۔ اس کا بنیادی کام بھی کتوں اور گھوڑوں کی ٹریننگ ہی تھا... اور... پھر... یہ لفظ "ٹیٹ۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑی تاہم میں نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے۔ میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم کبھی خوشاب کے قریب شادپورہ میں بھی رہے ہو؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں، میں رہا تو ہوں شادپورہ میں بھی... پر تم کیسے جانتے ہو؟"

"کیا... تمہارا کوئی دوست عمو نام کا بھی تھا... عمو عمران۔" میں نے وضاحت کی۔

اس کی اکلوتی آنکھ میں لشکارے سے نظر آئے۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا...

"تم... تم عمو کو کیسے جانتے ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

میں گہری نظروں سے اس کو سرتاپا دیکھتا رہا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "کیا میں سمجھوں کہ تمہارا اصل نام گوہر نہیں ہے؟"

"تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔"

"تم نے بھی تو جواب نہیں دیا۔ تمہارا اصل نام گوہر ہے یا... راجا؟"

راجا کے لفظ پر وہ جیسے اچھل پڑا۔ اس نے بدکے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم عمو کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ کدھر ہے وہ؟"

ایک طرح سے وہ تسلیم کر رہا تھا کہ اس کا نام راجا ہے۔ میں نے اسے سرتاپا گھورا۔ ہاں، وہ راجا ہی تھا۔ وہی حلیہ جو عمران نے مجھے کئی بار بتایا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا ویسا ہی نشان۔ وہی بول چال۔ میں غائبانہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہی تیز طرار شخص تھا جس نے سولہ سترہ سالہ عمران کو ماجھاں جیسی جابر عورت کے چنگل سے چھڑایا تھا اور بے رحم حالات میں اسے زندہ رہنے کے گر سکھائے تھے۔ آگے چند برسوں میں راجے اور عمران کی دوستی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے اور پھر بقول عمران... راجا لاہور کے بازار حسن میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے اہم کردار سے میری ملاقات ہو گی اور ایسے حالات میں ہو گی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ دروازے کے دونوں پٹ اس طرح کھلے کہ ان میں چودہ پندرہ انچ کا فاصلہ ہو گیا۔ تاہم اسٹین لیس اسٹیل کی ایک نفیس زنجیر کے ذریعے دروازہ پورا کھلنے سے رک گیا۔ ایک رائفل بردار گارڈ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم تھا۔ ملازم نے ایک چھوٹی ٹرے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر کھسکا دی۔ ٹرے میں انڈے اور پیاز کا آملیٹ تھا۔ دو پراٹھے اور دہی وغیرہ تھا۔ رائفل بردار سفاک انداز میں بولا۔ "ناشتا کر لو۔ ہو سکتا ہے یہ تمہارا آخری ناشتا ہو۔"

"لسی مل جائے گی؟" گوہر یعنی راجے نے کراہتے ہوئے کہا۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ راجا ہی ہے۔

رائفل بردار پھنکارا۔ "لسی تو نہیں لیکن دہی کافی سارا پڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارے ہی کام آئے گا۔"

اس کے آخری الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ ان الفاظ کا اصل مطلب قریباً ایک گھنٹے بعد واضح ہوا اور یہ مطلب لرزہ خیز تھا۔

میں قریباً بیالیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ بدترین حالات اور اندیشوں کے باوجود کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز محسوس ہوئی۔ میں نے ٹرے اٹھا کر قالین پر رکھ لی۔ پہلا لقمہ لیا تو پتا چلا کہ جسم کے بہت سے دیگر حصوں کی طرح جبڑا بھی پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ بمشکل تھوڑا سا منہ کھول کر لقمہ زبان پر رکھ پایا۔ عمران نے مجھے سکھا دیا تھا کہ شدید خطرات اور اندیشوں کے نرغے میں بھی کس طرح خود کو نارمل رکھا جاتا ہے اور کس طرح صرف حال پر نظر رکھ کر مستقبل اور مستقبل قریب کو چکما دیا جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہیے اور مصیبت سے پہلے ڈرنا نہیں چاہیے۔ گارڈ کھڑکی میں موجود تھا، لہٰذا اب ہم "ایک دوسرے سے تعارف" والا موضوع نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ گوہر یعنی راجا کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وہ جلد از جلد مجھ سے عمران کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ ہمیں کافی لیٹ ناشتا دیا گیا تھا۔ قریباً دس بج چکے تھے۔ جس وقت ہم ناشتا کر رہے تھے، پارکنگ کی طرف سے گاڑیوں کے

اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ''شب بسری'' کرنے والے بیشتر مہمان اب رخصت ہورہے ہیں۔ ان میں سے کئی مہمان رخصت ہونے سے پہلے ہمیں دیکھنے کے لیے آئے۔ وہ گرل دار کھڑکی میں سے یوں جھانک رہے تھے جیسے بڑی تگ و دو کے بعد جنگل سے پکڑے جانے والے خطرناک جانوروں کو دیکھ رہے ہوں۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں شراب نوشی اور ''دیگر مصروفیات'' کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

قریباً بارہ بجے کا وقت تھا جب میری چھٹی حس نے کہا کہ یہاں کوئی خطرناک تماشا ہونے والا ہے۔ سلطان چٹا ہمارے کمرے کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔

وہ ذرا فاصلے پر گیا تو راجا نے کھڑکی میں کھڑے گارڈ سے پوچھا۔ ''کچھ ہمیں بھی بتاؤ اکرم خاں کیا ارادے ہیں تمہارے؟''

اس نے ایک بار پھر کھڑکی میں سے تھوک پھینکا جو راجے کے عریاں کندھے پر گرا۔ ''ارادے بڑے چنگے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم اوپر پہنچنے والے ہو۔'' گارڈ نے کہا۔

''تو پھر کیا سوچ رہے ہو... جو کرنا ہے فٹافٹ کرو۔ مارو گولی اور ٹھنڈا کرو ہمیں۔'' راجا نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ گولی تو انہیں ماری جاتی ہے جنہیں مارنا ہو۔ تمہیں تو پہلے زندگی موت کے درمیان ٹانگنا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔'' ایک طرف سے سیکریٹری ندیم نمودار ہوا اور آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''کئی ملکوں میں قانون ہے کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ہم بھی تمہیں تین کتوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ اصلی نسل کے بلڈاگ ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی جو تین کتے تم لوگوں نے مارے ہیں، یہ ان کے رشتے دار ہیں... بالکل جائز وارث ہیں۔ ایک ''متوفی'' کا بڑا بھائی ہے۔ دو اس کی مادہ کے پیٹ سے ہیں۔''

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ ندیم کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے دو دن پہلے تہ خانے میں بھی یہ بات کہی تھی کہ مجھ پر کتے چھوڑے جاسکتے ہیں۔ اب یہاں کوئی ایسا ہی سین ترتیب دیا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ندیم کی بات سن کر راجا کا چہرہ بھی متغیر ہوا ہے۔ دراصل صورتِ حال ہمارے لیے سنگین تر ہوتی جارہی تھی۔

ندیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے تاسف سے کہا۔ ''معاملے کو یہاں تک پہنچانے کے ذمّے دار تم خود ہو۔ تم نے اوپر تلے غلطیاں کی ہیں۔ اور سب سے اہم غلطی اس ''ماں کے ہیرو'' والی تھی۔ تم نے فون پر اسے الرٹ کر کے جاوا صاحب کی طرف سے اپنی موت پر مہر لگوا لی۔ جان تو اس ناکام ہیرو کی اب بھی نہیں بچنی، تم خوامخواہ جوانی میں اناللہ ہو رہے ہو۔''

ندیم کی بات سے مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی اور وہ تسلی یہ تھی کہ کم از کم ابھی تک تو عمران محفوظ ہے۔

ندیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ تم نے جاوا صاحب کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا۔ پہلی غلطی کے بعد یہ دوسری غلطی سراسر خودکشی کے برابر تھی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے میری دوسری غلطی کے بارے میں بتا کر ندیم ایک طرح سے مجھے امید کی مدھم سی کرن بھی دکھا رہا ہے۔ مجھے بتانا چاہتا ہے کہ اگر میں اب بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر دوں تو کوئی بری بھلی صورت نکل سکتی ہے لیکن یہ ایک چکما بھی ہوسکتا تھا۔ کم از کم سلطان چٹا وغیرہ کے تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں مارنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ فضا میں ایک سراسیمگی سی پائی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایشوریا رائے ثانی جیسی لڑکیاں اور عام ملازم جو تماشائی کی حیثیت سے کھڑکی کے اردگرد موجود تھے، اب کہیں غائب ہو چکے تھے۔ فقط کرخت چہرہ گارڈز آس پاس نظر آتے تھے یا سلطان چٹا پھنکار رہا تھا۔

سرخ رنگ کی ایک پلاسٹک کی بالٹی لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس میں جو کچھ تھا، وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر کتوں کی خوفناک... گونجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد تین عدد جسیم کتے ہمارے سامنے تھے۔ ان کی چمکیلی زنجیریں تین تنومند افراد کے ہاتھوں میں تھیں۔ کتوں کے منہ پر بگیاڑیاں (حفاظتی جالیاں) تھیں۔ وہ پارے کی طرح مچل رہے تھے اور اپنے رکھوالوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جارہے تھے۔

گارڈ اکرم خاں نے سرخ بالٹی میں سے ایک بڑا ڈونگا بھر کر نکالا اور کھڑکی کے پاس بیٹھے راجا پر اچھال دیا اور

تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ اس بالٹی میں دہی ہے۔ راجے کا زخمی عریاں جسم دہی سے لتھڑ گیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ دوسرا ڈونگا مجھ پر ڈالا گیا۔ میرے کندھوں پر کچھ دہی گرا۔

اس کے بعد گرل دار کھڑکی کے رستے ہم پر تواتر سے دہی پھینکا جانے لگا۔ فرش اور قالین بھی دہی سے لتھڑ گیا۔ کمرے سے باہر کھڑے کتے، دہی کی خوشبو سے دیوانے ہو رہے تھے۔ غالباً ان کی تربیت ہی اسی انداز سے کی گئی تھی۔ یہ بڑی لرزہ خیز صورتِ حال تھی۔ کچھ دیر پہلے جب راجا نے ناشتے میں لسی مانگی تھی تو رائفل بردار نے کہا تھا... لسی تو نہیں دہی بہت ہے اور تمہارے ہی کام آنے والا ہے... اور اب یہ ''کام'' آرہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا لیکن وہ پہلے کی طرح بس فٹ سوا فٹ ہی کھل سکا۔ زنجیر نے اسے پورا کھلنے سے روک لیا۔ یہ خلا اتنا ضرور تھا کہ اس میں سے جسیم بلڈاگ اپنی تمام تر حشر سامانی کے ساتھ اندر داخل ہوسکتا... اور پھر وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے منہ پر سے حفاظتی جالی ہٹائی جاچکی تھی اور وہ کسی کو بھی اپنے نکیلے دانتوں سے پھاڑنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اضطراری حرکت کے تحت ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے... دیوار کے ساتھ جا لگے۔ اتنے میں دوسرا کتا بھی پھنس پھنسا کر اندر داخل ہوگیا۔ دونوں خونخوار جانوروں کی زنجیریں ان کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ انہیں کھینچ رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ تھوڑی ڈھیل بھی دے رہے تھے۔ یہ دہشت زدہ کرنے کا ایک ڈھنگ تھا۔ تاہم یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ اگر ان تین کتوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم خالی ہاتھ ہرگز اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ دونوں شدید زخمی تھے اور میری ایک ٹانگ تو تقریباً مفلوج تھی۔

چند لمحے بعد تیسرا کتا بھی خوفناک جست کے ساتھ اندر آگیا۔ وہ اپنے رکھوالے کو تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک دوسرے شخص نے بھی زنجیر تھام لی۔ کتوں کے سماعت شکن شور سے کمرے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ دہی کی خوشبو انہیں دیوانہ کر رہی تھی اور یقیناً ان میں ہمارے زخموں اور خون کی بو بھی شامل تھی۔ یہ واقعی قیامت خیز گھڑیاں تھیں۔ اپنے جیسے شخص سے برسرِپیکار ہونا، اس سے مار کھانا اور اسے مارنا ایک اور بات ہے، مگر بپھرے ہوئے خونخوار جانوروں کا سامنا کرنا دیگر بات۔

آخر میں داخل ہونے والا جسیم کتا راجا کے بالکل قریب آگیا تو راجا نے اس کے منہ پر لات رسید کی۔ اس لات کی سزا دینے کے لیے رکھوالے نے زنجیر کو کچھ اور ڈھیل دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے نے راجا کی پنڈلی پر منہ مارا۔ اس کی پتلون کا پائنچا ادھیڑ کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ٹخنے کو بھی زخمی کیا۔ راجا نے مغلظات بکیں اور تکلیف سے دہرا ہوگیا۔ اس کے لمبے ملائم بال چہرے پر بکھر گئے تھے اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔

سلطان چٹا سب کچھ کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا... مونچھوں کو تاؤ دے کر دہاڑا۔ ''چڑھا دو حرامزادے پر۔ پھاڑ دو پیٹ اس کا۔''

کتا ایک بار پھر راجا کی طرف آیا۔ یوں لگا کہ وہ واقعی اس کا خاتمہ بالخیر کر دے گا مگر سیکریٹری ندیم نے رکھوالے کو روکا۔ اس نے کتا پیچھے کھینچ لیا... چند سیکنڈ بعد باقی دونوں کتے بھی کھینچ لیے گئے۔ ان کو برآمدے تک پیچھے ہٹا لیا گیا۔ ہمارے اردگرد سماعت شکن شور قدرے کم ہوگیا۔ سیکریٹری ندیم گرل دار کھڑکی میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور عداوت کی چنگاریاں تھیں۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''یہ تمہارے لیے آخری... بالکل آخری موقع ہے سلطانی گواہ بننے کا۔ ورنہ ٹھیک پانچ منٹ بعد تم دونوں کی لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کرنا اور انہیں علیحدہ علیحدہ شاپروں میں ڈالنا کافی مشکل ہوجائے گا۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' میں نے وقت ٹالنے کے لیے پوچھا۔

''نہیں نہیں، اب پوچھنا وچھنا کچھ نہیں۔ اب تو دوٹوک بات ہے۔ ایک اور سنہری موقع دیتے ہیں تمہیں۔ سیل فون تمہارے ہاتھ میں تھماتے ہیں۔ کسی طرح اپنے یار کو بل میں سے نکال سکتے ہو اور یہاں بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ کچھ ایسا رونا روؤ اس کے سامنے کہ وہ تڑپ کر تمہارے پاس پہنچ جائے۔''

سلطان چٹا پھنکارا۔ ''لیکن اگر پہلے والا کمینہ پن کیا تو اس بار چھوٹ نہیں ملے گی... یہ تینوں کتے ایک ساتھ تمہارے اوپر چڑھائی کریں گے۔ پہلے سیکنڈ میں تمہیں ننگا کریں گے۔ اگلے دو سیکنڈ میں پھاڑ دیں گے...''

ابھی سلطان کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ آواز کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ایک طویل برسٹ چلا۔ کچھ چلاتی ہوئی آوازیں آئیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے کوئی بڑی گاڑی کوٹھی کا مین گیٹ توڑتی ہوئی اندر گھس آئی ہے اور... یہ ایک گاڑی نہیں تھی۔ شاید کئی گاڑیاں تھیں۔ ان کے انجن چنگھاڑ رہے تھے اور شاید اس کے ساتھ ساتھ

گاڑیوں پر سوار لوگ بھی للکارے مار رہے تھے۔

ایک دم ہی کوٹھی کے طول و عرض میں اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں نے گارڈ اکرم خاں کو دیکھا، وہ اپنی رائفل سیدھا کر کے احاطے کی طرف مڑا مگر ابھی دو قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ اس کی چھاتی پر آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ اچھل کر برآمدے کی سیڑھیوں میں گرا۔ سلطان چٹا اور ندیم وغیرہ بھی آڑ کے لیے مختلف اطراف میں بھاگے... رکھوالوں نے کتوں کی زنجیریں چھوڑ دیں، وہ تینوں کتے جارحانہ انداز میں مختلف اطراف میں لپکے۔ ”لگتا ہے مخالف پارٹی نے حملہ کر دیا ہے۔“ راجا اپنا زخمی ٹخنہ دبائے دبائے بولا۔

”مخالف پارٹی کون ہے؟“

”کوئی تو ”اللہ کی بندی“ ہوگی۔“ راجا نے عجیب جواب دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا، وہ پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ماؤزر تھا۔ اس نے ایک ستون کی آڑ لے رکھی تھی اور اندرونی کمروں کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پکار رہا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے اس شخص کو ریان ولیم صاحب کے آس پاس دیکھا ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ یہ ریان ولیم گروپ کے لوگ ہیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کی شبیہہ میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ ہمیں جلالی صاحب کی طرف بھیجنے والا اور نت نئے حالات سے دوچار کرنے والا ریان ولیم ہی تھا۔ ریان گروپ اور جاوا گروپ میں آرا کوئے کے مجسمے کے لیے خوفناک کشمکش چل رہی تھی۔ اس کشمکش کو چند دن پہلے اس وقت عروج ملا تھا جب جاوا کے لوگوں نے جلالی فارم پر حملہ کیا تھا، قتل کیے تھے اور عصمت دری کی تھی۔ اس بھیانک واردات کا ملبا ریان گروپ پر ڈالنے کے لیے جاوا کے لوگوں نے ایک ناٹک بھی کیا تھا۔ جاوا کے نادرے نامی دراز قامت غنڈے نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے رکھا تھا اور پشتو لہجے میں اردو بولی تھی۔ یوں انہوں نے تفتیش کا رخ ریان گروپ کے مرجان خان کی طرف موڑنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ بعدازاں عمران نے اس صورتِ حال کو ریورس گیئر لگایا تھا۔

فائرنگ کی آواز میں شدت آتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی اور نیم مفلوج ٹانگ کو متحرک کیا۔ ادھ کھلا دروازہ ہمارے سامنے تھا اور آزادی کی نوید سنا رہا تھا۔ دروازے کے خلا میں اتنی جگہ موجود تھی کہ ہم پھنس پھنسا کر اس میں سے نکل سکتے تھے۔ باہر چاروں طرف پرواز کرتی ہوئی اندھی گولیوں کا خدشہ تو موجود تھا مگر اندر بھی تو موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پہلے میں اور پھر راجا عرف گوہر دروازے سے باہر آگئے۔ باہر آتے ہی گولیوں کے پورے ایک برسٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ برسٹ راجا کے سر سے دو ڈھائی فٹ اوپر دیوار میں لگا۔ میں نے اکرم خاں کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور لنگڑاتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں آگیا۔ راجا بھی جھک کر دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کا چھریرا جسم تیز دھوپ میں چمک رہا تھا۔

میں نے دیکھا، ریان گروپ کا ایک شخص اندھا دھند دوڑتا ہوا واپس اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بلڈاگ اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ شخص گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسنے میں کامیاب ہوا لیکن اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی جسیم کتا بھی اندر گھس گیا۔ ممکن ہے ریان گروپ کے کسی شخص نے کتے پر فائر وغیرہ بھی کیا ہو لیکن وہ اسے لگا نہیں۔

اگلے چار پانچ سیکنڈ گاڑی میں گھسنے والے کے لیے بڑے بھیانک تھے۔ بپھرے ہوئے کتے نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں گاڑی کے کھلے دروازے میں سے بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ کتے کے منہ میں بدقسمت شخص کے پیٹ کا ایک بڑا لوتھڑا تھا اور اس کی انتڑیاں بکھر رہی تھیں۔ اس کی آخری آوازیں بڑی دردناک تھیں۔ گاڑی کی دائیں کھڑکیوں کے شیشے خون سے لتھڑ گئے اور یہ لرزہ خیز منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا۔ احاطے میں کھڑی ایک سفید اسٹیشن وین کا ایک ٹائر گولی کا نشانہ بن کر دھماکے سے پھٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کتا کار سے باہر نکلا جس نے ریان گروپ کے شخص کو وحشیانہ طریقے سے مارا تھا۔ کار سے باہر نکلتے ہی کتا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ یقیناً اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔

”یہاں سے نکلنے کا یہ اچھا موقع ہے۔“ راجا نے میرے کان میں کہا۔

”کس طرف سے نکلیں؟“ میں نے پوچھا۔

راجا نے عقابی نظروں سے چند قدم دور کھڑی ایک لینڈ روور جیپ کو دیکھا۔ جیپ کا سامنے والا حصہ پچکا ہوا تھا... ہیڈ لائٹس بھی چکنا چور تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسی جیپ سے ٹکر مار کر کوٹھی کا مین گیٹ توڑا گیا تھا۔ راجا نے

کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ جیپ کی چابی اندر ہی ہے، کسی طرح جیپ تک پہنچ جاؤ۔“

ہم دونوں زمین پر لیٹ گئے۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اس پرانے ماڈل کی جیپ کی طرف بڑھے۔ فائرنگ شدید تر ہوگئی تھی۔ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ لڑنے والوں کے للکارے پوری کوٹھی میں سنائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے لوگ عداوت کے عروج پر پہنچ کر ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ صرف احاطے کے اندر ہمیں کم از کم چار لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم پورچ کے قریب کھڑی لینڈ روور کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آخری سات آٹھ قدم کا فاصلہ ہم نے جھک کر دوڑتے ہوئے طے کیا... اور جیپ میں گھس گئے۔ راجا چونکہ پہلے گھسا تھا، اس لیے اس نے بائیں طرف والی نشست سنبھالی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ جونہی میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی، جیپ تھرتھراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوگئی۔ ٹانگ کام نہیں کر رہی تھی مگر میں کسی نہ کسی طرح کلچ دبا کر گیئر لگانے میں کامیاب رہا۔ ایکسلریٹر دبایا تو جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ گولیوں کی مار سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے سر حتی الامکان حد تک نیچے جھکا رکھے تھے۔ کتے کی خون آلود لاش کو روندتی ہوئی جیپ گیٹ سے نکلی اور باہر آگئی۔ سامنے دو تین گاڑیاں اس طرح آڑی ترچھی کھڑی تھیں کہ راستہ بند تھا۔ میں جیپ کو گھما کر کوٹھی کی بغلی گلی میں لے گیا اور پھر عقب میں نکل آیا۔ اسی اثنا میں ایک اندھی گولی نے جیپ کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ ہنگامے اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی کچھ خبر نہیں تھی۔ کوٹھی کے عقب سے گزرتے ہوئے اچانک میں چونکا۔ میں نے جیپ کو بریک لگا دیے۔

”عقل تو نہیں ماری گئی؟ کیا کرتے ہو؟“ راجا چلایا۔

”بس ایک سیکنڈ۔“ میں نے کہا اور چھلانگ لگا کر جیپ سے اترا۔ لنگڑاتا ہوا اس لمبی گھاس کی طرف بڑھا جس میں اپنا سیل فون چھپایا تھا۔ سیل فون ڈھونڈنے اور جیپ میں واپس آنے میں مجھے آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیپ ایک بار پھر آگے بڑھی اور طوفانی رفتار سے بڑی سڑک کی طرف چل دی۔ ہمارے عقب میں کوٹھی کے اندر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شاید کسی حصے میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ دھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ہم نے موقعِ واردات سے دور آنے کے لیے کچے راستے استعمال کیے۔ کھیتوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی سے قریباً دس کلومیٹر دور آگئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ پر ہیں۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارا رخ لاہور کی طرف ہی رہا ہے۔ یہ بالکل دیہاتی علاقہ تھا۔ راستے میں چند بڑی بڑی پھلواریاں اور زرعی رقبے بھی دکھائی دیے تھے۔ یہ عین دوپہر کا وقت تھا۔ قریباً ایک بج چکا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھیت کھلیان، راستے اور گاؤں، سب خاموش اور سنسان نظر آتے تھے۔ بس کہیں کوئی چرواہا مویشیوں کو ہانکتا دکھائی دیتا۔ چارے سے لدی ہوئی کوئی گدھا گاڑی ہچکولے کھاتی نظر آتی یا دور کہیں کسی کھیت میں ٹریکٹر کی آواز ابھرتی اور بکھرتی۔

اس سارے سفر کے دوران میں ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ ہماری نگاہیں بار بار عقب نما آئینے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں جہاں ہچکولے کھاتے راستے اور گرد کے مرغولوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جاوے کی دہشت ناک صورت بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ وہ واقعی ایک بے رحم ڈان کا چہرہ تھا اور اس ”ڈان“ نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک عمران کو ختم نہیں کر لیتا، اپنی مرغوب چیزوں کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ وہ اس کو بھرت وچن کا نام دیتا تھا۔ جاوے کے اس ٹھکانے پر جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ لرزہ خیز تھا۔ میں اس سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا...... راجا کو گاڑی کے ڈیش بورڈ کے اندر سے ایک پسندیدہ شے مل گئی تھی۔ یہ انگریزی شراب کی ایک سربمہر بوتل تھی۔ راجا نے بلاتکلف اس کی سیل توڑی اور گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دی تھی۔ تھوڑی سی شراب اس نے اپنے زخمی ٹخنے پر بھی انڈیلی تھی اور برے برے منہ بنائے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ شراب کے لیے ترسا ہوا ہے... یا پھر اپنی جسمانی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ پی رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک تہائی بوتل خالی کر گیا۔ اس کی ورم زدہ آنکھ کا ورم کچھ کم ہوگیا تھا مگر وہ گہری نیلی پڑ چکی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ ان بالوں پر ابھی تک سوکھا ہوا دہی موجود تھا۔

عمران کی روداد میں، میں نے راجا کا ذکر بڑی تفصیل سے سنا تھا۔ ایک طرح سے اس کا مفصل غائبانہ تعارف ہو چکا تھا لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی

وقت راجا سے اس طرح ملاقات ہوگی۔ وہ اور میں ایک ''چوری شدہ'' جیپ میں بیٹھ کر ایک پُر ہنگام جگہ سے نکلیں گے اور ایک چلچلاتی دوپہر میں چور راستوں پر سفر کریں گے۔ ہمارے جسموں پر نامکمل لباس ہوں گے۔ پاؤں ننگے ہوں گے اور زخموں سے خون رس رہا ہوگا۔ راجا مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور میں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن فی الحال اس حوالے سے ہم دونوں خاموش تھے۔

جھاڑیوں کے ایک سایہ دار جھنڈ کے اندر سے گزرتے ہوئے میں اور راجا بری طرح چونک گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے جیپ کے پچھلے حصے میں کوئی موجود ہے۔ کوئی جاندار چیز۔

''یہ کیا ہے؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، آواز تو آئی ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔

''بریک لگاؤ۔'' راجا نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی۔ راجا کسی ماہر شکاری کی طرح چوکس ہو گیا تھا۔ مرحوم گارڈ اکرم خاں کی رائفل ابھی تک ہمارے پاس تھی۔ راجا نے رائفل اٹھائی اور اپنے چھریرے جسم کو بل دیتا ہوا جیپ کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ لینڈ روور جیپ مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ کافی کشادہ بھی ہوتی ہے۔ یہ جیپ گو کہ پرانی تھی مگر اب تک اس نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب یہ اپنے اندر کا کوئی اسرار ہم پر کھول رہی تھی۔ راجا عقبی نشستوں پر گیا۔ پھر وہ یوں کسی شے پر جھپٹا جیسے بلی چڑیا پر جھپٹتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی عورت سریلے انداز میں چلائی۔ چند سیکنڈ بعد ہم مبہوت رہ گئے۔ جیپ کی سب سے پچھلی نشستوں کے اگلے خلا سے ایک لڑکی برآمد ہوئی تھی۔ جاوا گروپ کی دیگر لڑکیوں کی طرح یہ بھی ہوش ربا لباس میں تھی۔ اس نے نہایت کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی اور سفید رنگ کی چست شارٹس ٹانگوں سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال راجا کی مٹھی میں تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور پھر چونک گیا۔ یہ ایشوریا رائے کی وہی ہم شکل تھی جو کوٹھی میں ہر وقت ندیم کی بغل میں گھسی نظر آتی تھی۔

''اوئے یہ پری کہاں سے آگئی؟'' راجا پُرجوش آواز میں بولا۔

''اس پری ہی سے پوچھو۔'' میں نے کہا۔

راجا نے لڑکی کو کھینچ کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس کے بال بدستور راجا کی مٹھی میں تھے اور اس کی صراحی دار گردن ایک طرف کو خم کھائے ہوئے تھی۔ ''سوہنیو! یہ کہاں آ پھنسے ہو؟'' راجا نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''وہ... وہ میرے پیچھے بھاگے تھے... میں جان بچانے کے لیے گاڑی میں گھس گئی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کون بھاگے تھے سوہنیو...؟'' راجا نے بازاری انداز میں پوچھا۔

''وہی جو کوٹھی میں گھسے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً ریان گروپ کے لوگوں کی طرف ہی تھا۔

راجا نے اس کے بال چھوڑے اور اس کی گردن پر ہاتھ چلاتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔ ''بادشاہو! یہ کیا کرتے رہے ہو آپ جناب... ساڈے نال سفر بھی کرتے رہے ہو اور ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ ہمیں بتاتے، ہم آپ کی کوئی خدمت شدمت کرتے۔ کوئی ''چائے پانی'' پلاتے آپ کو۔'' راجا کے اندر وھسکی کے نشے نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پلیز! مجھے جانے دو۔'' وہ پھر روہانسی آواز میں بولی۔

''یہ تو میں نے بھی بہت کہا تھا کہ مجھے جانے دو لیکن تم نے میری بات مانی تھی؟''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں اس سے۔'' وہ منمنائی۔

''تمہارا نہیں، پر تمہارے اس یار ندیمے اور سلطان چٹے کا تو ہے نا۔''

''دیکھو... مم... مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔''

''یہ انار کلی یا مال روڈ نہیں ہے سوہنیو... جنگل ہے جنگل۔ یہاں کوئی جناب کا شور نہیں سننے والا۔ اور اگر... فرض کیا... ہم چھوڑ بھی دیں تو جناب عالی جائیں گے کہاں؟ یہاں چاروں پاسے جھاڑیوں اور برساتی نالوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے جنگلی جناور بھی ہیں یہاں۔ وہ اتنی سوہنی، مکھن ملائی جیسی کڑی کو دیکھ کر چھوٹے موٹے جناور نہیں رہیں گے، ایک دم چیتے اور ببر شیر بن جائیں گے۔ پھاڑ کھائیں گے آپ کو۔ ویسے بھی آپ کی شکل انڈین ہیروئن سے ملتی ہے اور انڈیا ہمارا پکا دشمن ہے۔'' راجا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مم... میں... پاکستانی ہوں۔''

''پر شکل کا کیا کریں جناب! شکل تو انڈین ہے نا۔''

راجا نے ایک بار پھر حریص انداز میں اس کی گردن پر ہاتھ

چلایا۔

راجا کی دست درازی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم اور سنگین حالات کو جیسے ایک دم بھول ہی گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس قماش کا شخص ہے۔ اوپر سے ایک تہائی بوتل کا نشہ بھی تھا اسے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اگلے چند منٹ میں کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ میں نے ایشوریا ثانی اور اس کے ''معاملات'' میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''گوہر! ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔''

''تو میں کیا کہہ رہا ہوں یار! تم گاڑی چلاؤ۔ میں اس کو سنبھال کر پیچھے بیٹھا رہتا ہوں۔''

''لیکن تمہیں نشہ چڑھا ہوا ہے۔ تم ''بیٹھو'' گے نہیں۔''

''یار! کیسی کنڈم بات کر رہے ہو تم۔ اتنا بے صبرا نہیں ہوں میں۔ اللہ نے دیا ہے، آرام سے کھائیں گے۔''

جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ میں نے اسے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا لیکن وہ ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔ میں نے میٹر چیک کیا۔ فیول موجود تھا، ٹمپریچر بھی ٹھیک ہی تھا... چابی گھما کر پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ہوئی۔

''ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔ تم اس پری کا دھیان رکھنا۔'' راجا بولا اور عقبی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے بونٹ اٹھا کر تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور پھر بولا۔ ''لو اب کرو اسٹارٹ۔''

میں نے پھر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ چند سیکنڈ کے لیے لگا کہ انجن اسٹارٹ ہو رہا ہے مگر پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ راجا نے کہا۔ ''لگتا ہے کاربوریٹر میں کچھ مسئلہ ہے۔''

میں نے ٹول باکس نکال کر اسے دیا۔ وہ ماہرانہ انداز میں کاربوریٹر کا ایک حصہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں تھا لیکن راجا ماہر لگتا تھا۔ مجھے یاد آیا... عمران نے اپنی روداد میں بتایا تھا کہ راجا کے پاس جانوروں کو ڈھونے کے لیے ایک نہایت کھٹارا لوڈر ہوا کرتا تھا جس کا نام اس نے پاٹے خان رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے چلاتا رہتا تھا اور ٹھیک بھی کرتا رہتا تھا۔

مگر آج تو راجا بھی فیل ہوا۔ کافی کوشش کے باوجود ہم اس پرانی لینڈ روور کو اسٹارٹ نہ کر سکے۔ اس دوران میں ایشوریا ثانی پچھلی سیٹ پر دبکی بیٹھی رہی۔ میں نے رائفل اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس رائفل کی دید ایشوریا کو بے حد محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ویسے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے زیادہ خطرہ یہی ہے کہ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچے۔ جہاں تک عزت آبرو کی بات تھی، ایشوریا جیسی لڑکی کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کوئی بلند پایہ فن کارہ نہیں، ایک ایکسٹرا گرل تھی اور ندیم اور سلطان جیسے لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد راجا ہانپا ہوا سا واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ پچھلی نشست پر ہی بیٹھا تھا۔ جیپ کی دیوار پر گھونسا مار کر بولا۔ ''شکر کرو کہ یہ حرام زادی ان درختوں کے اندر خراب ہوئی ہے۔ کہیں کھلی جگہ پر لمبی لیٹ جاتی تو مسئلہ ہو جانا تھا۔''

''مسئلہ تو اب بھی ہے یار! ابھی ہم موقع سے بہت زیادہ دور نہیں آئے۔ تلاش کرنے والے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''یار! اگر وہ ریان پارٹی کے لوگ ہوئے تو پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہے... ہم نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ انہوں نے ہمارا بگاڑا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے لیے چنگا ہی کیا ہے۔ ہمیں وہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے۔ اگر وہ آ گئے تو ہم یہ پری اپنے پاس رکھ کے یہ گاڑی ان کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔''

''اور اگر وہ جاوے کے لوگ ہوئے تو پھر؟''

''پھر دھن دھنا دھن۔ پر تو اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے بھاپے! مجھے نہیں لگتا کہ جاوے کے لوگ اب دو چار دن سے پہلے سنبھل سکیں گے۔ ابھی تو وہاں وہ بچھی ہوگی... کیا کہتے ہیں اسے...؟''

''صفِ ماتم۔'' میں نے کہا۔

''ہاں... اور تھانے کچہری کا زبردست چکر چل رہا ہوگا۔''

''تو پھر اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اس کو ٹھیک کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہوا تو پھر رات کو اڈیکیں گے۔ دن دیہاڑے یہاں سے نکلنا تو ایک دم خطرناک ہوگا۔''

راجا کی بات میں وزن تھا۔ یہ جگہ کافی محفوظ تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ گھنی چھاؤں بھی تھی۔ کوئی اکیلا دکیلا آدمی ادھر آ بھی نکلتا تو اسے مطمئن کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھور والی جگہ تھی۔ کافی دور تک کھیت دکھائی نہیں دیتے تھے... بالکل پاس سے ایک سیم نالہ گزر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دن ڈھلنا شروع ہو گیا۔ سائے لمبے ہونے لگے۔ راجا گھونٹ گھونٹ وھسکی پی رہا تھا۔ جیپ کے

اندر سے ہی اسے نمکو اور چپس کے دو چار لفافے بھی مل گئے تھے۔ ایک پری پیکر اس کے پہلو میں تھی اور وہ زخمی ہونے کے باوجود خود کو بالکل مطمئن محسوس کر رہا تھا۔

میں اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی صورت عمران سے رابطہ ہو سکے۔ میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر سکوں اور موجودہ صورتِ حال پر مشورہ بھی حاصل کر سکوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی بتا سکوں کہ اس کا کون سا دیرینہ ساتھی میرے ساتھ موجود ہے لیکن سیل فون پر سگنل نہیں آ رہے تھے۔ اگر کسی وقت آتے تھے تو بہت کمزور۔ میں نے سیل فون گھاس میں چھپاتے وقت آف کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کی چارجنگ بہت کم رہ گئی تھی۔

راجا، ایشوریا رائے ثانی (سویٹی) کے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور اس کی کہانی سن رہا تھا۔ یہ کہانی اس طرز کی عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہی باپ کی دوسری شادی... ماں بیمار، بھائی نشئی، گھر میں فاقے۔ وہ روزگار کی تلاش میں نکلی۔ کسی نے کہا اس کی شکل مشہور فلم ایکٹریس سے ملتی ہے۔ وہ اسے اسٹوڈیو کی روشنیوں میں لے گیا۔ وہ روشنیاں جو اندر سے بہت تاریک ہوتی ہیں... وہ انہی ”تاریک روشنیوں“ میں چلتی ہوئی اور کئی خلوتوں سے گزرتی ہوئی سلطان صاحب اور جاوا صاحب تک جا پہنچی۔ پتا نہیں کہ اب ایشوریا کی اس کہانی میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے بگ باس جاوا صاحب کیا کام کرتے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”وہ ایک بڑے فلم پروڈیوسر ہیں۔ بالی ووڈ میں ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ وہ آج کل مشہور انڈین ہیروئنوں کے ڈپلی کیٹ اکٹھے کر رہے ہیں۔ ان ڈپلی کیٹس کو بڑی اچھی تنخواہ پر ملازم رکھا جائے گا۔ ان کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔“

”کیسی ٹریننگ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کیمرے کے سامنے آنے کی... ویسے صحیح پتا تو بمبئی پہنچ کر چلے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں تو تمہاری ٹریننگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ ندیم اور سلطان چٹا وغیرہ تمہیں رات دن ٹرینڈ ہی تو کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو بمبئی جا کر تمہیں زیادہ تر ”یہی کام“ کرنا ہوگا۔“

وہ چپ رہی۔ راجا نے نشیلے انداز میں اس کے رخساروں پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

”سوہنیو! اور کتنی کڑیاں آپ کے ساتھ یہ تالیم (تعلیم) حاصل کر رہی ہیں؟“

”چھ سات ہیں۔“

”ان سب کی شکل کسی ایکٹریس سے ملتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

ایشوریا نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دائیں رخ سے واقعی ایشوریا رائے ہی نظر آتی تھی۔

راجا اس پر فدا ہوا جا رہا تھا۔ شراب بھی کام دکھا رہی تھی۔ اگر میں یہاں موجود نہ ہوتا تو وہ کب کا کپڑوں سے باہر ہو چکا ہوتا۔ یوں تو اب بھی اس کے جسم پر کپڑے برائے نام ہی تھے۔ اس کی شرٹ تو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی تار تار ہو گئی تھی۔ پتلون کا ایک پائنچا بھی وہیں پر لیر ولیر ہو گیا تھا۔ اپنی سوجی ہوئی نیلی آنکھ اور زخمی چہرے کے ساتھ وہ کسی حد تک مضحکہ خیز بھی نظر آتا تھا۔ وہ مجھے ابھی تک اپنا نام گوہر ہی بتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام تابش بتایا تھا۔ اگر یہ ہوش ربا لڑکی ہمارے درمیان موجود نہ ہوتی تو شاید ہم اب تک ایک دوسرے کو اپنی سچی جھوٹی کہانی سنا چکے ہوتے۔ لیکن اس خوبرو لڑکی نے راجا کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اسے غالباً اس کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے عمو کا ذکر بھی مؤخر کیا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کا خوف بھی اب کافی حد تک دور ہو گیا ہے۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی جان کو یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے راجے کو اپنی ”خوب شکلی“ کا کچھ خراج دینا پڑے گا۔ راجا اور ایشوریا ثانی کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس سے مجھے ایک دو باتوں کا مزید پتا چلا۔ اندازہ ہوا کہ راجا انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں واقعی بلڈاگ اور ہاؤنڈ کتوں کی ٹریننگ کے لیے موجود تھا۔ تاہم اس دوران میں اس نے اپنی عادت کے مطابق کوئی ہینگی بینگی کی تھی۔ غالباً کوئی قیمتی شے چوری کی۔ اس چوری کے دوران میں اس کے چاقو سے ایک شخص شدید زخمی ہوا جس کے بعد جاوا کے لوگوں نے اسے پکڑ کر اور مار پیٹ کر تہ خانے میں ڈال دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی۔ اس جھنڈ کے اندر تاریکی پھیلنے لگی۔ لیکن یہ تاریکی توقع سے کچھ زیادہ تھی۔ میں نے درختوں سے باہر نکل کر دیکھا۔ گہرے بادل چھا گئے تھے اور مزید گہرے ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش بھی ہونے لگی۔ بڑے زور کا تریڑا پڑنے لگا۔ راجا نے مسرور

ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں نشست پر پھیلائے اور بولا۔ ”چلو یہ ڈر بھی ختم ہوا کہ کوئی گڈی کے پہیوں کے نشان دیکھتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ہم وہ بجا سکتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے...؟“

”چین کی بانسری۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں... چین کی بانسری۔“ اس نے معنی خیز انداز میں ایشوریا رائے ثانی کو دیکھا۔

بارش تیز تھی اور تواتر سے برس رہی تھی۔ درختوں کے ہیولے جھومتے تھے اور ان کے درمیان رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ راجا نے ترنگ میں آ کر سرائیکی انداز کا ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ شراب ہے، بارش بھی ہے اور محبوب بھی۔ بوتل اور پیالے کی کھن کھن، بارش کی رم جھم اور چوڑیوں کی چھن چھن آپس میں رل مل گئی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان آوازوں کی لے پر ناچنا شروع کر دوں۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میرے سیل فون کی بیٹری یکسر ختم ہو گئی اور میں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ کل کی تقریباً ساری رات بھی ہنگامہ خیزی کی نذر ہوئی تھی۔ جسم زخموں اور تھکن سے چور تھا۔ میں نے نشست کو اسٹریچ کیا اور نیم دراز ہو گیا۔ بارش ختم ہونے کے بعد ہی ہم جیپ سے نکل سکتے تھے اور کسی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔ ابھی تک ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ ہمیں ایشوریا رائے کو اپنے ساتھ رکھنا ہے یا باندھ کر یہیں لینڈ روور کے اندر چھوڑ جانا ہے۔ ایسی فیشن ایبل خوبرو لڑکی کو ساتھ رکھنے میں یہ نقصان تھا کہ راستے میں کوئی بھی ہم پر شبہ کر سکتا تھا۔ کسی پولیس ناکے پر بھی ہمیں خوامخواہ روکا جا سکتا تھا یا وہ خود پولیس کو یا عام لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جاوا گروپ کے لوگوں نے ایشوریا ثانی کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی رپورٹ وغیرہ بھی درج کرا رکھی ہو۔ مگر اس کو ساتھ رکھنے میں یہ فائدہ تھا کہ اگر کہیں جاوا گروپ کے لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو ہم ایشوریا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ان پر کچھ دباؤ ڈال سکتے تھے۔

میں اونگھنے لگا تو راجا نے کہا۔ ”چلو تم کچھ دیر آرام کر لو۔ میں جاگتا ہوں۔ پھر میں انکھ لگا لوں گا اور تم پہرے داری کرنا۔“

راجا کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ میری غنودگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ثروت کی گمشدہ مہک میرے آس پاس بکھر گئی۔ اس مہک میں معصوم بالو کے جسم کی مہک بھی شامل ہو گئی۔ ایک مہک نے جیسے دوسری مہک کو اپنی گود میں لے لیا۔ میں ان دونوں مہکاروں کا پیچھا کرتے کرتے سو گیا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی دیر سوؤں گا۔ تھکاوٹ اور رت جگے نے کام دکھایا تھا۔ ایک پہلو سن ہو گیا تھا شاید... میں نے نشست پر پہلو بدلا تو آنکھ کھل گئی۔ بارش دھیمی ہو گئی تھی لیکن برس رہی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ راجا جیپ میں موجود نہیں ہے اور غالباً ایشوریا رائے بھی نہیں تھی۔

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی آن کر کے پیچھے دیکھا۔ عقبی نشستیں بالکل خالی تھیں۔ رائفل بھی نظر نہیں آئی۔ تو کیا راجا، ایشوریا کو لے کر نکل گیا تھا؟ اس نے دھوکا دیا تھا؟ میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک چند قدم کے فاصلے پر شاخوں اور پتوں کے اندر سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ وہاں تاریکی میں کوئی موجود تھا۔ شاید راجا اور ایشوریا... یا پھر کوئی جانور؟ یا کوئی غیر متعلقہ شخص؟ کئی سوال ایک ساتھ میرے ذہن میں ابھرے۔

لیکن مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی میرے اندازے کی تصدیق ہو گی۔ ہریالی کے اندر سے دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی۔ یہ یقیناً ایشوریا کی ہنسی تھی۔ اس کے ساتھ ہی راجا کی بہکی ہوئی آواز ابھری۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ پیراشوٹ کا ایک بڑا غلاف بھی جیپ کی پچھلی نشست پر موجود نہیں ہے۔ یہ جیپ کا غلاف تھا اور اب ان دونوں کے بچھونے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راجا پر لعنت ارسال کی اور نشست پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

تین چار منٹ بعد اندازہ ہوا کہ راجا اور ایشوریا ثانی جیپ کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ میں سویا بنا رہا۔ وہ دبے پاؤں آئے۔ بڑے آرام سے پچھلا دروازہ کھولا اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے اندر آ گئے۔ راجے نے ایشوریا کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ جواباً اس نے بھی کچھ کہا۔ ایشوریا کے گیلے بالوں کے کچھ چھینٹے میرے چہرے پر بھی پڑے لیکن میں نے آنکھیں بند رکھیں اور ان دونوں کے لیے خجل ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

...راجا واقعی ایک نمبر کا خرانٹ اور چال باز تھا۔ جو جیپ کل سہ پہر کو کسی بھی طرح اسٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی، وہ رات پچھلے پہر کو راجے کی تھوڑی سی کوشش سے اسٹارٹ ہو گئی۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ کل سہ پہر راجا کی

نیت ہی خراب تھی۔ وہ درختوں کے اس جھنڈ سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال، میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

بارش اب ایک دھیمی پھوار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کے اس جھنڈ سے نکلے اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ اونچے نیچے راستے پر جیپ کی لائٹس مسلسل ہچکولے کھا رہی تھیں۔ یہ چھوٹی لائٹس تھیں۔ ہیڈ لائٹس تو اس وقت ہی ٹوٹ گئی تھیں جب ریان گروپ کی اس جیپ نے کوٹھی کا گیٹ توڑا تھا۔

''اب اس تمہاری شہزادی کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے راجے سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ کسی مناسب جگہ پر اسے گڈی سے اتار دیتے ہیں اور سلاماں لیکم کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن اسے ''پھر'' کوئی جانور شانور پڑ گیا تو؟'' میں نے کہا۔ میرے فقرے میں ''پھر'' کے لفظ پر شاید راجا نے زیادہ غور نہیں کیا۔

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں، اب تو تھوڑی دیر میں سویر ہو جانی ہے۔''

''یا پھر اسے اس جگہ چھوڑ دیں جہاں گاڑی چھوڑنی ہے۔ یہ گاڑی کے اندر ہی رہے۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' راجا نے تائید کی۔

قریباً پانچ کلومیٹر سفر طے کرنے کے بعد ہم شیخوپورہ سے لاہور جانے والی بڑی سڑک کے قریب پہنچ گئے۔ اب اس مسروقہ جیپ کو اس سے آگے لے جانا خود کو شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ ہم نے جیپ ایک قریبی گاؤں کے نواح میں درختوں کے درمیان کھڑی کی۔ راجا کی نگاہوں میں ابھی تک ایشوریا کے لیے حریصانہ چمک تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس مصیبت کو اس سے آگے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

وہ اس سے بولا۔ ''سوہنیو تے مکھنو! زیادہ گھبرانا نہیں۔ گڈی کے اندر آرام سکون سے بیٹھو۔ سویرا ہوتے ہی لوگ تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔''

''تو تم لوگ دروازے کو لاک کر کے جاؤ گے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''اگر دروازوں کو لاک نہ کریں گے تو خود لاک اپ میں بند ہو جائیں گے۔''

''لیکن میں نکلوں گی کیسے؟''

راجا بولا۔ ''کوئی اللہ کا بندہ اِٹ مار کر شیشہ توڑ دے گا۔ میں نے کہا ہے نا گھبرانے کی بات نہیں اور یہ آخری ملاقات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کہیں نا کہیں ٹاکرا ہو جائے گا ہمارا۔''

ہم نے پہلے ہی اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ گاڑی میں کوئی ایسی شے موجود نہ ہو جس کو استعمال کر کے یہ لڑکی کوئی شیشہ توڑ سکے۔ اس گاڑی میں یہ آپشن موجود تھا کہ دروازوں کو باہر سے لاک کر دیا جائے تو وہ اندر سے نہ کھل سکیں۔

گاڑی کا پیراشوٹ کا لمبا چوڑا غلاف ایک بار پھر ہمارے کام آیا۔ ہم نے بلیڈ کی مدد سے اس کے دو ٹکڑے کیے اور ان ٹکڑوں کو برساتی کی طرح اوڑھ لیا۔ جیپ کے دروازے بند کرنے کے بعد راجا نے ایشوریا رائے کو الوداعی آنکھ ماری لیکن اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی۔ جو آنکھ اس نے دبائی تھی وہ تو پہلے ہی سوجن کی وجہ سے بند تھی۔

ہم ہلکی پھوار میں کیچڑ زدہ زمین پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ رائفل راجا نے اپنی برساتی میں چھپائی ہوئی تھی۔ ان برساتیوں نے ہمارے بہت سے عیب ڈھک لیے تھے۔ ہماری نیم عریانی، ہمارے خون آلود کپڑے، ہمارے زخم... حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت ہم ان سے اپنے ننگے پاؤں بھی ڈھک سکتے تھے۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بمشکل لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

ہم سڑک تک پہنچنے کے لیے چھوٹی پگڈنڈیاں استعمال کر رہے تھے۔ بس پر تو ہم بیٹھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے پھر حلیہ بھی مشکوک تھا۔ بہتر تھا کہ کوئی رکشا ٹیکسی مل جاتا۔ لاہور اور گرد و نواح میں ان دنوں ٹیکسیاں کم کم ہی نظر آ رہی تھیں لیکن ایک بہت اچھا اتفاق ہوا کہ ابھی ہمیں سڑک کے کنارے کھڑے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک پیلے رنگ کی مہران ٹیکسی نظر آ گئی۔ ہمارے اشارے پر وہ رک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈرائیور سے لاہور تک کا کرایہ طے کیا۔ ہم سوار ہو گئے۔ میں اگلی سیٹ پر اور راجا پچھلی پر چلا گیا۔

ڈرائیور گاہے بگاہے میرے چہرے کی چوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بھی الجھا ہوا تھا کہ ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے باوجود ''برساتیاں'' اپنے جسم سے جدا نہیں کی تھیں۔ بہرطور اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی الجھن دیکھ کر میں نے خود ہی کہا۔ ''ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا بھائی صاحب! ٹریکٹر ٹرالی الٹ گئی تھی۔ آٹھ دس بندے زخمی ہوئے تھے۔ دو چار کو تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میری ٹانگ بھی کافی زخمی ہے۔ مرہم پٹی کے لیے لاہور کے وڈے اسپتال

جا رہے ہیں۔''

راجا نے راستے میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔ اچھرہ موڑ کے قریب ایک لالہ زار نامی درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ اس کا مالک جو منیجر بھی تھا، راجا کا رازداں دوست تھا۔ راجا کو پتا تھا کہ وہ ہمارے حلیے کی پروا کیے بغیر نہ صرف ہمیں کمرا دے گا بلکہ حلیہ درست کرنے کے لیے فوری انتظام بھی کر دے گا۔ میں جلد از جلد عمران سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اب سیل فون کے سگنل تو یقیناً آ رہے تھے لیکن بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب ہوٹل پہنچ کر ہی رابطہ کروں گا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم شہر زندہ دلانِ لاہور میں داخل ہوئے۔ ابھی یہ شہر اپنے زندہ دلانوں، اپنی رونقوں، رنگینیوں اور ہنگاموں سمیت سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے انگڑائی لینی تھی اور اپنی حشر سامانیوں سمیت جاگ جانا تھا۔ یہ بڑا اچھا وقت تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے میناروں کی بلندیاں ہولے ہولے نمایاں ہو رہی تھیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ناکوں پر شہریوں کو رات بھر تنگ کرنے والی پولیس اپنی حرکتوں سے باز آ جاتی ہے اور تھانوں کا رخ کر لیتی ہے۔ ہم بھی کسی چیکنگ کی زد میں آئے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹی سڑک پر لالہ زار ہوٹل کی تین منزلہ عمارت تھی۔ مالک منیجر اشفاق رانا ایک کمرے میں سویا پڑا تھا۔ چوکیدار نے اسے جگایا۔ چوکیدار بھی غالباً راجا کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد تیس پینتیس سال کا ایک فربہ اندام شخص توند مٹکاتا اور آنکھیں ملتا ہمارے سامنے تھا۔ اس کے بدن پر بس بنیان اور شلوار نظر آ رہی تھی۔

اس نے راجا کو راجے کہہ کر مخاطب کیا اور تپاک سے ملا۔ ساتھ ساتھ وہ میرے اور راجا کے زخمی حلیے پر فکرمند بھی تھا۔ راجا اور وہ کمرے میں چلے گئے۔ میں وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور زخمی ٹانگ اٹھا کر دوسرے صوفے پر رکھ دی۔ برساتی نما کپڑا ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ میرے ننگے پاؤں دیکھ کر چوکیدار کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے ایک دوسرے ملازم نے باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔

میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں بس بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ایک بار عمران سے رابطے کی کوشش بھی کرنا چاہتا تھا۔ فون سیٹ قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بتایا کہ ایک کال کرنی ہے۔ اس نے فون میرے قریب تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ رنگ ٹون کے طور پر اس کے سیل فون پر بڑا اوٹ پٹانگ میوزک سنائی دیا کرتا تھا۔ اب آواز آ رہی تھی، اڈی اڈی جانواں ہوا دے نال۔ کافی دیر تک یہ آواز میرے کانوں کے پردے مجروح کرتی رہی پھر میں نے کوشش ترک کر دی۔ غالب گمان یہ تھا کہ اس وقت وہ Zoo کے قریب اپنے اپارٹمنٹ میں سو رہا ہوگا۔ لیکن اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ آج تیسرا چوتھا دن تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

اسی دوران میں راجا اور اشفاق رانا کمرے سے نکل آئے۔ گراؤنڈ فلور پر ہی ہمارے لیے ایک آرام دہ کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اشفاق ایک میڈیکل باکس لے آیا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ درد کش دوائیں بھی موجود تھیں۔ اشفاق نے ہمارے لیے کپڑوں کے تین چار جوڑے بھی مہیا کر دیے تاکہ ہم ان میں سے اپنے ناپ کے مطابق استعمال کر سکیں۔

یہ جان کر راجا حیران ہوا کہ میں اپنے زخموں کو خاطر میں لائے بغیر نہانا چاہتا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میری تکلیف میں اضافہ ہوگا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ میرے لیے تکلیف اور راحت کی حدیں کبھی کبھی آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ میں نے اطمینان سے شاور لیا۔ بعد میں تولیے سے جسم کو اچھی طرح خشک کیا۔ یہ اور بات ہے کہ تولیے پر جگہ جگہ خون کے دھبے آ گئے۔ میرے سارے پنڈے پر چمڑے کی بیلٹس کے نشان موجود تھے۔ جہاں جہاں اسٹیل کے بکل لگے تھے، وہاں وہاں خون کا رساؤ تھا۔ میں نے خود ہی تھوڑی بہت مرہم پٹی بھی کی۔ درد کش دوائیں میں نے بہت عرصہ پہلے چھوڑ دی تھیں۔ اب بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ جیکی کہا کرتا تھا کہ درد تو ایک نعمت ہے اور یہ دبانے کے لیے نہیں سہنے کے لیے ہوتا ہے۔ راجا گاہے بگاہے حیرت سے میری طرف دیکھتا تھا اور جیسے دل ہی دل میں میری برداشت کا معترف ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میری ٹانگ میں فریکچر ہو چکا ہے اور مجھے چلنا پھرنا نہیں چاہیے۔ مگر ایسی اذیتوں اور ایسے اندیشوں سے لڑ کر میری عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔

پُرتکلف لاہوری ناشتا ہمارے کمرے میں پہنچ گیا۔ پوڑی، آلو اور اچار والے گرما گرم چنے، سرخی مائل حلوہ، نہاری اور کلچے... اور اس کے ساتھ میٹھی و نمکین لسی۔ بڑی اشتہا آمیز خوشبو تھی۔ میرا جبڑا اکڑا ہوا تھا تاہم میں نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ آدھا ناشتا میں نے بڑی رغبت

سے کیا لیکن پھر ایک دم کچھ یاد آگیا۔ ایک بو سی دماغ میں گھسنے لگی اور میں نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ فتح محمد کی لاش کی بُو تھی۔ وہ لاش جو کئی گھنٹے تک میرے جسم سے لپٹی رہی تھی اور میری ہر سانس کے ساتھ میرے دل و دماغ میں سرایت کرتی رہی تھی۔

میں کبیدہ خاطر ہو کر لیٹ گیا اور آنکھیں موندلیں۔ کل صبح اور پرسوں رات کے سارے خوں ریز مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ خونخوار کتوں کا دہی کی خوشبو پر دیوانہ وار جھپٹنا۔ میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ان کی شعلہ بار آنکھیں۔ گارڈ اکرم خاں کو گولی لگنا اور اس کا لڑکھڑاتے ہوئے اوندھے منہ گرنا۔ گاڑی کے اندر گھسنے والے ریان گروپ کے بندے پر سدھائے ہوئے بلڈاگ کا جھپٹنا اور اس کا پیٹ پھاڑ دینا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔

تھکن، رت جگے اور ایشوریا کے سرور سے چور راجا بھی بستر پر لیٹ گیا۔ اس پر تیزی سے غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”گوہر! یہ کیا چکر ہے؟ تمہارا یہ دوست اشفاق رانا تمہیں راجا کہہ کر بلا رہا تھا۔“

”ہاں... کک... کچھ یار دوست اس نام سے بھی بلاتے ہیں۔“

”یعنی تمہارا اصل نام گوہر ہے؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بس ”ہوں“ کہنے پر اکتفا کیا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ایک دو فقرے اور بولے لیکن اسی دوران میں وہ سو گیا۔ یہ موقع تھا کہ میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کرتا۔ میں لنگڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے مردہ سیل فون کے لیے چارجر کا انتظام کیا۔

پانچ دس منٹ بعد میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کمرے کے باتھ روم میں تھا اور دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میری سماعت عمران کی آواز سننے کے لیے بے قرار تھی لیکن وہاں وہی بے ڈھنگی صدا تھی... اڈی اڈی جانواں ہوا دے نال۔ میں دانت پیسنے لگا۔ کبھی اس پر غصہ آتا تھا، کبھی دل و دماغ میں اندیشے اودھم مچانے لگتے تھے۔

میری چوتھی، پانچویں کوشش پر عمران کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً کمرے سے باہر تھا اور دوڑتا ہوا فون تک پہنچا تھا۔ ”ہیلو تابی!“ وہ بڑی بے تابی سے بولا۔

”ہیلو... عمران... تم... ٹھیک تو ہو نا؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم بتاؤ... یہ کیا خوفناک ڈرامے کر رہے ہو تم؟ پچھلے دو تین دنوں میں کوئی ایک ہزار بار تو تمہارا نمبر ملایا ہوگا۔ کوئی جواب نہیں، کوئی خبر نہیں۔ اس وقت کہاں ہو تم؟ جلدی سے بتاؤ۔“ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”اب جلدی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آرام سے بات کر سکتے ہو۔ میں خیریت سے ہوں اور لاہور کے ایک ہوٹل میں ہوں۔ لالہ زار نام ہے ہوٹل کا۔ اور تم کہاں ہو؟“

وہ میرے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”کس جگہ ہے یہ ہوٹل؟“

”اچھرہ کے علاقے میں۔ آسانی سے مل جائے گا۔ اور اب گھبرانے کی بات نہیں، میں اب یہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی فارم ہاؤس سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گا تمہارے پاس۔ تم اب اپنا فون آن رکھنا۔“

”لیکن یار! میں نے کیا بکواس کی تھی تم سے۔ تم نے ابھی فارم سے باہر نہیں نکلنا... جاوا ــــ کے درجنوں کارندے اور گاڑیاں فارم کے آس پاس ہیں۔ گھیرا ڈالا ہوا ہے انہوں نے... یہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے عمران!“

”ہاں آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن جہاں تک تم سوچ رہے ہو، وہاں سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ یہاں فارم ہاؤس کے قریب کافی بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ چار چھ لاشیں بھی گر گئی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

”ریان صاحب اور جاوا گروپ کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔ کئی گھنٹے تک گولیاں چلی ہیں۔ دونوں طرف کے بہت سے بندے پکڑے بھی گئے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب خود شیخوپورہ آکر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورے علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔“

یہ بات پہلے ہی میرے ذہن میں آرہی تھی کہ شاید کل صبح انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں میں جو سخت لڑائی ہوئی ہے، اس کی کوئی تازہ وجہ بھی ہے۔

عمران اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم گھبراؤ مت۔ اب فارم ہاؤس سے باہر نکلنے میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں پورے حفاظتی انتظام کے ساتھ نکلوں گا۔“

”کیا حفاظتی انتظام ہوگا؟“

”یار! تیرے جیسے پانچ چھ جاں نثار مجاہد ساتھ ہوں گے۔ ویسے بھی روانگی خفیہ ہوگی۔“ اس نے مجھے ہر طرح سے تسلی دی۔

میں نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے آجاؤ۔ یہاں میرے پاس تمہارے لیے کچھ اہم خبریں ہیں اور ایک سرپرائز بھی ہے۔“

”کیا سرپرائز؟“

”ایک پرانے دوست سے تمہاری ملاقات کرانے والا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے لیکن تم بالکل خیریت سے تو ہو نا... اور وہ فتح محمد... کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟“

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”تمہارے پہلے سوال کا جواب ہاں میں ہے اور دوسرے کا نہیں میں۔“

”کیا مطلب؟ فتح محمد ساتھ نہیں؟“

”وہ ساتھ تھا لیکن اب نہیں رہا۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”اوہ گاڈ۔“ عمران گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ ہمارے درمیان گفتگو ختم ہوئی اور میں نے بستر پر لیٹ کر عمران کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی ایسوسی ایشن ہو چکی تھی کہ چند دن دور رہنے سے بھی ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور شخص اپنے اردگرد کی ہر شے کو زندگی اور توانائی سے بھر دیتا تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عمران لالہ زار ہوٹل میں موجود تھا۔ میں نے مالک منیجر اشفاق رانا کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ عمران کو ہمارے کمرے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے قدموں کی چاپ سے ہی اندازہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔“

وہ آیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے خود کو مجھ سے دور کیا اور سرتاپا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ ”یہ کیا کیا ہے تم نے اپنے ساتھ؟“ اس کی آواز میں درد تھا۔

”کچھ نہیں۔ بس درد سہنے کی تھوڑی سی پریکٹس کی ہے۔“

”اوئے خبیث! یہ تھوڑی سی ہے۔ اتنی پریکٹس کوئی ہاکی میں کرے تو میاں داد بن جائے اور کرکٹ میں کرے تو سمیع اللہ بن جائے۔“

”تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔“ میں مسکرایا۔

”لیکن تم کون سی صحیح بات کہہ رہے ہو... کہ تھوڑی سی پریکٹس ہے۔ ویری سیڈ یار! بہت افسوس ہوا ہے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ دو چار دن فارم سے نہیں نکلنا۔ لگتا ہے کہ میری ہر بات کا الٹا اثر ہونے لگا ہے تم پر...“

اسی دوران میں اس کی نگاہ راجا والے بیڈ پر پڑی۔ وہ کروٹ بدلے سویا پڑا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“ عمران نے چونک کر دبی آواز میں پوچھا۔

”سرپرائز۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”ذرا آگے جا کر دیکھو۔ شاید پہچان لو۔“ میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

عمران پُرتجسس انداز میں آگے بڑھا۔ راجا کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ جیسے تھے۔ تھوڑی سی کوشش سے عمران نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا، تب دوبارہ راجے کو دیکھنے لگا۔

”کیسا ہے سرپرائز؟“ میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

”زبردست۔“ اس نے سرسراتی آواز میں کہا پھر مجھے کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں راجا کو سوتا چھوڑ کر باہر آگئے۔ عقبی صحن میں جا کر عمران پرجوش انداز میں بولا۔ ”یہ بلا کہاں سے ملی تمہیں؟ اور تم نے اسے پہچانا کیسے؟“

”سلطان چٹے کی کوٹھی سے ملی اور پہچانا اس طرح... کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔“

”یہ تو جیل میں تھا۔ سلطان کی کوٹھی میں کیسے پہنچا؟“

”ابھی اس نے براہِ راست تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال، یہ سلطان اور ندیم کی ایک ملازمہ لڑکی سے باتیں کرتا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ قید کاٹ کر باہر آچکا ہے اور شکاری اور رکھوالی والے کتوں کو ٹریننگ دینے کے لیے سلطان اور ندیم کے پاس موجود تھا۔“

ندیم کے ذکر پر عمران ذرا چونکا۔ ”یہ کس ندیم کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”سیکریٹری ندیم کی۔ تمہارے لیے ایک اہم خبر یہ ہے کہ ندیم، جاوا ــــ کے لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ سمجھو کہ اب وہ جاوا گروپ کا حصہ ہے۔ وہ فارم ہاؤس کی وہی بڑی کالی بھیڑ ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ اس نے جلالی صاحب کے قریب رہ کر انہیں زبردست نقصان پہنچایا ہے۔“

عمران نے اپنے ہونٹ تشویش ناک انداز میں

سکیٹرے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم فتح محمد پر شبہ کرتے رہے ہیں لیکن وہ ہمارے شبہے کے برعکس نکلا۔ اسے ندیم کی ایک دو کارستانیاں معلوم ہوئی تھیں اور وہ اس کے بارے میں پریشان تھا۔ ندیم کی حقیقت پتا کرنے کے لیے ہی وہ منگل کی رات فارم ہاؤس سے نکلا تھا... بس اس کی موت اسے کھینچ کر انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں لے گئی۔“

”کیا ہوا اس کے ساتھ؟“

میں نے عمران کو کوٹھی میں پیش آنے والے گمبھیر واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں گم سنتا رہا۔ وہاں تہ خانے میں زخمی فتح محمد کو جس سفاکی سے گولی ماری گئی تھی، وہ نقشہ ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

پوری روداد سننے کے بعد عمران نے ایک لمبی سانس لی اور اس کے چہرے کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا، وہ بولا۔ ”تمہاری وہ فون کال بڑی پریشان کن تھی۔ آخری دو تین لفظ تو میری سمجھ میں نہیں آسکے لیکن اتنا پتا تو چل گیا کہ فارم کے باہر خطرہ ہے اور تم مجھے باہر نکلنے سے منع کر رہے ہو۔ اس کے بعد میں نے اس فون نمبر پر درجنوں بار کال کی لیکن فون بند تھا۔ تمہارے نمبر پر بھی بڑی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ تمہاری یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آچکی تھی کہ نادرے وغیرہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے جاوا کے لوگوں نے فارم کے اردگرد گھات لگائی ہے۔ ابھی میں اس معاملے سے نمٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ پتا چلا کہ فارم سے کوئی ایک کلومیٹر دور نہر کی طرف جاوا اور ریان گروپ کے لوگوں کے درمیان چھوٹی سی جھڑپ ہوئی ہے جس میں دو بندے زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی اس جھڑپ کی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اگلے روز شام کے وقت دونوں گروپوں میں زوردار تصادم ہو گیا۔ دونوں طرف کے لوگوں نے باقاعدہ پوزیشنیں لے کر ایک دوجے پر دو گھنٹے تک اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ پانچ کے قریب بندے جان سے گئے۔ کافی تعداد میں زخمی بھی ہیں۔ اس کے بعد پولیس کی بھاری نفری موقع پر پہنچ گئی۔ کئی اعلیٰ افسر بھی آموجود ہوئے۔ جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب نے تو وہاں مستقل ڈیرا لگایا ہوا ہے۔ فارم کے اردگرد کرفیو کا سماں ہے۔ میڈیا میں بھی گرم گرم خبریں آرہی ہیں۔ باکس اور آرا کوئے والا معاملہ بھی زیرِ بحث ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہ معاملہ مزید بگڑے گا۔ بڑی بڑی مچھلیاں بھی اس معاملے میں ملوث ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے آرا کوئے کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے جلالی صاحب پر دباؤ ڈالا جائے۔“

”تو کیا جلالی صاحب یہ دباؤ لے لیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”بابا جی ہیں تو بڑے پکے۔ اندر سے ایک دم لوہے کی طرح ہیں لیکن زیادہ سخت لوہا بھی تو کبھی کبھی ایک دم ٹوٹ جاتا ہے۔“ عمران نے رمزیہ انداز میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”بابا جی کی ایک کمزوری کم از کم ہمارے علم میں تو آچکی ہے... ڈاکٹر مہناز اور بابا جی کا تعلق... اور یہ بہت بڑی کمزوری ہے جگر۔ اس کمزوری نے بڑے بڑے معرکے سر کرائے ہیں۔ دنیا کے نقشے بدلے ہیں، تاریخ کا رخ پھیرا ہے۔“

”تو پھر؟“

”مجھے لگتا ہے کہ اب جلالی صاحب کی اس کمزوری کو استعمال کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔ ان کا بھی اور دوسروں کا بھی۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”ابھی پوری طرح طے نہیں کیا۔ سوچ رہا ہوں لیکن...“

”لیکن کیا؟“

عمران نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم نے میری سوچ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ یہ کس بلا کو اپنے ساتھ چھوڑ لائے ہو۔“ اس کا اشارہ راجا کی طرف تھا۔

”لیکن یہ تو تمہارا دوست ہے اور اچھے برے وقت میں کام آتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے اور مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اسے دیکھ کر اور اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی چند دن ہمیں اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔“

اچانک ایک آہٹ نے ہمیں چونکایا۔ مڑ کر دیکھا تو راہداری میں ہم سے آٹھ دس قدم دور راجا کھڑا تھا۔ شرٹ اس کے جسم پر کچھ ڈھیلی تھی۔ اپنی اکلوتی سلامت آنکھ کے ساتھ وہ عمران کو گھورتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے پاؤں میں ہوٹل کی چپل نظر آرہی تھی۔

عمران نے بھی اسے دیکھ لیا۔ کچھ دیر تک دونوں ساکت و جامد کھڑے رہے پھر لپک کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ پُرجوش ملاپ تھا۔ راجا نے عمران کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”اوئے عمو! تو کہاں غائب ہو گیا تھا کھوتے کے سر سے سینگوں کی طرح؟ پورا ایک سال ہو گیا ہے مجھے باہر آئے ہوئے۔ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرا ہوں تجھے۔“

”میں نے بھی انڈیا سے آتے ہی جان انکل سے تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ نو دس مہینے پہلے راجا آیا تھا۔ اپنا فون نمبر بھی دے گیا تھا لیکن وہ فون نمبر جان محمد صاحب سے کہیں گم ہو چکا تھا...“

”تو بڑا کھوچل ہو گیا ہے عمو۔ ایک دم کنڈم بات کر رہا ہے۔ اگر تو نے مجھ سے رابطہ کرنا ہوتا تو اس کے اِک سو اِک طریقے تھے۔“

”تجھے کیا بتاؤں راجا! یہاں آتے ہی ایسا چکر چلا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی مہینے آسے پاسے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ساری باتیں یہیں کرنی ہیں۔ اندر چلو یار! آرام سے بیٹھتے ہیں۔“

ہم تینوں کمرے میں آگئے۔ میں ابھی تک بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ اندر پہنچ کر ایک بار پھر راجا اور عمران میں زوردار مکالمہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے شکوے شکایات کیے۔ راجا کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ عمران وہاں انڈیا میں کس ماں کے پاس گیا تھا۔

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ماں نہیں باپ ہے اور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ جس طرح تم اپنے جگر ہو، یہ بھی جگر ہے۔ یہ وہاں ایک بڑے پھڈے میں پھنس گیا تھا۔“

اس خیال سے کہ عمران اور راجا ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکیں اور ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا سکیں، میں بہانے سے باہر نکلا اور اپنی زخمی ٹانگ کو چالو کرنے کے لیے برآمدہ نما جگہ پر ٹہلنے لگا۔ جسم کے کسی حصے میں زیادہ تکلیف ہو تو جسم کی باقی تکلیفیں اس میں دب جاتی ہیں۔ ٹانگ کی وجہ سے میری دیگر جسمانی چوٹیں نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہی تھیں حالانکہ اپنی جگہ وہ بھی شدید تھیں۔ برآمدے میں بلی کے دو خوب صورت بچے گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے فارم ہاؤس کے وہ نایاب ایرانی بلونگڑے یاد آگئے جنہوں نے وہاں Zoo کی رونق کو دوبالا کیا تھا... اور ان کی ماں بھی یاد آئی۔ اس نے عمران کے ساتھ بے مثال وابستگی پیدا کر لی تھی۔ اسی وابستگی کی وجہ سے ہم سلطان چیتا کے ڈیرے پر نادر لمبو کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

میرے سیل فون پر میسج ٹون ہوئی۔ میں نے دیکھا، یہ آسٹریا سے نصرت کا میسج تھا۔ میں نے میسج کھولا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”تابش بھائی! میں اور باجی آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ آپ کیوں کال اٹینڈ نہیں کر رہے؟ آپ کا فون مسلسل بند جا رہا ہے، کیا مسئلہ ہے؟ کوئی ناراضی تو نہیں؟ باجی سمجھتی ہیں کہ اس روز انہوں نے آپ کی کال ریسیو نہیں کی تھی اس لیے آپ خفا ہو گئے ہیں۔ پلیز بھائی جان! باجی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ بہت بُری طرح گھری ہوئی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ باجی کو ہمارے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ پلیز! آپ جواب دیں۔“

میسج پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ نصرت میری خاموشی کو میری خفگی پر محمول کر رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ان تین چار دنوں میں، میں کن سنگین حالات سے گزرا ہوں اور اگر میں بتاتا تو شاید وہ دونوں یقین نہ کر پاتیں۔ موجودہ تابش اس تابش سے بہت مختلف ہو چکا تھا جسے وہ جانتی تھیں۔ اب اس کے شب و روز ہنگاموں سے عبارت تھے اور وہ ایک بگولے کا ہم رکاب تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نصرت سے رابطہ کروں کہ ایک منظر نے بے طرح چونکا دیا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو وائپر پر گیلا کپڑا ڈالے ہوٹل کے فرش کو صاف کر رہی تھی۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اس سے مل چکا تھا اور دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پتا نہیں تھا کہ اس سے یوں ملاقات ہو گی۔ وہ حمیدن تھی۔ ثروت کے شوہر یوسف کی گھریلو ملازمہ۔ چند ہفتے پہلے عمران کے ساتھی جیلانی نے اس عورت کو شیشے میں اتارا تھا اور اس نے ہمیں یوسف اور ثروت کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔

اسی دوران میں حمیدن کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ تھوڑی سی کوشش سے اس نے مجھے پہچان لیا اور اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ ”حمیدن! تم یہاں بھی کام کرتی ہو؟“

”جی صیب! پر آپ یہاں کیسے؟ اور آپ کو تو چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔“

”ہاں... بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“

میرے اور حمیدن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور میں حمیدن کو کمرے میں لے آیا۔ عمران بھی اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ حمیدن نے ہمیں بتایا کہ وہ پچھلے ایک سال سے یہاں صفائی کا کام کر رہی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں ہمارے کمرے کی صفائی بھی شاید اسے ہی کرنا تھی۔ میں نے

حمیدن سے کہا۔ ’’بڑا اچھا ہوا ہے کہ تم سے خود ہی ملاقات ہو گئی۔ ہمیں تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔‘‘

’’بتائیں صیب جی۔‘‘ حمیدن کی آنکھوں میں وہی جانا پہچانا لالچ ابھر آیا۔

’’یہاں نہیں، کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرنا ہوگی۔‘‘ عمران نے کہا۔

’’میں نے ابھی صفائی کرنے کے بعد اوپر چھت پر دو تین قالین دھونے ہیں۔ کافی ٹائم لگ جانا ہے۔ آپ اوپر چھت پر ہی آجائیں۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔‘‘

نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ حمیدن کے لہجے میں دبا دبا جوش ہے۔ جیسے ہمیں بتانے کے لیے اس کے پاس کوئی خاص بات ہو۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم جب چھت پر جانے لگو تو ہمیں بتا دینا۔ ہم آجائیں گے لیکن اس بات کا کسی اور کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔‘‘

’’نہیں جی، میں کیوں بتاؤں گی کسی کو... میں نے پہلے بھلا بتایا ہے؟ ویسے مالک بڑا سخت ہے جی، کہتا ہے کہ گاہکوں سے آلتو فالتو بات نہیں کرنی۔ کہیں میری بے عزتی خراب نہ کردے۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ مالک یار بیلی ہے اپنا۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر غریبوں پر تو ہر کوئی چڑھائی کر دیتا ہے نا۔ پچھلے ہفتے چھوٹی سی بات پر ساتھ والے خان صاحب کا گھر بھی مجھ سے چھوٹ گیا ہے حالانکہ...‘‘

وہ اپنی تنگ دستی کا رونا رونے بیٹھ گئی۔ مطلب صاف ظاہر تھا۔ وہ ’’مال‘‘ اٹھوانے سے پہلے ’’ادائیگی‘‘ چاہتی تھی۔ عمران نے دو ہزار کے دو نوٹ پرس میں سے نکالے اور حمیدن کو تھما دیے۔ اس نے تھوڑا سا تکلف ظاہر کرنے کے بعد یہ نوٹ اپنے گریبان میں رکھ لیے اور سامنے اوڑھنی درست کرلی۔

عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’اگر پورا تعاون کرو گی تو اتنے ہی اور ملیں گے۔‘‘

وہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اگلا ایک گھنٹا ہم نے کافی بے چینی میں گزارا۔ آخر وہ وقت آگیا۔ حمیدن ہمارے کمرے کے سامنے سے گزری اور ہمیں سنانے کے لیے اپنے کسی ساتھی کا نام لے کر پکاری۔ ’’فضلو! میں چھت پر جارہی ہوں۔‘‘

اس اطلاع کے قریباً دس منٹ بعد میں اور عمران بھی چھت کی طرف روانہ ہو گئے۔ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھنا میرے لیے خاصا دشوار ثابت ہوا تاہم میں چڑھ گیا۔ چھت پر واقعی حمیدن کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ اپریل کے آخری دنوں کی سنہری دھوپ قرب و جوار کو روشن کررہی تھی۔ چھت پر ہوٹل کا بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے، چند ناکارہ ٹی وی سیٹ، دو چار خراب ونڈو اے سی اور اس قسم کی دیگر اشیا۔ تاہم چھت کے اردگرد لاہور کا بالائی نظارہ خوب صورت تھا۔ کبوتر اڑ رہے تھے۔ اِکا دُکا پتنگیں نظر آرہی تھیں۔ چھتوں پر رنگین آنچلوں کی جھلک تھی اور نیچے گلی کوچوں میں زندگی رواں دکھائی دیتی تھی۔

حمیدن نے کارپٹ کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے چھت پر بچھا رکھے تھے اور انہیں وائپر کے ساتھ دھونے میں مصروف تھی۔ میں اور عمران قریب رکھی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں آگئے ہیں لیکن ہمیں اصل سروکار تو حمیدن سے ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ’’ہاں حمیدن! کیا چل رہا ہے یوسف صاحب کے گھر میں؟‘‘

وہ دیدے گھما کر بولی۔ ’’صیب جی! وہاں تو لمبی چوڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اللہ ماف کرے... اللہ ماف کرے۔ دن میں تارے نظر آگئے ہیں یوسف صیب کو۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔‘‘

’’ہوا کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’صیب جی! یہ تو آپ کو پتا ہی ہے نا کہ بڑی بی بی جی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی بیمار ہیں اور علاج کے لیے باہر کے ملک گئی ہیں... بڑی بی بی بھی ساتھ ہیں؟‘‘

’’ہاں پتا ہے مجھے لیکن یہاں کیا معاملہ ہے؟‘‘

اس نے سسپنس بڑھانے کے لیے اردگرد دیکھا اور رازداری کے انداز میں بولی۔ ’’یوسف صیب کی جرمن ووہٹی واپس چلی گئی ہے۔ اس نے بڑا اوڈا دھوکا دیا ہے یوسف صیب کو۔‘‘

’’دھوکا دیا ہے؟‘‘

’’آہو جی، وہ چنگی کڑی ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یوسف صیب کا دل اس سے بھر گیا ہے اور اس کا دل یوسف صیب سے بھر گیا ہے۔ ان دونوں کی کہانی اب ختم لگتی ہے۔‘‘

’’تم کس دھوکے کی بات کررہی تھیں؟‘‘ عمران نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ’’تھوڑے دن پہلے میم کے چار پانچ رشتے

دار آئے ہوئے تھے گھر میں۔ ایک کڑی تھی، تین چار منڈے تھے۔ بس چٹی چمڑی۔ نہ منہ نہ متھا۔ ایک نمبر کے لوفر تھے سارے۔ ان میں سے ایک منڈا میم جی کا کوئی چاچے بابے کا پُتر بھی تھا۔ وی بائی سال کا ہوگا... بالکل سوکھا سڑا، کانے جیسی ٹانگیں۔ میم جی کو بڑی بے شرمی سے ڈارلانگ ڈارلانگ بھی کہتا تھا۔ یہ لوگ میم جی کو ساتھ لے کر سارا دن لور لور گھومتے تھے۔ رات کو نشہ پیتے تھے اور ناچ گانا کرتے تھے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس سوکھے سڑے منڈے کی وجہ سے ہی یوسف صیب اور میم جی میں جھگڑا ہوا... اللہ کی شان ہے جی... ویکھدے ہی ویکھدے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ کہاں تو یوسف صیب اپنی میم کے پاؤں کے نیچے تلیاں (ہتھیلیاں) رکھتے تھے، کہاں وہ اسے انگریزی میں گالیاں دیتے تھے اور وہ ان کو دیتی تھی۔ اللہ مافی... اللہ مافی۔ لگتا ہے کہ یہ عشق کا ''بھانبھڑ'' جتنی تیزی سے بھڑکا تھا، اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈا بھی ہوا ہے۔''

''گریس واپس کب گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو کوئی دو تین ہفتے ہو گئے ہیں جی۔ ایک دن سویرے میں کام پر گئی تو برآنڈے میں چینی کے کئی بھانڈے ٹوٹے پڑے تھے۔ ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ پروہنے (مہمان) جا چکے تھے اور ساتھ میں میم بھی جا چکی تھی۔''

حمیدن نے اپنی آواز دھیمی کی اور دیدے گھما کر بولی۔ ''سنا ہے جی، وہ اپنی ایک ایک شے واپس لے گئی ہے۔ یوسف صیب کے ہتھ میں کوئی مہنگی گھڑی تھی، وہ تک اتروالی ہے اس نے۔ کافی سارے نقد پیسے بھی لیے ہیں۔ ورنہ وہ تھانے جانے کی دھمکی دیتی تھی۔ بڑی عجیب چیز نکلی ہے جی وہ۔''

ہم سن رہے تھے اور سناٹے میں تھے۔

اب یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ نصرت کے بقول آج کل یوسف بدلا ہوا کیوں ہے۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ آج کل ثروت کا بڑا خیال رکھ رہا ہے۔ پاکستان سے دن میں کئی بار اس کا فون جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لگتا تھا کہ نصرت کی چھٹی حس کافی تیز ہے۔ اس نے فون پر مجھ سے شک کا اظہار کیا تھا کہ شاید وہاں لاہور میں یوسف بھائی کی طرف کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

عمران نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے حمیدن... یوسف صاحب اب کیا سوچ رہے ہیں؟''

''وہی جی... جو انہیں بہت پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ انہیں اب احساس ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہیرے جیسی بڑی بی بی کے ساتھ بڑی جیادتی کی ہے۔ اب انہوں نے بڑی بی بی کی ایک تصویر اپنے کمرے میں لگائی ہے۔ اتنی پیاری تصویر ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایمان سے حور لگتی ہیں اپنی بی بی اور وہ خصماں نوں کھانی... لنگور تھی ان کے سامنے۔ بس چٹی چمڑی اور نیلی کچ آنکھیں۔ اور کیا تھا اس میں۔'' حمیدن، یوسف کی جرمن بیوی گریس کے لیے جلی بیٹھی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''حمیدن! تمہارا کیا خیال ہے، اب اپنی بڑی بی بی سے یوسف صاحب کا سلوک اچھا ہو جائے گا؟''

''ضرور اچھا ہوگا جی۔ یوسف صیب ان کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے سونے والے کمرے کو بھی ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ کافی روپیا لگایا ہے کمرے پر۔ اور غسل خانے کو تو شیش محل بنا دیا ہے جی۔ پتا نہیں کس ملک سے چیزیں منگوا کر لگا رہے ہیں اس میں۔''

''یعنی بڑی بی بی کے لیے یوسف صاحب کی سوئی ہوئی محبت جاگ گئی ہے؟'' عمران نے کہا۔

''آہو جی اور یہ محبت اس ففے کٹن گوری نے سُلائی ہوئی تھی جی۔ ورنہ اپنی بی بی ثروت تو لاکھوں میں اک ہیں۔ اندھیرے کمرے میں بھی بیٹھیں تو چانن ہو جاتا ہے۔''

''اور اگر وہ ففے کٹن گوری پھر یہاں واپس آ گئی تو؟'' عمران نے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں جی کہ اب وہ واپس آئے گی۔ باقی اللہ کو پتا ہے۔ پر اس نے جو جادو کر رکھا تھا ناصیب جی پر، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ وہ آ بھی گئی تو اس کی وہ پہلے جیسی موجیں نہیں ہوں گی۔''

میں نے حمیدن سے پوچھا۔ ''ثروت کے سسر فاروقی صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ دس پندرہ دن پہلے آئے تھے جی۔ دو دن رہ کر چلے گئے۔ میم کے جانے پر وہ بھی خوش ہی تھے۔''

''بی بی ثروت باہر کے ملک سے واپس کب آ رہی ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں جی... مگر ابھی ان کو وہاں کافی ٹائم لگنا ہے۔ نصرت بی بی کی بیماری کوئی ایویں شیویں نہیں ہے۔ ان کا جگر کھراب ہے۔ کوئی بڑی نامراد بیماری ہے۔ اللہ اس کو شفا دے، یہ دونوں بہنیں ہی بڑی چنگی ہیں۔''

حمیدن ہم سے باتیں کرتی رہی اور ساتھ ساتھ قالین بھی دھوتی رہی۔ اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ ہم یہ معلومات کیوں اور کس لیے حاصل کر رہے ہیں۔ اسے صرف دو عدد بڑے سائز کے نیلے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کی یہ ضرورت عمران نے پوری کر دی۔

حمیدن سے بات چیت ختم کرنے کے بعد میں اور عمران نیچے آ گئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ صورتِ حال میں تیزی سے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک طرف جلالی صاحب اور آرا کوئے والا معاملہ تھا جو تیزی سے رنگ بدل رہا تھا۔ دوسری طرف میری ثروت اور یوسف کی کہانی تھی جس میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔

یوسف شروع سے ہی ایک شوقین اور خواہش پرست امیر زادے کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ایک بڑی جائداد کا مالک تھا اور اسے توقع تھی کہ مزید جائداد اس کے ہاتھ آنے والی ہے۔ وہ کافی حد تک جذباتی اور رومانی بھی تھا۔ اس نے خود سے تقریباً دس سال چھوٹی ایک ٹین ایج لڑکی سے عشق کیا اور اس کے لیے سب سے ٹکر لے لی۔ اپنا تن من دھن اس پر لٹا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی خوب صورت خاندانی بیوی (ثروت) سے بھی یکسر منہ موڑے رکھا۔ وہ سہاگن ہونے کے باوجود اس کی بیوی نہ بن سکی۔ لیکن اب صورتِ حال میں ایک اور حیران کن موڑ آیا تھا۔ یوسف کی محبوبہ بیوی اس سے لڑ جھگڑ کر جرمنی پہنچ چکی تھی اور اب یوسف کی سوچوں کے دھارے شاید ثروت کی طرف مڑ رہے تھے۔ شاید... اسے پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا کہ ثروت جیسی خوبرو اور باوفا لڑکی ایک بیوی کی حیثیت سے ہر دم اس کے پاس رہی ہے۔ وہ اس پر مکمل اختیار رکھنے کے باوجود اس کے التفات سے محروم رہا ہے۔

یورپ کی معطر فضاؤں میں رہنے والی ''خواہش پرست حسِ شامہ'' کو اب اپنی مٹی کی خوشبو کشش کر رہی تھی۔

کیا اب یہ ثروت کے ساتھ ایک اور دھوکا تھا؟

عمران نے کہا۔ ''کیا خیال ہے جگر! ویانا میں ثروت اور نصرت کو یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے؟''

''میرے خیال میں تو ابھی ہمیں مزید تصدیق کر لینی چاہیے... ہو سکتا ہے کہ حمیدن کی معلومات میں کوئی خلا ہو۔ کیا اس سلسلے میں جیلانی ہماری مدد کر سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں... ہماری مدد نہیں کرے گا تو کیا وہ امریکا کی اور یورپی یونین کی مدد کرے گا۔''

''امریکا یہاں کہاں سے آ گیا؟''

''امریکا ہر جگہ آ سکتا ہے اور ہر طرف سے آ سکتا ہے۔ یہ شیر کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ انڈا دے یا بچہ... یا کچھ بھی نہ دے اور صرف وعدے کرتا رہے کہ دوں گا۔ تمہیں پتا ہے پچھلے دنوں ہمارے فساد پلس چینل پر ایک پروگرام نشر کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا، امریکا کے وہ وعدے جو اس نے تیسری دنیا سے کیے اور پورے کیے۔ یہ پروگرام رات کو ٹھیک نو بجے شروع ہوا اور نو بج کر تین منٹ پر ختم ہو گیا۔ اس ''مفصل'' پروگرام کی وجہ سے بڑی لعنتیں ارسال ہوئی تھیں ہم پر...''

اس سے پہلے کہ عمران کی یہ عالمانہ گفتگو طول پکڑتی اور وہ آٹے دال کا بھاؤ اقوامِ متحدہ اور پینٹا گون سے ملا دیتا، میرے سیل فون پر پھر نصرت کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''کیا آپ کو میری صحت کا بھی خیال نہیں بھائی جان؟ آپ کیوں جواب نہیں دے رہے؟ میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا، لاہور میں پتا کرائیں کہ یوسف بھائی جان کس چکر میں ہیں، ان کا رویہ بہت بدلا بدلا ہے۔ آپ نے اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔''

میں نے اسی وقت نصرت کو جواب دیا اور لکھا۔ ''میں اور عمران فی الوقت ایک بہت ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس مصروفیت کی وجہ سے تم سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ تمہارے کہنے پر میں یوسف صاحب کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی اہم بات معلوم ہوئی تو تمہیں آگاہ کروں گا۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی صحت پر توجہ دو۔''

عمران نے میرے کندھے پر گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو جگر! چند ہفتے پہلے تم دیوداس بننے جا رہے تھے۔ دلیپ کماری لہجے میں کہہ رہے تھے... میں پشپا کے جیون سے نکل جاؤں گا۔ اس کے سکھی پریوار پر اپنی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ بندۂ خدا! اگر تم پشپا... میرا مطلب ہے ثروت کی زندگی سے نکل جاتے تو تمہیں کیسے پتا چلتا کہ یہ یوسف عرف پریم چوپڑا کیا گل کھلانے جا رہا ہے۔ ثروت کے وشواس کی ہتھیا کرنے کے لیے کون سا نروانترے پل رہا ہے اس کے دماغ میں۔''

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پتا تھا کہ ''نروانترے'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے جہاں عمران کو کوئی لفظ نہیں سوجھتا تھا، وہاں وہ کوئی من گھڑت لفظ لگا دیتا تھا۔

وہ اس طرح کے فقرے بولتا رہتا تھا۔ ''یار تابی! میرے دماغ میں عجیب سی کروشلا آئی ہے۔''

یا پھر ”یار! آج کل گرمی کے کارن بھوجن کی اکشا تا تو ختم ہی ہوگئی ہے۔“

یا پھر ”جلالی صاحب کے پریم کی خبر آؤٹ ہوگئی تو بڑا سمادھار بچے گا بھیا۔“

ان فقروں میں کروشلا، اکشا تا اور سمادھار کے الفاظ ہندی کی کسی لغت میں نہیں ڈھونڈے جاسکتے تھے... بلکہ دنیا کی کسی لغت میں نہیں۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون کے ذریعے جیلانی سے رابطہ کیا اور اس سے باتیں کرتا کرتا باہر نکل گیا۔ وہ یقینا جیلانی کے ذریعے ان اہم خبروں کی تصدیق چاہتا تھا جو ابھی ہمیں ملازمہ حمیدن نے پہنچائی تھیں۔

راجا نے کمرے کا ٹی وی آن کر رکھا تھا مگر اس کی آواز بند تھی۔ اچانک اسکرین پر نظر آنے والی ایک تصویر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ریان ولیم کی ایک پرانی تصویر تھی۔ تاہم اس میں بھی وہ کافی سے زیادہ موٹا نظر آتا تھا۔ میں نے فوراً ریموٹ کنٹرول راجا سے جھپٹا اور آواز اونچی کی۔ ایک نیوز چینل سے خبریں نشر ہورہی تھیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کے فوراً بعد ایک اور دھندلی سی تصویر دکھائی گئی، یہ جاوا کی تھی۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ”...دونوں گروپوں کی اس لڑائی میں اب تک تیرہ چودہ افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ یاد رہے کہ کل صبح، انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہونے والا ہنگامہ بھی ان دونوں گروہوں کی عداوت کا شاخسانہ تھا۔ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں نے ایک دوسرے پر اندھا دھند فائرنگ کی اور کئی افراد جان سے گئے۔ اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ یہ دونوں گروپ بدھا کی اس خاص مورتی کے لیے مار دھاڑ کر رہے ہیں جسے آرا کوئے کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں عرصہ دراز سے کئی کہانیاں اور کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مورتی اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں اور اس جگہ کی حفاظت بھی کرتی ہے جہاں یہ موجود ہوتی ہے۔ آیئے، اب ہم آپ کو اس مورتی کے بارے میں ایک ڈاکومینٹری دکھاتے ہیں...“

اس کے بعد آرا کوئے کا تاریخی پس منظر بیان کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے یہ کہاں تھی؟ اس کے بعد کہاں گئی؟ دوسری جنگ عظیم میں یہ ایک قصبے میں موجود جاپانیوں کے لیے کس طرح سود مند ثابت ہوئی۔ پھر یہ کس طرح چوری ہو کر پاکستان پہنچی اور واپس کس طرح گئی اور دوبارہ پاکستان کیونکر آئی۔ اس حوالے سے نوادرات کے شکاری ا[illegible] صدیقی اور میڈم صفورا وغیرہ کے نام بھی آئے۔

میں نے چینل بدلنے شروع کیے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک اور نیوز چینل پر مطلوبہ خبر نظر آگئی۔ میں چونک[illegible] یہاں جلالی صاحب خود نظر آرہے تھے۔ فارم ہاؤس کا [illegible] منظر تھا۔ لان میں کرسیاں بچھی تھیں۔ میز پر پرانی طرز [illegible] گراموفون نظر آرہا تھا۔ ایک نمائندہ جلالی صاحب کا انٹرو[یو] کررہا تھا۔ نقاہت زدہ جلالی صاحب آرام کرسی پر تقریباً [illegible] دراز تھے مگر ان کی آواز کا طنطنہ برقرار تھا۔ وہ کہہ ر[ہے] تھے۔ ”...میرا بیان وہی ہے جو میں پہلے بھی آپ لوگوں کو [illegible] چکا ہوں۔ وہ باکس میرے پاس ایک امانت کے طور پر [illegible] ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا مالک خود [illegible] تک نہیں پہنچتا۔“

”لیکن جناب! فرض کیا وہ شخص کسی حادثے کا شکار [illegible] چکا ہے اور اب آپ سے رابطہ نہیں کرسکتا تو پھر؟“

”پھر بھی میں انتظار کروں گا۔ کم از کم چار پانچ مہینے اور... اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

”جناب! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کی جان کو خطر[ہ] ہے۔ آپ اس باکس کی ذمے داری سے فارغ کیوں نہیں [illegible] جاتے؟ آخر اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟“

اس چبھتے ہوئے سوال نے جلالی صاحب کا پار[ہ] اچھال دیا۔ وہ بھڑک کر بولے۔ ”کیسے فارغ ہو جاؤں [illegible] ذمے داری سے؟ کیا پولیس والوں کو یہ ذمے داری د[ے] دوں... یا کسی چور وزیر کو... یا پھر تمہیں دے دوں؟ [illegible] تمہیں دے دوں؟“

”نہیں جناب! میرا مطلب یہ تھا کہ...“

”خاموش۔“ وہ دہاڑے۔ ”میں سمجھ رہا ہوں تمہار[ا] مطلب... تم میں سے زیادہ تر بلیک میلر ہیں۔ تم لوگوں [نے] اپنی اپنی حکومتیں بنائی ہوئی ہیں۔ آزاد ریاستیں قائم کی ہو[ئی] ہیں۔ کالی بھیڑوں کی طرح گھسے ہوئے ہو تم لوگ ہر جگہ۔ [illegible] میڈیا کو بھی بدنام کررہے ہو۔ یہ کیمرا ”پستول“ کی طر[ح] اٹھائے پھرتے ہو اور اس سے لوگوں کو ہینڈز اپ کروا[تے] ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں ڈر جاؤں گا؟ میں جاوا جیسے حرا[می] ڈان سے نہیں ڈرا، تم کس باغ کی مولی ہو...“

نمائندے کا ٹمپریچر بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ دھیما لہجہ اختیار کرتا، اس نے مزید سخت سوال کی[ا]: ”جناب! کل ایک چینل پر ایک پروگرام چلا ہے جس میں [بتایا] گیا ہے کہ آپ خود بھی آرا کوئے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ [illegible] کے علاوہ یہاں فارم ہاؤس کے ماحول کے بارے میں بھی کچھ ”باتیں“ کہی گئی ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

جلالی صاحب آتشیں لہجے میں بولے۔ ”یہاں کے ماحول سے کس کی ماں بہن کو نقصان پہنچا ہے؟ کس کو پہنچا ہے؟ میں نے کہا تھا نا تم بلیک میلر ہو۔ میں تمہیں... میں تمہیں...“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی موٹی چھڑی اٹھائی اور پورے زور سے گھمائی۔ یہ وار غالباً کیمرا مین کی طرف تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیمرے کا زاویہ تبدیل ہونے سے ڈاکٹر مہناز بھی فریم میں آگئی۔ ”پلیز سر... پلیز!“ وہ پکاری اور جلالی صاحب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہوگئی۔ چند لمحے بعد نیوز کاسٹر خجل انداز میں دیگر خبریں نشر کرنے لگی۔

”بڑا گرم بڈھا ہے بھئی۔“ راجا نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عمران اندر آگیا۔ ”یہ کیا چل رہا تھا یار ٹی وی پر؟ مجھے تو جلالی کی آواز لگ رہی تھی۔“

”وہی حضرت تھے۔ لائیو ڈراما شروع ہونے لگا تھا۔ بچ بچا ہوگیا۔“ میں نے کہا۔

عمران کے پوچھنے پر میں نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”جگر! یہ معاملہ تیزی سے بگڑتا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب ریان اور جاوا کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس تماشے میں کود پڑیں۔ جلالی کی جان کو شدید خطرہ ہے لیکن وہ سمجھ نہیں رہا اور نہ کسی کی بات مان رہا ہے۔“

”تو پھر کیا ارادے ہیں؟“

”اب کوئی راست قدم اٹھانا پڑے گا۔“ عمران نے کش لگایا۔

”یار! مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ یہ کیا اسٹوری چل رہی ہے؟“ راجا نے مداخلت کی۔

”پہلے ہمیں تو ٹھیک سے پتا چل جائے، پھر تمہیں بھی بتادیں گے۔“ عمران نے اسے ٹالا۔

راجا کی اکلوتی صحت مند آنکھ میں ”جستجو“ چمک رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔

☆☆☆

اگلے روز شام کے فوراً بعد میں اور عمران جلالی صاحب کی طرف روانہ ہوگئے۔ راجا کو عمران نے فی الحال

ہوٹل میں رہنے پر رضامند کرلیا تھا۔ اسے ابھی ہم نے کچھ بتایا نہیں تھا پھر بھی وہ موجودہ حالات کے بارے میں کافی سارے اندازے قائم کرچکا تھا۔ بڑا کائیاں شخص تھا وہ اور عیار بھی۔ راستے میں اس نے جس طرح لینڈ روور کو خراب کر کے مجھے الو بنایا تھا اور اپنا الو سیدھا کیا تھا۔ وہ مجھے بھولا نہیں تھا... میری ٹانگ اب پہلے سے کافی بہتر تھی... پھر بھی واکنگ اسٹک کے سہارے چلنا پڑ رہا تھا۔ جسم پر جابجا چوٹوں کے نیلے پیلے نشان موجود تھے لیکن ان میں سے زیادہ تر لباس میں چھپ گئے تھے۔ مجھے اپنے خاص الخاص چاقو کی گمشدگی کا افسوس تھا۔ جارج گورا کو جہنم واصل کرنے والا یہ خنجر نما چاقو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی رہ گیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں اور کس کے پاس تھا۔

عمران ایک تاریک شیشوں والی کرولا گاڑی میں یہاں پہنچا تھا۔ پتا نہیں یہ کس کی گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا لیکن اس نے بتایا نہیں۔ جب وہ کچھ چھپانے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر اس سے بحث فضول ہوتی تھی۔ راستے میں وہ شاہین سے فون پر خوب لڑتا جھگڑتا رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب سنائیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے رتی بھر جگہ بھی نہیں ہے۔ اور خدا نہ کرے... خدا نہ کرے وہ ایک ہوجائیں تو زندگی برباد ہوجائے اور دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے۔ حسبِ معمول فون پہلے شاہین نے ہی بند کیا تھا اور عمران کے خوبرو چہرے پر شرارت ناچ گئی تھی۔

عمران کے بعد میں نے فرح اور عاطف سے بات کی اور انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔ وہ بھی اس بات پر بہت پریشان تھے کہ میرا فون چار دن تک مسلسل بند رہا تھا۔ فون ہی پر میں نے اپنے اور سلطانہ کے لختِ جگر بالو کی زندگی بخش آواز بھی سنی۔

ہم رات نو بجے کے لگ بھگ ”جلالی فارم ہاؤس“ پہنچے۔ عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا... فارم ہاؤس کے اردگرد کا نقشہ اب بدلا ہوا تھا۔ دو تین جگہ ہمیں پولیس ناکوں پر سے گزرنا پڑا۔ یہاں عمران نے باقاعدہ اپنی اور میری شناخت کروائی۔ آخری ناکے پر بذریعہ فون جلالی صاحب سے اجازت حاصل کی گئی۔

فارم کے مین گیٹ پر پولیس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کے لوگ بھی موجود تھے۔ یہاں گیٹ سے باہر میڈیا کے کچھ افراد بھی موجود تھے۔ انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور وہ باہر بیٹھے بس گھول

رہے تھے۔ مجھے اور عمران کو دیکھ کر وہ ہماری طرف لپکے۔ دو تین افراد نے کار کی کھلی کھڑکی میں سے اپنے مائیک اندر گھسا دیے۔ ایک رپورٹر نے کہا۔ ”عمران صاحب! جاوا ایک بہت طاقتور شخص کا نام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو انڈین فلم انڈسٹری پر راج کرتے ہیں۔ آپ نے اسے للکارا ہے... آپ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟“

”مادھوری ڈکشٹ کا بلکہ وہ پوری کی پوری میرے پیچھے ہے۔ اور عورت آگے ہو یا پیچھے، اس کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔“ عمران نے ایک آنکھ میچی۔

”کون مادھوری جناب؟ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں؟“ رپورٹر نے کہا۔

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مادھوری ایک بہت ذہین اور چاذبہ گر خاتون ہے۔ اس کی یادداشت بھی غضب کی ہے۔ چند سال پہلے جب وہ فلموں میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی، جاوا نے اس کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کیا تھا۔ اب وہ اس کا بدلہ چکانا چاہتی ہے۔“

”ہرول بھرشاٹ...؟ یہ کیا لفظ ہے جناب؟ پہلی بار سنا ہے۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے سنا ہے یا نہیں لیکن ہرول بھرشاٹ تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔ اور انڈیا میں تو یہ بہت زیادہ ہے۔ ہر جگہ اس کا دور دورہ ہے۔ امیر طبقے کے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو غریبوں کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔“

”لیکن اس کا مطلب...“

رپورٹر کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ عمران نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

ہم کوٹھی کے پورچ میں پہنچے... اور پھر اندر چلے گئے۔ دور سے دیکھا، جلالی صاحب چھوٹے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں عمران نے مائیکروفون چھپایا تھا اور اس ننھے سے آلے کے ذریعے ہم نے اس کوٹھی کے کئی سربستہ راز معلوم کیے تھے۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ہم نے شیشے میں سے دیکھا، جلالی صاحب کمر کے پیچھے دو تین کشن رکھے صوفے پر نیم دراز تھے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ بابے طفیل کی بہو رضیہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ دوسروں کے سامنے جلالی صاحب، مہناز سے بالکل لیے دیے رہتے تھے بلکہ کسی وقت ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ مہناز بھی جناب اور سر کے سوا بات نہیں کرتی تھی۔ ابھی تک کوٹھی میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ یہاں ایک نہایت خفیہ شادی کی صورت میں کتنی تبدیلی آ چکی ہے۔ کم از کم ابھی تک تو یہ بات ایک ”... سیکرٹ“ ہی تھی۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ... نے اسے اشارے سے باہر بلایا۔ اس نے ہاتھ کی حرکت سے بتایا کہ تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ جلالی صاحب ... وائٹل سائنز چیک کرنے کے بعد اس نے جلالی صاحب کے بازو پر لگے ہوئے ”کینولا“ میں دو انجکشن دیے اور ... آ گئی۔ نایاب ایرانی بلی کا ایک گول مٹول بلونگڑا ... صاحب کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔

کل شام ہی عمران نے ڈاکٹر مہناز کو فون پر ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔ میری خیریت اور فتح محمد کی ہلاکت سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ سیکریٹری ندیم کے دہرے روپ ... اہم ترین اطلاع بھی مہناز تک پہنچا دی تھی۔ اس کے ... اسے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو یہ معلومات جلالی صاحب کو دے دے۔

مہناز میری بخیریت واپسی پر خوش تھی، تاہم جلالی صاحب کی ابتر طبیعت نے اسے پریشان بھی کر رکھا تھا۔ ... نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں نے ابھی سر کو کچھ نہیں ... صرف تمہاری خیریت سے آگاہ کیا ہے۔“ مہناز کا ... میری طرف تھا۔

”ندیم کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟“ ... نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ فتح محمد کی موت کی خبر ... طرح اس خبر سے بھی سر کو بہت صدمہ پہنچنا ہے اور ان ... حالت ایسی نہیں کہ فی الحال انہیں ایسے شاک ... جائیں۔“

”ہوا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سب کچھ بگڑ رہا ہے۔ بلڈ پریشر، ہارٹ بیٹ ... لیول۔ ایک تو حالات ایسے ہیں، اوپر سے یہ میڈیا والے ... ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کل ایک چینل کے ... پر بہت بگڑے ہیں سر۔ طبیعت تو اسی وقت خراب ہو گئی ... بعد میں سی آئی اے والے آ گئے۔ ہر ایک کی ڈیمانڈ ... کہ سر ”آرا کوئے“ والا باکس حوالے کر دیں اور اپنی ... چھڑائیں۔ لیکن یہ بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ ... ضد پکڑ لی ہے کہ نہیں۔ جتنا زور دیا جا رہا ہے، اتنا ہی ... مؤقف پر سخت ہو رہے ہیں۔“

”ڈاکٹر مہناز! تم بھی کچھ نہیں کر سکتی ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے اس طرح دیکھنے سے وہ گڑبڑا گئی اور بولی۔ ”کیا مطلب؟“

”تم سر کے اتنے قریب ہو۔ وہ تمہاری بات تحمل سے سنتے ہیں، اس پر غور کرتے ہیں۔“

”لیکن ایسا تو بس کسی وقت ہی ہوتا ہے، جب موڈ اچھا ہو۔“

”تو تم موڈ اچھا کر لو نا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ ذرا چونک سی گئی۔ روشن پیشانی پر ایک شکن سی ابھری اور غائب ہو گئی۔ ”وہ آپ دونوں کو بھی تو بڑے غور سے سنتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بات کرتے؟“ وہ بولی۔

اسی دوران میں جلالی صاحب کو شدید کھانسی ہونے لگی۔ ہماری طرح ڈاکٹر مہناز نے بھی کھڑکی میں سے انہیں کھانستے دیکھا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر بڑی تن دہی سے ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ رضیہ بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ مہناز نے جلالی صاحب کو ایک ”ان ہیلر“ دیا۔ پھر ان کا سر اونچا کرنے کے لیے اپنے زانو پر رکھا اور ان کے بوڑھے سینے پر ہولے ہولے ہاتھ چلانے لگی... ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اب ہم اس انداز میں مہناز کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

ہاں... اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو کہیں نہیں دیکھا۔ وہ کہاں گئی؟ کب اور کیوں گئی؟ کچھ پتا نہیں چلا۔ اگلے قریباً دو ماہ تک ہم ڈاکٹر مہناز کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ یہ اس روداد میں ایک عجیب موڑ تھا۔

لیکن فی الحال تو اس رات کی بات ہو رہی ہے جب اس نے جلالی صاحب کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ ہولے ہولے ان کے سینے پر چلا رہی تھی۔ ان کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا، عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح جان چکے تھے کہ اگر جلالی صاحب پر کسی طریقے سے دباؤ ڈالا جا سکتا ہے تو وہ طریقہ صرف ”مہناز“ ہی ہے۔ اگر جلالی صاحب کو یقین ہو جاتا کہ ان کے چپ رہنے سے مہناز کسی بڑی مصیبت میں پھنس رہی ہے یا اس کی زندگی کو خطرہ ہے تو وہ اپنی ضد کے خول سے نکل سکتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو دباؤ کے لیے استعمال کرنا یقیناً ہمارے لیے ایک ناخوشگوار عمل تھا۔ لیکن جس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے، ان میں اب کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اب بھی کچھ نہ کرنے میں بہت سے خطرے پوشیدہ تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خدانخواستہ جلالی صاحب کو کچھ ہو جاتا اور آرا کوئے ہمیشہ کے لیے کہیں اوجھل ہو جاتا۔

ہمارے پاس دو تین پلان تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر ڈاکٹر مہناز کو جلالی کے سامنے گن پوائنٹ پر رکھا جائے۔ اگر ناگزیر ہو تو کچھ تشدد بھی کیا جائے اور جلالی کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا جائے۔

رات بارہ بجے کے قریب عمران Zoo کی طرف اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ٹانگ سمیت جسم کے مختلف حصوں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کمرے کی الماری میں پین کلرز موجود تھیں لیکن مجھے درد کو مارنے کے بجائے درد کو سہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ درد برداشت کرنے کے لمحوں میں، میں خود کو باروندا جیکی کے بہت قریب محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہ جیسے میرے قریب آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

نہ جانے کس وقت درد... دوا ہو گیا اور میں سو گیا۔

کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بابا طفیل میرے سامنے تھا... سفید داڑھی کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ دل دوز آواز میں بولا۔ ”اٹھو، دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ جلالی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، وہ زندہ ہے... مجھے نہیں لگتا...“

میں اٹھا اور ننگے پاؤں جلالی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ بابا طفیل بھی روتا ہوا میرے ساتھ تھا۔ کوٹھی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ جلالی صاحب بالکل ساکت و جامد پڑے تھے۔ چہرے پر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے ان کی نبض ٹٹولی۔ نبض کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جسم ٹھنڈا تھا۔ غور کرنے پر سینے میں ہلکی سی حرکت محسوس ہوئی۔ شاید یہ سانس کی حرکت تھی۔

”ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟“ میں نے چلا کر پوچھا۔

”وہ چلی گئی۔ بھاگ گئی حرام خور۔ اس کا کمرا خالی ہے۔ سارا سامان بھی غائب ہے۔“ بابے طفیل نے کراہتے ہوئے کہا۔

”یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟“

اسی دوران میں عمران بھی پہنچ گیا۔ لگتا تھا کہ بابے طفیل کے آخری الفاظ اس نے بھی سن لیے تھے۔ میں نے

کہا۔''عمران! جلالی صاحب کو اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی ان کی تھوڑی بہت سانس چل رہی ہے۔''

ایک ایمبولینس بیڈ روم کے عقبی دروازے کے پاس بالکل تیار حالت میں رہتی تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ایمبولینس دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے بابے طفیل اور رضیہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ ابھی کمرے کی کسی شے کو اس کی جگہ سے ہلایا نہ جائے۔ کمرے میں کچھ چیزیں اپنی جگہوں سے ہٹی ہوئی تھیں۔ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوا کی دو شیشیاں نیچے گری ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹا ٹائم پیس شاید ان شیشیوں کے اوپر گرا تھا اور ٹوٹ گیا تھا۔ جلالی صاحب کی بیڈ شیٹ پر بہت سی سلوٹیں تھیں۔

ہم جلالی صاحب کے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھا کر ایمبولینس تک لائے۔ عمران نے کہا۔''ہم دونوں کا جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں رہو اور فون پر مجھ سے رابطہ رکھو۔ ڈاکٹر مہناز کو ڈھونڈو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر ہی کہیں موجود ہو۔ نرس بشریٰ کا بھی پتا کرو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وحید... عمران اور ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بے سدھ جلالی صاحب کو ایمبولینس میں ڈال کر نکل گئے۔

ملازم آبدیدہ تھے۔ کئی باقاعدہ رو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے تئیں جلالی صاحب کو مردہ قرار دے دیا تھا۔

انچارج پولیس افسر ایس پی تیمور خاں بھی فوراً ہی اندر آگیا۔ اس کو بیان دیتے ہوئے بابے طفیل نے کہا۔''جلالی کی طبیعت شام سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ دس بجے تک طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ میرے کہنے پر مہناز نے اپنے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا۔ یہ ڈاکٹر خود تو نہیں آیا، اس نے ایک چھوٹے ڈاکٹر کو بھیج دیا۔ اب پتا نہیں وہ ڈاکٹر تھا بھی یا نہیں۔ شکل سے تو کوئی بوچڑ ہی لگتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ مہناز نے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا بھی تھا یا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ یہ ساری پلاننگ پہلے سے ہی تھی۔ اس کمینی نے جب یہ دیکھا کہ جلالی کا آخری وقت آگیا ہے تو صفایا کر کے یہاں سے نکل گئی۔'' بابا طفیل پھر ہچکیوں سے رونے لگا۔

ایس پی تیمور نے پوچھا۔''صفایا کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کچھ چیزیں بھی گئی ہیں؟''

''ہاں جی... یہ دیکھیں، یہ ساری الماری الٹ پلٹ ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ نکالا گیا ہے یہاں سے۔'' بابے طفیل نے الماری کے پٹ کھول کر دکھائے۔ واقعی ہر شے درہم برہم دکھائی دیتی تھی۔ ایک دراز ادھ کھلی تھی۔ وہاں افراتفری میں کیش نکالا گیا تھا۔ پانچ پانچ سو کے دو... دراز سے نکل کر الماری کے نچلے حصے میں پڑے تھے۔ ... میں سونے کی ایک زنجیر بھی اٹکی ہوئی تھی۔ یہ غالباً کسی ... ہار کا حصہ تھی۔ بابا طفیل ہمیں ساتھ والے کمرے میں لایا۔ یہاں آبنوس کی بنی ہوئی ایک مضبوط دیوار گیر الماری تھی۔ اس الماری کا ایک تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ بابے طفیل نے کھولا۔ اندر لکڑی کا ایک باکس تھا۔ باکس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب رہی ہوگی۔ اس کی چوڑائی ایک فٹ اور اونچائی ایک فٹ سے تھوڑی کم محسوس ہوتی تھی۔ باکس کے اطراف میں سرخی مائل مٹی لگی ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ باکس کہیں زمین میں دبا رہا ہے۔ باکس کا ایک کونا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ ذہن میں فوراً یہ آیا کہ یہی وہ باکس ہے جس کے لیے یہاں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ یہ وہی آرا کوئے والا نادر باکس تھا... لیکن یہ خالی تھا۔ ایس پی تیمور نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ باکس میں اخباری کاغذوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ کاغذ غالباً مجسمے کو خراش وغیرہ سے بچانے کے لیے تہ در تہ باکس میں رکھے گئے تھے۔

''مجسمہ کہاں ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''آپ خود اندازہ لگالیں جی کہ کہاں ہے۔ مہناز اور اس کا ساتھی لے گئے ہیں۔''

رات کو گیٹ پر موجود رہنے والا سب انسپکٹر بھی کمرے میں موجود تھا۔ ایس پی تیمور نے پوچھا۔''ڈاکٹر مہناز کتنے بجے نکلی تھی کوٹھی سے؟''

''یہی کوئی ایک بجے کا وقت ہوگا۔''

''اور کون تھا؟''

''وہی سانولے سے رنگ والا ڈاکٹر جو رات دس بجے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اسی کی مہران گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس وقت وہ دونوں کہاں جارہے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا تھا کہ جلالی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ فوری طور پر کچھ دواؤں کی ضرورت ہے جو لاہور سے ملیں گی۔ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجاتے ہیں۔''

ایس پی تیمور نے کہا۔''تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر جلالی صاحب کی طبیعت خراب ہے تو پھر وہ دونوں کیوں جارہے ہیں؟ ان میں سے ایک کو یہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔''

''جی، اس وقت یہ بات دماغ میں نہیں آئی۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ شاید بڑے صاحب کو کوئی انجکشن وغیرہ لگایا گیا ہے اور فی الحال وہ سو رہے ہیں۔''

''گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا ہے؟''

''بالکل جناب! گاڑی کی یہاں سے روانگی کا بالکل ٹھیک ٹائم بھی لکھا ہوگا رجسٹر میں۔''

ایس پی تیمور اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے حکم پر کوٹھی کے تینوں بیرونی دروازے بند کردیے گئے اور گارڈز کو ہائی الرٹ کردیا گیا۔ سنسنی کی کیفیت شدید ہوتی جارہی تھی۔

میں مبہوت سا لکڑی کے اس باکس کے سامنے کھڑا تھا جو اب تک ایک معما بنا رہا تھا۔ وہ اب بھی ایک معما ہی تھا کیونکہ اس کے اندر اصل چیز موجود ہی نہیں تھی۔

بابا طفیل مسلسل اپنی سفید داڑھی کو آنسوؤں سے بھگو رہا تھا۔ اسے جیسے یقین ہوچکا تھا کہ وہ اب جلالی صاحب کو زندہ نہیں دیکھ پائے گا۔

میں نے باکس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''ظاہر ہے کہ یہ یہاں موجود نہیں تھا۔ ورنہ تلاشی کے وقت جاوا کے ہتھے چڑھ گیا ہوتا، یا ریان کے لوگ اسے لے اڑے ہوتے۔ لگتا ہے کہ یہ دو چار دن پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' بابے طفیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''پرسوں شام کے وقت جلالی کی طبیعت کافی اچھی تھی۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ شام سے کچھ دیر پہلے ہی جیپ پر بیٹھ کر سیر کے لیے نکل گئے تھے۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ مغرب سے کوئی ایک گھنٹا بعد واپس آئے تھے۔ جیپ سامنے کی طرف کھڑی کرنے کے بجائے انہوں نے یہاں پچھلے صحن میں کھڑی کی تھی۔ اپنے کمرے کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ یہ جیپ ادھر کیوں لے آئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اسی شام جلالی یہ لکڑی کا صندوق کہیں سے نکال کر لائے تھے... ہاں، ایک بات اور یاد آئی...'' بولتے بولتے بابا طفیل ایک دم چونک سا گیا۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بولا۔''مجھے یاد آرہا ہے کہ اسی رات گیارہ بارہ کے قریب مجھے فرش پر کچھ گھسیٹے جانے کی آواز بھی آئی تھی۔ ہاں، گیارہ بارہ کا ٹائم ہی ہوگا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ جلالی جی اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا بھی لیکن کچھ کہا نہیں پھر دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت انہوں نے یہ صندوق ہی گھسیٹا ہو۔''

میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے ذریعے صندوق کو احتیاط سے پلٹ کر دیکھا۔ کافی حد تک بابے طفیل کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ صندوق نما باکس کی نچلی سطح پر گھسیٹے جانے کے نشان موجود تھے۔ خشک لکڑی کا یہ باکس زیادہ وزنی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن سات آٹھ کلو سے زیادہ نہیں تھا اور اگر آرا کوئے کا وزن دس کلو بھی تھا تو پھر ٹوٹل وزن 18 کلو کے قریب بنتا تھا... بے شک جلالی صاحب بیماریوں کے نرغے میں آکر بہت کمزور ہوچکے تھے پھر بھی ان میں بلا کی مزاحمت تھی۔ جب ان کی حالت بہتر ہوتی تھی تو وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر توانا دکھائی دیتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس شام انہوں نے اکیلے ہی اس باکس کو زمین سے نکالا ہو اور جیپ پر رکھ کر یہاں لے آئے ہوں۔

میں نے کہا۔''بابا! یہ بات تو اب تقریباً صاف ہے کہ یہ وہی باکس ہے جس کے لیے یہ ساری کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جلالی صاحب اسے اس کی محفوظ جگہ سے نکال کر یہاں کیوں لے آئے؟''

''میں تو ایک مسکین نوکر ہوں اس گھر کا۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔''ویسے بابا طفیل! تم اتنے بھی بے خبر نہیں ہو۔ جلالی صاحب بہت بھروسا کرتے تھے تم پر۔''

میرے لہجے نے بابے طفیل کو ذرا چونکایا لیکن اس نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں۔ میں بابے طفیل کو جلالی صاحب اور مہناز کی خفیہ شادی کے حوالے سے کرید سکتا تھا لیکن ابھی یہ موضوع چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنی توجہ موجودہ صورتِ حال پر ہی مرکوز رکھی۔ میں نے کہا۔''بابا! میرا خیال ہے کہ تم جلالی صاحب کے مزاج کو جتنا سمجھتے ہو شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جلالی صاحب نے یہ باکس ڈاکٹر مہناز کے سپرد کرنے کے لیے ہی اس کی خفیہ جگہ سے نکالا ہو اور یہاں پہنچایا ہو؟''

''لیکن پتر جی! اگر ایسی بات ہوتی تو پھر تالے کیوں توڑے جاتے اور چیزیں کیوں اٹھائی جاتیں؟ وہ بڑی غلط زنانی نکلی ہے۔ وہ ہر وقت جلالی کے قریب رہ کر ہر اونچ نیچ کی خبر رکھتی رہی ہے۔ اسے ٹوہ لگ چکی ہوگی کہ جلالی جی صندوق کہیں سے نکال کر کوٹھی میں لے آئے ہیں۔ اس نے موقع دیکھا۔ اپنے ساتھی کو بلایا اور مورتی لے اڑی۔ اس کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ ہوسکتا ہے کہ... اس نے خود ہی جلالی جی کو بے ہوشی کا ٹیکا شیکا لگا دیا ہو۔''

میں نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ باکس کا ایک

کونا ٹوٹا ہوا تھا جیسے اسے کہیں سے پھینکا گیا ہو۔ یہ ٹوٹا کونا یقیناً اس واقعے کی نشانی تھا جب اس باکس کو کسی نامعلوم شخص نے چلتی گاڑی میں سے جھاڑیوں میں پھینکا تھا اور یہ جلالی صاحب تک پہنچا تھا۔ باکس پھینکنے والا ابرار صدیقی ہی تھا یا کوئی اور... یہ بات بھی ابھی تک ایک معما تھی۔ ابرار صدیقی کے بارے میں ابھی تک کوئی اچھی بری خبر ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں میرے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر دیکھا، عمران کا نمبر تھا۔ دل دھڑک اٹھا۔ جلالی صاحب کی طرف سے کوئی بری خبر آسکتی تھی۔ خبر آئی لیکن وہ اچھی تھی نہ بری۔ جلالی صاحب کی حالت نازک تھی۔ وہ اسپتال پہنچ چکے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ کومے میں جا چکے ہیں۔ یعنی ابھی وہ سانس لے رہے تھے۔ زندوں میں شامل تھے۔

ڈاکٹر مہناز کے بارے میں میری سوچ ہمیشہ مثبت رہی تھی۔ وہ جس جانفشانی سے ہمہ وقت جلالی صاحب کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی، وہ متاثر کن بات تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے مریض کے علاج میں آخری حد سے بھی آگے چلی گئی ہے۔ یہ ایک انوکھی مثال تھی۔ اس نے اپنے اور جلالی صاحب کے درمیان ہر فاصلہ مٹا دیا تھا۔ اس فاصلے کو مٹانے کے لیے وہ مذہبی اور معاشرتی تقاضا بھی پورا کر دیا تھا جسے ہم شادی کہتے ہیں۔ لیکن... اس سب کے باوجود جو کچھ اب سامنے آرہا تھا، وہ بھی تحیر انگیز تھا۔ مکمل تحقیق تو ظاہر ہے کہ پولیس کو... ہی کرنا تھی لیکن جو شواہد یہاں موقع پر نظر آرہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے یا انہیں بے ہوش کرنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی نے دونوں کمروں کی تلاشی لی۔ تالے توڑے اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ نایاب مجسمہ آراکوئے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

انسان ایک پہیلی ہے اور دلوں کے راز اللہ... ہی جانتا ہے۔ چند دن پہلے تک ہم فتح محمد کو اس کوٹھی کی کالی بھیڑ سمجھتے تھے اور سیکریٹری ندیم کو نمک حلال ملازم... لیکن جو حقیقت سامنے آئی، وہ برعکس تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہم نے ''شریف صورت'' ندیم کا جو روپ دیکھا، وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اب یہاں ڈاکٹر مہناز کے بارے میں ایک مختلف صورتِ حال سامنے آرہی تھی۔ میں نے اب تک کئی بار اس کے سیل فون پر رابطے کی کوشش کی تھی مگر فون بند تھا۔

اسی دوران میں ایس پی تیمور اپنے لاؤ لشکر کے ... پھر آن موجود ہوا۔ وہ موقع پر موجود ہر شخص کو شک کی ... سے دیکھ رہا تھا اور سوالات کر رہا تھا۔ پولیس فوٹو گرافر ... فنگر پرنٹس اٹھانے والے اہلکار بھی اس کے ساتھ تھے۔ ... نے ہم سب کو باہر نکال دیا اور تیزی سے کام میں مصروف ... گیا۔

اسی دوران میں عمران کا فون آگیا۔ میں نے ... ریسیو کی۔ ''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔ جلالی صاحب کے لیے ہم جو ... سکتے تھے، کر چکے ہیں۔ اب تمہاری ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو شکل سے پہچانتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔ لیکن کیا معاملہ ہے؟''

''مہناز غائب ہو چکی ہے۔ اس کا واحد کھوج اس کی والدہ ہے۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ مہناز یہاں سے غائب ہوئی ہے تو آراکوئے سمیت خراماں خراماں اپنی اماں جان کے پاس پہنچ جائے گی؟''

''تم ابھی کچے جاسوس ہو۔ تمہارے عقل کے دانت ابھی نکلنے ہیں۔ مہناز اپنی اماں جی کے پاس تو نہیں جائے گی لیکن وہ جلد یا بدیر ان سے رابطہ ضرور فرمائے گی۔ اور ... وجہ ہے کہ اس کی والدہ خطرے میں ہے۔ ہمیں اسے اس جگہ سے ہٹانا ہوگا جہاں وہ موجود ہے۔''

''تو کیا میرا ابھی آنا ضروری ہے؟''

''نہیں، اگلی جمعرات تک آجانا۔ یار! تم بندے ... کہ چغد۔ یہ سوچنے کا نہیں، کچھ کرنے کا وقت ہے۔ نپولین بونا پارٹ میرے دادا جی کا یار بیلی تھا۔ دونوں نے اکٹھے جڑانوالہ سے میٹرک پاس کیا تھا۔ دادا جی نپولین کو پیار سے نوپی نوپی کہتے تھے۔ دادا جی نے مجھے بتایا تھا کہ نوپی نے اپنے دشمنوں پر ہمیشہ اس لیے فتح پائی کہ وہ ان کی توقع سے پہلے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ تو میرے پیارے شہزادے! ... گاڑی مت بنو، ایکسپریس بنو۔ شٹاشٹ... شٹاشٹ... جلدی ہو سکتا ہے، مینار پاکستان کے سامنے پہنچ جاؤ، راوی روڈ والے گیٹ پر۔''

میرے اور عمران کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں روانہ ہو گیا۔

ایس پی تیمور نے سارے دروازے بند کروا رکھے تھے لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ یہاں میری اور عمران کی ایک خاص اتھارٹی ہے۔ اس نے مجھے نہ صرف جانے کی اجازت دی بلکہ ایک اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ جائے اور پولیس موبائل میں مجھے مطلوبہ جگہ تک پہنچائے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے۔ یہاں میڈیا والوں کا ہجوم تھا۔ ان کی رنگ برنگی اسٹیشن ویز نظر آرہی تھیں۔ یہ رات کا آخری پہر تھا مگر ٹیوب لائٹس اور سرچ لائٹس کی وجہ سے گیٹ کے آس پاس دن کا سماں تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر کچھ رپورٹرز ہماری طرف لپکے لیکن اے ایس آئی گل احمد تیزی سے آگے نکل گیا۔ وہ اپنے نام ہی کی طرح ذرا کھلا کھلا اور خوش باش شخص تھا۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔

وہ بولا۔ ''تابش صاحب! آپ کے دوست عمران صاحب کا تو بڑا چرچا ہو گیا ہے جی۔ ہر اخبار میں خبر آئی ہے اور ٹی وی پر بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے جاوا جیسے انڈین بدمعاش کو للکارا ہے اور اسے سرحد پار جانے پر مجبور کر دیا ہے...'' پھر وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ ''کیا واقعی جاوا انڈیا واپس چلا گیا ہے یا یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ لوگ یہ سوال عمران سے کرو تو شاید کوئی جواب مل جائے۔''

میں خاموشی سے سفر کرنا چاہ رہا تھا لیکن گل احمد باتونی شخص تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتا تھا۔ مثلاً جلالی صاحب کا انتقال ہو گیا تو آگے کیا ہوگا؟ کیا ڈاکٹر مہناز واقعی خود یہاں سے گئی ہے، کہیں اسے کسی نے اغوا تو نہیں کیا؟ آراکوئے کا مجسمہ واقعی غائب ہے یا کوٹھی کے اندر ہی کہیں چھپایا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس کے ان سوالوں کے مختصر ترین جواب دیے۔ اس حوصلہ شکنی کے باوجود وہ گاہے بگاہے بات چھیڑتا رہا۔ پانچ دس منٹ چپ رہنے کے بعد وہ اچانک بولا۔ ''تابش بھائی! یہ جو عمران صاحب نے بتایا تھا کہ جاوا نے کچھ عرصہ پہلے انڈین اداکارہ مادھوری سے ہرول بھر شاٹ کیا تھا... تو کیا واقعی کوئی اس قسم کا کام ہوا تھا؟''

''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی دماغ میں سوال آرہا ہے۔ ویسے یہ ہے تو زیادتی نا کہ ایک لڑکی جو کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کے پاس کام مانگنے آتی ہے، اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔''

''کیا کیسا جائے؟''

''یہی ہرول بھر شاٹ وغیرہ۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہرول بھر شاٹ کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ وہ یونہی چھوڑی تھی عمران صاحب نے۔ ان کی یہ عادت ہے۔''

''واقعی؟'' گل احمد نے دیدے گھمائے۔

''میں عدالت میں جا کر حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں۔'' میں نے بیزار ہو کر کہا۔

''حیرت ہے۔ وہاں گیٹ پر تو ایک اخباری نمائندہ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے اور اس کا مطلب بڑا غلط قسم کا ہے... چلو شکر ہے، آپ نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ ورنہ بڑے گندے گندے خیال آرہے تھے۔'' اس نے بظاہر سکون کی سانس لی۔ لیکن لگتا تھا کہ دل ہی دل میں وہ جیا دا کی طرف سے خاصا ''مایوس'' ہوا ہے۔

... آدھ گھنٹے بعد جب اے ایس آئی گل احمد نے مجھے مینار پاکستان کے مطلوبہ گیٹ پر اتارا تو رات کے ساڑھے تین چار کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس بھی جیسے اونگھ رہی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق مجھے اتارنے کے بعد بھی گل احمد وہیں کھڑا رہا۔ ایک طرف سے عمران برآمد ہوا۔ بالکل ایسے لگا کہ زمین سے نکل آیا ہے۔ ''یہ ساتھ کس کو لائے ہو؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ایک اے ایس آئی ہے۔ گل احمد نام ہے۔''

''چلو اچھی بات ہے۔ ہم ابھی اسے اپنے ساتھ رکھیں گے بلکہ اسی کی گاڑی پر جائیں گے۔ ذرا آسانی رہے گی۔ میں اپنے والی گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم اے ایس آئی گل احمد کے ساتھ تیز رفتاری سے لوئر مال روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ایک رہائشی آبادی میں داخل ہوئے پھر ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے جا کر رک گئے۔ یہ صاف ستھرا اسپتال ایک بڑی کوٹھی کے اندر واقع تھا۔ ہم نے گل احمد کو گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور خود اس اسپتال نما کلینک میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر اسپتال کے اندر باہر خاموشی تھی۔ یہاں دس پندرہ کمرے اور تین درمیانے سائز کے وارڈز تھے۔ زیادہ تر مریض سو رہے تھے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی مریض کے اٹینڈنٹ ہیں۔ عمران کے ہاتھ میں دواؤں والا ایک چھوٹا سا شاپر بھی تھا۔ کسی نے ہم سے روک ٹوک نہیں کی۔ ایک وارڈ کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ یہ فیمیل وارڈ تھا۔ دروازے کے شیشے میں سے دس بارہ مریض

خواتین نظر آرہی تھیں۔ اِکّا دُکّا تیماردار بھی تھے۔ وارڈ کے اندر ایک نرس کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی غالباً سسپنس ڈائجسٹ کی ورق گردانی کررہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کی۔ ”مہناز کی والدہ کو پہچان سکتے ہو؟“

میں نے دھیان سے دیکھا۔ ”ہاں... دائیں طرف پانچواں بیڈ ہے۔“

”آر یو شیور؟“

”یس۔“

ہم اندر داخل ہوئے اور سیدھے مطلوبہ بیڈ پر پہنچے۔ وارڈ کی مدھم روشنی میں خاتون نیم دراز تھیں اور ہولے ہولے کھانس رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد عمران سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”آنٹی! ہم جلالی فارم ہاؤس سے آئے ہیں۔ آپ کو ایک خاص اطلاع دینی ہے۔“

خاتون کا چہرہ ہلدی ہوگیا۔ ”مم... مہناز تو خیریت سے ہے نا؟“

”وہ خیریت سے ہے لیکن اطلاع اسی کے بارے میں ہے۔“

خاتون نے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ والے بستر کی خاتون بھی ہماری طرف دیکھنے لگی۔

عمران نے مہناز کی والدہ سے کہا۔ ”اگر آپ کو چلنے میں زیادہ دشواری نہ ہو تو سامنے لابی میں آجایئے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔“

مہناز کی والدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کوشش کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عمران بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات میں بے چینی تھی۔ ہم مہناز کی والدہ کو سہارا دے کر لابی تک لائے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عمران نے اپنے مخصوص ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ”آنٹی! وہاں فارم میں پھر گڑبڑ ہوئی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر مہناز خطرہ محسوس کر کے کہیں نکل گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی طرف سے آپ کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ...“

ابھی عمران کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دو گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے آئیں اور اس پرائیویٹ اسپتال کے عین سامنے آکر رکیں۔ پہیوں کے چرچرانے کی آواز دور تک گونجی۔ چند ہیولے برآمد ہوئے اور لپکتے ہوئے اسپتال کے دروازے کی طرف آئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مین دروازے تک پہنچتے، رات کا سناٹا فائرنگ کی خوفناک آواز سے چکنا چور ہوگیا۔ میں نے ایک ہیولے کو گولی کھا کر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ دوسرے آڑ لینے کے لیے مختلف اطراف میں بھاگے۔

یہی وقت تھا جب دو تین اور گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک اسٹیشن ویگن نے بڑے سنگین انداز میں ایک ٹویوٹا کار کو سائڈ ماری اور ٹویوٹا کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک شوکیس سے جا ٹکرائی۔ عمران چلایا۔ ”آنٹی! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

آنٹی ہکّا بکّا تھیں۔ وہ جیسے یکسر مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں کی کرسی پر بٹھا لیا۔ اسپتال میں افراتفری مچ گئی تھی۔ جن مریضوں کے لیے ہلنا جلنا بھی محال تھا، وہ جان بچانے کے لیے بستروں سے اتر آئے تھے۔ ہم دونوں آنٹی کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میری ٹانگ ایک بار پھر درد سے سنسنانے لگی۔

ایک ڈیوٹی ڈاکٹر ہمارے راستے میں آئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کہاں لے جارہے ہو انہیں؟“

عمران نے دھکا دے کر ڈاکٹر کو ایک طرف گرایا۔ ہم آنٹی سمیت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔ بلندی سے اردگرد کا منظر زیادہ وضاحت سے ہمارے سامنے آیا۔ یہ لرزہ خیز تھا۔ اسپتال کے اردگرد کم از کم ایک درجن مشکوک گاڑیاں آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔ اسپتال کے عین سامنے اور بائیں جانب اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ ٹائر برسٹ ہورہے تھے۔ لوگ چلا رہے تھے اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اور کانپ گیا۔ پولیس موبائل میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے قریب ہی اے ایس آئی گل احمد سڑک پر اوندھے منہ بے سدھ پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں کو باہمی عداوت نے ہوش وحواس سے بیگانہ کردیا ہے اور وہ ہر جگہ وحشی جانوروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ تصادم کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے چار فٹ اونچی منڈیر پھاندی اور ساتھ والی چھت پر آگیا۔ آنٹی سکتہ زدہ تھیں۔ ان کا وزن بہت زیادہ نہیں تھا۔ عمران نے انہیں بازوؤں میں اٹھایا اور منڈیر کے اوپر سے میری طرف بڑھا دیا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

مکین و مکان

کاشف زبیر

مکان کی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے... خصوصاً وہ لوگ جن کے سروں پر کوئی چھت... چھپر اور سائبان نہیں ہوتا... اس سائبان کو حاصل کرنے کے لیے انسان اپنی پوری زندگی تیاگ دیتا ہے... مکان کی زینت مکیں ہوتے ہیں... انہی کی ہمنوائی اس مکان کو پرسکون گھر میں بدل دیتی ہے...

چلبلے اور شرارتی جلیل میاں کا ایک اور کارنامہ... لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دینے والا سلسلہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش نہ صرف جواں تھا بلکہ تازہ تازہ جیل سے بھی وارد ہوا تھا۔ چوری سے تائب ہو چکا تھا مگر ہیرا پھیری کا سلسلہ جاری تھا اس لیے منزلِ مقصود یعنی شنو اس وقت بھی اتنی ہی دور تھی جتنی اس وقت ہے۔ اماں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں ہیرا پھیری نہیں چھوڑوں گا خاکسار کا سر سہرے سے محروم رہے گا۔ شنو منگیتر کی پوسٹ پر تھی اور بیوی بننے کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی۔

راجا دوست تو پرانا ہی تھا لیکن کمینہ تازہ تازہ ہوا تھا اس لیے اس کی دوستی اتنی ہی ضروری تھی جتنا کہ عادی تمبا کو خور کے لیے گٹکا... ہماری دوڑ فتو کے کیفے ڈی پھونس تک تھی جو نیا کھلا تھا لیکن اس کی خستہ حالی کے باعث لوگ سمجھتے تھے کہ فتو کے دادا جان نے کھوکھرا پار کے راستے پاکستان وارد ہوتے ہی کھولا تھا اور والد صاحب کے دستِ نا مبارک سے تباہی کی منازل طے کرتا ہوا فتو کو وراثت میں ملا تھا۔ حالانکہ فتو اور اس کے کیفے دونوں کی تباہی میں اس کے سالوں کا ہاتھ تھا جو فنِ پہلوانی کے تمام نئے داؤ جو وہ ٹی وی پر آنے والی ریسلنگ سے سیکھتے تھے، فتو پر ہی آزماتے تھے۔

یہ سالوں کی مشقِ ستم کا نتیجہ تھا کہ فتو کی چال میں لہر آگئی اور ایک آنکھ سے وہ دائیں طرف دیکھتا تھا۔ اس دوران میں دوسری راست رو رہتی تھی یعنی سامنے دیکھتی تھی۔ اس کے سالے بزنس کے وقت اپنے تمام مفت خورے دوستوں سمیت کیفے ڈی پھونس میں آدھمکتے تھے۔ فتو کی تمام دن کی آمدنی وہ چائے اور بسکٹ کی صورت میں کھا پی جاتے تھے۔ پھر فتو ہم جیسے پرانے دوستوں سے یہ خسارہ پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں... ماس اور مال صرف جمی کے پاس تھا اور وہ ایسی تمام جگہوں کے پاس بھی پھٹکنے سے گریز کرتا تھا جہاں خدانخواستہ خرچ کا معمولی سا بھی احتمال ہو۔ ان مقامات میں سرِفہرست کیفے ڈی پھونس تھا۔

ہیرا پھیری کے باوجود آمدنی اتنی کم تھی کہ بہ مشکل میرے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ اس لیے میں کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اگر کام مل جاتا تو کام سے زیادہ اس کی فکر کرتا کہ راجا کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے ورنہ وہ جونک کی طرح مجھے چمٹ جاتا اور اس وقت تک چمٹا رہتا جب تک میری جیب میں رقم پائی جاتی۔ اس وقت بھی ہم کیفے ڈی پھونس میں بیٹھے تھے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ فتو کے کان پھاڑ ڈیک کی دھن پر وہاں موجود کشتگان چائے بیٹھے بیٹھے ناچ رہے ہوں حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ وہ اشاروں کی زبان میں بات کر رہے تھے کیونکہ آواز تو کوئی اور آ نہیں سکتی تھی، خود میں اور راجا لپس ریڈنگ کے ماہر ہو چکے تھے اور آپس میں اسی طرح گفتگو کرتے تھے۔

حقے کے پانی جیسی چائے پیتے ہوئے راجا اس سنہری وقت کو یاد کر رہا تھا جب نہ کھانے کی فکر ہوتی تھی نہ کپڑوں کی اور نہ رہائش کی۔ کیونکہ ان تمام اخراجات کا ذمہ سرکار نے مع میڈیکل کے لے رکھا تھا یعنی جب ہم جیل میں تھے۔ رہائی کے بعد راجا نے ایک موقع پر اعتراف کیا کہ جیلر اور اس کا عملہ اس کے باپ کے مقابلے میں زیادہ رحم دل تھے۔ شنو کے بارے میں میں نے فرض کرلیا تھا کہ اس کی محبت کا خاتمہ میری سزا کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے بھی کبھی جیل آکر یا نامۂ محبت بھیج کر غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے ایامِ جیل اتنے مشکل نہیں رہے تھے۔ مگر اتنے سنہری بھی نہیں تھے کہ میں راجا کی طرح ان کی یاد میں کھو جاتا۔

”راجا بھول جا اس وقت کو... اور حال کے مسائل کی طرف توجہ دے... جن میں سرِفہرست ہماری مالی حالت ہے۔“

”مالی حالت۔“ راجا نے سرد آہ بھری۔ ”اسی مسئلے کو بھلانے کے لیے میں ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا مگر جلیل کے بچے تُو نے پھر سے یاد دلا دیا۔“

”کیونکہ ہماری جیب میں اب اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اس نام نہاد چائے کا بل ادا کر سکیں۔“ میں نے پیالی میں جھانکا جس میں تہ میں تلچھٹ باقی رہ گیا تھا۔ اس چائے کی پتی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ یہ کئی دن سے مسلسل استعمال ہو رہی تھی۔ اگر فتو کو گاہکوں کی طرف سے فوتگی کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ اسے گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرانے کی کوشش کرتا۔ اس اطلاع نے راجا کو فکر مند کر دیا۔

”تب فتو کو کیا کہیں گے؟“

”یہی کہ بل حساب میں شامل کر لے۔“

”لیکن حساب تو پہلے ہی تیرے نامۂ اعمال سے زیادہ طویل ہو چکا ہے اور اس کی جواب دہی اتنی ہی مشکل ہے جتنی تیرے اعمال کی۔“

”لیکن اس حساب میں تُو نے ستّر فیصد حصہ ڈالا ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا تو راجا بُرا مان گیا۔

”جلیل! تو جیل سے کمینگی سیکھ کر آیا ہے، دوستوں سے اتنا سا حساب کرتا ہے۔ بہر حال ہم نے کون سا انکار کیا ہے کبھی نہ کبھی اس کا حساب بھی بے باق کر دیں گے۔“

ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ بہ شرطِ زندگی میں آنے والے تیس چالیس سالوں میں یہ قرض اتار ہی دوں گا۔ فکر کی بات یہ تھی کہ فتو نے کیفے ڈی پھونس میں گھستے ہی چائے کی دیگچی میں چلانے والا چمچہ لہرا کر واضح کر دیا تھا کہ یہ اس کیفے میں آخری چائے بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”کیا تو نے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا فیصلہ کیا ہے؟“

”کاش... مجھ میں اتنی ہمت ہوتی۔“ فتو نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے تائید کی۔

”یہی بات تُو شادی سے پہلے بھی کہہ سکتا تھا اور بعد کی شرمندگی سے بچ جاتا لیکن خیر اگر تو چھرا نہیں گھونپ سکتا تو چائے میں زہر دے سکتا ہے۔“

اس بار فتو نے ناقابلِ اشاعت الفاظ میں واضح کیا کہ اس میں اس کی ہمت بھی نہیں ہے اور زہر بھی نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر چمچہ لہرایا۔ ”یہ اس کیفے میں تم دونوں حرام خوروں کی آخری چائے ہے۔ آئندہ بل دیے بغیر یہاں قدم رکھا تو...“ فتو کے باقی الفاظ بھی ناقابلِ اشاعت سمجھے جائیں۔

”اسے کیفے ڈی پھونس کی آخری چائے سمجھ لے۔“

”یار ایسی آخری چائے تو ہم کئی بار پی چکے ہیں۔“ راجا نے بے نیازی سے کہنا چاہا لیکن لہجے کی تشویش چھپی نہیں رہی۔ اس وقت تک عارفہ سے زیادہ اس کا باپ حوالدار نادر شاہ راجا پر مہربان تھا اس لیے راجا کا زیادہ وقت اس کے ڈرائنگ روم میں گزرتا تھا۔ بعد میں اس نے ترقی کی اور عارفہ کے بیڈ روم میں منتقل ہو گیا۔ مقام بدل گیا لیکن راجا کا مستقبل نہیں بدلا تھا۔ جو کام پہلے نادر شاہ آلاتِ تشدد کی مدد سے لیتا تھا، وہی کام عارفہ پیار سے کرنے لگی۔ یعنی راجا کو قبر کی طرف دھکیلنے کا کام۔ راجا جب ان باپ بیٹی کے چنگل سے نکلتا تو سیدھا کیفے ڈی پھونس ہی آتا۔

”جلیل! کچھ کرنا پڑے گا۔“

راجا کا مطلب تھا کہ میں کمانے کے لیے کوئی چکر چلاؤں۔ ان دنوں مالی مسائل حل کرنے کے تین ذرائع تھے۔ ایک شنو جس سے ادھار لینا مشکل کام تھا۔ عطائے محبت کے ساتھ وہ مال کے معاملے میں بھی سخت کنجوس ہوتی جا رہی تھی۔ پیاسے کو ملے کنوئیں سے شبنم۔ دوسرا جمی تھا جس سے رقم نکلوانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا بیل سے دودھ نکالنا۔ تیسرا ان دونوں کا بھی باپ تھا یعنی سیٹھ چھوٹا بھائی بڑا، جو دمڑی مانگنے والے کی چمڑی اتار لیتا تھا۔ پیارے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں ان دنوں کیسی مشکل سے دوچار تھا۔ راجا نے جمی کی طرف چلنے کو کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو بھول رہا ہے، ایک ہفتہ پہلے ہی ہم نے جانی چریا کی محبوبہ سے اس کا فلیٹ خالی کرایا تھا اور یہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ جانی چریا کی محبوبہ ہے۔ اب جمی بھگت رہا ہو گا۔ وہ زندہ ہے کیونکہ کسی بھی اخبار میں چڑیا گھر سے فرار ہونے والے کسی گینڈے کی وفات کی خبر نہیں آئی ہے۔ جمی ہمیں نہیں چھوڑے گا۔“

”تب چھوٹا بھائی بڑا رہ جاتا ہے۔“

”وہ پہچانے گا بھی نہیں، جب تک اسے مطلب نہ ہو وہ اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتا۔ والد مرحوم کو آخری وقت تک سخت قلق رہا۔ اگر چھوٹا بھائی بڑا کی جگہ وہ کوئی طوطا پال لیتے تو وہ پھر بھی انہیں پہچان لیتا۔“ میں نے کہا۔ ”تو کوشش کیوں نہیں کرتا؟ تیرے باپ نے اچھا خاصا تجھے دکان پر لگایا تھا۔“

”صرف کپڑے استری کرنے اور گاہکوں تک پہنچانے کے لیے، معاوضہ وہ خود وصول کرتا ہے۔“

”تب صبر کر اور حالات بہتر ہونے کا انتظار کر۔“

راجا نے مناسب سمجھا کہ فتو کی طرف سے تقاضائے بل آنے سے پہلے وہاں سے کھسک لیا جائے۔ اس کے جانے کے بعد میں حالات پر غور کر رہا تھا جو افغانستان کے حالات سے بھی زیادہ خراب نظر آرہے تھے۔ اچانک مجھے کیفے ڈی پھونس کے باہر جمی نظر آیا اور میری چھٹی حس نے ارشاد فرمایا۔

”بھاگ بچہ اس سے پہلے کہ پکڑا جائے۔“

لیکن بدقسمتی سے جتنی دیر میں، میں اس ارشاد پر عمل کرتا، کمینے فتو نے نہایت سرعت سے جمی کو اشارہ کیا کہ جلیل کہاں پایا جاتا ہے، اس نے صرف اشارہ نہیں کیا تھا بلکہ مجسم قطب نما بن گیا تھا۔ اس لیے جمی سیدھا میری طرف آیا اور میں نے فوراً دفاعی پوزیشن لی۔ اگر جمی حملہ کرتا تو میں غوطہ مار کر میز کے نیچے گھس جاتا اور جمی کے وزن سے میز کے ساتھ کرسی کا بھی ملبا ہو جاتا۔ فتو کو اپنے کمینے پن کی قرار واقعی سزا مل جاتی۔ مگر جمی نے فوری حملے سے گریز کیا تو مجھے موقع ملا۔

”دیکھ جمی، تُو جانتا ہے، اس میں میرا قصور نہیں تھا، جب تجھے ہی نہیں معلوم تھا کہ وہ چاکلیٹی حسینہ کون ہے تو مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔“

”جلیل! چھوڑ اسے۔“ جمی نے خلافِ توقع بیٹھے لہجے میں کہا تو میں بھونچکا رہ گیا۔

”چھوڑ دوں... میں نے اسے کب پکڑا ہے اور اتنی جرأت کہاں ہے مجھ میں کہ جانی چریا کی محبوبہ پر ہاتھ ڈالوں۔“

”میرا مطلب ہے اس چکر کو بھول جا۔“ جمی نے کھڑے کھڑے کہا کیونکہ یہاں کوئی بھی کرسی جمی کا وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ”میرے ساتھ چل۔“

ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ جمی کہیں اور لے جا کر میری گوشمالی کرنا چاہتا ہے لیکن مجھے یاد آیا کہ گینڈے کی جسامت والے جمی کے ڈرم جیسے سینے میں مرغی جتنا دل ہے۔ وہ صرف

ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر کسی کی گوشمالی کر سکتا ہے، بقائمی ہوش وحواس اس کے لیے یہ کام بہت مشکل تھا۔ پھر ایک شبہ یہ بھی ہوا کہ جمی کے توسط سے جانی چڑیا مجھے کہیں بلا رہا ہے لیکن یہ خیال بھی جھٹک دیا۔ جانی چڑیا کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ بقلم خود آکر مجھے کشاں کشاں ساتھ لے جا سکتا تھا اور میرا دل پسند حشر کر سکتا تھا۔

''جمی! کیا بات ہے یہیں کر لے۔''

جمی نے آس پاس دیکھا۔ ''یہاں نہیں کر سکتا۔ رازداری کی بات ہے۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ''جمی! صاف صاف بات کر، نوٹوں کا معاملہ ہے؟''

جمی دکھی نظر آنے لگا اور اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ''ہاں۔'' اس کی یہ ہاں قصائی کی چھری دیکھ کر نکلنے والی بکرے کی ''باں'' سے ملتی جلتی تھی۔

''مجھے کیا ملے گا؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''پہلے بات تو سن لے۔'' جمی نے بھنا کر کہا۔

مجبوراً میں جمی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں جمی نے نہایت خوشگوار موڈ میں بتایا کہ مس حسینہ گزشتہ دن آئی تھی اور تلافی کے طور پر اسے ڈانس دکھا کر گئی تھی۔ مس حسینہ کرایہ بھی اسی طرح ادا کرتی تھی۔ جب جمی کرایہ لینے جاتا تو وہ کسی گانے پر اپنا وضع کردہ سنسنی خیز ڈانس کر کے دکھاتی اور جمی کرایہ لیے بغیر آہیں بھرتا ہوا لوٹ آتا مگر جلد جمی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شاید جمی ڈانس سے زیادہ کچھ چاہتا تھا اور مس حسینہ اس کے موٹاپے سے ڈرتی تھی۔ اس لیے جمی نے میری خدمات حاصل کیں کہ کسی طرح مس حسینہ سے فلیٹ خالی کرایا جائے۔ میں نے خالی کرا دیا لیکن عین موقع پر پتا چلا کہ مس حسینہ جانی چڑیا کی بیوہ... میرا مطلب ہے محبوبہ ہے۔ اس لیے مجھے عجلت میں اپنا معاوضہ بھی چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ کچھ دنوں تک تو میں گھر سے نکلا نہیں اور ہر روز اخبار میں جمی کے متوقع مرڈر کی خبر تلاش کرتا رہا۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ اب جمی بتا رہا تھا کہ معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہو گیا ہے اور اس میں بنیادی کردار مس حسینہ کا تھا جس نے جمی کی حرکت معاف کر دی تھی اور مزید تسلی کے لیے اسے فری میں ڈانس بھی دکھا گئی تھی۔

''جمی! لگتا ہے وہ تجھے پسند کرنے لگی ہے ورنہ اس طرح کیوں آتی؟''

جمی نے ایک سرد آہ کے ساتھ حقیقت بیانی سے کام لیا۔ ''نہیں یار، بات یہ ہے کہ میں واحد مرد ہوں جو اس حال میں دیکھ کر بھی اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

میں چشم تصور سے مس حسینہ کا سنسنی خیز رقص دیکھ سکتا تھا۔ قدرت نے اسے قیامت خیز سراپا اور اس بھی زیادہ قیامت خیز ادائیں دے رکھی تھیں۔ اگر اس کا رنگ چاکلیٹی نہ ہوتا تو وہ شاید شوبزنس میں ہوتی۔ ہماری ٹاپ ماڈلز اس کا پاسنگ بھی نہ ہوتیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ جمی کا مسئلہ حل ہو گیا تھا اور وہ مقتول وغیرہ ہونے سے بھی بچ گیا تھا، میں نے اس سے اپنے معاوضے کا مطالبہ کر دیا جو ایک کرائے کے مساوی تھا۔ جمی کے حیل وحجت کے جواب میں میں نے راستے سے یوٹرن لینے کی دھمکی دی۔ اس پر بادل ناخواستہ جمی نے بٹوے سے دو ہزار برآمد کر کے مجھے پکڑائے۔ میں نے اعتراض کیا۔

''دو ہزار کیوں جبکہ تو اس فلیٹ کا کرایہ چار ہزار وصول کر رہا ہے؟''

''دو ہزار فلیٹ کی مرمت کرانے پر خرچ ہوئے ہیں۔'' جمی نے جواب دیا۔ مجبوراً میں نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی جان کر یہ دو ہزار جیب میں رکھے اور باقی کا معاملہ آنے والے کیس پر چھوڑ دیا۔ جمی کو یقیناً کوئی ایسا مسئلہ لاحق ہوا تھا جس کا حل اس کے پاس نہیں تھا اور وہ اسی لیے میرے پاس آیا تھا۔ جمی مجھے لیے چلا جا رہا تھا اور اب تک منزل نہیں آئی تھی۔ جمن خانے کا قصد نہیں تھا کیونکہ یہ راستہ اس طرف نہیں جاتا تھا۔

اچھا خاصا چلنے کے بعد جمی ایک ایسی گلی میں آیا جہاں صرف رہائشی مکانات تھے۔ یہ گوداموں کے پیچھے واقع تھی۔ چوڑی سڑک اور دونوں طرف سے آمدورفت ممکن تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ گلی اب تک کمرشل کیوں نہیں بنی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہاں کے رہائشی ہو سکتے تھے۔ گلی میں تقریباً تمام بڑے اور اچھے گھر بنے تھے۔ پھر شاید اس لیے کہ یہاں سے شہر کے تجارتی علاقے کی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ گوداموں کے لیے گاڑیوں کو خاصا گھوم کر جانا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے اس گلی میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

''جمی! مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ چل چل کر میرا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جمی مجھے یہاں لا رہا ہے تو میں بس میں بیٹھ جاتا اور دس منٹ میں آرام سے یہاں پہنچ جاتا۔

''جلیل! وہ مکان دیکھ رہا ہے؟'' جمی نے گلی کے وسط میں گوداموں کی طرف واقع ایک چھوٹے سے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا تو میری نظر چیک کرنے کے لیے اتنا چلا کر لایا ہے؟'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''مکان چھوٹا ہے لیکن اندھے کو بھی نظر آ جائے گا۔''

''تبھی تجھے دکھا رہا ہوں۔'' جمی نے سادگی سے کہا۔ ''جلیل! مجھے یہ مکان چاہیے۔''

میں نے چونک کر جمی اور پھر مکان کی طرف دیکھا۔ یہ مشکل سے پندرہ بائی ساٹھ یا ستر فٹ کا مکان تھا، رقبہ سو گز سے ذرا اوپر ہو گا۔ اس گلی میں یہ سب سے چھوٹا اور خستہ حال مکان تھا ورنہ باقی سارے مکان بہت اچھے اور جدید انداز کے بنے ہوئے تھے۔ اکثر گھروں کے آگے کیاریاں تھیں اور گلی میں سڑک بھی پکی تھی۔ میں نے جمی کی طرف دیکھا۔

''اس مکان میں کیا خاص بات ہے؟ اگر لینا ہے تو اس میں سے کوئی اچھا مکان لے۔''

''مجھے یہی چاہیے۔'' جمی بولا۔ ''میں بڑھیا کو تین لاکھ کی پیش کش کر چکا ہوں لیکن وہ مانتی نہیں ہے۔''

میں حیران رہ گیا، آج سے کوئی دس سال پہلے تین لاکھ خاصی اچھی قیمت تھی۔ اس وقت قیمتیں بڑھنے کا رجحان شروع ہو چکا تھا لیکن یہ اتنی اوپر جائیں گی، اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ پھر یہ مکان جس علاقے میں تھا، اس لحاظ سے اچھی قیمت تھی۔ ''پھر کیوں نہیں مان رہی؟''

''بس ضد کر رہی ہے۔'' جمی نے کہا۔

''اگر وہ بیچنا ہی نہیں چاہتی ہے تو تو کیسے خرید سکتا ہے؟''

''اگر بیچے گی نہیں تو جلد مکان سے ہاتھ دھو لے گی کیونکہ چھوٹا بھائی بڑا بھی یہ مکان لینا چاہتا ہے اور تو جانتا ہے اس کے پاس دولت کی طاقت ہے، وہ کوئی چکر چلا کر بڑھیا کے مکان پر قبضہ کر لے گا۔''

میں ایک بار پھر حیران ہوا کہ اس مکان میں ایسی کیا خاص بات ہے جو جمی اور چھوٹا بھائی بڑا دونوں اسے خریدنا چاہ رہے ہیں اور کم سے کم جمی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بے تاب بھی ہے۔ ورنہ جمی دس روپے کی چیز پانچ روپے میں لینے کا عادی تھا، اس چیز کے پندرہ روپے وہ صرف اسی صورت میں دے سکتا تھا جب اس چیز کی مالیت اصل میں بیس ہو۔ اب سوال یہ تھا کہ اس مکان کی اتنی مالیت کیسے بن رہی تھی جبکہ بہ ظاہر یہ تین کا کیا، دو لاکھ کا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ یہ سوال میں نے جمی سے کیا تو اس نے جواب گول کر دیا اور بولا۔ ''جلیل! یہ کام تجھے کرنا ہے اپنے دوست کی خاطر...''

''دوست!'' میں نے طنز کیا۔ ''جس سے کام لے کر تو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا ہے اگر تو چاہتا ہے کہ میں یہ کام کروں تو مجھے درست بات بتا؟''

''بتا تو دی ہے، میں یہ مکان خریدنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اور میں تجھ سے مفت میں تو کام نہیں لے رہا ہوں، پورا معاوضہ دوں گا۔''

''کیا دے گا؟''

''اگر تو نے سودا کرا دیا تو تجھے ایک فیصد کمیشن دوں گا۔''

''ایک فیصد۔'' میں اچھل پڑا۔ ''جمی! تیرا دماغ درست ہے، تو مجھے صرف تین ہزار دے گا جبکہ اسٹیٹ ایجنسی والے بھی دو فیصد لیتے ہیں۔''

''اچھا۔'' جمی نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''چل میں تجھے دو فیصد دوں گا۔''

''پہلے تو میرے باقی دو ہزار دے، اس کے بعد ہی بات آگے چلے گی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو جمی نے نہایت دکھی دل کے ساتھ مجھے دو ہزار دیے اور بہ زبانِ دیگر واضح کیا کہ میں جو کر رہا ہوں وہ ذرا دوسری قسم کی یاری میں کیا جاتا ہے۔ میں نوٹ وصول کرتے ہوئے مسکراتا رہا۔ انہیں جیب میں رکھنے کے بعد میں نے جمی سے کہا۔ ''جمی! تیری خاطر میں اس کام کا معاوضہ دس ہزار لے لوں گا، اگر دل مانے تو آ جانا گھر یا کیفے ڈی پھونس۔''

جمی اشتعال میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ''جلیل! تو ٹھیک نہیں کر رہا ہے۔''

''بے شک میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''لیکن تو ہے اسی قابل۔''

میں جمی کو وہیں چھوڑ کر واپس روانہ ہو گیا۔ میرا کام ہو گیا تھا اور اب میں اس قابل تھا کہ کم سے کم ایک مہینے کیفے ڈی پھونس کی جوشاندہ نما چائے سے محفوظ رہ سکوں۔ فتو کا ادھار اتارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ گلی سے نکلتے ہی میں نے تیزی سے اس کے مخالف سمت میں دوسرے داخلی راستے کا رخ کیا۔ جمی بھی اسی طرف سے آتا اس لیے جب تک میں گھوم کر دوسری طرف پہنچتا تو جمی جا چکا ہوتا۔ گلی خاصی لمبی تھی اور مجھے آنے میں دس منٹ سے زیادہ وقت لگا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا، وہ گلی میں نہیں تھا۔ اس کے سامنے میں قریب سے اس مکان کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ جب میں گلی میں داخل ہوا تو وہاں اس مکان کے پاس ایک آدمی موجود تھا اور میں اسے دیکھ کر تیزی سے واپس دیوار کی آڑ میں ہو گیا کیونکہ وہ مرزا بد بخت تھا۔ نام تو اس کا مرزا بخت رکھا گیا

تھا لیکن اپنے اعمال کے سبب مرزا بد بخت کہلاتا تھا۔ میں مزید حیران ہوا کہ اس مکان میں ایسی کیا خاص بات تھی جو جمی اور چھوٹا بھائی بڑا کے بعد اب یہ مرزا بد بخت بھی یہاں موجود تھا اور صورت سے خطرناک نظر آنے والی بڑی بی سے جھاڑ کھا رہا تھا۔

"منحوس صورت... کلموئے... دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ جھاڑو سے..." آگے کی دھمکی ناقابل بیان تھی بس یوں سمجھ لیں کہ بڑی بی نے مرزا کو اشرف المخلوق کے درجے سے گرا کر طائر بنانے کی دھمکی دی تھی۔ جھاڑو اس کے ہاتھ میں تھی اور غالباً وہ صفائی کرتے ہوئے آئی تھی اس لیے اب مرزا کی طبیعت صاف کر رہی تھی۔ وہ گھگیا رہا تھا۔

"اماں، میری بات تو سنو..."

"اماں ہو گی تیری کوئی ہوتی سوتی..." بڑی بی نے جھاڑو سے وار کیا۔

"اتنی اچھی قیمت کوئی نہیں دے گا، ہائے۔" مرزا نے جھاڑو کھا کر فریاد کی۔

"مجھے اپنا مکان نہیں بیچنا ہے۔" وہ غرا کر بولی اور واپس اندر چلی گئی۔ مرزا اپنی پشت سہلا رہا تھا اور شاید دل ہی دل میں بڑی بی کو سنا رہا تھا۔ میں مرزا کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا۔

"جلیل! تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے معصومیت سے نمک پاشی کی۔ "مغل بچے اب تلوار کے بجائے جھاڑو کے زخم سہنے پر مجبور ہیں۔"

مرزا کھسیا گیا۔ "تُو نے دیکھ لیا، بڑھیا پاگل ہے۔"

"دیکھ بے مرزا! مجھے بے وقوف مت بنا، بڑھیا پاگل نہیں ہے۔"

"پاگل تو ہے، میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ تمہارا مکان بکوا دیتا ہوں، اچھے دام ملیں گے مگر وہ تو جھاڑو بکف چڑھ دوڑی۔"

"تو اس کا مکان بکوانے پر کیوں کمر بستہ ہے؟"

"یار ایک پارٹی ہے، وہ اس مکان کو خریدنا چاہتی ہے۔"

میرے پہلے سے کھڑے کان مزید کھڑے ہو گئے۔ یعنی جمی اور چھوٹا بھائی بڑا کے علاوہ بھی کوئی پارٹی تھی۔ معاملہ اب پُراسرار ہو گیا تھا اور میرے ذہن میں پرانے مکانوں سے وابستہ وہ تمام کہانیاں گردش کرنے لگیں جن میں مدفن خزانوں کا ذکر تھا۔ کیا اس خستہ حال مکان میں کسی خزانے کی موجودگی ممکن تھی۔ بہ ظاہر تو ایسا نہیں لگتا تھا۔ اس گھر میں چند روپے نکل آنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ ممکن ہے یہ مکان کبھی کسی بڑے مکان کا حصہ رہا ہو اور مدفن خزانہ اس حصے میں موجود ہو جو اب بڑی بی کی ملکیت تھا۔ جمی، چھوٹا بھائی بڑا اور اس تیسری پارٹی کو کسی طرح اس خزانے کا علم ہو گیا ہو اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑھیا سے مکان خریدنا چاہ رہے ہوں۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"یہی کہ میں بھی اسٹیٹ ایجنٹ بن جاؤں۔"

مرزا چونکا اور مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تُو کیوں اسٹیٹ ایجنٹ بننا چاہتا ہے؟"

"جھاڑو کھانے کے لیے نہیں بننا چاہتا۔" میں نے کہا اور مرزا کا ہاتھ پکڑا۔ "چھوڑ ان باتوں کو، کہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔"

مرزا فوراً چل پڑا۔ وہ مفت میں ملنے والا زہر بھی پینے کو تیار ہو جاتا۔ "لگتا ہے تیرے پاس مال آیا ہے؟"

"مال تو نہیں ہے پر شاید آ جائے۔"

ایک نزدیکی ہوٹل میں دو عدد دودھ پتی حلق سے اتارنے کے بعد مرزا کچھ کھلا۔ اس نے انکشاف کیا کہ یہ مکان جانی چریا خریدنا چاہ رہا ہے۔ میں دم بہ خود رہ گیا، اس لیے نہیں کہ جانی چریا یہی مکان خریدنا چاہ رہا تھا بلکہ اس لیے کہ استاد ڈی ٹی کا دستِ ناراست جانی چریا چیز خریدنے کا قائل نہیں تھا۔ زن، زر اور زمین میں سے اسے جو چیز پسند آ جاتی، وہ حاصل کر لیتا تھا بالکل مفت، بغیر کوئی قیمت دیے۔ اس لیے اگر جانی چریا بھی یہ مکان خریدنا چاہ رہا تھا تو نہایت حیرت کی بات تھی۔ "اسے اس مکان کا کیا کرنا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن وہ لینا چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" مرزا نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو کمیشن سے مطلب ہے۔"

"اس نے تیرے ذمے یہ کام لگایا ہے؟"

"ہاں۔" مرزا محتاط ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ میں اگلا سوال معاوضے کے بارے میں کروں گا اس لیے میں نے سوال کرنے سے گریز کیا۔ مجھے اس سے سروکار بھی نہیں تھا کہ اسے کتنا معاوضہ مل رہا ہے۔ مجھے اب پوری طرح تجسس لاحق ہو چکا تھا کہ اس مکان میں ایسی کیا خاص بات تھی۔ یہ جاننے کے لیے مکان کی مالکن بڑھیا سے ملنا ضروری تھا لیکن شام ہو چکی تھی اور اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مجھے شنو سے چھت کے پوائنٹ پر ملاقات کرنی تھی۔ اس لیے جاسوسی کا

کام صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سامنے والا چاند میاں اپنی چاند سے بیوی چاند بانو کو لے کر کہیں گھومنے جا رہا تھا۔ اس کی چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی چندیا پر پسینا آ گیا تھا کیونکہ ناہنجار موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں ایک بار پہلے بھی بلا معاوضہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے دے چکا تھا اور اس کا چاند میاں نے بُرا منایا تھا اس لیے آج میں اسے اور چاند بانو کی التجا کرتی مسکراہٹ نظر انداز کر کے گھر میں گھس گیا۔ شنو بہت دیر سے یعنی پورے پانچ منٹ اور اڑتالیس سیکنڈ سے میرا انتظار کر رہی تھی اس لیے چراغ پا تھی۔

"جلیل! کہاں مر گیا تھا؟ ٹہل ٹہل کے میرے پاؤں جواب دے گئے۔"

ان دنوں شنو کا وزن کسی قدر بڑھنا شروع ہوا تھا اور کسی قدر مبالغے کے ساتھ اسے چھریرا قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس نے گرمی کی مناسبت سے لان کا گلابی سوٹ پہن رکھا تھا جو بالشت بھر کے دوپٹے کے ساتھ اس کے گلاب وجود پر اچھا لگ رہا تھا اس لیے میں نے اس کی زبان کے کانٹوں کو نظر انداز کر دیا۔ "ٹہلنے سے تمہارا وزن کم ہو گا۔"

ذرا دیر میں شنو کا مزاجی درجۂ حرارت جون کی گرمی کی دوپہر سے کم ہو کر اکتوبر کی سرمئی شام جیسا ہو گیا یعنی خوشگوار ہو گیا اور اس نے شرمانے کے انداز میں دوپٹا کسی پٹی کی طرح اپنی انگلی پر لپیٹنا شروع کیا اور ساتھ ہی معصومیت کے اظہار کے لیے پلکیں بار بار جھپکانا شروع کیں تو میں سمجھ گیا کہ ابھی فرمائشی پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ آپ نے گھوڑے کو دوائی پلانے والا قصہ سنا ہو گا جس میں گھوڑے نے پہلے پھونک مار دی تھی۔ اس سے پہلے کہ شنو بات کرتی، میں نے کہا۔ "شنو! تیرے پاس سو روپے ہوں گے، سخت ضرورت پڑ گئی ہے۔"

شنو کا موڈ آف ہو گیا، اس نے جھنجلا کر کہا۔ "نہیں ہیں۔"

"میرے پاس بھی نہیں ہیں۔" میں نے دانت نکالے۔ "چلو مارو گولی، ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

شنو نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ "جلیل! تُو مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے، اتنی شرافت سے کیسے مان گیا۔"

میں نے شنو کو یقین دلایا کہ وہ جو بھی ہے اسے میں نے نہیں بنایا، اسے خدا نے بنایا ہے اور کیا خوب بنایا ہے۔ شنو شرمائی۔ "جلیل! بے ہودہ کہیں کے..."

"کہیں کا نہیں یہیں کا ہوں۔" میں نے بے خیالی میں کہا اور پھر غلطی سے پوچھ لیا کہ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ شنو شروع ہو گئی۔

"جلیل! آج میں اماں کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی، وہاں اتنے پیارے کپڑے آئے ہوئے ہیں۔ ایک سوٹ تو بس میرے دل میں اتر گیا۔"

"دل میں کیسے اتر گیا؟" میں نے اعتراض کیا۔ "وہاں تو غالباً میں رہتا ہوں۔"

شنو شرما کر ہنسی۔ "تیری بات اور ہے، سوٹ تو آنی جانی چیز ہے۔"

"کاش کہ تم کسی ایک سوٹ کو دل میں بسا لو، ساری عمر اسی کے ساتھ رہو۔"

"جلیل پلیز۔" وہ التجا پر اتر آئی۔ "مجھے بہت اچھا لگا تھا، پلیز... مجھے چاہیے۔"

کیا زمانہ تھا شنو سچ مچ اتنی معصوم تھی کہ چند سو کے ایک سوٹ کی خاطر یوں التجا کرتی تھی... بعد میں وہ میری حق حرام و حلال کی کمائی میں سے دھڑلے سے ہزاروں کی شاپنگ کر کے آ جاتی اور مجھے کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ میں کس دل سے انکار کرتا، بادل ناخواستہ میں نے کہا۔ "اچھا کتنے کا ہے؟"

شنو خوشی سے اچھل پڑی۔ قیمت معلوم کرنے کا مطلب تھا کہ میں مان گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "صرف سات سو روپے کا سوٹ ہے جلیل! جب پہن کر تجھے دکھاؤں گی تو تو دیکھتا رہ جائے گا مجھے۔"

"وہ تو میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں، اس کے لیے سات سو روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔

"نہیں نا، اس میں اور اچھی لگوں گی۔" وہ مچل کر بولی۔

مجبوراً مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میں اسے جلد سات سو روپے دے دوں گا۔ اس کے لیے یہ اقرار کافی تھا، اب مجھ سے رقم نکلوانا اس کا کام تھا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رقم کس طرح نکلوائی جاتی ہے۔ اس نے اپنی بات منوا لی تھی اور اب میری باری تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا کرتا، نیچے سے خالہ لاؤڈ اسپیکر نے شنو کو پکارا۔ "اری کہاں مر گئی ہے ہانڈی چڑھا کر... تیرے باوا کی لاش بو دے رہی ہے۔"

"اماں بلا رہی ہے۔" شنو نے گھبرا کر کہا۔

''جا کر اپنے باوا کو دیکھو۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''مستقبل میں میری لاش بھی اسی طرح ہانڈی میں بو دے گی۔''

شنو پوری بات سنے بغیر روانہ ہو گئی۔ سامنے والے جاسوس بڑے میاں نے اشارے سے چڑیا اڑائی اور ایک عدد استہزائیہ قہقہہ بھی لگایا۔ میں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے روانہ ہو گیا۔ چاند میاں بدستور موٹر سائیکل کے ساتھ مصروف تھے۔

☆☆☆

دل کڑا کر کے میں نے بڑی بی کے مکان کا دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد اس نے اندر سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں ایک ویلفیئر ٹرسٹ کی طرف سے آیا ہوں آپ کی مدد کرنے۔''

آخری جملے نے جادوئی کام کیا اور بڑی بی نے دروازہ کھول دیا۔ اگرچہ اس کے تاثرات اب بھی خوفناک تھے لیکن اس نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ ''بیٹا! تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''باجی۔'' میں نے مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میں اس وقت بتا سکتا ہوں جب مجھے معلوم ہو کہ آپ کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔''

میرا حلیہ میرے کردار سے مطابقت رکھتا تھا، میں نے پینٹ اور شرٹ کے ساتھ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کور والی فائل اور شانے پر ایک ایسا بیگ لٹکا ہوا تھا جیسے اس میں مزید فائلیں ہوں۔ میں نے اپنا حلیہ بھی کسی قدر بدل رکھا تھا۔ شرافت اور نفاست سے بال کٹوائے تھے اور آنکھوں پر گول فریم کی زیرو نمبر کی عینک تھی۔ صبح سویرے گرمی میں آدھا گھنٹا چلنے سے حلیہ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی بڑی بی شروع ہو گئیں اور اپنی خستہ حالی کی داستان سنانے لگیں۔

''بیٹا! کیا بتاؤں... میاں خود تو مر گئے، مجھے چھوڑ گئے اس غربت اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے... دو سلیں دھری ہوئی ہیں سینے پر... ان کو کھلاؤں یا ان کی شادی کروں...''

میں بہ ظاہر غور سے سن رہا تھا اور ضروری ''نوٹ'' فائل پر اتارتا جا رہا تھا لیکن درحقیقت میں سوچ رہا تھا کہ کس بہانے سے مکان کو اندر سے دیکھوں۔ بڑی بی مسلسل بول رہی تھیں اور جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے رکیں، میں نے جلدی سے کہا۔ ''باجی، آپ کا مکان دیکھنا بھی ضروری ہے۔ تصویریں بھی لینا ہوں گی۔''

بڑی بی بدک گئیں۔ ''تصویریں کیوں؟''

''باجی! اوپر جو بیٹھے ہیں وہ صرف زبانی سن کر تو مدد منظور نہیں کریں گے، اس کے لیے تصویریں بھی چاہیے ہوں گی اور آپ کے دو پڑوسیوں کی گواہی درکار ہوگی۔''

بادل ناخواستہ بڑی بی مجھے اندر لے جانے پر آمادہ ہوئیں۔ پہلے انہوں نے اندر جا کر اپنی بیٹیوں کو ڈھکنے اور چھپنے کا حکم دیا۔ ان کی پاٹ دار آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی، ایک لڑکی نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اماں! اندر مت بلاؤ، نہ جانے کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟''

''چپ کر مجھ سے زیادہ دنیا نہیں دیکھی ہے۔'' بڑی بی نے اسے گھر کا۔ ''شریف بچہ ہے کوئی فراڈیا نہیں ہے۔''

میں نے بڑی بی کے حسنِ ظن پر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ وہ مجھے اندر کہاں گھسنے دیتیں۔ چند منٹ بعد وہ نمودار ہوئیں۔

''آؤ بیٹا دیکھ لو غریب کی کٹیا۔''

اندر سے گھر واقعی ایسا ہی تھا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ ٹوٹا پھوٹا خستہ حال، نہ ہونے کے برابر سامان اور وہ بھی نہایت پرانا۔ صحن میں پانی کی ایک ٹنکی رکھی تھی جس پر کائی جم رہی تھی۔ میں خلیل کا کیمرا لایا تھا اور صرف فلیش چلانے لگا کیونکہ اس میں ریل تو تھی ہی نہیں۔ کمروں میں بھی فرنیچر نہیں تھا اور کچن کی حالت سب سے زیادہ عبرت ناک تھی۔ جہاں چند برتن رل رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ یہاں سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ غربت کیا ہوتی ہے، میں خود غریب گھرانے سے ہوں لیکن غربت کا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اگر مجھے تجسس نہیں ہوتا تو میں لازمی بھاگ جاتا لیکن دل پر جبر کر کے وہاں رکا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان ڈری سہمی لڑکیاں موجود تھیں انہوں نے میلے دوپٹوں سے چہرے چھپا رکھے تھے لیکن بڑی بڑی آنکھیں اور صاف رنگت بتا رہی تھی کہ وہ قبول صورت ضرور ہیں، اگر کسی اچھے گھر میں ہوتیں تو خوب صورت بھی کہلا سکتی تھیں۔ گھر دیکھ کر میں صحن میں جھلنگا چارپائی پر آ بیٹھا۔ بڑی بی مطمئن تھیں، میں نے گھر دیکھ لیا تھا اور اب انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک فارم نکال کر فل کرنے لگا۔ بڑی بی اور ان کی بیٹیوں کے نام پوچھے۔ شناختی کارڈ نمبر پوچھا۔ پھر میں نے اصل سوال کیا۔

''باجی! یہ گھر آپ کا ہے؟''

''ہاں بیٹا! مرحوم یہی ایک اچھا کام کر گئے تھے کہ سر چھپانے کا ٹھکانا کر دیا تھا۔''

''یعنی مکان آپ کا اپنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی مالیت کا کچھ اندازہ ہے آپ کو؟''

بڑی بی بدک گئیں۔ ''لو غریب کی کٹیا ہے، اس کی کیا مالیت ہوگی؟''

''باجی! کچھ نہ کچھ مالیت تو ہوگی۔ پکّی جگہ ہے اور آبادی کے درمیان ہے۔ یہاں تو خالی پلاٹ بھی لاکھوں کا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے ڈرایا۔ ''غلط بیانی کرو گی تو مدد نہیں ملے گی۔''

بڑی بی ہچکچائیں۔ ''کچھ دن سے لوگ خریدنے کی بات کر رہے ہیں، ایک موٹا سا آدمی تو تین لاکھ روپے بھی دے رہا تھا۔''

''ایک سے زیادہ پارٹیاں خریدنا چاہتی ہیں اس مکان کو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس میں ایسی کیا بات ہے کہ کوئی اس کے تین لاکھ روپے دے؟''

''حیرت تو مجھے بھی ہے پر دھوکے باز لگتے ہیں۔ میں نے بھگا دیا، میرا اور میری بچیوں کا یہی تو ایک ٹھکانا ہے۔ اسے بیچ دیا تو ان بچیوں کو لے کر کہاں رلتی پھروں گی؟''

''اگر کوئی اس کے تین لاکھ دے رہا ہے اور فراڈ نہیں کر رہا تو باجی بیچ دو۔ ڈیڑھ لاکھ میں اچھا بھلا فلیٹ مل جائے گا۔''

''ارے واہ! کیوں بیچ دوں؟ میں نہیں دوں گی۔''

''یہ تو مسئلہ ہو جائے گا باجی۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔ ''اگر ویلفیئر والوں کو پتا چل جائے کہ تم تین لاکھ کے مکان میں رہ رہی ہو تو مدد نہیں ملے گی۔''

''انہیں کیسے پتا چلے گا بیٹا! تم بتانا ہی مت۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بعد میں چیکنگ کرنے والے آئیں گے اور حقیقت پتا چلے گی تو میری نوکری چلی جائے گی۔''

بڑی بی مایوس ہو گئیں۔ ''تو مدد نہیں ملے گی؟''

''اس صورت میں تو مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے آپ نے خریدنے والوں سے پوچھا نہیں، وہ مکان کی اتنی قیمت کیوں لگا رہے ہیں؟''

مگر بڑی بی نے جمی، مرزا اور چھوٹا بھائی بڑا سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ان کو یہ فکر تھی کہ اگر مکان تین لاکھ کا ہے تو وہ ویلفیئر سے مدد کیسے حاصل کریں گی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیٹا! یہ ویلفیئر والے کتنی مدد دیں گے؟''

''ماہانہ پانچ ہزار تک دے سکتے ہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگتے ہوئے جھوٹ بولا۔

''میں یہ مکان بیچ دوں اور کوئی چھوٹا مکان لے لوں تب تو مجھے مدد مل سکتی ہے نا؟''

بڑی بی کی بات سے مجھے ایک خیال آیا اور میں اس پر غور کرنے لگا، جیسے جیسے بحیرۂ غور میں غوطہ کھاتا گیا، خیال کے نایاب و نادر ہونے کا یقین ہوتا گیا۔ بڑی بی بڑی امیدوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ''ارے بیٹا! کیا سوچ رہے ہو؟''

میں ہچکچایا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے باجی... لیکن مکان بیچنے کا فیصلہ عجلت میں مت کرنا۔ اگر یہ اپنے منہ سے تین لاکھ تک دے رہے ہیں تو اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ میں کوئی اور گاہک بھی دیکھتا ہوں۔''

بڑی بی خوش ہو کر مجھے دعائیں دینے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گی، چاہے کوئی کچھ بھی کہے۔ میں نے اپنا نام شریف الدین بتایا تھا اور میرا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا اس لیے اگر بڑی بی نے کسی کو میرے بارے میں بتایا بھی تو وہ مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اپنے پتّے ٹھیک طرح سے کھیلے تو بڑی بی کا کام ہو جائے گا اور کم سے کم دس پندرہ ہزار میری جیب میں آئیں گے لیکن جب میں بڑی بی کے خستہ حال گھر سے نکلا تو میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

خوش قسمتی سے اس شام فتو کیفے میں نہیں تھا۔ اس کے سالوں نے کوئی نیا داؤ آزمایا تھا جس کی وجہ سے وہ بیڈ ریسٹ پر تھا اور کیفے ڈی پھونس چھوٹا سنبھال رہا تھا جسے یہ علم نہیں تھا کہ ہم پر کتنا حساب چڑھ گیا ہے۔ البتہ اس نے ادھار دینے سے انکار کر دیا اور محاورے کا بیڑا غرق کرتے ہوئے بولا۔ ''استاد بولا ہے نو ادھار تیرہ نقد۔''

''چل یار نو ادھار نہ دے، تیرہ نقد ہی لے لے اور دو کڑک لے آ۔''

راجا حیران تھا کہ میں اسے کیفے ڈی پھونس کیوں لے جا رہا ہوں، جب اس نے فتو کو غائب پایا تو سکون کا سانس لیا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تیرے پاس لمبا مال آ گیا ہے اور تُو نے فتو کا ادھار چکا دیا ہے۔''

''بیٹے تو بھول رہا ہے، یہ ادھار ہم دونوں مل کر چکائیں گے۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''فی الحال تو ایک مسئلہ ہے اور تجھے میرے ساتھ مل کر اس کا حل نکالنا ہے۔''

چائے پیتے ہوئے میں نے جمی، چھوٹا بھائی بڑا اور جانی چڑیا کا ذکر کیے بغیر راجا کو بڑی بی کے مکان اور اس کی قیمت کے بارے میں بتایا۔ راجا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ''اگر

بڑی بی کا چھوٹا اور ٹوٹا پھوٹا مکان تین لاکھ میں بک رہا ہے تو تجھے کیا تکلیف ہے؟''

''تکلیف نہیں تجسس ہے بیٹے... آخر اس مکان میں کیا بات ہے جو کئی پارٹیاں اسے لینے کے لیے بے تاب ہیں اور مارکیٹ سے زیادہ قیمت بھی دے رہی ہیں؟''

راجا نے اپنے باپ کے گدھے جیسا منہ بنایا۔ اسے بھی ہڈ حرامی کی عادت تھی۔ ''اگر معلوم ہو گیا تو بھی کیا فائدہ ہو گا؟''

''دیکھ یار! گورے کہتے ہیں کہ علم اور وقت ہی اصل دولت ہیں۔ پہلے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ مکان کے معاملے میں کیا چکر ہے اور پھر موقع آنے پر اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔''

''تو اپنی معلومات میں اضافہ کر۔'' راجا نے حرام خوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چائے کی پیالی خالی کی اور کھڑا ہو گیا۔ ''جب تیرے پاس معلومات آجائیں تو موقع آنے پر مجھے بلا لینا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راجا! جب میں معلومات اپنی محنت سے حاصل کروں گا تو کمانے کے موقع پر تجھے کیوں بلاؤں گا؟''

راجا واپس بیٹھ گیا۔ ''یعنی کمائی کا موقع ہے؟''

''یہ تو بعد میں پتا چلے گا، پہلے یہ بتا تُو میرے ساتھ شامل ہو رہا ہے یا نہیں؟''

راجا نے غور کیا۔ ''اگر میں شامل ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟''

''ایک تہائی تیرا اور دو تہائی میرا۔''

''آدھا آدھا۔''

''اچھا چالیس فیصد تیرا اور ساٹھ فیصد میرا، اب کچھ مت کہنا ورنہ میں اکیلے ہی کام کر لوں گا۔''

''منظور ہے، یہ بتا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟''

''تُو سیٹھ چھوٹا بھائی بڑا کی نگرانی کرے گا کیونکہ اس مکان کا ایک متوقع گاہک وہ بھی ہے، اگر وہ مکان کی مالک بڑی بی سے ملنا چاہے تو تو مجھے خبر کرے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں یہ کام کر لوں گا لیکن تُو کیا کرے گا؟''

''میں مکان کی اہمیت کی وجہ جاننے کی کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہے لیکن پہلے تُو میرے ساتھ چل، ابّا نے دکان شام تک پھر میرے ذمے لگا دی ہے۔''

''مجھے تو معاف رکھ اس خواری سے۔''

لیکن وہ راجا ہی کیا جو اتنی آسانی سے مان جائے۔ وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ دکان پر لے گیا۔ ابھی ہم نے جا کر دکان کھولی تھی کہ راجا نے باہر جھانکا اور عجلت میں استری کرنے والے تختے کے نیچے ہو گیا۔ ''جلیل! یہ جو لڑکا آرہا ہے اسے کسی طرح ٹہلا دے۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے باہر جھانک کر اس لڑکے کو دیکھا جس کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے۔

''تجھے بعد میں بتاؤں گا۔'' راجا سرگوشی میں بولا۔

لڑکا آیا اور غرا کر بولا۔ ''وہ نامعقول کہاں ہے؟''

''میں کسی نامعقول کو نہیں جانتا، تمہارا کوئی بھائی کھو گیا ہے؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

''میں راجا کی بات کر رہا ہوں، ایک ہفتہ ہو گیا پتلون دی تھی اب تک واپس نہیں ملی ہے۔''

''راجا اور اس کا باپ فوتگی میں گئے ہیں۔ ان کے گدھے کا کزن مر گیا ہے۔ مرحوم کی تدفین ہے۔''

''کیا، کون مر گیا ہے؟'' لڑکا سمجھے بغیر نرم پڑ گیا۔

''اسے کہنا میں کل آؤں گا اپنی پتلون لینے۔''

اس کے جانے کے بعد راجا بڑی مشکل سے تختے کے نیچے سے نکلا اور استری سے گرم ہو جانے والی تشریف سہلائی۔ اس دوران میں وہ لڑکے کو گالیاں دیتا رہا جس کی وجہ سے اسے اتنے مشکل پوز میں روپوش ہونا پڑا تھا۔

شام کے قریب راجا کا باپ آنے والا تھا اس لیے میں دکان سے رخصت ہو گیا۔ راجا کی گلوخلاصی کی امید کم تھی اس لیے میں نے خود چھوٹا بھائی بڑا کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو اس کے کئی ایک دھندے تھے لیکن اس کا اصل کاروبار ڈسٹری بیوشن کا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا کے پاس درجنوں کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشن تھی اس کے علاوہ وہ باہر سے بھی سامان منگواتا تھا اور اسے پورے ملک میں بھیجتا تھا۔ لیکن اس کے خستہ حال چھوٹے سے دفتر کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا اتنا بڑا کاروبار ہے۔ اپنی کرسی پر اکڑوں بیٹھے ہوئے وہ معمولی سا کاروباری لگتا تھا۔ ٹیکس چوری اور چور بازاری کا اس جیسا ماہر کوئی نہیں تھا۔ دو نمبر دھندے کرتے کرتے وہ خود بھی دو نمبر ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ دو تین دن اس کی نگرانی کرنے سے اصل بات سامنے آجائے گی کہ چھوٹا بھائی بڑا کیوں اس مکان کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کھیل کا اصل فریق وہی تھا۔

اسی نے اس مکان کی اہمیت تلاش کی ہو گی اور پھر کسی طرح جمی اور جانی چڑیا کو بھی اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے مگر چھوٹا بھائی بڑا کی وجہ سے کھل کر سامنے بھی نہیں آرہے تھے اس لیے جمی نے مجھے آگے کیا اور جانی چڑیا نے مرزا کو پکڑ لیا۔ حسبِ توقع اس روز کچھ نہیں ہوا۔ دوسرا دن بھی ضائع گیا۔ چھوٹا بھائی بڑا اپنے دفتر سے نکلا ہی نہیں تھا۔ راجا ہڈ حرام نہیں آیا تھا اس لیے اس پر لعنت بھیج کر میں خود نگرانی کر رہا تھا۔ تیسرے دن میں شام کو واپس گھر جانے اور اس سارے معاملے پر لعنت بھیجنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ چھوٹا بھائی بڑا اچانک دفتر سے برآمد ہوا۔ کچھ دور اس کا ایک چھوٹا گودام تھا، وہ وہاں تک پیدل گیا۔ گودام میں ایک ٹرک میں کچھ سامان بار کیا جا رہا تھا۔

میں نے چھوٹا بھائی بڑا کو بھی ٹرک میں چڑھتے دیکھا تو عجلت میں آس پاس کوئی سواری تلاش کی۔ ایک رکشا کھڑا تھا اور ایک بڑے میاں مع اپنی بڑی بی کے اس میں سوار ہونے جا رہے تھے کہ میں لپک کر رکشے میں بیٹھ گیا۔ بڑے میاں نے شور مچایا۔ ''اجی ہم نے روکا تھا اسے۔''

''لیکن بیٹھ تو میں گیا ہوں۔'' میں نے کہا اور رکشے والے کو بیس کا ایک نوٹ تھما دیا۔ ''یہ میٹر کے علاوہ ہے۔''

ظاہر ہے اس کے بعد رکشے والے نے بھی بڑے میاں کی چیخ پکار سننے سے گریز کیا اور رکشا اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''اس ٹرک کے پیچھے۔'' میں نے گودام سے نکلنے والے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔

''اگر پشاور جا رہا ہو تو؟'' رکشے والے نے سوال کیا، وہ جھکّی لگ رہا تھا۔

''تم بھی پشاور چلنا۔'' میں نے مذاق میں کہا اور اس سے پہلے کہ وہ بُرا مناتا، میں نے جلدی سے وضاحت کر دی۔ ''یہیں جا رہا ہے۔''

ٹرک گھوم کر سڑک پر آیا اور روانہ ہو گیا۔ رکشا اس کے پیچھے تھا۔ کچھ دیر بعد ٹرک ایک صنعتی علاقے کی طرف مڑ گیا اور وہاں پہنچ کر اس کے نزدیک ہی گوداموں کی طرف گھوم گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ٹرک ایک بڑے سے گودام کے سامنے رکا اور دروازہ کھلنے پر اندر چلا گیا۔ میں نے رکشے والے کو میٹر کے مطابق کرایہ دیا۔ ''اگر رکتے ہو تو واپسی میں بھی اسی طرح کرایہ لے لینا، میٹر سے بیس روپے اوپر۔''

رکشے والا مان گیا۔ میں گودام کی طرف بڑھا۔ باہر کچھ خالی پیٹیاں رکھی تھیں۔ میں نے ایک پیٹی اٹھا کر شانے

پر رکھی اور چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ چارپائی پر چوکیدار موجود تھا لیکن اس نے مجھے بھی ٹرک کے ساتھ آنے والوں میں سمجھا تھا، میں پیٹی اٹھائے آرام سے اندر پہنچ گیا۔ گودام بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ کم سے کم بھی یہ دو ایکڑ پر تھا۔ اس میں بے شمار شیڈز بنے تھے جن میں مختلف سامان تھا۔ تقریباً تمام ہی سامان لکڑی اور پلائی سے بنے بڑے کارٹنوں میں تھا۔ شاید یہ چھوٹا بھائی بڑا کا مین ڈسٹری بیوشن پوائنٹ تھا۔ اس کے دفتر کے پاس والا گودام تو اس کے مقابلے میں دسواں حصہ بھی نہیں تھا۔ میں گھومتا ہوا گودام کے آخری حصے تک چلا آیا۔ یہاں بہت اونچی دیوار تھی جو ظاہر ہے چوروں کو اندر آنے سے روکنے کے لیے تھی، اس پر تین فٹ تک خاردار باڑ بھی لگی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے عقبی طرف سے کسی کے اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں اس دیوار کے ساتھ تھا کہ اچانک میرے کانوں سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ آواز دیوار کے دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ آواز ایک ہی بار آئی تھی اس لیے میں کان لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میں یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ میرے کانوں نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ لیکن جب خاصی دیر تک دوبارہ آواز نہیں آئی تو میں نے پاس میں موجود شیڈ کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی بارہ فٹ اونچا تھا اور اس کی چھت پر چڑھنا نسبتاً آسان تھا۔ ایک سیڑھی کی مدد سے میں نے یہ مرحلہ سر کیا اور پھر دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

جمی، جمن خانے کی چھت پر تھا۔ اگر میں پہلے بھی اسے کئی بار چھت پر نہ دیکھ چکا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ وہ اس تن و توش کے ساتھ چھٹی منزل تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے وزن کے باوجود چھت سلامت رہ سکتی ہے۔ اس نے اپنے پالتو کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ”جلیل... تو کہاں مر گیا تھا؟ میرے کام کا کیا ہوا؟“

”تیرا ہی کام کر رہا تھا۔“ میں نے چارپائی پر بیٹھنے کی کوشش کی اور فرش پر جا گرا اور سر پٹی سے لگا... کیونکہ چارپائی میں صرف فریم تھا۔ میں نے کھسیا کر سر سہلایا اور اس بار احتیاط سے فریم سے ٹک گیا۔ ”جمی، مکان تجھے مل سکتا ہے۔“

وہ خوش ہوگیا۔ ”سچ میں تُو نے بڑھیا کو راضی کر لیا ہے؟“

”ہاں لیکن اب مکان کی قیمت پانچ لاکھ ہوگی۔“

”پانچ لاکھ۔“ جمی کا منہ لٹک گیا پھر اس نے بپھر کر کہا۔ ”میں تین لاکھ سے زیادہ ایک روپیا نہیں دوں گا۔“

”تمہاری مرضی ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”چھوٹا بھائی بڑا اس مکان کے پانچ دینے پر تیار ہے۔“

جمی نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر رو دینے والے انداز میں بولا۔ ”جلیل! میں گدھا ہوں۔“

”اس میں مجھے کبھی شک نہیں رہا۔“

”تجھے اس معاملے میں شامل ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تیرا خیال ہے کہ میں نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر پانچ لاکھ دینے کا خیال ہو تو مجھ سے رابطہ کر لینا کل صبح تک ورنہ چھوٹا بھائی بڑا سودا کر لے گا۔“

”میرا شک درست تھا، تُو اس معاملے میں ملوث ہے۔“ جمی بولا۔ ”جلیل! میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”یاروں کو چھوڑنا ویسے بھی اچھی بات نہیں ہے۔“

جمی کے پاس سے نکل کر میں سیدھا چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر پہنچا۔ اس کا گنا چنا عملہ جا چکا تھا اور وہ اپنے سر میں فٹ کمپیوٹر میں سارے دن کے نفع کا اندازہ کر رہا تھا۔ نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ جس دن اسے نقصان ہو جاتا، وہ یہاں نہیں ہوتا کارڈیو میں پڑا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر چھوٹا بھائی بڑا نے غصے سے کہا۔ ”ایسے کائے کو منہ اٹھائے اندر آتا ہے، مُچھٹا کھا فالتو ٹیم نہیں ہے۔“

لیکن میں مُچھٹا کھانے کے بجائے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ”چھوٹا بھائی! ٹیم تو نکالنا پڑے گا۔ ورنہ ٹیم تیرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”کیا... کیا کہتا ہے؟“

”تمہیں وہ مکان چاہیے؟“

”کک... کون سا مکان۔“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”جو تم اس غریب عورت سے اونے پونے داموں خریدنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”جلیل۔“ چھوٹا بھائی بڑا بلبلا کر بولا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا اور اگر میں کوشش کر رہا ہوں تو تجھے کیا؟“

”مجھے تو کچھ نہیں ہے، پر جانی چڑیا کو اس کی فکر ہے۔“

”جانی چڑیا!“ چھوٹا بھائی کرسی سے اچھل پڑا۔ ”اسے کس نے بتایا؟“

”اب جس نے بھی بتایا ہو۔ وہ ہر قیمت پر یہ مکان لینا چاہتا ہے، بڑھیا کو چھ لاکھ کی آفر کر چکا ہے۔“

چھوٹا بھائی آپے سے باہر ہوگیا۔ ”اس کے باپ کا مکان ہے۔“

”چھوٹا بھائی! مکان تمہارے باپ کا بھی نہیں ہے۔ ابھی بولو سودا میرے ہاتھ میں ہے۔ ورنہ کل تک جانی چڑیا میدان مار جائے گا اور تم اس کا منہ دیکھو گے۔“

”جلیل! یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔“

”چلو میرا ہی سمجھ لو، پر سودے کی بات کرو۔ ورنہ میں جاتا ہوں جانی چڑیا کے پاس۔ پھر تم یہی مکان دس لاکھ کا بھی لو گے۔“

چھوٹا بھائی نے سوچا اور مرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”جلیل! تُو کیا چاہتا ہے؟“

”چھوٹا بھائی! ادھر گارڈن میں تمہارا ایک چھوٹا فلیٹ ہے دو کمروں والا۔ میں چاہتا ہوں تم وہ فلیٹ اس عورت کے نام کر دو اور چار لاکھ کیش دو۔ یہ مکان تم کو مل جائے گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ فلیٹ ڈھائی سے کم کا نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، میں تمہیں اپنی ڈیمانڈ بتا رہا ہوں اور ابھی اپنا کمیشن تو بتایا ہی نہیں ہے۔ چھ لاکھ کا ڈھائی فیصد یعنی پندرہ ہزار روپے میں لوں گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا مزید بلبلایا۔ ”تُو بھی پندرہ ہزار لے گا اس بڑھیا سے بھی کمائے گا؟“

”اگر میں کہوں گا کہ میں اس سے نہیں کما رہا تو تم یقین نہیں کرو گے اس لیے سمجھتے رہو۔ تمہیں پندرہ دینے ہی ہوں گے۔“

چھوٹا بھائی بڑا تیزی سے دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مکان جانی چڑیا کے پاس چلا گیا تو وہ اپنی من مانی قیمت پر دے گا اور چھوٹا بھائی کو یہ قیمت ادا کرنی ہی پڑے گی۔ بادل ناخواستہ وہ راضی ہوا۔ ”ٹھیک ہے جلیل! پر تیرا کمیشن کام کے بعد ہوگا۔“

”نہیں، ہاتھ کے ہاتھ ہوگا ورنہ تم بعد میں اپنے باپ کو نہ پہچانو، مجھے کیسے یاد رکھو گے۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے مجھے گھورا پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، بڑھیا سے بولو کل مجھ سے فلیٹ کے کاغذات، سیل ڈیڈ اور قبضہ لے لے اور کیش میں ایک ہفتے بعد دوں گا۔“

”کیش بھی کل ہی دینا ہوگا چھوٹا بھائی۔ وہ تمہیں مکان کا سیل ڈیڈ دے دے گی اور لیز تم کراتے رہنا۔ جو بھی ہونا ہے کل بارہ بجے سے پہلے ہونا ہے تاکہ اس غریب عورت کو پریشانی نہ ہو۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیا بات ہے جلیل! تجھے اس بڑھیا کا بہت درد اٹھ رہا ہے؟“

”اس لیے کہ میں بھی اس کی طرح غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تم نے کبھی غربت کا بھیانک روپ نہیں دیکھا ہے اس لیے تمہیں پتا بھی نہیں ہے۔ میں کل صبح آؤں گا، کاغذات اور کیش تیار رکھنا، بڑی بی کے گھر چل کر سارا معاملہ ہوگا اور ہاں چار لاکھ کیش نہیں بلکہ ڈرافٹ لانا۔“

میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر سے نکلا تو مطمئن تھا۔ میں نے اس کا گارڈن والا فلیٹ دیکھا تھا۔ یہ پہلی منزل پر تھا اور بڑے کمروں والا فلیٹ تھا۔ عمارت بھی اچھی تھی۔ ان ماں بیٹیوں کو کہیں بہتر ماحول ملتا۔ ساتھ ہی چار لاکھ مل جاتے جسے کسی سرکاری اسکیم میں لگا کر وہ اتنی رقم حاصل کر سکتی تھیں جتنا کہ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ بڑی بی سے میں پہلے ہی بات کر چکا تھا، خاص طور سے انہیں ہدایت کی تھی کہ میرے بارے میں کسی کے سامنے بات نہ کریں ورنہ بات خراب ہو جائے گی اور انہیں مدد نہیں ملے گی۔ انہوں نے قسمیں کھا کر یقین دلایا تھا کہ وہ کسی سے اس بارے میں بات نہیں کریں گی۔ چھوٹا بھائی بڑا صبح سویرے اپنے دفتر میں موجود تھا، اس نے مجھے چار لاکھ کا ڈرافٹ اور فلیٹ کے اصل کاغذات دکھائے۔ چابیاں اور سیل ڈیڈ کے دونوں معاہدے بھی اس نے تیار کرا لیے تھے، بس ان میں بڑی بی کا نام اور شناختی کارڈ نمبر ڈالنا تھا۔ کام پکّا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا نے کہا۔

”جلیل! مجھے آج ہی قبضہ چاہیے اگر جانی چڑیا کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ درمیان میں کود جائے گا۔“

خود مجھے بھی یہی خطرہ تھا کیونکہ میں نے جانی چڑیا کے حوالے سے قطعی جھوٹ کہا تھا۔ مرزا نے بتایا تھا کہ جانی چڑیا صرف دو لاکھ میں یہ مکان لینا چاہ رہا تھا اور اس کا ارادہ بڑی بی کے ساتھ زبردستی معاہدہ کرنے کا تھا۔ وہ بدمعاش تھا، اپنی بات منوا سکتا تھا۔ اس لیے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ معاملہ جلد از جلد حل ہو جائے ورنہ چھوٹا بھائی بڑا کا نقصان ہوتا لیکن اس سے زیادہ بڑی بی اور میرا نقصان ہو جاتا۔ میں چھوٹا بھائی بڑا کے ساتھ بڑی بی کے مکان پر پہنچا۔ گواہ وغیرہ سب چھوٹا بھائی بڑا نے کر لیے تھے۔ معاہدہ ہوتے ہی چھوٹا بھائی بڑا نے فلیٹ کی چابیاں اور چار لاکھ کا بینک ڈرافٹ بڑی بی کے سپرد کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”چھوٹا بھائی! آج شام تک مکان کا قبضہ تمہیں مل جائے گا۔ پہلے ان کو سامان سمیت فلیٹ شفٹ کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، پر یہ کام آج ہو جانا چاہیے۔“ چھوٹا

بھائی بڑا نے جاتے ہوئے کہا۔ اس کے جاتے ہی میں بڑی بی کو لے کر نکلا، پہلے بینک جا کر ان کے اکاؤنٹ میں چار لاکھ کا ڈرافٹ جمع کرایا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کا مکان اتنے اچھے داموں بک سکتا ہے اور ابھی انہوں نے فلیٹ نہیں دیکھا تھا۔ بینک سے میں انہیں فلیٹ لے گیا۔ فلیٹ دیکھ کر بھی وہ حیران ہوئی تھیں۔ یہ ان کے گھر سے چھوٹا تھا لیکن بہت اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اس کی مالیت ڈھائی لاکھ سے اوپر تھی۔

''بیٹا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''باجی! فلیٹ آپ کے نام ہو چکا ہے، ایک مہینے بعد یہ آپ کے نام لیز بھی ہو جائے گا۔ چار لاکھ روپے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو چکے ہیں۔ اب اس میں یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ شام تک آپ سامان سمیت اس فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گی۔''

بڑی بی رونے لگیں۔ ''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ چھوٹا بھائی مجھے سودا کرانے کا کمیشن دے رہا ہے۔''

بڑی بی نے میری بات نہیں مانی۔ وہ مصر تھیں کہ میں نے احسان کیا ہے۔ واپسی میں چھوٹا بھائی بڑا کے آدمی ٹرک سمیت آچکے تھے۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے سارا سامان اٹھا کر ٹرک میں ڈالا اور ایک گھنٹے بعد وہ اسے فلیٹ میں اتار بھی چکے تھے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو بڑی بی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیٹے! میں تیرے لیے کیا کروں؟''

''دعا کریں۔'' میں نے منہ سے کہا اور دل ہی دل میں اس جھوٹ کی معافی چاہی جو میں اب تک بولتا آیا تھا۔ کیونکہ اس دن کے بعد میں نے انہیں اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔ ان کے مکان کی چابی میرے پاس تھی۔ وہ لے کر میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر پہنچا اور چابی سامنے رکھ کر کہا۔ ''لاؤ چھوٹا بھائی! پندرہ ہزار نکالو۔''

''کون سے پندرہ ہزار؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے چابی واپس اٹھالی۔ ''کون سا مکان... ابھی ایک گھنٹے بعد وہاں جانی چڑیا کے آدمی بیٹھے ہوں گے۔''

چھوٹا بھائی بڑا کے تاثرات بدل گئے۔ ''جلیل! مذاق بھی نہیں سمجھتا ہے۔'' اس نے جلدی سے اپنے بٹوے میں سے پندرہ ہزار نکال کر میرے حوالے کیے۔ میں نے نوٹوں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ چھوٹا بھائی بڑا جیسے آدمی سے کوئی بعید نہیں تھا، وہ مجھے جعلی نوٹ تھما دیتا۔ اس کا ایک سائڈ بزنس یہ بھی تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے چابی اس کے سامنے رکھی۔

''خوش رہو سیٹھ... اب مزے سے اپنے گودام کے لیے ادھر سے راستہ نکالو اور گلی کا بیڑا غرق کر دو۔''

اس شام کو میں کیفے ڈی پھونس میں بیٹھا راجا کو ساری کہانی سنا رہا تھا۔ فتو کی واپسی ہو گئی تھی لیکن پچھلے حساب کا چالیس فیصد لے کر اس نے ادھار کھاتا آگے جاری رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ہم آتے جاتے رہے تو کبھی نہ کبھی اس کا ادھار بھی اتر جائے گا۔ ہم بھاگ گئے تو ادھار بھی جائے گا۔ راجا اصل کہانی سن کر اچھل پڑا۔

''چھوٹا بھائی اس گھر کو اپنے گودام کے پچھلے گیٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے؟''

''ہاں اور یہ سہولت اس علاقے میں صرف اسے ہی حاصل ہو گی۔ اب شہر یا بندرگاہ سے اس کا مال بہت شارٹ راستے سے گودام تک پہنچ جائے گا کیونکہ دن بھر میں ایک درجن سے زیادہ ٹرک نہیں آئیں گے اس لیے گلی والوں کو بھی اعتراض نہیں ہو گا۔ ایک سال میں اسے اتنے کا تو ڈیزل بچ جائے گا جتنے میں اس نے یہ مکان خریدا ہے۔''

''اور دو نمبر سامان بھی کسی کی نظر میں آئے بغیر گودام میں آتا جاتا رہے گا۔'' راجا نے آنکھ مار کر کہا۔ ''یہ چھوٹا بھائی بہت کمینی شے ہے۔ تیرے ہاتھ کیسے آیا؟''

''جانی چڑیا کی دھمکی نے اسے بالکل سیدھا کر دیا۔''

''اگر جانی چڑیا کو پتا چل گیا کہ سارا چکر تو نے چلایا ہے تو...؟''

''کیسے پتا چلے گا؟ بڑی بی تک مجھے نہیں پہچان سکیں گی اور چھوٹا بھائی کو میں صاف جھٹلا دوں گا۔''

راجا کام کی بات پر آ گیا۔ ''یہ بتا، اس سودے میں تجھے کیا ملا؟''

''دعائیں اور بس اتنا ملا کہ فتو کا حساب کر کے شنو کو ایک سوٹ دلا دوں۔''

''جلیل! میرے ساتھ چالاکی نہ دکھا' تو مجھے جانتا نہیں...''

''راجا! میرے گہن لگے چاند... میں تجھے نہیں جانوں گا بھلا۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''چلتا ہوں، شنو انتظار کر رہی ہو گی۔''

جب میں نکلا تو فتو، راجا کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ آج کا بل اس سے وصول کرتا۔ میں مسکراتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہم سفر

تنویر ریاض

سفر کسی بھی قسم کا ہو... اس کی دھوپ چھائوں... سرد و گرم ہوائیں... اپنے اندر ایک خاص دلچسپی کا ساماں رکھتی ہیں... دوران سفر چند ایسے ہی مسافروں کی نشست و برخاست... بحث و تکرار کے سلسلے... نوک جھوک اور شگفتگی کے ماحول میں اچانک ہی ایک جرم کی آمیزش شامل ہو گئی۔

ایک زیرک و دانا سراغ رساں کا مشاہدہ جو جرم کی تہ تک جا پہنچا تھا

اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے ہی ٹرین ایل وو کے ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی تھی اور اب پوری رفتار سے منزلِ مقصود کی جانب گامزن تھی۔ آسمان صاف تھا اور پورے چاند کی روشنی میں نظر آنے والے سائے بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ متحرک تھے۔ اسی ٹرین کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سراغ رساں بومن کھڑکی کے ساتھ چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ دوپہر سے پہلے ہی اسے اپنی زمینوں کے منیجر کی جانب سے ایک خط ملا تھا جس میں اس

نے اطلاع دی تھی کہ شدید سردی کی وجہ سے گندم کی فصل تباہ ہو گئی ہے اور اب زیرِ کاشت رقبے پر دوبارہ بوائی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے بومن سے ہدایات مانگی تھیں۔

بومن کے پاس تھوڑی سی فرصت تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ منیجر کو تحریری ہدایات بھیجنے کے بجائے خود ہی زمینوں پر جا کر نقصان کا جائزہ لے اور منیجر سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے لہٰذا اس نے ٹرین کے ذریعے زیبوز جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے اس کی زمینوں تک کا فاصلہ سات میل تھا جو اسے بذریعہ سڑک طے کرنا تھا۔

بومن کے علاوہ اس کمپارٹمنٹ میں دو مسافر اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک مضبوط جسم کا ہٹا کٹا شخص تھا جس کے سخت چہرے پر سنہری مونچھیں اس کی شخصیت کو رعب دار بنا رہی تھیں۔

دوسرا درمیانے قد کا شخص تھا جس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کسی دفتر میں فائلوں اور نقشوں پر جھکے ہوئے گزارا ہے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو موسم کے حوالے سے شروع ہوئی تھی اور وہ اس کے نتائج پر بات کر رہے تھے لیکن جلد ہی ان کے درمیان ایک بے معنی بحث شروع ہو گئی کیونکہ زمیندار کسی دوسرے کی سننے کے بجائے اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ غالباً اسے اپنی حیثیت پر غرور تھا اور سمجھتا تھا کہ فصلوں یا موسم کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات کسی کے پاس نہیں.... جبکہ انجینئر اس کے خیالات سے متفق نہیں تھا اور بے دلی سے اس کی تائید کر رہا تھا۔ وہ اس لایعنی گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

ٹرین کے بائیں جانب چاند کی روشنی میں بننے والے سائے بڑے واضح اور صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ زمین پر پڑنے والا بوگیوں کا سایہ بھی ٹرین کی رفتار کے ساتھ ہی حرکت کر رہا تھا اور یہ سائے اتنے واضح تھے کہ ان میں بوگیوں کی کھڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک میں اس نے اپنا سایہ بھی دیکھا جو کہ ایک عکسی تصویر کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر سراغ رساں کو تجسس ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس طرح تو ان تمام مسافروں کی نقل و حرکت بھی نظر آ سکتی ہے جو کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوں۔ اس کی تصدیق کے لیے سب سے پہلے اس نے اپنے سائے کا معائنہ کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس طرح کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں پھر اس نے دوسری کھڑکیوں کے سائے پر توجہ دی اور اسے اگلے ڈبے میں ایک جوڑے کے سر نظر آ گئے اور وہ دل ہی دل میں ان سایوں کی مدد سے اپنے ذہن میں ان کی تصویر بنانے لگا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ اس میں سے ایک کا قد دوسرے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ اس کا چہرہ گول تھا اور وہ اپنے ہونٹوں کو اس طرح حرکت دے رہا تھا جیسے اپنے ساتھی کو کسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا دوست درمیانے قد کا تھا۔ ناک پتلی تھی اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی گھنی مونچھیں تھیں۔ اب اس نے چشمہ بھی اتار دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ صرف پڑھنے کے لیے اس کا استعمال کرتا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ لمبے قد والے کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک ہے اور وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے صفحے پلٹتے ہوئے کسی بات کی جانب اشارہ کر رہا ہے پھر اسے دوسرے آدمی کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور وہ نوٹ بک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں پرچھائیاں غائب ہو گئیں۔ یقیناً وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔

ٹرین کی تیز سیٹی کی آواز فضا میں گونجی۔ وہ اس وقت کسی اسٹیشن سے گزر رہی تھی۔ بومن نے گھڑی پر نظر ڈالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اب یہ ٹرین آدھ گھنٹے بعد ہودیو کے اسٹیشن پر ہی رکے گی۔''

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر نظریں جمائے ٹرین کے دوڑتے بھاگتے سائے کو دیکھتا رہا لیکن کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ پھر اچانک اسے ایک پرچھائیں دکھائی دی۔ اس کا چہرہ پہلے دو کے مقابلے میں چھوٹا تھا اور اس نے سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا جس کے نیچے اس کے جدید فیشن کے تراشے ہوئے بال نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ چہرہ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ کسی عورت کے چھوٹے چھوٹے بازو اور کندھے نظر آنے لگے۔ اس نے ایک ہاتھ سے گلاس تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے اسے بھر رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے ایک تیسرا ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے ایک شیشی میں سے کئی قطرے اس میں ٹپکائے پھر وہ دونوں ہاتھ غائب ہو گئے اور صرف اس ہاتھ کی پرچھائیں نظر آتی رہی جس نے گلاس پکڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کو یہ گلاس دے رہا ہے۔ پھر ایک اور ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے وہ گلاس پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ بھی منظر سے غائب ہو گیا۔

بومن نے سوچا کہ یہ تینوں مسافر پینے پلانے کے شوقین معلوم ہوتے ہیں اور وقت گزاری کے لیے شغل کر رہے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے کھڑکیاں خالی رہیں اور وہاں کسی کا سایہ نظر نہیں آیا۔ پھر اچانک ہی دبلے آدمی کا ہاتھ نمودار ہوا، اس نے ہاتھ میں کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی۔

انجن نے ایک اور طویل سیٹی دی اور ٹرین کی رفتار آہستہ ہونا شروع ہو گئی۔

''ہودیو آ گیا۔'' زمیندار نے انجینئر سے کہا۔ ''مجھے یہیں اترنا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ گھوڑا گاڑی تیار ملے کیونکہ ابھی بہت دور جانا ہے اور میں کافی تھک چکا ہوں۔''

ٹرین اب رکنے والی تھی۔ زمیندار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اوپری خانے سے اپنا بھاری سوٹ کیس نکالا اور کمپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا۔ ٹرین اب پوری طرح رک چکی تھی اور کمپارٹمنٹ کے دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''بیئر، چائے، سگریٹ۔'' ریستوران کے بیرے کی آواز سنائی دی جو اپنی ٹرے کندھے پر اٹھائے ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پانچ منٹ پورے ہوتے ہی ٹرین نے دوبارہ رفتار پکڑنا شروع کر دی۔ اچانک ہی کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ٹکٹ چیکر گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے باری باری بومن اور انجینئر کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''کیا تم دونوں میں سے کوئی ڈاکٹر بھی ہے؟''

''کیا ہوا؟'' بومن نے پوچھا۔

''دوسرے کمپارٹمنٹ میں ریویرو جانے والا ایک مسافر بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بے ہوش ہوا ہے یا مر چکا ہے۔ کیا تم میں سے کسی کو اس بارے میں کچھ پتا ہے؟''

''میں کسی حد تک جانتا ہوں۔'' بومن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ، چل کر دیکھتے ہیں۔'' اس نے انجینئر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں دوسرے کمپارٹمنٹ میں پہنچے تو وہاں ایک ہٹا کٹا شخص نیم دراز حالت میں اپنی برتھ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ بے جان حالت میں جھول رہے تھے۔ بومن نے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی پھر جھک کر اپنا کان اس کے سینے سے لگا دیا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا

اور بولا۔ ''یہ زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہوا ہے۔ اسے کوئی ایسی چیز دی گئی ہے جو اسے فوراً ہی ہوش و حواس سے بے بیگانہ کر دے۔''

''اس کے پاس ریویرو کا ٹکٹ ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور جوڑا بھی اس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میاں بیوی تھے۔ میں نے انہیں ہودیو آنے سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ضرور وہاں اتر گئے ہوں گے حالانکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے پاس بھی ریویرو کے ہی ٹکٹ تھے پھر وہ پہلے کیوں اتر گئے؟''

''یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔'' بومن نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے ہی اسے کچھ دیا ہو؟'' انجینئر نے شبہ ظاہر کیا۔

''وہ ایسا کیوں کریں گے؟'' ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔

''فی الحال اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔'' بومن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم بعد میں بھی اس پر غور کر سکتے ہیں۔ کیا تمہیں اس شخص کا نام معلوم ہو سکا ہے؟''

''پہلے ہمیں اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔'' انجینئر نے بلند آواز میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''مگر کیسے؟'' بومن نے کہا۔ ''اسے بے ہوشی کی جو چیز دی گئی ہے، اس کا اثر چوبیس گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ دیر تک رہتا ہے اور اسے ہوش میں لانے کے لیے کچھ مخصوص دوائیں دی جاتی ہیں جو ریویرو کے اسپتال میں ہی مل سکیں گی۔''

''مجھے اس شخص کا نام معلوم نہیں۔'' ٹکٹ چیکر نے کہا۔ ''اس کے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا اور ایسے مسافروں کے لیے اپنی شناخت کروانا ضروری نہیں ہوتا۔''

''لگتا ہے کہ یہ کوئی دولت مند تاجر یا صنعت کار ہے۔ کم از کم اس کے ہاتھ پر بندھی قیمتی گھڑی اور انگلیوں میں پہنی ہوئی انگوٹھیوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ میں چاہوں گا مسٹر ٹکٹ چیکر کہ تم اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔ شاید کوئی سراغ مل جائے۔''

ٹکٹ چیکر نے فوراً ہی اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے بے ہوش شخص کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ جیبی گھڑی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس کی تمام جیبیں خالی تھیں۔

''یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں سفر کرے کہ اس کی جیب میں بٹوا بھی نہ ہو۔'' بومن نے کہا۔ ''یہاں تک کہ ہمیں اس کا ٹکٹ بھی نہیں ملا۔ ہمیں اس کا

نام بھی معلوم نہیں۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والوں نے پہلے اسے بے ہوش کیا اور پھر لوٹ کر چلتے بنے۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیوار پر اس کا رین کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے اس کی جیبیں بھی کھنگال ڈالیں مگر کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے اس کا چھوٹا سا بیگ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک جیکٹ، قمیص، تولیا، بالوں کا برش، کنگھا اور کچھ رومال رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی پر بھی کوئی نشان یا مونوگرام نہیں بنا ہوا تھا۔

‘‘اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی جلدی میں اسے لوٹا ہے۔’’ بومن نے کہا۔ ‘‘چور اس کا بٹوا لے کر چلے گئے جس میں نقد رقم کے علاوہ ٹکٹ یا ایسے کاغذات بھی ہوں گے جن سے اس شخص کی شناخت ہونے کے علاوہ اس سفر کا مقصد بھی معلوم ہوسکتا تھا۔’’

‘‘اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟’’ ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔

‘‘تمہیں کوئی الزام نہیں دے گا۔’’ بومن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ‘‘میں تو زیبوز پر اتر جاؤں گا۔’’

‘‘ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔’’ انجینئر نے کہا۔

‘‘مسٹر انجینئر! تم اسی کمپارٹمنٹ میں ٹھہر کر اس شخص کی نگرانی کرنا اور مسٹر، تم کمپارٹمنٹ کے دروازے بند کر دینا تاکہ کوئی شخص اندر داخل نہ ہوسکے۔ ٹرین اس اسٹیشن پر صرف دو منٹ کے لیے رکتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اسٹیشن ماسٹر کو اس حادثے کی رپورٹ مت دینا بلکہ ریویرو پہنچنے کا انتظار کرنا جہاں تم اس شخص کو فوری طور پر اسپتال پہنچا سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ یہ شخص وہاں مشہور ہو اور کوئی اسے پہچان لے۔ وہاں پہنچ کر تم پولیس کو اس حادثے کے بارے میں سب کچھ بتا سکتے ہو۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔’’

بومن نے ٹکٹ چیکر کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ‘‘اگر پولیس کو میری گواہی کی ضرورت ہوگی تو وہ مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔’’

اس کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انجن نے ایک اور وسل دی۔

‘‘میری منزل آگئی۔’’ بومن نے ٹکٹ چیکر اور انجینئر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ‘‘میری ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا۔’’

☆☆☆

اس کا منیجر آئیون ابھی تک نہیں پہنچا تھا جس کی وجہ سے بومن کو الجھن ہونے لگی۔ اسے کسی کا انتظار کرنا بالکل پسند نہیں تھا لہٰذا وہ وقت گزاری کے لیے اسٹیشن کے ریستوران میں چلا گیا اور اپنے لیے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا۔

چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے بھی وہ اسی اجنبی شخص کے بارے میں سوچتا رہا جسے کسی نے بے ہوش کر کے لوٹ لیا تھا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے خیالات آرہے تھے۔

‘‘پولیس بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائے گی۔ میں انہیں کافی معلومات فراہم کرسکتا ہوں جو اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔’’ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ‘‘اگر اس میں الجھ گیا تو میری کم از کم ایک رات ضائع ہوجائے گی اور میں سو بھی نہیں سکوں گا پھر مجھے کل سہ پہر تک واپس بھی جانا ہے۔ آئیون بھی ابھی تک نہیں آیا۔’’

وہ اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ریستوران کا دروازہ کھلا اور آئیون اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔

‘‘معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ دراصل راستے میں ٹریفک بہت زیادہ تھا۔’’

‘‘میں تمہاری بہانے بازی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔’’ بومن نے ناگواری سے کہا۔ ‘‘ٹھیک ہے، تم گاڑی کے پاس ہی رہو۔ میں چائے ختم کر کے آتا ہوں۔’’

اس کے جانے کے بعد بومن نے ویٹر کو بلایا اور کہا۔ ‘‘بل لے آؤ۔’’

ویٹر بل لے کر آیا تو بومن نے اس سے پوچھا۔ ‘‘ریویرو سے آنے والی ٹرین یہاں کب پہنچتی ہے؟’’

ویٹر مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ‘‘ریویرو ایکسپریس اب سے پینتالیس منٹ بعد آئے گی جبکہ عام مسافر ٹرین نصف شب کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔’’

‘‘اور ہودیو سے آنے والی اگلی ٹرین کب یہاں پہنچے گی؟’’

‘‘اس کے لیے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا، تقریباً دو بجے تک، لیکن یہ ریستوران پوری رات کھلا رہتا ہے۔’’

‘‘بہت شکریہ۔’’ بومن نے اپنا بٹوا کھولا اور چائے کا بل ادا کردیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں حساب کتاب لگانے لگا۔ ‘‘اگر میں نصف شب سے پہلے ہودیو پہنچ جاؤں تو میرے پاس واپس آنے کے لیے ایک گھنٹا اور پندرہ منٹ ہوں گے اور اس دوران، میں ان چوروں تک پہنچ سکتا ہوں۔ وہ یقیناً کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔ مجھے یقین

ہے کہ انہیں آسانی سے پہچان لوں گا کیونکہ ان کی پرچھائیں میرے ذہن میں محفوظ ہے۔’’

اب اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا اور پورے جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، جلدی سے اٹھا اور ریستوران سے باہر آکر ہودیو جانے کے لیے ایک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ پھر وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف آیا جہاں آئیون، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

‘‘تم سیرینا ہوٹل میں میرا انتظار کرو۔ مجھے ایک کام کے سلسلے میں کچھ دیر اسٹیشن پر رکنا ہوگا۔ فارغ ہونے کے بعد میں خود ہی ہوٹل پہنچ کر تم سے رابطہ کروں گا۔’’

آئیون نے حیرانی سے اسے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ بومن ایک منٹ کے لیے وہاں رکا اور جب آئیون چلا گیا تو وہ بھی واپس ریستوران میں آگیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ہودیو جانے والی ٹرین میں سوار ہوچکا تھا۔ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تمام نشستیں پہلے سے ہی پُر ہوچکی تھیں۔ اسے بمشکل تمام راہداری میں جگہ ملی جہاں اسے اگلے ایک گھنٹے تک کھڑے ہو کر سفر کرنا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پاس اپنے قدم جمائے اور پورے چاند کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے لگا۔ جب ٹرین ہودیو کے اسٹیشن پر رکی تو وہ جلدی سے اترا اور وقت ضائع کیے بغیر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کے پاس پہنچ گیا۔

کانسٹیبل ایک ہٹا کٹا اور صحت مند شخص تھا۔ اس نے بومن کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

‘‘معاف کرنا۔’’ بومن نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ‘‘کیا تم اس وقت بھی یہاں ڈیوٹی دے رہے تھے جب نو بجے والی ٹرین آئی تھی؟’’

‘‘ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔’’ کانسٹیبل نے مضحکہ خیز اڑانے انداز میں کہا۔ ‘‘اگر میری شفٹ ہوگی تو میں ہی ڈیوٹی پر ہوں گا ورنہ نہیں۔’’

‘‘میرے سوال کا جواب دو۔’’ بومن نے سختی سے کہا۔ ‘‘اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ میں پولیس آفیسر ہوں اور ایلویو سے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔’’

‘‘سوری، مجھے معلوم نہیں تھا۔’’ کانسٹیبل اٹینشن ہوتے ہوئے بولا۔ ‘‘میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟’’

‘‘کیا تم نے ایک جوڑے کو ٹرین سے اترتے ہوئے دیکھا تھا؟ مرد درمیانے قد کا ہے اور اس نے مونچھیں ترشوا رکھی ہیں۔ عورت بھی دبلی پتلی ہے اور غالباً اس نے سرخ رنگ کا ہیٹ پہن رکھا ہے۔’’

‘‘یہاں آنے والے بیشتر مسافر مقامی ہوتے ہیں لیکن جو حلیہ تم بیان کررہے ہو، میں نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو بے تکلفی سے بُلا رہے تھے۔ عورت نے مرد کو میزل کہہ کر پکارا جبکہ وہ اسے صوفیہ کہہ رہا تھا، میرا نام بھی میزل ہے۔ اس لیے مجھے یہ یاد رہ گیا۔ اس پر میں نے مڑ کر دیکھا بھی تھا، گو کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ پھر وہ ریستوران میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کا مجھے معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری ٹرین سے چلے گئے ہوں یا کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں، میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ یقیناً وہ آدھ گھنٹے بعد آنے والی ٹرین سے زورو چلے گئے ہوں گے۔’’

‘‘مجھے اس پر شبہ ہے۔’’ بومن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ‘‘کیا تم بتا سکتے ہو کہ باہر جانے والے راستے پر کون شخص ٹکٹ جمع کرتا ہے؟’’

‘‘ہاں، اس کا نام زوسکی ہے لیکن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سختی نہیں کرتا اور وہ بلا روک ٹوک پلیٹ فارم پر گھومتے رہتے ہیں۔’’

‘‘کیا وہ یہاں موجود ہے؟’’

‘‘ایک منٹ پہلے وہ مجھے نظر آیا تھا۔ ٹھہرو، میں اسے دیکھتا ہوں۔’’

‘‘پہلے اپنے کمانڈر کو فون کرو کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔’’

‘‘اس کی ضرورت نہیں۔ وہ پہلے سے ہی ریستوران میں موجود ہیں۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔ اسے فوراً بلا کر لاؤ اور زوسکی کو بھی تلاش کرو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔’’

کانسٹیبل نے حکم کی تعمیل کی اور تیز تیز قدموں سے ریستوران کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران میں بومن نے ایک کیبن سے اپنے لیے سگریٹ خریدے۔ وہ واپس پلٹا ہی تھا کہ اس نے اپنے سامنے ایک باوقار شخص کو پولیس کی وردی میں دیکھا جس پر کئی اسٹار چمک رہے تھے۔

‘‘کیا تمہیں کچھ چاہیے؟ میں کمانڈر پیٹروش ہوں۔ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟’’

‘‘تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی کمانڈر۔ معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں میری وجہ سے اپنے دوستوں کی کمپنی چھوڑ کر آنا

پڑا۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ مجھے صرف ایک گھنٹے کے لیے تمہارے آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ ہمیں بہت تیزی سے کارروائی کرنا ہوگی۔''

کمانڈر نے اس کا کارڈ دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم سے مل کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔ بولو کیا کرنا ہے؟''

''اپنے ساتھ دو سپاہی بھی لے لو۔''

کمانڈر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔ ''یہ کانسٹیبل کہاں چلا گیا؟''

''وہ زوسکی کو دیکھنے گیا ہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا۔''

ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کانسٹیبل اور ٹکٹ کلکٹر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ بومن نے زوسکی سے پوچھا۔ ''کیا تم ہی نو بجے آنے والی ٹرین کے مسافروں سے ٹکٹ جمع کر رہے تھے؟''

''جی جناب!'' زوسکی نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا تم نے وہ ٹکٹ دفتر میں جمع کروا دیے؟''

''نہیں، ابھی تک میری جیب میں ہی ہیں۔ ویسے ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔''

یہ کہہ کر زوسکی نے اپنی جیب سے ٹکٹوں کا ایک پیکٹ نکالا جس پر باریک سی ڈوری بندھی ہوئی تھی اور بومن کو پکڑا دیا۔

وہ سب تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں چلے گئے جو اس وقت تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ بومن نے پیکٹ کھولا اور تمام ٹکٹ میز پر پھیلا دیے اور انہیں جلدی جلدی چیک کرنے لگا۔ جلد ہی انہیں دو ٹکٹ ایسے مل گئے جو ریویریو جانے کے لیے خریدے گئے تھے، بومن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ یہ ٹکٹ واپس رکھ لو۔'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں جلدی کرنا ہے۔ کیا تم نے دو کانسٹیبل کا بندوبست کر لیا؟''

''اس وقت میرے پاس یہی ایک کانسٹیبل ہے۔ دوسرے کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ میں فون کرتا ہوں۔ تھانہ مرکزی شہر میں ہے۔ کانسٹیبل کو آتے آتے کچھ وقت تو لگے گا۔''

''ایسی صورت میں ہم ایک کانسٹیبل سے ہی کام چلا لیں گے۔ اس قصبے میں کتنے ہوٹل ہوں گے؟''

''حقیقی معنوں میں صرف دو ہی ہیں لیکن میں انہیں ہوٹل نہیں سمجھتا۔ سستا ہونے کی وجہ سے لوگ وہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ ان کے نام کریب اور مونٹی ہیں۔''

''یہ ہوٹل یہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں؟'' بومن نے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں۔ کریب تو تین منٹ کی مسافت پر ہے اور اس سے تھوڑا سا آگے مونٹی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔''

وہ تینوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئے۔ کریب ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر ریستوران تھا جبکہ اس کے اوپر دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جنہیں کبھی کبھی ایک رات کے لیے کرائے پر دے دیا جاتا تھا۔

''ان کمروں کی کھڑکیاں کس جانب کھلتی ہیں؟'' بومن نے پوچھا۔

''یہ دونوں کمرے سڑک کی جانب ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ کانسٹیبل ہوٹل کی عمارت کے سامنے پہرا دے گا اور اس بات کا خیال رکھے گا کہ کوئی بھی شخص کھڑکی سے کوئی چیز باہر نہ پھینکے۔ میں اور کمانڈر اندر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' کانسٹیبل نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

انہوں نے ہوٹل کے سامنے والے رخ پر ایک شراب خانہ دیکھا جبکہ ریستوران کا دروازہ بغلی گلی میں کھلتا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہیں اندر سے آنے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔ آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔

کمانڈر نے دروازہ کھولا اور وہی پہلے اندر داخل ہوا۔ ''کیا مسٹر کریب موجود ہیں؟'' اس نے بار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔ اس دوران میں بومن نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں تقریباً ایک درجن لوگ ٹولیوں کی شکل میں مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت مزدور پیشہ، ڈرائیوروں اور ریلوے میں کام کرنے والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ بڑے بے فکرے انداز میں باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے لیکن پولیس کمانڈر اور بومن کو اندر آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

برابر میں ایک دوسرا کمرا تھا جسے مرکزی ہال سے ایک لکڑی کی دیوار کے ذریعے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور اس کے دروازے پر ایک بوسیدہ سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہاں سے اندر کا منظر بالکل صاف دیکھا جا سکتا تھا جہاں ایک پرانے

طرز کی بڑی اور بھاری میز رکھی ہوئی تھی اور اس کے گرد چند لوگ ہاتھوں میں چھڑی اور بیئر کے مگ لیے ہوئے کھڑے تھے۔

''مسٹر کریب کہاں ہیں؟'' کمانڈر نے اپنا سوال دہرایا۔

''اس طرف۔'' بار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے لڑکے نے راہداری کی جانب اشارہ کیا۔ اسی وقت ایک لڑکی راہداری میں نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر لڑکے نے کہا۔ ''روزی! مسٹر کمانڈنٹ آئے ہیں۔ جلدی سے فادر کو بلا کر لاؤ۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ریستوران کا مالک عقبی کمرے سے برآمد ہوا اور ان کے پاس آ کر داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔

''یہ میری عزت افزائی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ کس سلسلے میں آنا ہوا؟ میرا لڑکا آج ہی بہت عمدہ شراب لے کر آیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو ایک بوتل آپ کی خدمت میں پیش کروں؟''

''ابھی نہیں۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''تمہارے علاوہ یہاں اور کون ہے؟''

''غالباً آپ یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ میرے ساتھ کون رہتا ہے۔ دو گھنٹے پہلے میرا بیٹا جوزف آیا ہے۔ آپ تو اسے جانتے ہیں۔''

''میں اس کی بات نہیں کر رہا۔'' کمانڈر نے دوبارہ قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تمہارے مہمان خانے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ شاید روزی کو معلوم ہوگا۔'' پھر اس نے روزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کسی نے رات کے لیے کمرا کرائے پر لیا ہے؟''

''ہاں، ایک مرد اور ایک عورت..... وہ کل صبح چلے جائیں گے۔''

''مرد کا قد درمیانہ ہے، آگے کو نکلی ہوئی ناک اور تراشی ہوئی مونچھیں ہیں۔ عورت دبلی پتلی ہے اور اس نے سرخ ہیٹ پہنا ہوا ہے۔'' بومن نے مشتبہ افراد کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، وہی۔'' روزی نے تصدیق کی۔ ''لگتا ہے کہ وہ دونوں تمہارے دوست ہیں۔''

''ہاں۔'' بومن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان سے فوری طور پر ملنا ہے۔ کیا تم ہمیں ان کا کمرا دکھا سکتی ہو؟''

''سیڑھیوں کے سامنے والا کمرا ہے، میں ٹارچ لے لوں۔ اوپر اندھیرا ہوگا۔''

''میں نے وہ کمرا دیکھا ہوا ہے۔'' کمانڈر بولا۔ ''تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ٹارچ بھی ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔''

وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں کئی لوگ بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے میزوں پر جوئے میں لگائی گئی رقم پڑی ہوئی تھی۔ کمانڈر کو آتا دیکھ کر بہت سے لوگوں نے میزوں پر سے پیسے سمیٹنا شروع کر دیے۔ کمانڈر نے انہیں اس طرح گھورا جیسے ابھی انہیں جوا کھیلنے کے الزام میں گرفتار کر لے گا۔ بومن کو بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس نے کمانڈر کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سے بعد میں نمٹ لینا۔ فی الحال ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔''

کمرے سے نکل کر وہ ایک تاریک راہداری میں پہنچے۔ کمانڈر نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا۔ ''احتیاط سے قدم بڑھانا۔''

''مجھے نظر آرہا ہے۔'' بومن نے کہا۔ ''میرے پاس بھی ٹارچ ہے۔ ضرورت پڑی تو اسے بھی جلا لوں گا۔''

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر کمانڈر نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ یہ عمل دہرایا۔

بومن نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور چابی کے سوراخ سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی سننے کی حس بہت تیز تھی اور انتہائی مدھم آوازیں بھی سن لیتا تھا۔ اسے کمرے میں کچھ کھڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوئی پھر ماچس کی تیلی جلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے غنودگی کے عالم میں کہا۔

''کون ہے؟''

کمانڈر نے ایک بار پھر زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ کمرے کے اندر ہلچل سی محسوس ہونے لگی پھر بومن کو کسی کی آواز سنائی دی۔ ''صوفی! اٹھو، پولیس آگئی ہے۔ کھڑکی کھول کر یہ چیزیں باہر پھینک دو۔''

''دروازہ کھولو۔'' کمانڈر زور سے چلایا۔

بومن اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لمحے دروازہ کھل گیا اور ایک درمیانے قد کا آدمی ہاتھ میں موم بتی لیے راہداری میں نمودار ہوا۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ انتہائی عجلت میں بستر سے اٹھ کر آیا ہے جبکہ عورت شب خوابی کے لباس میں کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

کمانڈر اور بومن، اس شخص کو دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ بومن نے دروازہ بند کر کے چابی اپنے قبضے میں کر لی۔

''کاغذات دکھاؤ۔'' کمانڈر نے کہا۔

اتنی دیر میں وہ شخص کسی حد تک اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم نے جس طرح نصف شب کے قریب شریف شہریوں کے آرام میں خلل ڈالا ہے، اس نے مجھے ششدر کر دیا ہے۔ بہرحال، میں تمہارے اختیارات کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ تم کاغذات دیکھنا چاہتے ہو، ایک منٹ ٹھہرو۔''

وہ میز کی طرف گیا اور ایک تھیلے میں سے دو کارڈ نکال کر کمانڈر کو پکڑا دیے۔

کمانڈر نے ان کارڈز کا بغور معائنہ کیا۔ ان پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھا اور بومن کو دیتے ہوئے بولا۔

''کاغذات تو ٹھیک ہیں۔ تم خود دیکھ سکتے ہو۔''

بومن نے کارڈز پر لکھے ہوئے کوائف پڑھے۔ ایک پر ایلوس بلسکی کا نام لکھا ہوا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ تاجر تھا جبکہ دوسرا کارڈ اس کی بیوی ماریا کا تھا۔

''ہاں، کاغذات تو ٹھیک ہیں۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا وجہ ہے کہ تم آدھی رات کو ہمیں پریشان کرنے چلے آئے؟'' اس شخص نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔'' بومن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جعلی کارڈز بنوانے میں بڑی ہوشیاری دکھائی ہے مسٹر میزل۔ اگر مجھے تمہارا اصلی نام معلوم نہ ہوتا تو میں بھی دھوکا کھا جاتا۔''

اس شخص کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

''شاید مس صوفیہ بتانا پسند کریں کہ تم دونوں کے اصلی نام کیا ہیں اور تم لوگ کیا کام کرتے ہو؟''

اس عورت کی آنکھوں سے بھی خوف جھلکنے لگا۔

''دوسری صورت میں ہمیں تمہارے سامان کی تلاشی لینا ہوگی۔''

''تمہیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔'' مرد نے ایک بار پھر تیزی دکھانے کی کوشش کی۔

بومن نے اس کے احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی اور تلاشی لینے لگا۔ اس کے پرس میں سے سو امریکی ڈالرز اور کچھ مقامی کرنسی برآمد ہوئی جبکہ عورت کے پرس میں بھی مقامی کرنسی اور کچھ سکے پڑے ہوئے تھے۔ سوٹ کیس میں ان کے کپڑوں کے علاوہ کئی طرح کی وگیں، دو عدد مصنوعی داڑھیاں اور ایک محلول کی شیشی بھی پائی گئی۔ بومن نے شیشی کا ڈھکنا کھول کر اسے ناک سے لگایا اور دوبارہ بند کر کے اسے میز پر رکھ دیا۔

''اس شیشی میں کیا ہے مسٹر میزل؟''

''یہ ماؤتھ واش ہے۔ اپنے ہی ملک میں بنتا ہے۔''

''تم مسلسل غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔''

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ کمانڈر نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں کوبلوج ہوں مسٹر کمانڈر۔'' یہ وہ کانسٹیبل تھا جسے عمارت کی نگرانی کے لیے باہر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

''کیا تمہیں کوئی چیز ملی ہے؟''

''ہاں، یہ ایک تھیلا ہے۔ انہوں نے تو اسے کافی فاصلے پر پھینکا تھا لیکن چاند کی روشنی میں مجھے نظر آگیا۔''

''اسے بھی کھول کر دیکھتے ہیں۔'' بومن نے کانسٹیبل کے ہاتھ سے تھیلا لیتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس سے کچھ مدد مل سکے۔''

یہ ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ تھا جس میں نقدی تو نہیں البتہ کچھ کاغذات ضرور رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک خط سیونگ بینک ریویرو برانچ کی جانب سے تھا جو لیونارڈ سکی کے نام لکھا گیا تھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''جناب والا! یونین بینک ویانا کی جانب سے آپ کے نام پچیس ہزار آسٹریلوی شلنگ موصول ہوئے ہیں۔ آپ یہ رقم پولینڈ کی کرنسی میں ذاتی طور پر یا اپنے نمائندے کے ذریعے چیک نمبر 275 پیش کر کے وصول کر سکتے ہیں۔''

☆☆☆

''اب ہم ٹھوس ثبوت کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' بومن نے میزل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو تقریباً کرسی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی کانسٹیبل کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ ''کیا تم مجھے مس صوفیہ کا سرخ ہیٹ پکڑانے کی زحمت کرو گے؟''

اس نے ہیٹ کا بغور معائنہ کیا پھر جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر بڑی احتیاط سے اس کا اندرونی استر ادھیڑنے لگا۔ اس میں سے بھی کچھ کاغذات برآمد ہوئے جنہیں اس نے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس معمے کا جواب ہے۔''

ان میں دو عدد شناختی کارڈز تھے جن میں سے ایک پر میزل پونک، منیجر اور دوسرے پر صوفیہ وسلوکا، درزن لکھا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ تیسرا کاغذ پچیس ہزار شلنگ کا چیک نمبر 275 تھا۔

''میرا اندازہ درست نکلا۔'' بومن نے مجرموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایلویو اور ہودیو کے سفر کے دوران تم نے اس شریف آدمی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور شاید اس نے باتوں باتوں میں تمہیں بتا دیا کہ وہ چیک کی رقم وصول کرنے جا رہا ہے۔ غالباً اس نے وہ چیک تمہیں دکھایا بھی ہو۔ پھر مس صوفیہ نے اسے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے مشروب پیش کیا جس میں تم نے بڑی ہوشیاری سے چند قطرے اس شیشی سے ٹپکا دیے جسے تم ماؤتھ واش کہہ رہے ہو وہ ایک انتہائی تیز قسم کی مسکن دوا ہے جو سیکنڈوں میں آدمی کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ اس کے بعد تم اس کے تمام کاغذات اور نقدی اس چیک سمیت لے کر راستے میں ہی اتر گئے تاکہ بینک جا کر اپنے آپ کو مسٹر لیونارڈ کا نمائندہ ظاہر کر کے یہ رقم وصول کر سکو۔''

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ مرد کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر رکھے تھے۔ مبادا اس کے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے جبکہ عورت بھی خاموشی کی تصویر بنی بستر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بومن نے کمانڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ایک آخری کام اور کر دو اور وہ یہ کہ ان دونوں کو ہتھکڑی لگا کر اپنے سپاہیوں کی نگرانی میں ریویرو پہنچا دو۔ ابھی ٹرین کے جانے میں بیس منٹ باقی ہیں۔ وہاں کی پولیس ان سے خود ہی نمٹ لے گی۔ تب تک مسٹر لیونارڈ بھی صحت یاب ہو جائیں گے اور ہم نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کے بیان سے اس کی تصدیق ہو سکے گی۔ میں بھی اسی ٹرین سے روانہ ہو جاؤں گا تاکہ ریویرو پولیس کو اپنی تحریری رپورٹ پیش کر سکوں۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''لیکن خیال رکھنا کہ تمہارا واسطہ کسی خوب صورت ہم سفر سے نہ پڑ جائے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور کانسٹیبل کو ہتھکڑی لگانے کا اشارہ کر دیا۔

اسماقادری

قسط 38

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے -پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو -محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے -دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے -زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے -بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے -جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل ... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو اغوا ہو کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ للی راستے میں اسلم اور جگو کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ماری جاتی ہے۔ جگو اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ایس پی شاہ میرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے

ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔شہر یار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔بہر حال وہ مشابرم خان کو دوبارہ ٹالی والا
تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی
وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی
واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذ
بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔شہر یار کو مشابرم خان کے ذریعے ٹالی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔شہر یار
ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ٹالی والا پہنچتا ہے۔وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی
اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں
جاتی ہے۔شہر یار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہر یار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ادھر شہر
ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کر لیتا ہے
اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں
ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بُری طرح
جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔شہر یار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ادھر ماریا کی
سنتھیا جوزف بیٹی کی موت پر شدید غم و غصے کا شکار ہوتی ہے اور ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے
تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ادھر شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔راستے میں گاڑی کے خراب ہونے پر وہ ایک جگہ رکتے ہیں۔اس
گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔شہر یار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں اور اس کی شناخت بدلنے
معاملات پر غور ہوتا ہے۔شہر یار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔شہر یار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہو
ہے کہ شہر یار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی اور عملی طور پر بھی ایسا دکھایا جائے گا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ کوما میں چلا گیا ہے
اس کی جگہ اسپتال میں کوئی دوسرا شخص ہوتا جبکہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کر دی جاتی۔مشابرم خان کو جب شہر یار کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع
ہے تو اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔شہر یار، ماہ بانو، اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ادھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کر دیا جاتا ہے اور را اور موساد والے
سمجھتے ہیں کہ شہر یار کا پتا صاف ہو گیا۔شہر یار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ادھر موساد والے
عابد انصاری کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی
تاہم مراد شاہ کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔کشور کے خدشات دور ہو جاتے ہیں اور وہ بھائی سے مل کے بہت خوش ہوتی ہے۔ادھر شہر یار
کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ
سراؤں کے ایک گرو بوبی کو اس مشن میں اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔بوبی اسے ایک ہندو خواجہ سرا شالنی کے پاس لے جاتا ہے۔شالنی اسے اپنے پاس
رہنے کی اجازت دے دیتی ہے۔۔مگر پھر اسے کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں لے آتی ہے۔وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔وہاں جاوید علی کو
چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔وہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرتا ہے اور شالنی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شالنی کو گرفتار کرنے کے
بجائے اس کی نگرانی شروع کر دی جاتی ہے۔ادھر ذیشان موہنی کو اٹھا کر اس سے اگلوا لیتا ہے کہ وہ را کی ایجنٹ ہے۔اسے موہنی سے کافی مفید معلومات
حاصل ہوتی ہیں۔ذیشان شہر یار کو تفصیل سے تمام صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے۔ادھر شہر یار اس کی باتیں سن کر اس سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ یہ سانحہ
کیا رنگ لائے گی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"تُو کیا کر رہی ہے رنجنی؟ کمرے میں پڑے پڑے تیرا دل نہیں گھبراتا۔ باہر نکلا کر۔ سب سے ملے جلے گی تو یہاں کے طور طریقے بھی سیکھ لے گی اور من بھی بہلے گا۔" جاوید علی بستر پر دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر اچانک اندر آئی اور بولتی چلی گئی۔

"تجھے کس نے کہا کہ میں سارا وقت کمرے میں ہی پڑی رہتی ہوں؟ میں تو خود یہاں کے طور طریقے سیکھنا چاہتی ہوں اس لیے کسی نہ کسی کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی رسوئی میں مدھو کے ساتھ کھانا پکانے میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ میری وجہ سے اس کا کام آدھے ٹائم میں ہی پورا ہو گیا۔ اس نے خود ہی مجھے کمرے میں بھیجا تھا کہ جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ جب کھانا پروسا جائے گا تو میں خود تجھے آواز دے لوں گی۔ اس کے کہنے پر میں کمرے میں آ کر لیٹ گئی اور یہ کتاب پڑھنے لگی۔" جاوید علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر وضاحت پیش کی۔

"چل، یہ تو اچھی بات ہے۔ اصل میں آج کل میرا وقت زیادہ تر باہر گزرتا ہے اس لیے یہاں کی خبر نہیں پاتی۔" آشا اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

"یہ تو میں بھی تجھ سے پوچھنے والی تھی کہ کدھر ہے؟ صبح ناشتے کے بعد جو غائب ہوتی ہے تو پھر تیری شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔" جاوید علی نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"سب شاز مین بی بی کی مہربانی ہے۔ کبھی کبھی انہیں گھومنے پھرنے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ دو چار دن پورے شہر میں بولائی پھرتی ہیں اور ظاہر ہے مجھے ہی ہر جگہ انہیں لے کر جانا ہوتا ہے۔ دو چار دن بعد وہ چین سے بیٹھتی ہیں تو مجھے بھی سکون ملتا ہے۔ آج بھی صبح صبح اٹھا کر پہلے مجھے سی سائڈ لے گئیں۔ پھر میوزیم کا خیال آیا اور آخر میں مزارِ قائد پہنچ گئیں۔ دیوانی ایسی ہیں کہ نہ خود کھانا کھایا اور نہ مجھے کھلایا۔ پورا دن جوس اور پانی پی پی کر گزر گیا۔" آشا نے بیزاری سے بتایا۔

"یہ تو بڑی زیادتی کی انہوں نے تمہارے ساتھ۔ نوکروں کو بھی انسان سمجھنا چاہیے۔" جاوید علی نے اس سے ہمدردی جتائی۔

"میری بات ہمیشہ یاد رکھنا رنجنی! جو بھی بندہ انسان کو اس کی اوقات کے مطابق پیسا دینے کی طاقت رکھتا ہے، وہ اسے انسان نہیں سمجھتا بلکہ بازار میں بکنے والی ان چیزوں میں سے ایک سمجھ لیتا ہے جنہیں وہ قیمت دے کر خرید سکتا ہے اور خریدنے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق برت سکتا ہے۔ مجھے بھی شاز مین بی بی سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ انہیں دو تین مہینے بعد ہی ایسا دورہ پڑتا ہے۔ باقی وقت وہ مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتیں، ورنہ ان کے والد جناب نواب صاحب مجھے جو تنخواہ دیتے ہیں، اس تنخواہ میں وہ روزانہ بھی مجھے اتنا ستا سکتی ہیں۔"

آشا کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ اس بار جاوید علی نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے آشا کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس خواجہ سرا کے بارے میں اس کے دل میں کیسے جذبات ہیں۔ ایک طرف تو وہ اسے مظلوم اور معاشرے کی ستائی ہوئی لگتی تھی اور دوسری طرف وہ کردار کے حوالے سے اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ نواب صاحب کے علاوہ اس کے شالنی کے ساتھ جس نوعیت کے تعلقات تھے، ان سے اس کے کردار کا ہلکا پن ظاہر ہوتا تھا پھر شالنی کی ملک دشمن سرگرمیوں اور آشا کی اس سے قربت کی وجہ سے اسے شک تھا کہ وہ بھی ان سرگرمیوں میں شالنی کے ساتھ شامل ہے اور یہ ایسا معاملہ تھا جسے وہ ذاتی کردار سے بھی زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

"کیا ہوا... تُو کس خیال میں ڈوب گئی؟" آشا نے اس کے چہرے کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس بڑے لوگوں کی اداؤں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" جاوید علی نے چونک کر جواب دیا۔

"جانے دے، تیرے وچار سے کچھ نہیں ہوتا۔ بیکار کی باتوں میں الجھ کر میں بھی اصل بات کرنی بھول گئی۔ تیرے لیے نواب صاحب کا پیغام لائی ہوں۔" آشا نے یکدم ہی موضوع بدل دیا۔

"کیسا پیغام...؟" وہ حیران ہوا۔

"اتنا حیران کیوں ہو رہی ہے؟ یہاں آئی ہے اور رتی کے کمرے میں بسی ہے تو اس کی جگہ بھی تو سنبھالنی ہو گی۔ آج رات نواب صاحب نے تجھے اپنی خدمت میں بلایا ہے۔" آشا کا پیغام غیر متوقع نہیں تھا پھر بھی وہ ساکت رہ گیا۔ نواب صاحب نے اسے جس خدمت کے لیے بلایا تھا، وہ تو وہ کسی صورت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ تو شاید یہ جان کر اسے فوراً ہی شوٹ کر دیتے کہ ایک مرد خواجہ سرا کے روپ میں انہیں دھوکا دیتا رہا ہے۔ شوٹ نہ کرتے تو کم از کم شالنی کو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے سے ضرور آگاہ کر دیتے اور یہ صورتِ حال جاوید علی کے لیے مزید خطرناک ہوتی۔ شالنی تو فوراً ہی سمجھ جاتی کہ رتی کے کریا کرم والی رات شمشان گھاٹ کو گھیرے میں لے کر قانون کے رکھوالوں نے جو کارروائی کی تھی، اس کے پیچھے کون تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنی جلدی یہ بھید کھلے۔ ابھی اسے کچھ مہلت درکار تھی تاکہ نوازش علی کی کوٹھی کا بھید جان سکے۔ وہ نوازش علی اور شالنی کے درمیان تعلق کی اصل وجہ بھی جاننا چاہتا تھا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ اگر شالنی نے اس کوٹھی میں اتنے بہت سارے ہندو خواجہ سراؤں کو جمع کیا تھا تو یہ جدوجہد بے وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔

"اب زیادہ سوچ بچار نہ کر۔ میں تیرے کپڑے اور زیور بھجوا دیتی ہوں۔ نہا دھو کر اچھی طرح تیار ہو جا اور وہاں کھانا پروسے جانے سے تجھے باہر آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا کھانا میں یہیں بھجوا دوں گی۔ تُو اب بس اسی وقت کمرے سے باہر نکلے گی جب نواب صاحب کی طرف سے بلاوا آئے گا۔" آشا اسے ہدایت پر ہدایت دیتی جا رہی تھی اور وہ غائب دماغی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"تُو نے اچھی طرح سن لیا ہے نا جو کچھ میں نے کہا ہے؟" آشا نے بھی شاید اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا اس لیے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

"سن لیا ہے۔ سنوں گی کیوں نہیں۔ میں کوئی بہری تو نہیں ہوں۔" جاوید علی نے قدرے چڑچڑے پن سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ بجائے ناراض ہونے کے ہنس دی۔

"میں سمجھ گئی۔ یہ تیری پہلی باری ہے نا، اس لیے

کنفیوز ہورہی ہے، پر چنتا نہ کر۔ نواب صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔" وہ اسے تسلی دے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہاں ذرا دیر رک کر نرمی سے بولی۔ "گھبرا نہیں۔ شانتی کے ساتھ اشنان کر اور جو دوسری تیاری کرنی ہے کرلے۔ تیرے کپڑے لتے ابھی آتے ہی ہوں گے۔ تیاری میں کچھ مشکل ہو تو مجھے پکار لینا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ہوں۔ تھکن بہت ہوگئی ہے، تھوڑی دیر آرام کروں گی۔" وہ وہاں سے چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا دروازہ بھی ازخود بند کردیا تھا۔ اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی جاوید علی نے اپنی ہتھیلی پر یوں مکا مارا جیسے اس مکے کی زد میں آشا کا تھوبڑا ہو اور پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ہوئے وہ اس مصیبت سے نکلنے کا حل سوچ رہا تھا۔ ابھی دو چار چکر ہی لگائے تھے کہ ایک ترکیب ذہن میں آگئی اور وہ ٹہلنا ترک کرکے بستر پر اس انداز سے بیٹھ گیا کہ دونوں پیر سکیڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا رکھے تھے اور چہرہ گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر کوئی اندر داخل ہوا، تب بھی اس نے اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی۔

"ارے رنجنی! تجھے کیا ہوا؟ اس طرح سے کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟" آنے والی جوہی نے اسے ٹوکا۔

"میرے پیٹ میں سخت درد ہورہا ہے دیدی!" اس نے منہ اوپر اٹھاتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر اس وقت واقعی ایسے تاثرات تھے کہ دیکھنے والے کو اس کی تکلیف کا یقین کرنا ہی پڑتا۔ سرخ رنگ کا زرق برق لباس اور زیورات کے ڈبے لانے والا جوہی نامی وہ خواجہ سرا بھی یقین کر بیٹھا۔

"ہائے رام! یہ کیا ہوگیا؟ تیری تو آج حاضری ہے نواب صاحب کی خدمت میں۔" وہ پریشان سی اس کے قریب چلی آئی۔

"چنتا نہ کرو دیدی! مجھے پیٹ درد کی کوئی گولی لادو۔ ایک آدھ گھنٹے میں میری طبیعت سنبھل جائے گی تو میں تیار ہو جاؤں گی۔" اس نے گویا تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر کہے تو کسی ڈاکٹر کو بلا لوں؟" جوہی ہنوز پریشان تھی۔

"نہیں دیدی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس مجھے گولی بھجوا دو اور تھوڑی دیر خاموشی سے آرام کرنے دو۔" اس نے اپنی اداکاری جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے زور دینے پر جوہی وہاں سے چلی گئی اور تھوڑی دیر میں پیٹ درد کی گولی کے ساتھ حاضر ہوگئی۔

"اگر گولی کھا کر جلد آرام نہ آئے تو مجھے بتا دینا۔ میں ڈاکٹر کو بلوا لوں گی۔" اسے گولی کے ساتھ ایک گلاس میں پانی پیش کرنے کے بعد وہ اس ہدایت کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد جاوید علی نے اطمینان سے پانی کا گلاس چڑھایا اور گولی فلیش میں بہا کر آنے کے بعد آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ اب اسے آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔ بیس پچیس منٹ بعد جوہی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"بہتر ہے۔ درد کافی کم ہوگیا ہے۔" اس نے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے، تُو آرام کر... میں تیرے کھانے کے لیے کچھ ہلکا پھلکا بھیجتی ہوں۔ جو کھانا پکا ہے، وہ تو تو کھا ہی نہیں سکتی۔ کھاتی تو انگلیاں چاٹتی رہ جاتی۔ مدھو سے اچھے نرگسی کوفتے میں نے کبھی کسی اور کو بناتے نہیں دیکھا اور آج اس نے سب سے خاص ڈش یہی بنائی ہے۔" جوہی نے جیسے اس کے نرگسی کوفتوں سے محروم رہ جانے پر تاسف کا اظہار کیا اور وہاں سے چلی گئی۔ دس منٹ بعد اس کے لیے دلیا، ساگودانہ، ڈبل روٹی، دہی وغیرہ جیسی اشیا پر مشتمل کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس کے حق میں اس وقت یہی بہتر تھا کہ وہ نرگسی کوفتوں اور دیگر پُرتکلف کھانوں کو بھول کر اس پرہیزی کھانے کو صبر و شکر کے ساتھ تناول کرلے، چنانچہ یہی کیا اور مزے سے سب چیزیں ٹھکانے لگا دیں۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسے کمرے کے باہر آہٹ سنائی دی تو جھپٹ کر ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا اور وہاں سے سن گن لینے لگا۔ کوئی اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ واش بیسن کے سامنے جا کھڑا ہوا اور نل کھول کر منہ سے ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے اسے الٹی ہورہی ہو۔

"کیا ہوا رنجنی! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" باتھ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اور جوہی کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پر اس طرح پانی کے چھپکے مارنے لگا کہ بہت سا پانی بہہ کر اس کے کپڑوں کو بھی بھگو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ واٹر پروف میک اپ بہا تو نہیں تھا لیکن اب اس کے چہرے پر ویسی تازگی بھی نظر نہیں آرہی تھی جیسا وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے قبل محسوس ہورہا تھا۔ اس طرح مطمئن ہو کر اس نے اپنے چہرے کے زاویوں کو کچھ اور بگاڑا اور ہانپتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا۔

"کیا ہوا رنجی... کیا ہوا؟" پریشان جوہی نے اس کی صورت دیکھتے ہی پوچھنا شروع کردیا لیکن وہ جواب دینے کے بجائے نڈھال سا بستر پر جا کر گر گیا۔

"کیا ہوا... تیری حالت تو سنبھلنے لگی تھی پھر یہ اچانک تُو اتنی نڈھال کیسے ہوگئی؟" پریشان جوہی اپنے سوالوں کے ساتھ اس کے بستر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"معلوم نہیں کیا ہوا۔ آپ نے گولی دی تھی تو درد بالکل ٹھیک ہوگیا تھا۔ میں نے آرام سے کھانا کھایا پر کھانا کھاتے ہی حالت بگڑنے لگی۔ پہلے ایک موشن ہوا اور پھر الٹیاں شروع ہوگئیں۔ بھگوان کی قسم بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے آنتیں الٹ کر منہ سے باہر نکلنے والی ہیں۔" اس نے ہانپتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں بتایا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ تیری حالت تو بالکل بھی ایسی نہیں ہے کہ تجھے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ میں جا کر بڑی دیدی کو بتاتی ہوں۔" جوہی جھٹ پٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں بڑی دیدی وہاں موجود تھی۔ یہ وہی خواجہ سرا تھا جس نے پہلے دن کوٹھی میں شالنی اور اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ یہاں منتظم کی حیثیت رکھتا تھا اور سب اسے بڑی دیدی کہہ کر پکارتے تھے۔

"جوہی بتا رہی ہے کہ تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟" کمرے میں موجود صوفہ سیٹ کے ایک صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا۔

"جی دیدی! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے نواب صاحب کا موڈ خراب ہوجائے گا۔" جاوید علی نے اس کے احترام کے اظہار کے لیے بیٹھتے ہوئے شرمندگی اور نقاہت سے ملی جلی آواز میں جواب دیا۔

"اس بات کی فکر نہ کرو۔ نواب صاحب کے موڈ کو میں خود سنبھال لوں گی۔ تم اپنی صحت کی فکر کرو۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کردیتی ہوں۔ ڈاکٹر آ کر تمہیں دیکھ لے گا تو پھر اس کی ہدایات کے مطابق تمہارا صحیح طریقے سے علاج شروع ہوجائے گا۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔

"پلیز دیدی! ڈاکٹر کو مت بلائیے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر آئے گا تو میری حالت کو دیکھتے ہوئے انجکشن اور ڈرپ وغیرہ لگانے پر زور دے گا اور مجھے ان چیزوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں آپ کو کچھ دواؤں کے نام لکھ کر دے دیتی ہوں، آپ مجھے وہ منگوا دیں۔ بھگوان نے چاہا تو دوائیں کھا کر میں کل تک ٹھیک ہوجاؤں گی۔" وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر آیا تو اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا اس لیے بہانہ تراشتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم ڈاکٹر کو آنے دو۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو نواب صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔ پہلے ہی وہ رتی کے صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھلے ہیں۔" اس نے جاوید علی کو نرمی سے سمجھایا۔

"پلیز دیدی! میری بات مانیں۔ میں دوا کھا کر ٹھیک ہوجاؤں گی۔ ڈاکٹروں سے تو مجھے ویسے ہی بڑی الجھن ہوتی ہے اور میں اکثر اپنا علاج خود ہی کرلیتی ہوں۔" اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر کو نہ بلانے پر زور دیا۔

"ٹھیک ہے، تم دواؤں کے نام لکھ کر دے دو، صبح تک طبیعت میں افاقہ نہیں ہوا تو پھر میں ڈاکٹر بلوانے کے بجائے تمہیں سیدھی ہاسپٹل لے جاؤں گی۔" اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور جوہی کو اسے کاغذ قلم لا کر دینے کی ہدایت۔ جوہی نے اسے دونوں چیزیں لا کر تھمائیں تو وہ کاغذ پر چند ایسی دواؤں کے نام لکھنے لگا جو واقعی پیٹ درد، الٹی اور موشن وغیرہ کے علاج کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

"میں یہ دوا ابھی منگوا کر تمہیں بھیج دیتی ہوں۔ اگر دوا کھا کر بھی تمہیں آرام محسوس نہ ہو تو اطلاع کردینا۔ تمہارے کہنے پر آدھی رات کو بھی ڈاکٹر کو بلا لیا جائے گا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتی ہوئی کھڑی ہوئی اور وقار سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ جوہی کو البتہ اس نے اس کے ساتھ ہی رکے رہنے کا اشارہ کردیا تھا۔ جوہی وہیں بیٹھ گئی۔ جاوید علی نقاہت اور کمزوری کا ڈراما تو پہلے ہی کامیابی سے کررہا تھا، اسے دکھانے کے لیے ایک دفعہ اور باتھ روم کا چکر لگا آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آشا دواؤں کا لفافہ تھامے وہاں آن دھمکی۔

"یہ اچانک ہی تیری طبیعت اتنی خراب کیسے ہوگئی؟ جب میں تیرے پاس آئی تھی تب تو تُو بالکل ٹھیک تھی۔" دواؤں کا چھوٹا سا لفافہ اسے تھماتے ہوئے اس نے تشویش سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کیا ہوا؟ میں تو خود حیران ہوں۔ تُو گئی تو بس اسی وقت پیٹ میں درد ہوگیا اور پھر معاملہ بگڑتا ہی چلا گیا۔" جاوید علی نے کمزور سے لہجے میں اس کی بات کا

جواب دیا۔

''اس کا کارن نواب صاحب کی طرف سے بلاوا تھا۔ تُو نے ان کا بلاوا سنا اور فٹ سے بیمار ہوگئی۔'' چمک کر کہے گئے آشا کے اس جملے نے اسے چونکا دیا اور دل میں اندیشہ ابھرا کہ اس کی اتنی اچھی اداکاری کے باوجود آشا نے حقیقت کو پالیا ہے اس لیے فوراً ہی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟ میں کیا جان بوجھ کر بیماری کا ناٹک کررہی ہوں؟''

''نہیں میری جان، میں بھلا تجھ پر ایسا الزام کیسے لگا سکتی ہوں؟ بس تیری اچانک طبیعت خراب ہونے کا کارن مجھے سمجھ آگیا ہے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا ہوجاتا ہے کہ جب وہ اپنے جیون میں کسی نئے تجربے سے گزرنے جارہے ہوتے ہیں تو گھبراہٹ کے مارے اپنی طبیعت ہی خراب کر بیٹھتے ہیں۔ تیرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ تُو گھبرا گئی کہ جانے تیرے ساتھ کیا ہوگا اس لیے ٹینشن سے تیری طبیعت خراب ہوگئی۔ کیوں جوہی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس نے کمرے میں موجود جوہی سے تصدیق چاہی۔

''ٹھیک ہی کہہ رہی ہوگی لیکن اب یہ بھاشن مارنا چھوڑ اور مجھے رنجنی کو دوا کھلانے دے۔ اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ وقت پر دوا دینا ضروری ہے۔'' جوہی نے بیزاری سے اس کی بات کا جواب دیا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ باتونی آشا پر اس کے جھڑکنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ہنس پڑی جیسے جوہی کی جھنجلاہٹ سے بھی لطف اندوز ہوئی ہو۔

جاوید علی کے جذبات البتہ ان دونوں سے مختلف تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اس پر کوئی شک نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس کی خرابیِ طبیعت کی بہترین وجہ ڈھونڈ لی گئی ہے۔ اطمینان کے اسی احساس کے ساتھ اس نے جوہی کا بڑھایا ہوا پانی کا گلاس تھاما اور بظاہر دوا منہ میں ڈالتے ہوئے ایک گھونٹ پانی سے اسے نگل لیا۔ لیکن اصل میں یہاں اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی اور دوا منہ میں ڈالنے کے بجائے غائب کردی تھی۔

''جا جوہی! تُو جا کر اپنے دوسرے کام کاج دیکھ لے۔ میں تھوڑی نیند لے کر اٹھ گئی ہوں۔ آرام سے رنجنی کی دیکھ بھال کرلوں گی۔'' بظاہر جاوید علی دوا کھا چکا تو آشا نے جوہی سے کہا۔ جوہی نے فوراً ہی اس کی بات مان لی۔

''تُو بھی آرام کر۔ میں یہاں بیٹھی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بتا دینا۔'' جوہی کے جانے کے بعد اس نے جاوید علی کو ہدایت کی اور خود ایک صوفے پر نشست جمالی۔ اس کی ہدایت پر جاوید علی نے فوراً ہی عمل کیا۔ عملاً وہ اب کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا اس لیے آرام کرلینا ہی مناسب تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔ چند گھنٹوں کی پُرسکون نیند لینے کے بعد وہ اٹھا تو کافی رات ہوچکی تھی اور آشا بھی صوفے پر لڑھک کر سو چکی تھی۔ اس نے یہ سارا منظر دیکھا اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔ دبے قدموں چلتا ہوا وہ کسی کی بھی نظر میں آئے بغیر آسانی سے لان میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ بے شمار درختوں اور پودوں پر مشتمل لان اس وقت مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ایک کے سوا زیادہ تر لائٹیں بھی بند کردی گئی تھیں اس لیے خوب صورت پھولوں اور پھلوں سے بھرے اس لان کی دلکشی اس طرح چھپ گئی تھی جیسے کسی حسینہ نے اپنے چاند چہرے کو نقاب میں چھپالیا ہو۔ لیکن دیکھنے والی نظریں پھر بھی بھانپ لیں کہ اس نقاب کے پیچھے کچھ خاص موجود ہے۔ لان میں قدم رکھنے سے قبل ہی محسوس ہونے والی بھینی بھینی خوشبوئیں بھی اعلان کررہی تھیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا کچھ غیر معمولی ہے۔ بہرحال اسے اس وقت وہاں کی خوب صورتی یا بدصورتی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے وہاں آیا تھا کہ تنہائی میسر آسکے اور وہ ہیڈ کوارٹر کو اپنی آج کی رپورٹ دے سکے۔ اس کے لیے لازم تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار لازماً ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کرے گا تاکہ وہ لوگ اس کی خیریت سے باخبر رہ سکیں۔ دوسری صورت میں اسے کسی مشکل میں تصور کرکے وہاں سے ایکشن لیا جاسکتا تھا۔ آج وہ جس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، اس کے لیے اپنے معمول پر کاربند رہنا ممکن نہیں رہا تھا ورنہ کسی کے کہے بغیر اس نے ازخود یہ معمول بنا لیا تھا کہ رات کے کھانے سے فراغت پا کر جب اپنے کمرے میں جاتا تو ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دے دیتا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس معمول میں فرق آنے سے وہاں تشویش محسوس کی جارہی ہوگی۔

''خیریت ہے؟ آج تم روٹین سے کافی لیٹ ہوگئے ہو؟'' جیسے ہی اس کا ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ہوا، وہاں سے پہلا سوال یہی کیا گیا۔

''میں ٹھیک ہوں بس ذرا پھنس گیا تھا اس لیے وقت پر رابطہ نہیں کرسکا۔'' اس نے جواباً کہا اور پھر دھیمی آواز میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''گڈ! تم نے خاصی حاضر دماغی سے کام لیا... لیکن یاد رکھو کہ کوئی بھی بہانہ لمبے عرصے تک نہیں چل سکتا اس لیے تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کرکے وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' اس کی کارکردگی کو سراہنے کے ساتھ ساتھ اسے ہدایت کی گئی۔

''میں پوری کوشش کررہا ہوں۔ یہاں سب سے خاصا گھل مل بھی گیا ہوں لیکن ابھی تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ نواب کے کردار کے بارے میں بھی صرف یہی پتا چلا ہے کہ وہ تھوڑا سا نفسیاتی اور عیاش طبع شخص ہے... لیکن اس کے کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہونے کے آثار نہیں ملے ہیں۔ بہرحال میں کوشش کررہا ہوں، جونہی کوئی خاص بات معلوم ہوئی، آپ کو فوراً مطلع کردوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے، بائے۔'' دوسری طرف سے فوراً ہی رابطہ منقطع کردیا گیا۔ وہ ایک گہرا سانس لیتا ہوا واپسی کے لیے پلٹا لیکن وہاں کسی کو پستول بدست کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ مدھم روشنی کے باوجود وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک لڑکی تھی جس کا قد پانچ فٹ دو انچ سے زیادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں موجود پستول کی نال کا رخ اسی کی طرف تھا۔

''خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی ماردوں گی۔'' اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ غرائی لیکن لہجے میں ایسی لرزش تھی کہ جاوید علی نے بھانپ لیا، یہ دھمکی محض دھمکی ہے اور وہ عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس کے بولنے سے جاوید علی کا یہ ابہام بھی دور ہوگیا تھا کہ جسے وہ لڑکی سمجھ رہا ہے کہیں کوئی خواجہ سرا ہی نہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کے زنانہ بہروپ میں موجود فورس کے علاوہ اگر کوئی سچ مچ کی لڑکی موجود ہے تو وہ نواب صاحب کی بیٹی شازمین ہے۔ لمحوں میں ہر بات سوچ لینے کے بعد اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور جست لگا کر شازمین پر جا پڑا۔ اسے یقیناً امید نہیں تھی کہ پستول کی موجودگی کے باوجود وہ اس پر حملہ کرنے کی ہمت کرسکے گا اس لیے وہ خود کو بچانے کے لیے کچھ نہ کرسکی اور جاوید علی اس کو لیے ہوئے زمین پر اس طرح گرا کہ شازمین کا نرم و نازک بدن اس کے نیچے تھا۔

''اف اللہ! ہٹو میرے اوپر سے ورنہ میں دم گھٹ کر مرجاؤں گی۔'' وہ کراہتے ہوئے جھنجلا کر بولی تو جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ نازک سی لڑکی کس مشکل میں ہے۔ وہ فوراً اس کے اوپر سے ہٹ گیا لیکن اس کے اس ہاتھ کو نہ چھوڑا جس میں لمحہ بھر پہلے پستول دبا تھا۔ پستول اس کے حملے کے نتیجے میں نیچے گر چکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ تھامے تھامے دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا پستول اٹھایا۔

''بالکل جنگلی ہو۔ اتنی بُری طرح مجھے گرا دیا اور اس پر سے اپنا پہاڑ جیسا بوجھ لے کر اوپر بھی چڑھ بیٹھے۔ میری کوئی ہڈی وڈی ٹوٹ جاتی تو تم نقصان پورا کرتے کیا؟'' اپنے آزاد ہاتھ سے چھل جانے والی کہنی کو رگڑتے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا۔ جاوید علی نے صاف محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ ضرور ہے لیکن وہ خوف زدہ محسوس نہیں ہورہی۔ نہ ہی اس کا رویّہ ایسا تھا کہ وہ اس سے عداوت محسوس کررہی ہو۔ حالانکہ اس نے جاوید علی کی مردانہ آواز سن لی تھی اور اس کے طرزِ تخاطب سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کی حقیقت کو جان چکی ہے لیکن پھر بھی اس کے انداز میں ایسی کوئی تشویش نہیں پائی جارہی تھی جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ وہ خواجہ سرا کے روپ میں وہاں کسی مرد کو دیکھ کر پریشان ہوئی ہو۔ اس کا یہ غیر معمولی رویّہ خود جاوید علی کے لیے حیران کن تھا۔

''کون ہو تم؟'' اندازہ لگا لینے کے باوجود اس نے لڑکی سے سوال کیا۔

''اتنے احمق نہیں ہو تم کہ یہاں کسی لڑکی کو دیکھ کر یہ نہ جان سکو کہ یہ لڑکی کون ہے؟'' اس نے جھٹکے دار لہجے میں جواب دیا۔

''شازمین نوازش علی...'' جاوید نے اس سے تصدیق چاہی جس کے جواب میں اس نے محض سر ہلایا۔

''یہاں اتنی رات کو کیا کررہی تھیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''میرے باپ کی کوٹھی ہے یہ، تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟'' اس نے اسی جھٹکے دار لہجے میں جواب دیا۔

''سیدھی طرح جواب دو ورنہ ابھی گلا دبا کر یہیں دفن کردوں گا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوسکے گی کہ نواب نوازش علی کی اکلوتی صاحب زادی اپنے باپ کی کوٹھی میں ہی ایک گڑھے میں دفن ہے۔'' جاوید علی نے جھنجلا کر اسے دھمکی دی۔ ویسے اسے شازمین کے رویّے پر بدستور حیرت ہورہی تھی۔ وہ مکمل طور پر مطمئن اور بے خوف تھی۔

''اپنی یہ خواہش بھی پوری کرلو لیکن یاد رکھنا کہ اس کے بعد تم آسانی سے اس کوٹھی کی ہسٹری معلوم کرنے کا ایک سنہری موقع کھو بیٹھو گے۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے مزے سے جو جواب دیا اس سے ظاہر ہوگیا کہ وہ اس کی ہیڈ

کوارٹر سے ہونے والی گفتگو بھی سن چکی ہے۔ یعنی وہ اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ایک طرف تو اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ خواجہ سرا کے روپ میں وہ ایک مرد تھا، دوسرے وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ وہ جاسوسی کے ارادے سے وہاں آیا ہے۔ لاشعوری طور پر شازمین کی کلائی پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

"میری کلائی توڑو گے کیا؟ یاد رکھو میں اپنی موت تو تمہیں معاف کر سکتی ہوں لیکن لنگڑا لولا ہونا کسی صورت معاف نہیں کروں گی۔" اس نے احتجاج کیا تو جاوید علی نے اس کی کلائی ہی چھوڑ دی۔ اتنی دیر میں وہ ویسے بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہی ہے بلکہ ایک طرح سے اس کا انداز دوستانہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ جاوید علی کی وہاں موجودگی اس کے لیے خوش گوار ثابت ہوئی ہو۔

"تھینک یو۔" اس کی سوچوں سے بے پروا شازمین نے اپنی کلائی کو رگڑتے ہوئے دورانِ خون کو رواں کرنے کی کوشش کی اور بولی۔ "چلو وہاں اس درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ویسے تو یہاں کوئی نہیں آتا لیکن اگر اتفاق سے آنکلا تو خوامخواہ کی پنچایت شروع ہو جائے گی۔"

اپنی بات کہنے کے بعد وہ فوراً ہی کھڑی بھی ہو گئی۔ جاوید علی نے کسی معمول کی طرح اس کی پیروی کی۔ ویسے بھی اسے شازمین سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں پیش آ رہی تھی اور اس کا پستول بھی اس کے قبضے میں تھا۔ پستول شازمین کے پاس ہوتا، تب بھی اس کے لیے زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی کیونکہ کچھ دیر قبل ہی وہ اس کا اناڑی پن دیکھ چکا تھا۔ اس نے اس پر پستول تان ضرور رکھا تھا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس ہتھیار کے استعمال میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ اس کا یہ اناڑی پن اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں ہے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی تھیں؟" وہ دونوں درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ گئے تو جاوید علی نے ایک بار پھر گفتگو چھیڑی۔

"میں نے تم سے بھی تو نہیں پوچھا کہ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے تھے؟" اس نے ترنت جواب دیا۔

"تم نے اس لیے نہیں پوچھا کہ تم جان چکی تھیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔" اس بار اس نے بھی بھڑکے بغیر پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ جب وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ وہ اس کی گفتگو سن چکی ہے تو پھر کھل کر بات کر لینے میں کیا حرج تھا۔ اب اس نے شازمین کے غیر معمولی رویّے پر حیران ہونا بھی ترک کر کے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کوٹھی میں موجود ہر کردار کی طرح وہ بھی عجیب و غریب اور پُراسرار ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس سے کھل کر بات کرے تو اس کی پُراسراریت میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔

"مجھے اکثر رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ جاگتے جاگتے کبھی گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جائے تو کبھی کبھی یہاں لان میں آ جاتی ہوں۔ یہاں آ کر مجھے بہت سکون کا احساس ہوتا ہے۔ آج بھی میں یہاں اسی لیے آئی ہوئی تھی... کہ تمہیں یہاں آتے دیکھا۔ میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گئی کیونکہ بابا کے کسی ملازم سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم اپنی دانست میں خود کو تنہا سمجھ کر بات کرنے لگے۔ میں نے تمہاری ساری باتیں سن لیں اور چاہتی تو تمہیں بے خبری میں یہاں سے جانے دیتی لیکن میں جان بوجھ کر تمہارے سامنے آئی اور تمہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔"

"لیکن کیوں؟ تم چاہتیں تو بعد میں بہت آرام سے مجھے پکڑوا سکتی تھیں۔" جاوید علی نے استفسار کیا۔

"بالکل پکڑوا سکتی تھی لیکن پکڑوانا نہیں چاہتی تھی... بلکہ تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری صورت میں مجھے ایک ایسا شخص مل گیا جس کا مجھے انتظار تھا، جسے میں تلاش کر رہی تھی اور مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ شخص مجھے اتنی آسانی سے اپنی ہی کوٹھی کے لان میں اتنی اچانک مل جائے گا۔"

لان میں روشنی کم تھی اس لیے وہ شازمین کے قد کاٹھ کا تو اندازہ لگا سکتا تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش اس پر پوری طرح واضح نہیں تھے۔ صرف یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نازک سی کم عمر لڑکی ہے البتہ اس کی آواز بڑی لوچ دار اور پُرکشش تھی جس کا سحر وہ پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

"میں تمہاری بات صحیح سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ آخر تمہیں میری تلاش کیوں تھی اور تم مجھے دیکھ کر کیوں خوش ہوئیں؟" اس نے اس سحر میں گرفتار ہونے کے بجائے اپنی الجھن رفع کرنا ضروری سمجھا۔

"یہ ایک خاصی طویل داستان ہے جو میں تمہیں ابھی نہیں سنا سکتی۔ البتہ مجھے امید ہے کہ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گی، اسے سن کر تمہاری بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی اور تم میری الجھن بھی دور کرنے میں مدد کرو گے لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا صبر کرنا ہوگا۔ کل رات پھر تم اسی وقت یہاں آنا۔ میں تمہیں...... ساتھ لے کر اپنے کمرے میں جاؤں گی پھر وہاں ہم کھل کر باتیں کریں گے۔" وہ یکدم ہی کھڑی

ہو گئی اور خوشبو کے جھونکے کی طرح آگے بڑھ گئی۔ جاوید علی اسے روک نہیں سکا لیکن اس کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ لان میں موجود انواع و اقسام کے پھول پودوں کی خوشبوؤں میں سے اس کی خوشبو کے کم ہونے کا احساس بڑا واضح تھا۔ ایک نازک، نوعمر اور کنواری دوشیزہ کی وہ خوشبو ہر خوشبو سے منفرد اور معطر تھی جس کی مہک وہ اب بھی اپنی اس ہتھیلی پر محسوس کر رہا تھا جس سے کچھ دیر قبل شازمین کی کلائی کو جکڑ رکھا تھا۔

☆☆☆

"یہ بہت بُرا ہوا شالنی! ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمارا مال پکڑا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم نے پارٹی سے ایڈوانس لیا تھا اور ڈیلیوری سے پہلے ہی مال پکڑے جانے کا مطلب ہے کہ ہمیں وہ روپے واپس کرنے ہوں گے یا اس کی جگہ دوسرا مال دینا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نقصان ہمارا ہی ہوگا۔" شالنی کسی مجرم کی طرح را کے مقامی عہدے دار ورما کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ مضطرب سا اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں شرمندہ ہوں سر... لیکن میرا وشواس کیجیے، اس سب میں میرا دوش نہیں ہے۔ میں نے اپنی طرف سے سب کام ٹھیک کیا تھا۔ مال اس پوائنٹ پر پہنچ گیا تھا جہاں ڈیلیوری ہونی تھی۔ پارٹی کو بھی میں نے سب سمجھا دیا تھا۔ اب یہ بھگوان ہی جانتا ہے کہ بات لیک کیسے ہوئی۔ لیکن مجھے شک ہے کہ گڑبڑ دوسری پارٹی کی طرف سے ہی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان پولیس یا کسی خفیہ ادارے کا جاسوس موجود ہو اور اس نے میری کال کے بعد مخبری کر دی ہو۔ آپ ریڈ کا وقت دیکھیں۔ جس وقت پارٹی ڈیلیوری لینے پوائنٹ پر پہنچی ہے، عین اسی وقت ریڈ ہوا ہے۔ اس سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ پولیس کو وہ لوگ اپنے پیچھے لگا کر لائے تھے۔"

شالنی نے اپنی صفائی پیش کی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد شمشان گھاٹ سے نوازش علی کی کوٹھی پر واپس جانے کے بجائے راستے میں ہی اتر گئی تھی جہاں سے ایک پرانے آشنا نے اسے پک کر لیا تھا۔ رات اس آشنا کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ وہیں سے سیدھی ائرپورٹ پہنچ گئی تھی۔ موڈ غارت نہ ہو اور کوئی ڈسٹرب نہ کرے، اس خیال سے اس نے رات بھر اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ صبح ناشتے اور ائرپورٹ روانگی کی جلدی میں اسے آن کرنا یاد نہیں رہا۔ افراتفری میں نہ اخبار دیکھنے کا موقع ملا، نہ کوئی نیوز چینل لگا کر دیکھا اور وہ مکمل بے خبری میں کراچی سے لاہور پہنچ گئی۔ یہاں پہنچ کر بھی اس نے موبائل آن کرنے کے بجائے سو کر سفر اور دیگر مصروفیات کی تھکن اتارنے کو ترجیح دی اور ملازمہ کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت دے کر سو گئی۔ شام کے قریب جاگی تو واقعے کی خبر ہوئی۔ اس نے خبر سن کر اپنا سر پیٹ ڈالا۔ نیوز چینلز نے اس واقعے کی خبر بہت سرسری انداز میں چلائی تھی اور صرف یہ بتایا گیا تھا کہ کراچی اولڈ سٹی کے ایک شمشان گھاٹ میں کچھ مشکوک افراد کی موجودگی کے شبہے میں گشتی پولیس نے کارروائی کر کے چند افراد کو اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ اسلحہ پکڑے جانے کا سرے سے کوئی ذکر نہیں تھا جس سے اسے یہ خوش فہمی ہوئی کہ شاید پولیس کا خطرہ بھانپ کر اس کے آدمیوں نے پہلے ہی اسلحے سے بھرا تابوت کنوئیں میں پھینک دیا ہوگا لیکن ورما کی کال نے اس کی اس خوش گمانی کو بھی دور کر دیا۔

اس کے پاس پکی رپورٹ تھی کہ فائرنگ کے بھرپور تبادلے کے بعد مال سمیت بندوں کی گرفتاری عمل میں آئی ہے، تاہم اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ گرفتار ہونے والوں میں زندہ، مُردہ اور زخمیوں کی تعداد کتنی ہے۔ خود شالنی کو انڈرگراؤنڈ ہو جانے کا حکم دیا گیا۔

ہر قسم کے رابطے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی لیکن وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ موقع ملتے ہی ورما سے ملاقات کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ حکم عدولی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنا بڑا واقعہ ہو جانے کے باوجود اسے کسی نے نہیں چھیڑا تھا ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پولیس فوراً اس کی گرفتاری کے لیے بھی دوڑ پڑتی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کا یہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ یا تو پولیس اس کے بندوں کو زندہ گرفتار کرنے میں ناکام رہی ہے یا پھر ابھی تک ان کی زبان نہیں کھلوا سکی ہے۔ اپنے اس یقین کی وجہ سے وہ ورما کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔

راستے میں اس نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط کی کہ کسی کو اپنے پیچھے لگا کر نہ لے جائے۔ بہت دھیان دینے کے باوجود اسے کوئی تعاقب میں نظر نہیں آیا۔ وہ مزید مطمئن ہو گئی کہ شک کی زد میں نہیں ہے۔ ایک طرف کے اس اطمینان کے بعد اس کے لیے دوسرا اور زیادہ اہم مرحلہ ورما کو اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلانا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اپنوں کا مزاج بگڑ جائے تو وہ سخت بے رحمی پر اتر آتے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے حق میں ہموار کرنا ضروری ہے۔ اسے اپنی رہائش گاہ پر پا کر پہلے تو ورما خوب چیخا چلّایا

کہ وہ اس کی حکم عدولی کرتے ہوئے منظر پر کیوں آئی ہے۔ بڑی مشکل سے شالنی نے اسے یقین دلایا کہ وہ مشکوک افراد میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ پتا نہیں ورما کو یقین آیا یا نہیں لیکن بہرحال اس نے اپنے غصے کو کنٹرول کرلیا اور ذرا مہذب انداز میں اس سے گفتگو پر آمادگی ظاہر کردی اس طرح شالنی کو بھی اپنی صفائی دینے کا ایک موقع مل گیا۔

''پارٹی الزام لگا رہی ہے کہ مخبری ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کے سارے لوگ پرانے اور بھروسے کے لائق ہیں اس لیے وہ اپنے لوگوں پر کسی صورت شک نہیں کرسکتے۔'' ورما نے اسے بتایا۔

''وہ تو یہی کہیں گے تاکہ انہیں نقصان نہ ہو اور سارا بوجھ ہمارے اوپر آجائے۔'' شالنی فوراً ہی چمک کر بولی۔

''اس طرح کے معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ شک دونوں ہی طرف کے لوگوں پر کیا جاتا ہے اس لیے دکھاوے کی الزام تراشی اپنی جگہ لیکن ہمیں اپنی طرف کے بندوں کو چیک تو کرنا پڑے گا۔ تو بتا، تیرے بندوں میں سے تو کسی کے گڑبڑ کرنے کا ڈر نہیں ہے نا؟'' ورما نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر! سب بھروسے کے لوگ ہیں اور پھر اس ڈیل کا تو میرے سوا کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ تابوت میں اسلحہ بھرنے سے لے کر شمشان گھاٹ تک پہنچانے تک کا ہر کام آپ کے اپنے بھروسے کے لوگوں نے کیا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ کام کتنی ایمرجنسی میں میرے حصے میں آیا تھا۔ اگر اچانک ہی رتی کی موت نہ ہو جاتی تو کون سوچ سکتا تھا کہ مال کی ڈیلیوری کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جائے گا۔'' شالنی نے اپنے حق میں دلیل دیتے ہوئے پُرزور لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے پاس اطلاع ہے کہ اسی روز تو ایک نیا پیس لے کر نوازش علی کی کوٹھی پر گئی تھی اور وہ رتی کے کریا کرم میں بھی شامل تھا۔'' ورما کی معلومات سے ظاہر تھا کہ اس نے اپنے ماتحتوں کو بالکل آزاد نہیں چھوڑ رکھا کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں اور اسے خبر نہ ہو۔ اس کے اپنے کچھ اور ذرائع بھی تھے جن سے اسے معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔

''وہ تو ایک معمول کی بات تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نواب نوازش علی کو ایسے تحفے دیتی رہتی ہوں۔ رتی اس کو بہت پسند تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ اس کی موت پر نواب بہت اداس ہوگا اس لیے اتفاق سے اسی روز خود تک پہنچنے والی رنجنی کو نواب کا من بہلانے کے لیے اپنے ساتھ کرا کے لے گئی۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے کچھ روز کے لیے وہاں رہنے دوں گی اور پھر بہانے سے واپس بلوا کر اپنے مطلب کی ٹریننگ دے دوں گی۔ ویسے وہاں بھی میں نے آشا کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں اسے بہت کچھ سکھا دے گی۔ جو کسر رہ گئی، وہ میں بعد میں پوری کردوں گی۔'' اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

''ہوسکتا ہے رنجنی کچھ گڑبڑ ہو کیونکہ وہی تم لوگوں کے درمیان نئی تھی اور ہم اس پر پوری طرح وشواس نہیں کرسکتے۔'' ورما نے صاف لفظوں میں اپنے شک کا اظہار کیا تو شالنی کے ذہن کے پردے پر بھی یکدم وہ منظر ابھر آیا جب اس نے رنجنی کو سب کے درمیان سے غائب پایا تھا اور بعد میں وہ اس بہانے کے ساتھ شمشان گھاٹ کے باہر سے واپس آئی تھی کہ رفع حاجت کے لیے گئی ہوئی تھی... لیکن وہ یہ بات ورما کو بتا کر اپنی مصیبت کو آواز نہیں دے سکتی تھی اس لیے جلدی سے بولی۔

''ارے نہیں سر! وہ تو بہت سیدھی سادی ہے۔ چھوٹے علاقے سے آئی ہوئی ہے اس لیے ڈھنگ سے بات تک کرنا نہیں جانتی، مخبری کیا خاک کرے گی۔ ویسے بھی وہاں اسے میں نے مستقل اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی موقع ہی نہیں تھا کہ وہ مخبری وغیرہ کرسکے۔''

''ٹھیک ہے تُو مطمئن ہے تو میں بھی مطمئن ہو جاتا ہوں۔ اب بتا کہ آگے کا کیا سوچا ہے؟ پکڑے جانے والے بندوں میں سے کسی نے تیرا نام اگل دیا تو تُو بُری طرح پھنس جائے گی۔'' ورما نے سب سے اہم نکتہ چھیڑا۔

''مشکل ہے سر! پولیس والے ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچے تو سمجھ لیں کہ اب تک ہمارے لوگوں کی زبان بند ہے اور اب اتنا وقت گزر چکا ہے کہ سمجھا جاسکتا ہے، ان بے چاروں پر تشدد کا ہر حربہ آزمایا جاچکا ہوگا۔ ہمارے سورماؤں نے جب اب تک کچھ نہیں اگلا تو آگے بھی نہیں اگلیں گے۔ ویسے میں احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے انڈرگراؤنڈ رہوں گی۔ ابھی تو اس کارن باہر نکلی تھی کہ آپ سے مل سکوں اور اگر آپ کے من میں میرے لیے کوئی میل آگیا ہو تو اسے دھو سکوں۔''

شالنی کا سارا زور اس بات پر تھا کہ کسی طرح ورما کو یہ باور کروا سکے کہ وہ ہر طرح سے بے قصور ہونے کے ساتھ ساتھ شکوک و شبہات سے بھی محفوظ ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی ذات سے انہیں خود کو نقصان پہنچنے کا ذرا بھی احتمال ہوا تو وہ خود اسی سے بدک جائیں گے اور اس کا انجام بخیر نہ ہوگا۔

''تُو نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ تیرا انڈرگراؤنڈ رہنا ہی بہتر ہے بلکہ ایسا کر یہاں سے واپس ہی نہ جا۔ میرا یہ ٹھکانا محفوظ ہے۔ تُو آرام سے یہاں مہینوں بھی چاہے تو چھپی رہ سکتی ہے۔ کھانے پینے اور تفریح کی تجھے کوئی کمی نہیں ہو گی۔ بس تو یہاں سے باہر نہیں جاسکے گی۔'' ورما نے فوراً ہی اس سے اتفاق کرتے ہوئے ایک پیشکش بھی کردی اور اتنا تو شالنی بھی سمجھتی تھی کہ باس کی پیشکش صرف پیشکش نہیں ہوتی جسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ماتحت کو حاصل ہو۔ وہ ایک حکم ہی تھا جس کی ہر حال میں تعمیل کی جانی تھی۔

''دھنیواد سر! یہ تو میرے لیے بڑے گرو کی بات ہو گی کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے دولت کدے پر رہ سکوں۔'' اس نے خوشامدانہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے پیشکش نما حکم کو قبول کرلیا۔

''ٹھیک ہے، تم جا کر گیسٹ روم میں آرام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس معاملے کو کیسے ہینڈل کیا جائے۔ اگر تم سے مشورہ لینے کی ضرورت پڑی تو بلوالوں گا۔'' ورما نے اسے اجازت دی تو وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ باس کا سامنا کرنا اس کے لیے خاصا اعصاب شکن ثابت ہوا تھا اور ورما کو کافی آسانی سے اپنے دلائل سے قائل کرلینے کے باوجود وہ عجیب سے اضطراب کا شکار تھی۔ گیسٹ روم میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے کیبنٹ میں موجود شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل منتخب کی اور اپنے لیے ڈرنک تیار کرکے غٹاغٹ چڑھا گئی۔ تیز شراب نے اس کے سینے کو جلا ڈالا لیکن وہ اپنی اعصابی کشیدگی کو خاصا کم محسوس کرنے لگی۔ اس نے ایک کے بعد فوراً ہی دوسرا پیگ تیار کرلیا لیکن پہلے کی طرح اسے ایک سانس میں چڑھانے کے بجائے پُرسوچ انداز میں ٹھہر ٹھہر کر پینے لگی۔ آدھا پیگ پینے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون نکال کر آن کیا اور اس پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ورما کی طرف سے موبائل وغیرہ کے استعمال پر پابندی عائد کیے جانے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے آن کرکے اس پر کسی سے رابطہ کررہی تھی، وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ فون میں پرانی کی جگہ نئی سم ڈال لی تھی۔ یہ کام اس نے یہاں آنے سے پہلے ہی کرلیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آشا سے رابطہ کرکے کراچی کی خیر خبر لے گی لیکن پھر یہ کام ورما سے ملاقات کے بعد تک کے لیے ٹال دیا۔ ملاقات تو ہو چکی تھی، یہ اور بات ہے کہ وہ اس ملاقات کے بعد واپس نہیں جاسکی تھی لیکن ملاقات میں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں اب کراچی سے رابطہ کرنا اور بھی ضروری ہوگیا تھا اس لیے اس نے پہلی فرصت میں آشا کا نمبر ملا ڈالا۔

''ہیلو کون؟'' نیا نمبر دیکھ کر آشا نے محتاط انداز میں کال ریسیو کی۔

''میں ہوں آشا تیری شالنی؟'' اس نے نہایت لگاوٹ سے اپنا تعارف کروایا۔

''نمستے دیدی! کہیں کیا حال ہیں؟'' آشا اس کی آواز سن کر کھل اٹھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تُو اپنی سنا اور اس نئی مینا کی بھی جسے تیرے حوالے کرکے آئی ہوں۔'' وہ فوراً ہی اصل مطلب پر آگئی۔

''میں ٹھیک ہوں دیدی! لیکن رنجنی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔'' آشا اسے تفصیل سے سارا قصہ سنانے لگی۔ شالنی نے توجہ سے اس کی ساری بات سنی اور نواب صاحب کی خدمت میں حاضری کے وقت رنجنی کے اچانک بیمار پڑ جانے کا سن کر مزید مضطرب ہوگئی۔

''میری بات سن آشا! رنجنی پر سخت نظر رکھ۔ وہ کچھ گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔ اس کی وجہ سے میرا ایک بہت خاص کام رک گیا ہے اور جان مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ بچت کی یہی صورت ہے کہ اسے ثبوتوں کے ساتھ پکڑوا دوں۔'' اس نے آشا کو ہدایات جاری کیں تو پریشانی صاف اس کے لہجے سے ہویدا تھی۔

''تھوڑا کھل کر بتائیں دیدی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟'' آشا فوراً اس کے لیے پریشان ہو گئی۔

''ابھی تک تو میں ٹھیک ہوں۔ تُو زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے جو میں نے کہا ہے وہ کر... اور ہاں، یاد رکھنا کہ کاجل کو اس بات کی ہوا نہ لگ سکے۔ تجھے معلوم ہے کہ مجھے اس پر شک ہے کہ وہ وہاں رہ کر میرے خلاف جاسوسی کا کام کرتی ہے۔'' شالنی نے ذرا سخت لہجے میں اسے ٹوکتے ہوئے اسے ایک اور ہدایت دی اور پھر سلسلہ منقطع کرکے موبائل آف کردیا۔ اس وقت وہ آشا کی محبت اور تشویش بھرے استفسارات سننے اور وضاحتیں دینے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ابھی اس نے موبائل ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ تیزی سے کھلا اور ورما خوفناک منہ والی گن کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''مجھے معلوم تھا کہ اس مصیبت کے پیچھے تُو ہی ہے۔

اگر تُو زندہ رہی تو تیرے پیچھے دوسری مصیبتیں چلی آئیں گی اس لیے تیرا اس سنسار سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور شالنی کی کوئی بھی بات سننے سے قبل فائر کر ڈالا۔ ششدر بیٹھی شالنی اپنے بچاؤ کے لیے جگہ سے ہل بھی نہیں سکی اور گولی سیدھی اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔ اس کی موت کا اطمینان ہو جانے پر ورما نفرت سے تھوکتا ہوا باہر نکل گیا۔

شالنی کے قتل کی خبر فوراً ہی ذیشان تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ شالنی اپنی دانست میں بغیر کسی کی نظروں میں آئے ورما سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن اس کی نگرانی پر مامور سی ایف پی کا ایک اہلکار مستقل اس کے تعاقب میں لگا رہا تھا۔ شالنی کے سارے واقعے کے بعد پہلی بار، وہ بھی بہت محتاط انداز میں باہر نکلنے پر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی خاص شخص سے ملاقات کے لیے جارہی ہے۔ اس نے فوراً دفتر فون کر کے اطلاع دی جہاں سے اس کی مدد کے لیے دوسرا شخص روانہ کرنے کا عندیہ دیا گیا۔ دوسرے شخص کو بھجوانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شالنی جس سے ملاقات کے لیے جارہی ہے، اس کی بھی نگرانی کی جاسکے لیکن وہاں تو کہانی ہی کچھ اور ہوگئی۔ شالنی جس مکان میں داخل ہوئی، وہاں سے باہر ہی نہیں نکلی۔ سی ایف پی کے دونوں اہلکار بڑے صبر سے انتظار کرتے رہے۔ اگر انہیں غیر ضروری مداخلت سے روکا نہ گیا ہوتا تو شاید وہ مکان کے اندر کود کر صورتِ حال جاننے کی کوشش کرتے لیکن ہدایات کی روشنی میں انہیں صرف نگرانی تک محدود رہنا پڑا۔ ان کے کان اس وقت کھڑے ہوئے جب انہوں نے مکان کے اندر سے فائر کی آواز سنی۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن بہرحال وہ اتنی اہلیت رکھتے تھے کہ فائر کی آواز اور سمت کا درست تعین کر سکتے۔

دونوں آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب انہیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ دونوں ہی اندر جا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے حق میں تھے لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور ایک کار بڑی تیزی سے مکان سے برآمد ہوئی۔ کار کی اگلی نشست پر باوردی ڈرائیور موجود تھا جبکہ پچھلی نشست ادھیڑ عمر کے خاصے رعب دار چہرے والے شخص نے سنبھال رکھی تھی۔ کار کے منظر پر آتے ہی سی ایف پی کا بعد میں آنے والا اہلکار مکان کے اندر جانے کا خیال بھول کر اس کے تعاقب میں روانہ ہوگیا کیونکہ اس کی اصل ڈیوٹی بھی یہی تھی۔ اسے اسی مقصد کے لیے وہاں بھیجا گیا تھا کہ شالنی جس شخص سے ملاقات کے لیے گئی ہے اس کا تعاقب کرے۔

البتہ شالنی کے تعاقب میں آنے والے نے کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مکان کے اردگرد گھوم کر سن گن لینے سے اسے اندازہ ہوگیا کہ مکان خالی ہے اور شاید ہی وہاں کسی ذی نفس کی موجودگی کا امکان ہو۔ اپنے اندازے کے باوجود وہ بہت احتیاط سے مکان کے اندر داخل ہوا۔ مکان کی اندرونی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہاں باقاعدگی سے صفائی اور دیکھ بھال کا کام نہ ہوتا ہو۔

ایسا اس لیے تھا کہ ورما وہاں مستقل نہیں رہتا تھا۔ مہینے میں صرف دو دن ایسے تھے جب وہ یہاں آیا کرتا تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان مخصوص دو دنوں میں بھی لازماً وہاں آئے۔ اپنی دیگر مصروفیات میں الجھ کر اکثر وہ نہیں بھی آتا تھا۔ بے چاری شالنی نے تو صرف قسمت آزمائی تھی اور قسمت کی خرابی سے ہی ماری گئی تھی، ورنہ شاید اسے کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی۔ عارضی طور پر استعمال ہونے والے اس مکان میں کوئی مستقل ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ ورما یہاں آتا تو اس کے ساتھ آنے والا ڈرائیور ہی جھاڑ پونچھ اور تھوڑی بہت صفائی کا کام کر دیتا۔ مکان میں داخل ہونے والے سی ایف پی کے اہلکار کو وہاں داخل ہوتے ہی جس ویرانی اور بے سروسامانی کا احساس ہوا تھا، وہ اسی وجہ سے تھا۔ اپنے احساس کے باوجود وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا رہا اور بیرونی احاطے کا چکر لگانے کے بعد اندر داخل ہوا۔ اندر کا حال باہر کی نسبت بہتر تھا۔ اسے ایک کمرا اس حالت میں نظر آیا کہ اسے ایک میز اور کرسیوں کی ترتیب سے دفتر کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہاں ٹیلی فون اور کمپیوٹر وغیرہ سمیت دیگر لوازمات موجود نہیں تھے۔ کئی خانوں پر مشتمل ایک کیبنٹ ضرور تھی لیکن اس کے بھی زیادہ تر خانے خالی پڑے ہوئے تھے۔ اگلے دو کمروں میں بھی اسے کچھ نہیں ملا لیکن تیسرا دروازہ کھولتے ہی وہ چونک گیا۔ شالنی کی لاش خون کے چھوٹے سے تالاب میں پڑی صاف نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ فائر کی جو آواز سنی تھی وہ یقینی طور پر شالنی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

اس نے نظر دوڑائی تو اسے لاش کے اردگرد کچھ نظر نہیں آیا حالانکہ اس کا ہینڈ بیگ جو یہاں آتے وقت اس کے ہاتھ میں تھا اردگرد ہی کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہینڈ بیگ کی غیر موجودگی سے یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ کچھ دیر قبل اسے مار کر وہاں سے فرار ہونے والے اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے

ہیں۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے واقعے کی خبر دی۔

''تم وہیں رک کر انتظار کرو۔ میں کسی کو تمہاری مدد کے لیے بھیجتا ہوں۔'' اس نے خبر سن کر اپنے ماتحت کو حکم دیا پھر فوری طور پر دفتر میں موجود اہلکاروں میں سے چند کو احکامات دینے لگا۔ شالنی کی لاش کے پاس موجود اہلکار سے بھی پہلے اس نے اپنے اس ماتحت کی مدد کے لیے بندہ بھجوایا جو شالنی کے قاتل کے تعاقب میں گیا تھا۔ رابطوں کی آسانی کے اس دور میں یہ ذرا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اس ماتحت کی لوکیشن سے واقف نہ ہو سکے۔ اس کی یہ عقل مندی کام دکھا گئی کیونکہ ورما پہلے ہی چوکنا تھا۔ اسے شک تھا کہ شالنی اپنے پیچھے کسی نہ کسی کو لگا کر اس مکان تک پہنچی ہوگی اس لیے فوری طور پر اس کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ورنہ آج وہ خاص طور پر اس لیے وہاں موجود تھا کہ عنقریب پہنچنے والے کچھ خاص ہتھیاروں کو مکان کے تہ خانے میں بہ حفاظت رکھنے کے انتظامات کا جائزہ لے سکے۔ یہ کام تو انجام نہ پاسکا البتہ شالنی کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے اسے کچھ فوری فیصلے کرنے پڑے جن میں شالنی کا قتل اور ہمیشہ کے لیے اس مکان سے دست برداری شامل تھی۔

مکان سے روانہ ہوتے وقت وہ پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے سی ایف پی کا اہلکار اپنی بے حد احتیاط کے باوجود اس کی نظروں میں آگیا۔ اپنے اندازے کی تصدیق اور اس سے جان چھڑانے کی خاطر اس نے ڈرائیور کو گاڑی بے مقصد اِدھر اُدھر دوڑانے کا حکم دے ڈالا۔ تعاقب کار نے کہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑا لیکن اس دوران اس کا ذیشان سے رابطہ ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو اپنی لوکیشن سے لمحہ بہ لمحہ آگاہ کرتے ہوئے وہ اس وقت پیچھے ہٹ گیا جب اس کا ساتھی اس کی جگہ لینے کے لیے آپہنچا۔ اس کے پیچھے ہٹ جانے نے بوکھلائے ہوئے مجرموں کو مطمئن کر دیا کہ انہوں نے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور وہ دوسرے اہلکار کو اپنے ساتھ چپکائے اپنی اصل رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔

ذیشان کو اس کی رہائش گاہ کے پتے سے آگاہ کرنے کے بعد اس کی ہدایت پر کامیاب تعاقب کرنے والا اہلکار بدستور نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ ذیشان کی زبانی یہ اطلاع شہریار تک بھی پہنچ گئی۔ ذیشان کا خیال تھا کہ شالنی کے ذریعے وہ کسی بڑے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور اب انہیں مسلسل اس کی نگرانی کروانی چاہیے تاکہ اس کے ذریعے اس کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچا جاسکے۔

شہر یار نے اس کے خیال کی تائید یا مخالفت میں کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنے ہی کسی خیال میں گم بولا۔ ''اپنے آدمی سے کہو کہ اس مشکوک بندے کا فوٹو لے کر تمہیں ''سینڈ'' کر دے۔ تم وہ فوٹو مجھے بھی ''سینڈ'' کر دینا اور اپنی قید میں موجود وکرم کو بھی دکھا دینا۔ میرے خیال میں وکرم اسے شناخت کر لے گا کہ وہ کون ہے؟''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ یہ جس قسم کا سیٹ اپ ہے اس میں پہلے بھی را کی انوالومنٹ پائی گئی ہے اس لیے اب بھی یہی قوی امکان ہے کہ شالنی کا قاتل را کا ہی کوئی کرتا دھرتا ہوگا اور تم یا وکرم اسے شناخت کر سکو گے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اس کی بات سے اتفاق کرلیا۔

وہ جانتا تھا کہ ماضی میں شہر یار کی را والوں سے وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہی تھیں۔ بہت ممکن تھا کہ حالیہ منظر پر آنے والے آدمی کو وہ پہچان لے اور وکرم تو تھا ہی را کا وہ ایجنٹ جسے انہوں نے موہنی کے ساتھ گرفتار کیا تھا اور زندہ رکھ کر اپنے مفاد میں استعمال کر رہے تھے۔

شہر یار کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ وکرم سے اس کا آپریٹس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس آپریٹس کے ذریعے وکرم نے اپنے مقامی باس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بخیریت ہے اور موہنی کی لاش ملنے کے بعد احتیاطاً اپنی رہائش گاہ سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہے۔ اس نے موہنی اور وفاقی وزیر کی قابلِ اعتراض فلم پر مشتمل سی ڈی کے بھی اپنے پاس موجود ہونے کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے یہ باور کروا دیا تھا کہ اس سے موہنی کی ملاقات بالکل عمومی حالات میں ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا، اس میں را سے تعلق کے بجائے اس کی خوب صورتی وجہ بنی تھی اور وہ تنہا سفر کرنے والی دیگر بدقسمت حسین خواتین کی طرح کسی کی ہوس کا نشانہ بن گئی تھی۔ دوسری طرف کے لوگوں کے پاس اس کی بات کا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ سی ایف پی نے انہیں یقین دلانے کے لیے پورا اہتمام کیا تھا۔ جس ویران مقام سے اس کی گاڑی اور لاش برآمد ہوئی، وہاں کا منظر نامہ ایسا تھا کہ پہلی نظر میں ہی دیکھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس عورت کے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی مرضی سے تیار کروائی گئی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ الگ مہرِ تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ بہر حال، اس سارے کھیل کا یہ نتیجہ نکلا کہ موہنی کی لاش وصول کرنے اس کا کوئی والی وارث سامنے نہ آیا اور اسی وزیر نے اپنے ایک ملازم کے ذمے اس کی آخری رسومات ادا کرنے کی ڈیوٹی لگا دی جس کی سیکریٹری کے طور پر وہ کام کرتے ہوئے دیگر بارسوخ لوگوں کو شکار کر رہی تھی۔

''موہنی مشن'' سی ایف پی کی کامیابی کا ایک اور ثبوت تھا۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی مختلف تھا اور اپنے قیام سے اب تک اس کا کوئی اہلکار معمولی سی بدعنوانی میں بھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ چودھری افتخار کے کارخانے کے تہ خانے کی نگرانی پر مامور دو اہلکاروں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ وہ بظاہر سی ایف پی کے کارکن تھے لیکن صرف اس سی ایف پی کے جو لوگوں کو ان کی خواہش پر منہ مانگے داموں سیکیورٹی گارڈز فراہم کرتی تھی۔ سیکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں کام کرنے والی سی ایف پی کے اصل ملازمین جنہیں حساس ذمے داریاں سونپی جاتی تھیں، بالکل الگ تھے اور ان کی کارکردگی اب تک قابلِ تحسین رہی تھی۔

شہر یار کی فرمائش پر ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو اس نے موقع ملتے ہی آدھے گھنٹے بعد اسے ورما کی تصویر سینڈ کر دی۔ اس نے یہ تصویر فوراً ہی شہر یار کو فارورڈ کر دی اور ساتھ ہی وکرم کے پاس شناخت کے لیے گیا۔ وکرم تصویر شناخت نہیں کر سکا۔ اس کا بیان تھا کہ اس کے تعلقات اپنے ہی لیول کے لوگوں تک محدود ہیں اور کسی بڑے نے آج تک اس سے براہِ راست ملاقات نہیں کی۔ جو بھی ہدایات ملتی ہیں، وہ فون یا آپریٹس پر کوڈ ورڈ میں دی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ نہیں جانتا کہ یہ تصویر کس شخص کی ہے البتہ شہر یار تصویر دیکھتے ہی اچھل پڑا۔

ورما کو پہچاننے میں اس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ پہلے کے مقابلے میں بہت تبدیل کر لیا تھا اور اگر راہ چلتے اس پر سرسری سی نظر پڑتی تو وہ شاید اسے پہچان بھی نہیں پاتا لیکن تصویر میں تو وہ پوری فرصت سے اس کے ہر نقش کا جائزہ لے سکتا تھا۔ ورما کے ایک بار پھر سامنے آجانے کے خیال سے اس کے اعصاب تن سے گئے۔ یہی تو وہ شخص تھا جس کے ہاتھوں اس کے خاندان کی تباہی کا آغاز ہوا تھا۔ خواجہ سراؤں کے مذہبی گرو کی حیثیت سے اس نے پہلے اس کی پیاری بھتیجی شینا کو بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور جب شفقت پدری سے تڑپتے سجاد رانا نے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کھوجنا چاہا تو باوجود یہ کہ وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں ڈی آئی جی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خاصے اثر رسوخ کے مالک تھے، انہیں سرِعام فائرنگ کے ذریعے ہلاک کر دیا

گیا۔ یہ دو حادثے رانا خاندان کے لیے اتنے گہرے زخم چھوڑ گئے تھے کہ اب وہ ساری زندگی اس کی تکلیف سے نجات حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے لیاقت رانا اور بیگم آفرین کے پاس ان صدموں کو سہنے کے بعد اگر حصولِ خوشی کی کوئی واحد شکل رہ گئی تھی تو وہ شہر یار کی صورت میں تھی اور اس جنگ میں کودنے کے بعد وہ بھی ان کے لیے ایک ہستی ہو گیا تھا جس کے حوالے سے خوش کن خواب دیکھنے کے بجائے اب انہیں دن رات بس اس کی سلامتی کی دعائیں ہی مانگنی تھیں۔ رہیں سجاد رانا کی بیوہ مریم تو وہ بے چاری بھی اپنی زندگی کے محض چوتھے عشرے میں ہی زندگی کی گہما گہمی سے محروم ہو گئی تھیں۔ نوعمر اکلوتی بیٹی اور شوہر کو کھونے کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ ان کی ویران آنکھیں ان کے چاہنے والوں کے لیے رات دن جاری رہنے والا ایک امتحان بن گئی تھیں اور کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا جو وہ ان کے دکھوں کے علاج کے لیے تجویز کر سکتا۔

ورما ایک ایسا شخص تھا جسے وہ نجی اور قومی دونوں سطح پر اپنے دشمن کے طور پر جانتا تھا۔ یہ دشمن ایک بار پہلے بھی اس کے ہاتھ آنے کے بعد نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب دوبارہ سامنے آیا تھا تو اس کے ہاتھ اس کی گردن ناپنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے لیکن اس بار وہ پہلے کی طرح کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے لیے آزاد نہیں تھا۔ ورما تک پہنچنے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ تھی کہ فی الحال اسے اپنی قیام گاہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے تبدیلی کے جس عمل سے گزارا جا رہا تھا، اس کے مکمل ہونے تک وہ اپنے انسٹرکٹر عمر فاروق سے یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسے یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت دے دیں گے۔ دوسرا مسئلہ سلو کی آمد کا تھا۔ وہ شدت سے خواہاں تھا کہ یہ نوجوان طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق پاکستان ضرور پہنچے تاکہ اسے اپنی نظروں میں رکھا جا سکے۔ ورما کو چھیڑنے میں اسے سب سے بڑا خطرہ ہی یہ لاحق تھا کہ موہنی کی موت کے بعد اگر فوری طور پر را کا ایک اور ایجنٹ نشانہ بن گیا تو را والوں کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور وہ اپنی برسوں کی محنت اور سرمائے سے تیار کردہ سلو نامی عفریت کو کھلے بندوں پاکستان بھیجنے سے گریز کریں گے۔ قیدیوں کے تبادلے کی صورت میں پاکستان پہنچنے کے بجائے اگر سلو خفیہ طریقے سے یہاں آتا تو یقیناً ان کے اس تک پہنچنے سے قبل خاصے نقصان کا احتمال تھا۔ وہ اپنے ملک کو یہ نقصان بھی پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا اور ایک دوراہے پر آ کھڑا تھا کہ کیا کرے؟ اگر ایک طرف ورما کو فوری طور پر شکنجے میں کسنے کی خواہش تھی تو دوسری طرف بہت سی ایسی رکاوٹیں جنہیں نظر انداز کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ بے چین سا اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا کہ شاید اس مسئلے کا کوئی حل دماغ میں آجائے...

☆☆☆

''میں ٹھیک ہوں آشا! تو اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ تو میری وجہ سے خوامخواہ بے آرام ہو۔ کل رات کی بات اور تھی لیکن آج تو میری حالت سنبھل گئی ہے۔ آج مجھے کسی تیماردار کی ضرورت نہیں ہے۔'' نواب نوازش علی کی کوٹھی میں رات کا کھانا معمول کے مطابق کھایا جا چکا تھا اور سب اپنی اپنی ذمے داریاں انجام دے کر اپنے لیے مخصوص کمروں میں چلے گئے تھے۔ جاوید علی بھی اپنے کمرے میں جو کبھی رتی کی ملکیت ہوا کرتا تھا، واپس آ گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ... تھوڑی دیر آرام کرے گا پھر مقررہ وقت پر شازمین سے ملنے لان میں چلا جائے گا لیکن کمرے میں آمد کے فوراً بعد ہی آشا اس کے پیچھے ہی وہاں چلی آئی اور ارادہ ظاہر کیا کہ آج رات بھی وہ اس کے کمرے میں ہی گزارے گی۔ وجہ اس نے یہی بتائی تھی کہ وہ بیماری کی حالت میں رنجنی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی کہ مبادا رات کو سوتے میں اسے کوئی ضرورت پڑے اور اکیلے ہونے کی وجہ سے پریشانی اٹھانا پڑے۔ اس کا یہ پروگرام جاوید علی کے لیے کسی طور مناسب نہیں تھا۔ کل رات بھی وہ لان سے واپس آیا تھا تو آشا جاگ چکی تھی اور اسے اس کے سامنے اپنے باہر جانے کی خاصی وضاحتیں پیش کرنی پڑی تھیں۔ آج بھی اگر وہ یہاں رہتی تو کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا اور جبکہ وہ آج کل کے مقابلے میں زیادہ اہم ضرورت کے تحت مقررہ وقت پر لان میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اسے آشا کی وہاں موجودگی کھٹک رہی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ خود اپنے کمرے میں سونے کے لیے تیار ہو جائے لیکن آشا بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ بجائے اس کی بات مان لیتی، چمک کر بولی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی ایک دو روز تک تیرے ساتھ اس کمرے میں ہی سوؤں گی۔ یہاں سونے کے لیے مجھے کوئی کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا بلکہ من کو دلاسا رہے گا کہ میں تیرا خیال رکھنے کو تیرے پاس ہوں۔ ورنہ تو کتنی بے

پروا ہے، یہ میں نے کل رات ہی دیکھ لیا ہے۔ اتنی خراب حالت میں بھی آدھی رات کو اٹھ کر لان میں گھومنے چلی گئی تھی کہ من گھبرا رہا تھا۔ بھگوان نہ کرے اگر تو چکرا کر وہیں کہیں گر جاتی تو صبح تک کوئی تجھے دیکھنے والا نہیں تھا۔ آج کم سے کم اتنا تو ہوگا کہ اگر تیرا من پھر گھبرائے اور تُو باہر جانا چاہے تو میں تیرا خیال رکھنے کو تیرے ساتھ چلوں گی۔ تُو میری فکر نہ کر اور آرام سے سو جا۔"

آشا کا کسی صورت وہاں سے ٹلنے کا پروگرام نہیں تھا کیونکہ اسے شالنی کی ہدایت کے مطابق رنجنی پر نظر رکھنی تھی۔ ادھر جاوید علی اس کا پروگرام سن کر سخت جز بز ہو رہا تھا۔ اگر آشا، شازمین سے طے کیے گئے وقت سے قبل سوتی نہیں تو اس کا اپنا پروگرام کھٹائی میں پڑ جاتا۔ آشا کے جاگتے میں وہ لان میں جانے کا قصد کرتا تو وہ اس کے ساتھ چپک کر وہاں ضرور جاتی اور اس کی موجودگی میں ظاہر ہے شازمین سے ملاقات ... کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے دل میں اس مصیبت کو ٹالنے کا طریقہ سوچنے لگا۔

ایک حل تو یہی تھا کہ وہ آشا کو زیادہ باتیں بگھارنے کا موقع دیے بغیر فوراً سونے کے لیے لیٹ جائے تاکہ وہ خود بھی بور ہو کر سو جائے اور اس کے سونے کے بعد اسے باہر نکل جانے کا موقع مل جائے۔ بعد میں وہ جاگ بھی جاتی تو اس سے محض سوال جواب کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ جاوید علی کو ویسے بھی اندازہ تھا کہ اب وہ یہاں رنجنی کے کردار میں دو تین روز سے زیادہ نہیں رک سکتا۔ نواب نوازش علی اسے اس عرصے میں دوبارہ بھی یاد کر سکتا تھا اور اس کے لیے ہر بار بہانہ بنا کر حاضری کو ٹالنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے یہ ضروری تھا کہ شازمین کے توسط سے اسے یہاں کا اسرار جاننے کا جو سنہری موقع مل رہا ہے، اس سے فوری فائدہ اٹھائے اور اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ بعد میں پیچھے اس کے بارے میں کیا سوچا جاتا اور کہا جاتا، یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ سب سوچ لینے کے بعد اس نے سونے کے ارادے سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کرنی چاہی اور ابھی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور مدھو نامی خواجہ سرا ایک چھوٹی ٹرے میں دو گلاس رکھے اندر داخل ہوا۔

"یہ دودھ کاجل دیدی نے تم دونوں کے لیے بھیجا ہے۔" اس نے ٹرے میں سے ایک ایک گلاس اٹھا کر دونوں کو تھمایا۔ دونوں گلاسوں میں بے شک دودھ ہی موجود تھا لیکن بڑے فرق کے ساتھ۔ جاوید علی کو جو گلاس تھمایا گیا تھا، اس میں محض سادہ دودھ موجود تھا جبکہ آشا کے گلاس میں موجود دودھ میں کسی مشروب کی گلابی گھلے ہونے کے ساتھ ساتھ میوہ جات کی موجودگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جاوید علی نے اس فرق کو شدت سے محسوس کیا۔

"آشا کو میوے والا میٹھا دودھ بہت پسند ہے اس لیے میں اس کے لیے یہ لے کر آئی ہوں لیکن تیرے لیے اس لیے نہیں لائی کہ تیرا پیٹ ابھی ٹھیک ہوا ہے۔ زیادہ بھاری غذا اسے دوبارہ گڑبڑ ہو سکتی ہے اس لیے ابھی یہ پی لے، بعد میں جب تو پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو تجھے بھی ایسا دودھ تیار کر کے پینے کے لیے دوں گی۔" مدھو نے محسوس کر لیا کہ جاوید علی کی نظریں دونوں گلاسوں میں موجود دودھ کے فرق میں الجھی ہوئی ہیں اس لیے ازخود وضاحت دے کر اسے سمجھانے لگی۔

"اب جب نواب صاحب اسے دوبارہ یاد کریں تب اسے یہ دودھ پلانا۔ بے چاری کا من پکا ہوگا اور اب کی طرح ڈر کے مارے بیمار ہو کر بستر پر نہیں پڑے گی۔" آشا نے ہنستے ہوئے مدھو کو مشورہ دیا جس پر وہ پہلے مسکرائی اور پھر ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے بولی۔

"تو بہت چلبلی ہے۔ کسی سے بھی تیری زبان رکنے کو تیار نہیں ہوتی۔ اسے ذرا قابو میں رکھا کر ورنہ کسی دن کاجل دیدی سے ڈانٹ کھائے گی۔"

"وہ مجھے کچھ نہیں کہنے والی۔ اسے معلوم ہے نا میں شالنی دیدی کی لاڈلی ہوں۔" آشا نے اس کی نصیحت پر کان دھرنے کے بجائے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر مزے سے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"بہت بڑھیا۔ آج کا دودھ تو ہمیشہ سے زیادہ مزے کا ہے۔ کاجل دیدی کو میری طرف سے دھنیواد بول دینا۔" پہلا گھونٹ حلق سے اتارتے ہی اس نے تعریف کی۔

"پر دودھ تو میں نے تیار کیا ہے۔" مدھو معترض ہوئی۔

"سو تو ہے لیکن اگر دیدی نہ کہتی تو کیا تو اتنے مزے کا دودھ بِن کہے میرے لیے لے کر آتی؟" آشا نے چمک کر پوچھا۔

"نہیں لاتی۔ یہ تو دیدی نے کہا کہ آشا، رنجنی کی خاطر اتنی جان ماری کر رہی ہے، اس کی صحت کا بھی خیال رکھو اور کوئی طاقت کی چیز بنا کر پلاؤ... تو مجھے یہ دودھ کا شربت بنانے کا خیال آیا۔ شربت میں ڈالنے کے لیے الائچی کا پاؤڈر دیدی نے خاص اپنے پاس سے دیا تھا۔ کہہ

رہی تھیں انہیں یہ پاؤڈر کسی نے تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ الائچی کی اتنی اچھی خوشبو کہیں اور سے نہیں ملے گی۔" مدھو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"شاید اسی لیے آج کا شربت مجھے زیادہ مزے دار لگ رہا ہے۔" آشا تفصیل سن کر جھٹ بولی اور پھر جاوید علی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "یہ سب تیرا کمال ہے رنجنی کہ دیدی کو میرا خیال آ گیا ورنہ وہ مجھ سے زیادہ خوش نہیں رہتیں۔"

"تیری ٹرٹر کی وجہ سے وہ تجھ سے خفا ہوتی ہیں ورنہ انہیں تو سب ہی کا بہت خیال رہتا ہے۔" مدھو نے فوراً ہی اس کی تردید کی اور پھر اس اثنا میں خالی ہونے والے گلاس واپس ٹرے میں رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔

"یہ تو چمچی ہے دیدی کی ورنہ میں سب سمجھتی ہوں کہ دیدی مجھ سے جلتی ہے۔" اس کے باہر نکلتے ہی آشا نے تبصرہ کیا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جماہی لی۔

"چل بھئی میں تو سونے لگی ہوں، اگر تجھے رات کو اٹھ کر سیر سپاٹے کرنے کا شوق چڑھے تو مجھے جگا دینا۔" وہ ایک اور جماہی لے کر نرم و دبیز صوفے پر لیٹ گئی۔ کمرے میں صرف ایک ہی بیڈ تھا اس لیے اسے صوفے پر ٹھکانا بنانا پڑا تھا۔ اسے دکھانے کے لیے جاوید علی خود بھی بستر پر دراز ہو گیا لیکن اسے حیرت تھی کہ کچھ دیر قبل بالکل تازہ دم نظر آنے والی آشا کو اچانک نیند نے کیوں گھیر لیا؟ اس کے تربیت یافتہ ذہن نے کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا اور وہ یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھا کہ دودھ میں کوئی گڑبڑ تھی، وہ بھی آشا کے گلاس کی حد تک... ورنہ وہ خود تو اپنے ذہن کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ البتہ آشا لیٹنے کے ساتھ ہی تیزی سے نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ وہ اس غیر معمولی صورتِ حال پر غور کرنے لگا لیکن کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ کر سکا اور بالآخر وہ وقت آ پہنچا جب اسے شازمین سے ملنے جانا تھا۔ اس نے کمرے سے روانہ ہونے سے قبل غور سے آشا کا جائزہ لیا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ پھر بھی وہ بہت احتیاط سے کمرے سے نکلا اور لان کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ مقررہ مقام پر شازمین اس کی منتظر تھی۔

"آؤ چلو میرے ساتھ۔" اس نے جاوید علی کا ہاتھ تھام کر اسے ایک سمت میں کھینچا۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط اور پُرجوش تھی۔ جاوید علی پھر اسی مہک میں گھرنے لگا جسے گزشتہ شب بھی محسوس کرتا رہا تھا۔ شازمین اس کا ہاتھ تھامے ہوئے..... لان سے نکال کر اس راستے کی طرف لے گئی جہاں کوٹھی کی بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔ وہ دونوں دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ اوپر مکمل خاموشی تھی اور روشنی بھی بس اس حد تک ہی تھی کہ وہ لوگ کسی شے سے ٹکرائے بغیر شازمین کے کمرے تک پہنچ گئے۔ وہ خاصا شاندار کمرا تھا اور یقینی طور پر وہاں زندگی کی ہر سہولت کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ شازمین نے کمرے میں پہنچتے ہی ایک فانوس روشن کر دیا تھا اس لیے جاوید علی بخوبی وہاں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

"تمہارا کمرا تو بہت خوب صورت ہے۔" اس نے بے ساختگی سے تعریف کی، اب معلوم نہیں اس تعریف میں واقعی مرعوبیت کا پہلو تھا یا اس نے شازمین سے بے تکلفی قائم کرنے کے لیے ایسا غیر رسمی جملہ ادا کیا تھا۔

"ہاں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر پنجرہ سونے کا ہو تو پرندے کی اڑنے کی خواہش دم توڑ جاتی ہے۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"تم یہاں سے آزادی چاہتی ہو؟" جاوید علی نے اس سے پوچھا۔

"میرے خیال میں کوئی بھی نارمل انسان اس ماحول میں رہنا پسند نہیں کر سکتا۔ ہاں، اگر وہ میری دونوں ماؤں کی طرح یہاں رہ رہ کر ایب نارمل ہو جائے تو الگ بات ہے۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے وسیع و عریض بیڈ پر کسی شہزادی کی سی شان سے بیٹھ گئی۔ جاوید علی دیکھ رہا تھا کہ وہ خاصی خوب صورت لڑکی ہے۔ سارے نقوش اور گوری رنگت اس نے اپنے باپ سے ورثے میں لیے تھے۔ کل رات وہ لان میں اسے روشنی کی کمی کے سبب ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکا تھا اور بس ایک خوشبو بھرا احساس ہی ساتھ رہ گیا تھا لیکن آج تو آنکھیں چکا چوند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے خیالوں میں بسا کسی مغلیہ شہزادی کا کردار زندہ ہو کر سامنے آ گیا ہو۔ وہ حسن، معصومیت اور تمکنت کا ایسا امتزاج تھی جو اس سے قبل کبھی اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ عمر کے بارے میں بھی وہ یہی اندازہ لگا سکا کہ وہ تقریباً اس کی ہم عمر یا دو ایک سال چھوٹی ہوگی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" شازمین نے سوال داغا تو وہ کسی سحر سے آزاد ہوا اور سنبھل کر جواب دیا۔

"یہاں سب مجھے رنجنی کہتے ہیں۔"

"کہتے ہوں گے، اس لیے کہ وہ تمہیں اپنے جیسا

سمجھتے ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم ایک مرد ہو۔'' وہ سر جھٹک کر شاہانہ انداز میں بولتی اسے احساس دلا گئی کہ اتنی بھی سیدھی اور معصوم نہیں ہے جتنی صورت سے محسوس ہو رہی ہے۔

''جاوید علی۔'' وہ بحث میں نہیں پڑا اور اسے اپنا نام بتا دیا۔

''کس خفیہ ادارے کے لیے کام کرتے ہو؟'' اگلا سوال آیا۔

''یہ نہیں بتا سکتا بس اپنی تسلی کے لیے یہ جان لو کہ میرا ادارہ ملک وقوم کی سالمیت کے لیے کام کرتا ہے۔'' اس نے صاف انکار کرتے ہوئے اس کی تسلی کے لیے ایک چھوٹی سی وضاحت دی کیونکہ کل رات ہی شازمین اسے بتا چکی تھی کہ اسے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جسے وہ قانون کا سچا اور ایمان دار رکھوالا سمجھ سکے۔ اس کا جواب سن کر شازمین مسکرائی اور بولی۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم جھوٹ بولنے کے بجائے صاف انکار کر دینے کے عادی ہو۔ بہرحال، اس وقت تو تم اتنا کرو کہ باتھ روم میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہارے ناپ کے کپڑے موجود ہیں۔ اپنے اس گیٹ اپ سے نجات حاصل کر کے مردانہ کپڑے پہنو اور پھر مجھ سے بات کرو۔ میں اس کوٹھی میں ہیجڑوں کو دیکھ دیکھ کر اوب گئی ہوں اور اب ایک مرد کو ہیجڑے کے روپ میں قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس کے جواب کو سراہتے ہوئے اس نے ایک ایسی فرمائش کر دی کہ جاوید علی چکرا گیا۔

''اس بات کو جانے دیں مس اور مجھے اسی حلیے میں برداشت کرلیں کیونکہ اس گیٹ اپ سے جان چھڑانے اور پھر دوبارہ اس میں آنے کے لیے مجھے خاصی محنت اور وقت صرف کرنا پڑے گا اور ہمارے پاس گفتگو کی مہلت کم رہ جائے گی۔ میری کوشش ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس پہنچ جاؤں کیونکہ آشا وہاں موجود ہے اور اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو میری تلاش شروع کر دے گی اور بعد میں مجھے اس کے سوالوں کے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔'' شازمین کی فرمائش پر جز بز ہوتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس عجیب وغریب ماحول میں رہ کر وہ لڑکی تھوڑی سی کھسک گئی ہے اور اسے نرمی سے قابو کرنا بہتر ہے ورنہ وہ جو کچھ اسے بتانے کا ارادہ رکھتی ہے ہرگز نہ بتائے گی۔

''آشا کی پروا نہیں کرو۔ اس کا میں نے انتظام کروا دیا ہے۔ صبح دن چڑھے تک سوتی رہے گی اور میرے خیال میں تمہارے لیے اتنی مہلت کافی ہو گی۔'' شازمین نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تو وہ چونک گیا اور اسے آشا کا دودھ پیتے ہی یکدم غنودگی میں چلے جانا یاد آ گیا۔

''کیا آپ نے ہی اسے دودھ میں کچھ ملا کر پلوایا ہے؟'' فوری طور پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''یقیناً، ورنہ ہو سکتا تھا کہ تمہیں یہاں تک آنے میں دشواری پیش آتی۔'' شازمین نے مسکراتی آنکھوں اور لبوں سے جواب دیا۔

''اور اس کام میں مدھو نے آپ کا ساتھ دیا؟'' اس نے ایک اور اندازہ لگایا۔

''مدھو نے نہیں، کاجل نے۔ وہ میری وفادار اور جاں نثار ہے اور میری ہی وجہ سے شالنی کی سفارشی نہ ہونے کے باوجود ابھی تک اس کوٹھی میں ٹکی ہوئی ہے۔ لیکن رکو... میں تمہیں ابھی سے یہ تفصیل کیوں بتاؤں، پہلے تم میری شرط پوری کرو اور انسانوں کے حلیے میں آؤ تب ہی میں تم سے بات کروں گی۔'' وہ ایک بار پھر پینترا بدل کر اپنی فرمائش پر واپس لوٹ آئی۔

جاوید علی نے اندازہ کر لیا کہ اس کی بات ماننا ضروری ہے ورنہ وقت برباد ہوتا رہے گا اور یہ کوئی کام کی بات بتانے کے لیے راضی نہ ہو گی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں ایک ہینگر میں مردانہ پینٹ شرٹ ٹنگا ہوا تھا۔ رنجنی کے گیٹ اپ سے نجات حاصل کر کے اس لباس کو پہننے میں اسے خاصا وقت لگا۔ ناپ بالکل درست تھا اور شرٹ کے کالر کے ساتھ لگے ٹیگ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ برانڈڈ ڈریس کسی بڑی دکان سے خاصے مہنگے داموں خریدا گیا ہے۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے غسل خانے میں ہی موجود قدآدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ کئی دنوں بعد خواجہ سرا کے بہروپ سے نجات پا کر اپنا آپ ایک مرد کے طور پر دیکھنا بہت اچھا لگا اور شاید زندگی میں پہلی بار اس نے شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ وہ ایک خوب صورت اور ہینڈسم جوان ہے۔ غسل خانے سے باہر نکلا تو بستر پر نیم دراز شازمین کی نظروں نے اس کے احساس کی تصدیق کر دی۔

''واہ... زبردست۔'' وہ جیسے ٹرانس کے سے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی اور بے ساختہ ہی اس کی تعریف

کی۔ ''تم تو میرے اندازے سے بھی زیادہ ڈیشنگ نکلے۔''
''آپ نے میرے لیے اتنے صحیح ناپ کا سوٹ کہاں سے برآمد کیا؟ کوٹھی میں تو واحد مرد جناب نواب صاحب ہی ہیں اور ان کا قد کاٹھ مجھ سے بہت مختلف ہے۔ ویسے بھی میں نے انہیں کبھی اس طرح کے کپڑے پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔'' وہ اپنی تعریف پر ذرا سا جھینپ کر شازمین سے پوچھنے لگا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ تنہائی میں موجود تھا اور وہ لڑکی اسے یوں نثار ہونے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا بچپن مشکل حالات میں گزارا تھا اور کسی قسم کی فضولیات میں پڑے بغیر ساری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی تھی اور قسمت اسے سی ایف پی میں لے آئی تھی۔ اکیس بائیس سالہ زندگی کی اس کہانی میں کہیں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا تھا جہاں اس کا صنفِ نازک سے کوئی لطیف قسم کا ٹکراؤ ہوا ہو۔ اس لیے اب شازمین کے انداز اسے بوکھلا رہے تھے۔ اسے اپنی ساری ذہانت اور بہادری کے باوجود یہ لڑکی اپنے اوپر حاوی ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور وہ خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے اس کے سحر سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کپڑے میں نے آج ہی خاص طور پر تمہارے لیے خریدے ہیں۔ ناپ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تم سمیت یہاں موجود ہر ملازم کا ناپ کاجل کے پاس موجود ہوتا ہے۔ میں نے اسی سے تمہارا ناپ معلوم کیا تھا۔'' شازمین اس کے قریب چلی آئی اور شرٹ کے اوپر تک بند بٹنوں میں سے سب سے اوپری بٹن کو کھولتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تو کیا آپ نے کاجل کو بھی بتا دیا کہ میں خواجہ سرا نہیں بلکہ...'' اسے تشویش ہوئی۔

''نہیں، کاجل میری وفادار ضرور ہے لیکن میں کسی بھی شخص پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال کر اسے آزمائش میں ڈالنے کی قائل نہیں ہوں۔ کسی کو بلاضرورت رازوں میں شریک کرنا بھی اسے زیربار کرنے کے مترادف ہی ہوتا ہے نا۔'' وہ اپنی عمر سے بڑھ کر سمجھ داری کی باتیں کر رہی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن پھر بھی یہ آپ کے لیے ایک خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہاں اس کوٹھی میں کاجل کی شکل میں کم از کم آپ کو ایک ایسی ہستی تو میسر ہے جس سے آپ اپنے بہت سے کام لینے کے علاوہ راز بھی بانٹ سکتی ہیں... ورنہ میری معلومات کے مطابق نواب صاحب نے اپنے خاندان کی خواتین کو جتنی پابندیوں میں رکھا ہوا ہے، وہاں آپ کی کوئی فرمائش پوری ہو جانا بھی بہت بڑی بات ہے۔'' جاوید علی نے تبصرہ کیا۔

''بابا ظالم نہیں ہیں، بس ان کے ساتھ کچھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ مجھ سے تو وہ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ جو کاجل ہے، میری پیدائش سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اسے بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ مل کر میری چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کرنے کی عادت ہے۔ بعد میں اس کی ماں مر گئی، تب بھی یہ یہاں ہماری خدمت کرتی رہی۔ شروع میں کوٹھی میں صرف خواجہ سرا ملازمین کا رواج نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ یہ تو بعد میں ہوا کہ عورتوں کی جگہ بھی آہستہ آہستہ خواجہ سراؤں نے لے لی۔ تم اسے خوش قسمتی کہو یا بدقسمتی کہ کاجل بے چاری بھی خواجہ سرا تھی اس لیے اس کی کوٹھی میں جگہ بنی رہی۔ شالنی سے تعلقات کے بعد کوٹھی میں کئی نئے ملازم آئے جو سارے کے سارے خوب صورت اور کم عمر ہوتے تھے لیکن میں نے بابا سے کہہ دیا کہ کاجل کبھی بھی یہاں سے نہیں جائے گی۔ بابا نے میری بات مان لی۔ وہ خود بھی کاجل پر بھروسا کرتے ہیں اس لیے اسے تمام ملازمین کا سپروائزر بنا رکھا ہے۔ کاجل بھی بابا کی بہت عزت کرتی ہے لیکن بچپن سے میرے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے مجھ سے بہت محبت ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب بھی اسے بابا اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا کہا گیا تو اس کا انتخاب میں ہی ہوں گی۔'' شازمین نے تیقن سے بتایا۔ گفتگو کے دوران وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ تک لے گئی تھی اور اب وہ اس کے نرم و گداز بستر پر اس کے مقابل بیٹھا اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یہ تو ہو گیا کاجل کا تعارف۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے بقول آپ عرصے سے مجھ جیسے کسی شخص کو تلاش کر رہی تھیں تو کیوں؟'' وہ مطلب کی بات پر آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا سوال سنتے ہی شازمین کی آنکھوں کی شوخی ماند پڑ گئی اور وہ کچھ اداس اور ہراساں نظر آنے لگی۔

''جو بھی مسئلہ ہے آپ مجھے کھل کر بتا سکتی ہیں۔ میرا وعدہ ہے کہ پوری کوشش کروں گا کہ آپ پر ذرا بھی آنچ نہ آ سکے۔'' جاوید علی نے پہلی بار خود اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبا کر اسے بولنے کا حوصلہ دیا۔ شازمین پھر بھی خاموش رہی۔

''آپ نہیں بولیں گی تو وہ موقع کھو بیٹھیں گی جس کی

خود آپ کو تلاش تھی۔'' جاوید علی نے ایک بار پھر اسے اکسانے کی کوشش کی۔

''میں بولنے سے گریز نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی کچھ چھپانا چاہ رہی ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں آپ کی دلچسپی کا اصل محور و مرکز کوٹھی میں جاری موجودہ سرگرمیاں ہیں جبکہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ جاننے کے لیے آپ کے لیے ہمارے خاندان کا ماضی جاننا ضروری ہے تاکہ جب آپ کا محکمہ کوئی کارروائی کرے تو آپ لوگ یہ بات ذہن میں رکھ سکیں کہ میرے بابا اس وطن کے غدار یا دشمن نہیں ہیں بلکہ حالات کے شکنجے میں پھنس کر ایسے مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں کہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ اداس اور مغموم نظر آنے لگی... اور ابتدا میں جاوید علی کو اس میں جو ذرا دل پھینک سی شوخ و چنچل لڑکی دکھائی دی تھی، وہ کہیں پسِ پردہ چلی گئی تھی۔

''یہ صرف آپ کا اندازہ ہے کہ میرا انٹرسٹ کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں لیکن جب آپ سمجھتی ہیں کہ مکمل داستان سنائے بغیر آپ مجھے یہاں کے حالات سے بہتر طور پر آگاہ نہیں کر سکیں گی تو آپ کو تفصیل سے ہی سب کچھ بتانا چاہیے۔ خود میں بھی ذاتی طور پر حالات و واقعات سے مکمل طور پر آگاہ ہونا ہی پسند کروں گا۔'' جاوید علی نے اسے بات کرنے کا حوصلہ دیا جس پر اس نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا اور پھر گلا کھنکھارتے ہوئے بولنے پر آمادہ ہو گئی۔

''اس کہانی کا آغاز بابا کی پیدائش سے ہوتا ہے۔ میں آپ کو جو حالات و واقعات بتاؤں گی وہ مختلف اوقات میں، مختلف ذرائع سے میرے علم میں آئے ہیں۔ لیکن میری کوشش ہو گی کہ میں سارے قصے کو مربوط طور پر آپ کو سنا سکوں۔'' اس نے تمہید باندھی اور ذرا سے لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''بابا قیامِ پاکستان سے ذرا پہلے ایک بھارتی ریاست میں پیدا ہوئے۔ نواب خاندان تھا جہاں ان کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں لیکن جانے کیوں اور کس کی سازش سے بابا کے والد یعنی میرے دادا کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ بابا ان کی اولاد نہیں ہیں... اور دادی نے حویلی کے ایک قابلِ اعتماد ملازم جو کہ وہاں مینیجر کے فرائض انجام دیتے تھے، کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ زمانہ ایسا نہ تھا کہ وہ اپنے اس شک کو سب کے سامنے زبان پر لا سکتے، بس اندر ہی اندر کڑھتے اور دادی کو زچ کرتے۔ وہ ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے چلے گئے اور ان کی ذہنی الجھن نے جو سب سے اہم کام کیا، وہ حویلی میں کسی بھی مرد کے داخلے پر پابندی تھی۔ حویلی میں جتنے بھی خدمت گار تھے وہ یا تو خواجہ سرا تھے یا خواتین۔ دادا چونکہ بابا کو اپنی اولاد نہیں سمجھتے تھے اس لیے ان سے بدسلوکی بھی بہت کرتے تھے۔ خاص طور پر بابا کو دادی کے آس پاس دیکھ کر تو ان کا پارا ہی چڑھ جاتا تھا۔ ان حالات میں دادی نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹے کو ملازمین کے سپرد کر دیں۔ یوں ان ملازمین کے ہاتھوں بابا کی پرورش ہونے لگی۔ ان ملازمین میں ایک جوان اور خوب صورت خواجہ سرا بھی تھا جو اپنی ظاہری شخصیت سے ہٹ کر اندر سے بڑا بدطینت تھا۔ اس نے بہت نوعمری میں ہی بابا کا جسمانی استحصال شروع کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کو سمجھ نہ سکے اور عادی ہوتے چلے گئے۔ ادھر سیاسی حالات الگ خراب تھے۔ پاکستان بنے کئی سال ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں سے ہندوؤں کی دشمنی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دادی نے دادا کو بہت سمجھایا کہ دوسرے رشتے داروں کی طرح ہم بھی پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں لیکن دادا نہ مانے۔ ان کی ضد نے حالات کو اچھا خاصا خراب کر دیا اور حویلی کی وہ شان و شوکت نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں دادا بیمار ہو کر انتقال کر گئے اور دادی جان اسی مینیجر کی مدد سے بچا کھچا مال و اسباب جمع کر کے پاکستان پہنچ گئیں۔ بابا کم عمر تھے اور کسی بھی قسم کے کاروبار کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ دادی بھی مکمل طور پر خانہ دار خاتون تھیں اس لیے اس وقت سمجھ نہیں آتا تھا کہ جو کچھ بچا ہے، اسے کس طرح سنبھالا جائے اور زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھایا جائے۔ ایک وفادار مینیجر ہی تھا جو ساتھ دے رہا تھا لیکن اس کے نتیجے میں دادی کے کردار پر انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ آخر اپنی کسی سہیلی کے مشورے پر دادی نے سب کی زبانیں بند کرنے کے لیے اپنے مینیجر سے نکاح کر لیا لیکن اس بات سے بابا کے دل میں گرہ پڑ گئی اور انہوں نے سوچ لیا کہ دادا نے جو الزام دادی پر لگایا تھا، وہ درست تھا۔ وہ اپنے سوتیلے والد سے کبھی اپنے تعلقات اچھے نہیں رکھ سکے بلکہ ان کی ضد میں خود کو برباد کرتے چلے گئے۔ بدکردار خواجہ سرا ویسے ہی کم عمری میں انہیں تباہ کر چکا تھا، وہ اسی راستے پر دوڑتے چلے گئے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اس جائداد کے اکلوتے وارث تھے جسے ان کے سوتیلے والد نے بڑی محنت اور دیانت داری سے

سنبھالنے کے ساتھ ساتھ بڑھایا بھی تھا۔ چنانچہ بچپن میں ہی ان کی پھوپی زاد سے ہونے والا ان کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹ سکا۔ ویسے بھی خاندان میں منگنیاں توڑنے کا رواج نہیں تھا لیکن یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ بابا کسی طور شادی پر راضی نہیں ہوتے تھے۔

''تقریباً چالیس سال کی عمر میں جب دادی بسترِ مرگ پر پڑی تھیں، ان کی منت سماجت پر بابا اپنی منگیتر کو بیاہ کر لانے پر راضی ہوئے اور یوں ہماری بڑی امی اس کوٹھی میں آئیں۔ بڑی امی کے یہاں آتے ہی اوّل تو یہاں سے تمام مرد ملازمین کو دیس نکالا ملا اور دوسرے بابا نے اپنے سوتیلے والد کو بھی چلتا کیا۔ بڑی امی یہاں سخت پابندیوں میں رہیں۔ دادی تو ان کی شادی کے مہینا بھر بعد ہی چل بسی تھیں۔ بابا کو ان کی حرکتوں سے روکتا بھی تو کون؟ بڑی امی نے صبر کرلیا اور ان کے صبر کے نتیجے میں ان کی وفاداری کا یقین کرتے ہوئے شادی کے پانچ سال بعد بابا نے انہیں اولاد کی خوشی دیکھنے کے قابل سمجھا۔ اس موقع پر دادی کی بھتیجی جن کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی، کوٹھی میں آکر رکیں اور بابا کو اتنی پسند آئیں کہ انہوں نے ان سے شادی کی ضد باندھ لی۔ دولت، خوب صورتی، اختیار سب کچھ ان کے پاس تھا اس لیے ان کی ضد پوری نہ ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا؟ یوں میری امی بھی دلہن بن کر کوٹھی میں آگئیں اور بابا نے اپنے جاننے والوں میں خود ہی یہ بات مشہور کر دی کہ انہوں نے ایک شادی اپنے والد کی پسند سے ددھیال میں کی ہے۔ بہر حال جس طور بھی یہ شادیاں انجام پائیں، دونوں سوکنیں ایک ہی جگہ رہنے لگیں۔ دونوں پر ایک سی پابندیاں تھیں اور ایک سے حالات سے گزر رہی تھیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بابا نے خود کو سنبھالا تھا تو بس اس حد تک کہ کاروباری امور خود سنبھال لیے تھے، ورنہ وہ بچپن سے جن بُری لتوں میں مبتلا تھے، انہیں کبھی نہیں چھوڑ سکے۔ یہاں تک کہ دو بیویاں اور بچے بھی انہیں نہیں بدل سکے۔ بیویوں سے ان کی دلچسپی بھی بہت واجبی سی ہے اور بہت کم ہی وہ انہیں وقت دیتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں ان کے بھٹکنے کا ڈر بھی زیادہ ہے اور اب وہ ان دونوں کی اچھی خاصی عمریں ہو جانے کے باوجود بھی اعتبار کے لائق نہیں سمجھتے۔ ان پر پہلے ہی کی طرح پابندیاں عائد ہیں۔ اپنی حرکتوں کو اولاد سے چھپانے کی خاطر بابا نے بیٹوں کو تعلیم کے بہانے یہاں سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ میں لڑکی تھی اس لیے وہ مجھے کسی ہاسٹل وغیرہ بھیجنے کی ہمت نہیں کر سکے اور بیویوں کی طرح مجھے بھی بہت سی پابندیوں کے ساتھ یہاں رکھ لیا۔ بس فرق ہے تو اتنا کہ میرے اپنی اولاد ہونے کے یقین کے باعث وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ محبت مجھے بہت سی سہولتیں بھی دلوا دیتی ہے۔''

جاوید علی نے دیکھا کہ سر جھکائے یہ سب سناتی شازمین کی آنکھیں تسلسل سے آنسو بہا رہی ہیں۔ وہ لڑکی جسے کچھ دیر قبل اس نے تھوڑا بے باک بھی سمجھ لیا تھا، اب اسے خاصی مظلوم نظر آرہی تھی۔ اس نے جن حالات میں، شرمناک حقائق کا سامنا کرتے ہوئے زندگی گزاری تھی، یقیناً ان کی وجہ سے کچھ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی اور اپنی عمر اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق جنسِ مخالف میں دلچسپی رکھنے کے باوجود ان سے دوری کے باعث کسی چور راستے کی متلاشی تھی۔ جب ہی جاوید علی یعنی ایک مرد کو کوٹھی میں اپنے اتنے نزدیک پا کر اس سے ملنے کے لیے تڑپ گئی۔ کاجل کے تعاون سے وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب بھی رہی اور اب جاوید علی، رنجنی کے گیٹ اپ سے آزاد اپنی بھرپور مردانہ شخصیت کے ساتھ اس کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ غسل خانے سے کپڑے بدل کر نکلنے کے بعد اس نے شازمین کی آنکھوں میں لپکتی خواہشوں کو بھی دیکھا تھا لیکن اس کے خدشات کے برخلاف شازمین نے اب تک کوئی ایسی اوچھی حرکت نہیں کی تھی جو اسے سخت ناگوار محسوس ہوتی بلکہ اس آنسو بہاتی لڑکی کو دیکھ کر تو اب اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی بھی آگئی تھی۔ اب وہ شازمین کو ایک ایسی عورت کے طور پر نہیں دیکھ رہا تھا جو مرد کے قرب کے لیے ترستی کچھ بھی جائز ناجائز کرنے کو تیار ہو۔ وہ اسے ایک معصوم اور مظلوم لڑکی نظر آرہی تھی۔ جاوید علی کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

''مت رو اچھی لڑکی! تم نے جو کچھ مجھے بتایا بدقسمتی سے وہ تمہاری زندگی کا حصہ ضرور ہے لیکن تم اس کے لیے قصوروار نہیں ہو اس لیے تمہیں آنسو بہانے یا شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے خلوص سے بولتے ہوئے پہلی بار اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

''کیا واقعی تم ایسا سوچتے ہو؟'' شازمین نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جواباً اس نے محض سر کی جنبش سے اسے یقین دلایا۔ اس کے یقین دلانے پر وہ بجائے چپ ہونے کے بلک بلک کر رو دی۔ جاوید علی کے لیے یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ابھی تک اسے اصل بات پتا نہیں چلی تھی اور جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ نواب نوازش علی کے ماضی کا قصہ تھا جس سے اس کی نفسیات اور کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کے جمِ غفیر کی موجودگی کا تو پتا چلا تھا لیکن معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی جیسے ملک دشمن خواجہ سرا کا یہ اس سارے سیٹ اپ سے کیا تعلق ہے؟ رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی والی رات شالنی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسلحے کی ترسیل کی جو کوشش کی تھی، اس کے بعد وہ مبینہ طور پر ملک دشمن قرار پا چکی تھی اور اسے اس ملک دشمن شالنی کا نواب نوازش علی سے جوازِ تعلق تلاش کرنا تھا۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے شازمین کو جذباتی بحران سے نکالنا ضروری تھا چنانچہ اس کے جواب میں صرف زبان ہلانے کے بجائے عملی پیش رفت مناسب سمجھی اور اس کے سامنے سے اٹھ کر بالکل برابر میں بیٹھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے نازک سے وجود کو سمیٹ لیا پھر نہایت سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

''مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی کیا کوئی بھی دوسرا باشعور انسان تمہارے حالات کے لیے تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ ہی تمہارے حالات سے تمہاری ذاتی اچھائی پر کوئی فرق پڑ سکتا ہے۔ اگر تم ایک اچھی لڑکی نہ ہوتیں تو ہرگز بھی ایسے کسی شخص کی متلاشی نہ رہتیں جس کی مدد سے اپنی کوٹھی میں جاری گڑبڑ کو روکنے کے لیے اقدامات کر سکو۔ قسمت سے میں خود یہاں آگیا ہوں تو اس موقع کو ضائع مت کرو اور وہ سب بتا دو جو تمہارے اعصاب کے لیے بوجھ بن رہا ہے۔'' ہمدردی کے الفاظ میں وہ اسے اصل بات اگلنے کی تحریک دے رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کوشش میں وہ خود خاصے بڑے امتحان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ نرم و نازک حسین لڑکی کا اتنا قرب اسے بے چین کر رہا تھا۔ میک اپ کے لوازمات سے عاری اس کے سادہ سے چہرے پر بہنے والے آنسوؤں نے اسے ایسا روپ دے دیا تھا جو بس رات بھر اوس میں بھیگتے گلاب پر صبح دم ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس پر اس کا ہچکولے کھاتا ہوا بدن تھا جو نرم لچکیلی شاخ کی طرح اس کی بانہوں میں لرز رہا تھا۔ جاوید علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے سنبھالے یا خود کو۔

''میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔'' گھبراہٹ میں اور کچھ نہیں سوجھا تو اس سے دور ہٹ کر روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ ریفریجریٹر میں انواع و اقسام کے جوسز اور کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں بھری پڑی تھیں لیکن اس نے ان کے بجائے سادہ پانی کی ایک بوتل کا انتخاب کیا اور گلاس سمیت دوبارہ شازمین کے بستر تک واپس لوٹ آیا۔

''یہ لو پانی پی لو۔'' گلاس میں پانی انڈیل کر اس نے شازمین کی طرف بڑھایا البتہ اس بار اسے کسی بھی طرح چھونے کی غلطی نہیں کی۔ روتی ہوئی شازمین نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا لیکن محض دو گھونٹ پانی ہی حلق سے اتار سکی۔ دو گھونٹ پانی نے بھی خاصا کام دکھایا اور شازمین سنبھلی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

''سوری، میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔'' خود کو سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلے جاوید علی سے معذرت کی۔

''اِٹس اوکے۔ میں تمہاری کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اس لیے تمہیں کسی بھی بات پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی نے بڑے حوصلے سے اسے تسلی دی ورنہ کوئی اس سے پوچھتا کہ اسے شازمین کے نارمل ہو کر دوبارہ داستان کا باقی حصہ سنانے کی کتنی بے چینی ہے۔

''تھینک یو۔ تمہارے لفظوں نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے۔ اب بہتر ہے کہ میں بھی تمہیں زیادہ انتظار نہ کرواؤں اور سارا قصہ سمیٹ دوں۔'' شازمین نے بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے خود کو کافی تیزی سے سنبھال لیا اور ایک بار پھر ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

''بابا نے خواتین اور خواجہ سرا ملازمین صرف گھر کے اندرونی امور کی انجام دہی کے لیے رکھے تھے۔ ڈرائیور، چوکیدار اور مالی وغیرہ مرد ہی تھے لیکن جب بابا کی شالنی سے ملاقات ہوئی تو اس نے اتنی تیزی سے انہیں خواجہ سرا ملازمین سپلائی کیے کہ کچھ عرصے میں ہر جگہ یہی نظر آنے لگے۔ خواتین ملازمائیں بھی چلتی کر دی گئیں اور خواجہ سراؤں کی آہستہ آہستہ چھانٹی کر کے ان کی جگہ ہندو خواجہ سرا لائے جانے لگے۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ اب یہاں گیٹ پر موجود چوکیدار سے لے کر میرے ڈرائیور تک ہر ملازمت پر خواجہ سرا موجود ہیں، وہ بھی خوب صورت اور کم سن جن کی یہاں موجودگی کا مقصد بابا کا دل بہلا کر انہیں اور ان کے گھر کو اپنی مرضی سے چلانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری دونوں ماؤں کو تو اس صورتِ حال کا ادراک نہیں ہے اور وہ ظلم و ناانصافی سہہ سہہ کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہیں لیکن میں نے ان تبدیلیوں کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور کھوج میں لگ گئی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اپنی اس کھوج کے نتیجے میں مجھے واضح طور پر تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن یہ اندازہ ہو گیا

کہ کوٹھی میں کچھ مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔

''میں نے راتوں کو یہاں اجنبی لوگوں اور گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ کاجل نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے لیکن ان لوگوں کی حقیقت کو وہ بھی نہیں جانتی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ بابا کی توجہ اس طرف مبذول کروائے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن بابا نے اسے جھڑک دیا کہ اسے خوامخواہ وہم ہوا ہے۔ وہ خود کوٹھی میں رہتے ہیں اور انہوں نے کبھی یہاں راتوں کو کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ بابا کی اس بے خبری پر میں اور کاجل بھی حیران تھے لیکن پھر یہ راز بھی ہمیں سمجھ آگیا۔ ایسی کسی بھی مشکوک کارروائی کی رات بابا کے کمرے میں لازماً کوئی نہ کوئی خوب صورت اور طرح دار خواجہ سرا موجود ہوتا ہے اور صبح بابا نشے میں اتنی بری طرح دھت ملتے ہیں کہ یہ سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ ان کے دیکھنے، سننے، سوچنے اور سمجھنے کی کوئی صلاحیت کام بھی کررہی ہوگی۔''

وہ افسردہ سی جاوید علی کو بتاتی چلی گئی جو کہ وہ بہت غور سے اس کا ہر ہر لفظ سن رہا تھا۔

''تم نے یا کاجل نے کبھی کوشش نہیں کی کہ کوٹھی میں آنے والے مشکوک افراد کی سرگرمیوں کا کھوج لگا سکو؟'' جاوید علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا اور اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کا سوال سنتے ہی شازمین کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی ہے۔

''میں نے ایک بار کوشش کی تھی۔'' وہ تھوک نگل کر خوف زدہ سے لہجے میں بس اتنا ہی بولی اور چپ ہوگئی۔

''پھر... پھر کیا ہوا؟'' وہ پُرجوش سا پوچھنے لگا۔

''اس واقعے کو دہرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ جب بھی آنکھوں میں وہ منظر آتا ہے، لگتا ہے کوئی مجھے ذبح کررہا ہے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

''ڈرو مت۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں تمہارے پاس ہوں نا۔'' جاوید علی نے کسی معصوم بچی کی طرح سہمی ہوئی شازمین کو حوصلہ دیا تو اس نے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بتانا شروع کیا۔

''یہ جس رات کا واقعہ ہے، اس روز میں دوپہر کے کھانے کے بعد اتنی دیر تک سوتی رہی تھی کہ شام ڈھلے ہی جاگی تھی۔ اتنی طویل نیند لینے کی وجہ سے مجھے رات میں نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ ٹی وی سے دل بہلا سکوں لیکن ہر چینل سے بور قسم کے پروگرام آرہے تھے۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دیا تو اٹھ کر نیچے لان میں چلی گئی۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ رات کو وہاں زیادہ روشنی نہیں ہوتی اس لیے کسی کو میری وہاں موجودگی کا پتا نہیں چلا لیکن میں نے نوٹ کرلیا کہ کوٹھی میں لوگوں کی آمدورفت جاری ہے۔ آنے والے اپنے حلیے سے خواجہ سرا ہی لگ رہے تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ میرے لیے شناسا نہیں تھا۔ میں پہلے ہی کوٹھی میں رات گئے کسی کی آمدورفت کو محسوس کرچکی تھی۔ ان خواجہ سراؤں کو آتے دیکھا تو تجسس اور بھی بڑھ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ چھپ کر ان لوگوں کی نگرانی کروں گی تاکہ ان کے کوٹھی آنے کا مقصد جان سکوں۔ میں نے بڑی کامیابی سے یہ کام کیا اور ان لوگوں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے تک پہنچ گئی۔ ہماری اس کوٹھی کے نیچے بہت بڑا تہ خانہ ہے جس میں پرانا سازوسامان پڑا ہوا ہے اور بابا نے ناکارہ ہونے کے باوجود صرف اس وجہ سے نہیں پھنکوایا کہ وہ اسے یادگار تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کبھی وہ اس یادگار سامان کو دیکھنے تہ خانے تک جاسکیں۔ بہرحال، میں تمہیں بتارہی تھی کہ میں ان خواجہ سراؤں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے میں اتر گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ سب وہاں ایک بڑے کمرے میں جمع تھے اور کمرے کے درمیان میں خوفناک شکل والی عورت کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں میں نے ایک تقریباً اپنی عمر کی ایک لڑکی کو دلہن بنے دیکھا جو نیم بے ہوش تھی اور مجسمے کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سب دیکھتی رہی۔ وہاں باہر سے آنے والے خواجہ سراؤں کے علاوہ کوٹھی میں ملازم چند خواجہ سرا بھی موجود تھے۔ میں ابھی حیران پریشان اس محفل کو دیکھ ہی رہی تھی کہ مہمان خواجہ سراؤں میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور مجسمے کے قدموں میں پڑی لڑکی کو چھری کی مدد سے ذبح کردیا۔ یہ منظر دیکھ کر میری بہت بُری حالت ہوئی۔ ممکن تھا کہ ایسا دہشت ناک منظر دیکھ کر میری چیخیں نکل جاتیں لیکن میں اتنی بُری طرح خوف زدہ ہوگئی تھی کہ حلق سے آواز بھی نہیں نکل پارہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ بے ہوش ہوکر ابھی یہیں گر جاؤں گی لیکن اس وقت اللہ نے میری مدد کی اور مجھے احساس ہوا کہ اگر قاتلوں کے اس ٹولے نے مجھے دیکھ لیا تو وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں بہت ہمت اور حوصلہ کرکے تہ خانے سے نکلی اور گرتی پڑتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ میری وہ ساری رات نہایت دہشت کے عالم میں گزری اور میں سر سے پیر تک خود کو کمبل میں چھپائے بستر پر لیٹی رہی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ کوٹھی میں آنے والے وہ پُراسرار خواجہ سرا کب واپس گئے۔ صبح ہوئی تو میں نیم بے ہوش تھی اور تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ بہت دنوں تک میرا علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹر نے بھی یہی بتایا کہ دماغ پر کسی چیز کا بوجھ ہے۔ سب مجھ سے پوچھتے رہے لیکن میں نے کسی کے سامنے زبان نہ کھولی۔ پھر کاجل نے مجھ سے کچھ اپنے ڈھنگ سے پوچھا تو میں اپنے دل کا بوجھ اس کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میری زبان سے سب کچھ سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا کہ میں جس رات کا ذکر کررہی ہوں، اس رات وہ خلافِ معمول رات کے کھانے کے بعد فوراً ہی سوگئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی اسے اچانک اتنی گہری نیند آگئی تھی کہ برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ غور کرنے پر ہم دونوں سمجھ گئے کہ چند خاص افراد کے علاوہ اس رات کوٹھی میں موجود تمام افراد کو رات کے کھانے میں نیند یا بے ہوشی کی کوئی دوا ملا کر دے دی گئی تھی اس لیے سب رات بھر بے خبر سوئے رہے تھے لیکن میں نے اس رات کھانا کھایا ہی نہیں تھا۔ کھانے کی ٹرے میرے کمرے میں جوں کی توں رکھی رہی تھی کیونکہ ضرورت سے زیادہ سوجانے کی وجہ سے مجھے اپنی طبیعت بوجھل محسوس ہورہی تھی اور میں نے باقاعدہ کھانا کھانے کے بجائے ریفریجریٹر میں رکھے پھل اور مشروبات پر گزارہ کرلیا تھا۔

''ہم یہ سب اندازے لگا چکے تو کاجل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی سے بھی اس قصے کا ذکر نہ کروں ورنہ میری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ میں پہلے ہی چپ تھی، اس کے مشورے پر اور بھی محتاط ہوگئی۔ ادھر کاجل نے چپکے چپکے اس واقعے کی چھان بین شروع کردی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تہ خانے میں سچ مچ عورت کا ایک خوفناک مجسمہ موجود ہے لیکن اسے ایسے آثار نہیں مل سکے جن سے یہ ثابت ہوسکے کہ وہاں کسی لڑکی کو ذبح بھی کیا گیا ہے۔ ہم دونوں ہی نے فیصلہ کیا کہ کوئی واضح ثبوت ملنے تک اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔ ویسے بھی ہم کچھ بتاتے تو بھی کسے؟ بابا نے تو ہماری بات پر یقین ہی نہیں کرنا تھا۔ میں اور کاجل مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے لیکن اس واقعے کے بعد میرے اندر کبھی اتنی ہمت پیدا نہ ہوسکی کہ خود اس چھان بین میں حصہ لے سکتی۔ جو کچھ کررہی تھی، کاجل ہی کررہی تھی۔

''اس رات کے بعد اس نے یہ احتیاط شروع کردی تھی کہ کسی بھی طرح نشہ آور دوا ملا کھانا پینا اس کے پیٹ میں نہ جاسکے۔ اس کی اتنی احتیاط اور محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے معلوم کرلیا کہ کبھی کبھار راتوں کو یہاں کچھ اجنبی لوگ اور گاڑیاں آتی ہیں اور تہ خانے میں یا تو کچھ سامان رکھا جاتا ہے یا نکالا جاتا ہے۔ خاص بات یہ تھی کہ ایسے ہر موقع پر وہی چند خواجہ سرا سرگرم نظر آتے تھے جنہیں میں نے اس رات تہ خانے میں لڑکی کے ذبح ہونے کے وقت دیکھا تھا۔ یہ باتیں علم میں آنے کے بعد ہم دونوں کو ہی اندازہ ہوگیا کہ کوٹھی کو مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جارہا ہے اور یقیناً اس سب کے پیچھے شالنی ہی موجود تھی... کیونکہ یہ ساری سرگرمیاں جن افراد کی نگرانی میں جاری تھیں، وہ سب اس کے منظورِ نظر اور چہیتے تھے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے بابا کی کمزوری کو استعمال کرتے ہوئے ان کی کوٹھی پر قبضہ کرلیا تھا اور بابا کو کسی بات کا علم ہی نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ بابا کو کچھ بتانے کا کوئی فائدہ ہونا بھی مشکل ہے اس لیے کسی قابلِ بھروسا فرد کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگی۔

''اس عرصے میں تم یہاں آگئے۔ مجھے اور کاجل کو بھی اوروں کی طرح تمہاری اصلیت کا علم نہیں تھا لیکن جس رات تم لوگ رتی کی لاش کو شمشان گھاٹ لے کر گئے، اس رات کاجل نے ایک اور کارنامہ انجام دیا اور یہ جاننے میں کامیاب ہوگئی کہ کوٹھی کے تہ خانے میں رکھی پیٹیوں میں اسلحہ اور بارودی مواد بھرا ہوا ہے۔ اس کی حاصل کردہ ان معلومات کے بعد مجھے اور بھی زیادہ شدت سے ایسے شخص کی تلاش رہنے لگی جسے یہ سب بتانے کا کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے۔ لیکن میں ایسا شخص کہاں سے تلاش کرتی؟ بابا کی خراب شہرت کی وجہ سے خاندان والوں سے برسوں سے ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ سہیلیاں بنانے کی مجھے اجازت نہیں ہے، بس ایک موہوم سی امید پر ہی شہر میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ وہ بھی آشا کے ساتھ جو کہ شالنی کی سب سے چہیتی ساتھی ہے اور جو ان ساری سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ باہر میں کسی دکاندار سے بھی بات کروں تو مجھے یہی لگتا تھا کہ آشا کی نظریں میری نگرانی کررہی ہیں۔ اس لیے میں چاہنے کے باوجود کہیں کسی کو کچھ نہیں بتاسکی اور ایک طرح سے مایوس ہی ہوگئی تھی کہ کل رات اللہ نے اپنی مہربانی سے اتفاقاً تم سے ملوادیا۔ میں حیران رہ گئی کہ جس شخص کی مجھے اتنی شدت سے تلاش تھی، وہ میرے اتنے قریب ہی موجود تھا۔ بس پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔ یوں آج تم میرے سامنے موجود ہو اور مجھے امید ہے کہ ہم لوگوں کو اس عذاب سے نجات دلانے میں پوری مدد کروگے۔''

وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی یہ سب بتاتی رہی تھی۔
قصہ تمام ہوا تو گویا تھک کر چپ سادھ لی لیکن آنکھیں نہیں کھولیں اور مسہری کی پشت گاہ سے پیٹھ اور گردن ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی شخصیت پر چھائے حزن و ملال کے رنگ اور بھی گہرے ہو گئے تھے لیکن ان گہرے ہوتے رنگوں نے اس کے حسن کو ماند کرنے کے بجائے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ وہ اس سوئی ہوئی شہزادی کی طرح لگ رہی تھی جسے جادوئی سوئیوں کے زور پر سلا دیا گیا تھا اور وہ منتظر تھی کہ کوئی اس کی آنکھوں میں چبھی ہوئی سوئیاں نکال کر اسے اس نیند سے نجات دلائے۔ جاوید علی کو اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ جن حالات سے گزری تھی، وہ اس کی عمر کے حساب سے بہت سخت تھے اور واقعی وہ اس بات کی حق دار تھی کہ اسے اس عذاب سے نجات دلائی جائے۔ پھر یہاں تو ملکی مفاد کا بھی معاملہ تھا، اسے جذباتی سہارا دینے کے علاوہ بطورِ خاص شازمین کے لیے کچھ نہیں کرنا تھا۔ نواب نوازش علی کو مجرموں کے اس ٹولے سے نجات دلانے کے لیے وہ جو کچھ بھی کرتا، وہ پہلے ہی اس کے مشن کا حصہ تھا۔

''تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا پیاری لڑکی! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری کوئی امید رائگاں نہیں جائے گی اور میں تم لوگوں کی ہر ممکن مدد کروں گا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر شازمین کے رخساروں پر بہتے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چننے شروع کر دیے۔ یہ وہ شفاف اور قیمتی موتی تھے جن کے سامنے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالے جانے والے سچے موتیوں کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس کی یہ ہمدردی رنگ لائی اور شازمین کے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ چمکی۔

''اگر میں تمہیں بتاؤں کہ تم میرے لیے نجات دہندہ بن کر آئے ہو اور وہ پہلے شخص ہو جس سے میں اپنی زندگی میں یوں بے تکلفی سے ملی ہوں تو کیا تم یقین کر لو گے؟'' وہ بہت آس سے اس سے پوچھنے لگی۔

''بالکل یقین کر لوں گا بلکہ تم یہ بات مجھ سے نہ بھی کہتیں تو میں تمہارے کہے بنا بھی اس پر یقین رکھتا تھا۔'' جاوید علی کا جواب اور لہجہ غماز تھا کہ ان کے درمیان ہمدردی سے بھی آگے کوئی رشتہ جڑ رہا ہے۔

''تھینکس! ورنہ مجھے ڈر تھا کہ تم ایک بُرے کردار کے شخص کی بیٹی کو بھی اسی کے جیسا سمجھو گے۔''

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ نبیوں اور ولیوں سے لے کر عام انسانوں کی زندگی تک ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن میں باپ اور اولاد کو کردار کے حوالے سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف پایا گیا۔ کبھی ولی کے گھر شیطان تو کبھی شیطان کے گھر ولی کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سمجھا دیا کہ کردار و اخلاق کا تعلق رنگ و نسل یا حسب نسب سے نہیں ہے... تو پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں قانونِ قدرت کو جانتے ہوئے بھی تمہیں تمہارے والد کے کردار کے حوالے سے جج کروں۔ اور جہاں تک تم نے مجھے حالات بتائے ہیں، وہ خود بھی اپنے عمل کے حوالے سے کسی حد تک قابلِ معافی ہیں کیونکہ ان کے ماضی کے حالات نے ان کے ذہن میں جو نفسیاتی گرہیں لگائی تھیں، وہ کبھی کھل ہی نہیں سکیں اور وہ دولت و خود مختاری کے نشے میں تباہی کے راستے پر چلتے ہی چلے گئے۔ اگر ان کا باقاعدہ علاج ہوا ہوتا تو شاید وہ اپنے مرض اور بے راہ روی دونوں سے نجات حاصل کر چکے ہوتے۔'' وہ ہر ممکن طریقے سے شازمین کی دل جوئی کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔ اتنی اچھی کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہاری باتیں سنتی جاؤں، سنتی جاؤں اور ایسے ہی سو جاؤں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں بہت راتوں سے ڈھنگ کی نیند نہیں سو سکی ہوں۔ سونے کے لیے لیٹتی ہوں تو خوفناک شکلیں اور ہر طرف بکھرا ہوا خون نظر آنے لگتا ہے۔ میں ٹرنکولائزرز کی عادی ہوتی جا رہی ہوں لیکن آج دل چاہ رہا ہے کہ سکون سے گہری نیند سو جاؤں۔'' وہ بولتے بولتے اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

''ٹھیک ہے سو جاؤ، میں یہیں تمہارے پاس ہوں۔'' جاوید علی نے اس سے محبت سے کہا اور اس کے ریشمی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ ابھی اسے ان سارے واقعات و حقائق کی اوپر رپورٹ بھی دینی تھی لیکن شازمین کو بھی مایوس کرنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ شازمین سو جائے تو پھر یہ کام کر لے گا۔ ویسے بھی ابھی رات نے اپنا سفر مکمل نہیں کیا تھا اور اس کے پاس جاوید علی سے رنجنی کے روپ میں واپس جانے کے لیے خاصی مہلت تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے شازمین کے بالوں میں انگلیاں چلاتا اس کے رخسار کو دوسرے ہاتھ سے تھپکتا رہا۔ وہ بہت جلد نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ سوتے ہوئے وہ کسی بچی کی طرح معصوم لگ رہی تھی اور شاید اس کی موجودگی کی وجہ سے عدم تحفظ کے احساس سے بھی نکل آئی تھی اس لیے خاصی پُرسکون اور آسودہ تھی۔

اسے شازمین کے اپنا حلیہ تبدیل کروانے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ خواجہ سرا کا روپ اس کے لیے کراہت آمیز تھا اور وہ احساسِ تحفظ نہیں دے سکتا تھا جس کی وہ متلاشی تھی۔ شازمین کے رویّوں کی وجوہات کو سوچتے ہوئے اس نے اس کا سر نرمی سے اپنے زانو سے ہٹا کر تکیے پر رکھا اور باتھ روم میں جا کر دوبارہ رنجنی کا گیٹ اپ اختیار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کے قدم آگے بڑھتے، کمرے کی فضا میں ایک مترنم سی آواز گونجی۔ اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آواز شازمین کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے انٹرکام سے برآمد ہوئی تھی۔ جانے کوٹھی کا کون سا مکین تھا جو رات کے اس آخری پہر اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جاوید علی کا دھیان فوراً ہی کاجل کی طرف گیا۔ ایک وہی تھی جو جانتی تھی کہ وہ شازمین کے کمرے میں ہے اس وجہ سے شازمین اس وقت بھی جاگ رہی ہو گی۔ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انٹرکام دوبارہ بجے اور شازمین کی پُرسکون نیند میں خلل پیدا ہو۔

''شازمین بی بی! میں ہوں کاجل... آپ کو ایک اہم اطلاع دینی ہے۔'' جاوید علی نے ریسیور اٹھا تو لیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ کاجل نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ انٹرکام پر شازمین موجود ہے اس لیے بغیر تحقیق کے بولنا شروع کر دیا۔

''کاجل! میں رنجنی بات کر رہی ہوں۔ شازمین بی بی سو چکی ہیں اور میں ان کے کمرے سے نکلنے والی ہوں۔ اگر تمہیں ان سے کوئی ضروری کام ہے تو بتا دو۔ میں انہیں اٹھا دوں گی۔'' کاجل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت ہی اہم اطلاع موجود ہے۔ اس لیے جاوید علی نے فوراً رنجنی کے لب و لہجے میں اس سے گفتگو شروع کر دی۔

''تمہیں وہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ باہر تمہارے لیے خطرہ ہے۔ میں نے خود آشا کے موبائل پر آنے والی کال سنی ہے۔ فون کرنے والا میری آواز نہیں پہچانتا تھا اس لیے میرے صرف ''ہیلو'' بولنے پر ہی شروع ہو گیا۔ اس نے مجھے آشا سمجھ کر بتایا کہ لاہور میں شالنی کا قتل ہو چکا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی حکم دیا کہ رنجنی پر کڑی نظر رکھی جائے اور اسے کسی صورت کوٹھی سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ میں نے آشا کے انداز میں اسے یقین دلا دیا کہ اس کی ہدایات پر عمل ہو گا لیکن تم اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہاری شامت آ گئی ہے۔ جو حکم آشا کو ملا ہے، وہ گیٹ پر موجود چوکیدار کو بھی ملا ہو گا اور اب تم اس کوٹھی سے کسی صورت باہر نہیں جا سکو گی۔'' کاجل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے اطلاع دی۔

''تم میری طرف سے بے فکر رہو، بس اتنا خیال رکھنا کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ میں یہاں شازمین بی بی کے کمرے میں ہوں۔'' اس نے رنجنی ہی کے لب و لہجے میں کاجل سے کہا۔ شالنی کا قتل اور ساتھ ہی کہیں سے بطورِ خاص اس پر نظر رکھنے کی ہدایت خاصی معنی خیز تھی۔ اطلاع سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کسی نہ کسی سبب مشکوک سمجھا جا رہا ہے اور اس صورت میں اس کے گرد دائرہ تنگ ہونا لازمی تھا۔ اسے اپنی جان کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی لیکن اس کوٹھی کے کچھ راز اس کے سینے میں پوشیدہ تھے جنہیں جلد از جلد اپنی ہائی

تھرڈ مین

بھینگے باؤلر نے امپائر کی طرف دیکھا اور چیخ کر اپیل کی۔ ''ہاؤزیٹ۔''
''ناٹ آؤٹ۔'' لیگ امپائر نے جواب دیا۔
باؤلر لیگ امپائر کی طرف مڑا۔ ''میں آپ سے بات نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''بھائی... میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔'' تھرڈ مین نے صفائی پیش کی۔

قرض خواہ کے نام ایک خط

ازراہِ کرم سو روپے کا چیک وصول فرمائیے کیونکہ میرا ضمیر ساری ساری رات مجھے جگائے رکھتا ہے اور برابر دل پر کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ میں نے آپ کی رقم اب تک کیوں نہیں واپس کی۔
مکرر۔ اگر اب بھی نیند نہیں آئی تو باقی نو سو روپے بھی جلد از جلد بھیج دوں گا۔
(جاوید احمد، کوئٹہ کی دور اندیشی)

حسنِ انتخاب

ایک صاحب دوست سے کہنے لگے۔ ''میری بیوی نے الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ میں تاش کھیلنا چھوڑ دوں یا وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔''
دوست نے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔''
''ہاں۔'' وہ صاحب بولے۔ ''بیوی کے چلے جانے کا دکھ تو مجھے بھی ہوا۔''
(کاشف احمد، کراچی)

کمان تک پہنچانا ضروری تھا۔ رنجنی کے بہروپ میں فوری طور پر واپس آنے کا فیصلہ بدل کر وہ ہیڈ کوارٹر سے رابطے میں جت گیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ شاز مین کے بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے بڑوں پر نواب نوازش علی کی کوٹھی کے راز کھول رہا تھا اور اسے ان رازوں سے آگاہ کرنے والی خود میٹھی نیند سو رہی تھی۔

☆☆☆

''میں نے آپ لوگوں کے لیے کمرے تیار کروا دیے ہیں۔ آپ لوگ چاہیں تو نہا دھو کر سفر کی تھکان اتار لیں، اتنی دیر میں کھانا میز پر لگ جائے گا۔'' پانچ رکنی ٹیم کو اپنی راہنمائی میں بنگلے کے اندر لانے کے بعد بہرام خان نے ان سب کو مشترکہ طور پر مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے۔ دیکھا جائے تو اس کے الفاظ بالکل سادہ اور موقع محل کے مطابق تھے لیکن لہجے کا کھردرا پن اور آنکھوں میں موجود سرد مہری سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے لیے اپنے دل میں اچھے جذبات نہیں رکھتا ہے اور ان کی یہاں آمد کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ یہ پانچ رکنی ٹیم آج ہی وہاں پہنچی تھی۔ ضلع کے نئے اے سی عمیر آفندی نے خود فون کر کے منشی اللہ رکھا کو اس ٹیم کی آمد سے مطلع کیا تھا۔ عمیر کے مطابق طالبِ علموں کا یہ گروپ پاکستان کی جنگلی حیات پر تحقیق کر رہا تھا اور ملک کے بہت سے علاقوں کو چھاننے کے بعد اب انہوں نے پیر آباد سے متصل جنگل کا انتخاب کیا تھا۔ اپنے اس دورے کے لیے ان کے پاس باقاعدہ اجازت نامے موجود تھے۔ اس کے باوجود عمیر نے منشی اللہ رکھا سے ذاتی طور پر ان کے ساتھ تعاون کی درخواست کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تحقیقی ٹیم کا گروپ لیڈر اظفر آفندی اس کا فرسٹ کزن ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے اور انہیں آزادی سے جنگل میں کام کرنے کا بھرپور موقع فراہم کیا جائے۔ عمیر کو منشی سے یہ درخواست کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ نئے فاریسٹ آفیسر کی تعیناتی ہنوز نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ ڈاک بنگلے میں ماتحت عملہ موجود تھا اور اس عملے کے بیشتر افراد پیر آباد کے رہائشی تھے اور عمیر کے مطابق اس نے منشی اللہ رکھا کو اسی لیے ان لوگوں کا خیال رکھنے کی ذمے داری سونپی تھی کہ منشی گاؤں کے ہر فرد کو نہ صرف ذاتی طور پر جانتا تھا بلکہ وہ لوگ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔

منشی نے اسے اپنے تعاون کی مکمل یقین دہانی کرواتے ہوئے نہایت خوش دلی سے یہ ذمے داری قبول کر لی تھی اور پھر بہرام کو بلا کر اسے بھی سمجھا دیا تھا کہ اسے آنے والوں کا کس طرح خیال رکھنا ہے۔ بہرام بنگلے پر کام کرنے والے ملازمین کا انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ چودھری کا وفادار بھی تھا اور عملی طور پر آج کل جنگل میں کاشت کی جانے والی افیون کی دیکھ بھال اسی کے ذمے تھی اس لیے وہ کسی کٹ کھنے بلّے کی طرح ہوشیار تھا اور اس نے اس تحقیقاتی ٹیم کی آمد کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے منشی کے سامنے ان کی آمد پر اعتراض بھی کیا تھا۔

''اتنا پریشان نہ ہو پاگلے! یہ تو چنگی گل ہے نا کہ اس ٹیم کی ذمے داری ہم پر ہے۔ تُو اپنی ہور اپنے بندوں کی نگرانی میں ان کا کام کروانا، ہور اس طرف جانے ہی مت دینا جدھر اپنا کام ہو رہا ہے۔ انہیں ڈرا دینا کہ جنگل کے اس حصے میں خطرہ ہے۔'' منشی نے اس کے اعتراض کے جواب میں اسے سمجھایا تو بات اس کی عقل میں آ گئی لیکن اپنی ناپسندیدگی کو بہر حال وہ ختم نہیں کر پایا۔ چنانچہ ان لوگوں کی بنگلے پر آمد کے بعد ان کا استقبال کرتے ہوئے بھی اس کے انداز سے اس کی اندرونی کیفیت جھلکی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ہم لوگ فریش ہو کر ابھی دس منٹ میں آتے ہیں۔ اگر اتنی دیر میں کھانا لگ جاتا ہے تو پہلے کھانا کھا لیں گے ورنہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر جنگل کا نقشہ ڈسکس کر لیں گے۔'' اظفر نے اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''نقشے پر بھی گل ہو جائے گی صاحب! اتنی جلدی کس لیے ہے۔ پہلے آپ لوگ رج کر کھاؤ پیو، آرام کرو پھر کام شام بھی دیکھ لیں گے۔'' بہرام نے ذرا بے تکلف میزبان کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کھانا پینا اور آرام ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم یہاں کام کے لیے آئے ہیں اس لیے ہماری پہلی ترجیح کام ہی رہے گا۔ آج اور ابھی سے یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو تاکہ نہ تو تم خود کام چوری کر سکو اور نہ ہی ہمیں اس کے لیے اکساؤ۔'' اظفر نے سخت لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تو بہرام کا موڈ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گیا۔

''ٹھیک ہے صاحب۔'' اس نے با دل ناخواستہ جواب دیا لیکن اظفر اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رکا نہیں اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک ملازم اس کا سامان لے گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس سے بھی پہلے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ بہرام خان کھولتے ہوئے خون کے ساتھ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

''پانچ منٹ میں کھانا میز پر لگ جانا چاہیے۔ اگر ایک منٹ بھی اوپر لگا تو میں تم لوگوں کی کھال گرا دوں گا۔'' سارا غصہ اس نے اپنے ماتحتوں پر اتارا۔ اس کا انداز دیکھ کر خانساماں اور اس کا معاون بجلی کی رفتار سے حرکت میں آ گئے اور انہوں نے واقعی صرف پانچ منٹ میں کھانے کی میز سجا دی۔ اظفر اور اس کے ساتھی فریش ہو کر اپنے کمروں سے باہر نکلے تو کھانا ان کا منتظر تھا۔

''گڈ! تم لوگ وقت کی پابندی کرتے ہو، یہ اچھی بات ہے لیکن آئندہ خیال رکھنا کہ ہمارے لیے اتنے بہت سارے کھانے پکوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور میرے ساتھی سادہ کھانا کھاتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ کھانے کی میز پر ایک آدھ ڈش سے زیادہ موجود نہ ہو۔ یوں بھی ہم طالب علم ہیں اور صرف کھانے پر اتنا خرچہ کرنا برداشت نہیں کر سکتے۔'' کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اظفر نے ایک نظر میں میز کا جائزہ لیا اور سنجیدگی سے احکامات جاری کرنا شروع کر دیے۔

''آپ خرچے کی فکر نہ کریں جناب۔ یہاں کھانے پینے کا خرچہ آپ سے نہیں لیا جائے گا۔'' بہرام کو اس کا اندازِ گفتگو برا تو لگا لیکن وہ جس حوالے سے مہمان بن کر آئے تھے، ان لوگوں سے بدتہذیبی سے پیش آنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ذرا نرم لہجے میں اسے جواب دیا۔

''نہیں، خرچہ تو ہم خود ہی ادا کریں گے۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سرکاری مال کو مالِ مفت سمجھ کر بیدردی سے خرچ کریں۔'' اظفر نے اسی بے نیاز لہجے میں جواب دیا جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہا تھا۔ اس نے یہ لب و لہجہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا تاکہ اسے واقعی ایک خبطی اور سنکی محقق سمجھا جا سکے۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہو صاحب! آپ کا خرچہ سرکاری فنڈ سے ادا نہیں ہوگا۔ آپ یہاں چودھری افتخار عالم شاہ کے مہمان ہیں اور آپ کی جو بھی خاطر خدمت ہوگی، وہ انہی کے خرچے پر ہوگی۔'' بہرام نے اسے سمجھایا لیکن وہ مزید ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ ہم کہاں سے چودھری صاحب کے مہمان ہو گئے؟ نہ تو انہوں نے ہمیں دعوت دے کر بلوایا ہے اور نہ ہی ہم خود ان سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہیں تو پھر ہماری مہمان داری کا خرچہ زبردستی ان پر کیوں؟''

''یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے شک آپ اپنے کام سے آئے ہیں لیکن چودھری صاحب کی روایت ہے کہ وہ علاقے میں آنے والوں کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔'' بہرام نے کچھ پریشانی سے اس سر پھرے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے چودھری صاحب کی روایات سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں اپنے اصولوں پر چلنے والا بندہ ہوں۔ ویسے بھی میں چودھری کے علاقے میں نہیں ٹھہرا ہوا کہ ان کی روایات کے مطابق ان کا مہمان تصور کیا جاؤں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کیا یہ جنگل تمہارے چودھری صاحب کی ملکیت ہے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں دریافت کیا تو بہرام گڑبڑا گیا۔

''نن... نہیں سر! جنگل تو سرکار کی ملکیت ہے، بس چودھری صاحب خود ادھر آنے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اس عجیب و غریب کیس سے نمٹے۔ یہ عجیب ہی نمونہ اسے ٹکرا گیا تھا ورنہ اب تک تو وہ یہی دیکھتا آیا تھا کہ لوگ معمولی سے معمولی فائدہ حاصل ہونے پر بھی خوش ہی ہوتے ہیں اور یہ چودھری کی میزبانی کو ٹھکرا رہا تھا۔

''مگر میں نے تو سنا ہے چودھری صاحب آج کل یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ اپنے بیٹے سے ملنے امریکا گئے ہوئے ہیں۔'' پیشانی پر آ جانے والی ایک لٹ کو پیچھے جھٹکتے ہوئے اظفر نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ ویسے اس ساری گفتگو کے دوران وہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھرپور انصاف کر رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی لبوں پر دبی دبی مسکراہٹیں لیے اس کا پورا ساتھ دے رہے تھے۔

''چودھری صاحب کے نہ ہونے سے روایات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور سب کام اسی طرح چلتے رہتے ہیں لیکن آپ لوگوں کو منظور نہیں تو میں منشی صاحب کو بتا دوں گا۔'' بیزار آ کر بہرام نے اس بحث سے جان چھڑانے کے لیے ہار مان لی۔ اظفر نے بھی مزید کچھ نہیں کہا اور یوں خاموشی سے کھانا ختم کر لیا گیا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ نقشے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ بہرام انہیں سمجھانے لگا کہ جنگل کے کس حصے میں کس قسم کا ماحول ہے اور وہاں کیا کیا ملتا ہے۔

''اور یہ یہاں... یہاں کیسے حیوانات اور نباتات پائے جاتے ہیں؟'' اظفر نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ نقشے کے اعتبار سے یہ جنگل کا ایک ایسا مقام تھا جہاں جنگل میں پائے جانے والے تینوں قسم کے ماحول مل رہے تھے۔ یہاں جنگل کا ہرا بھرا حصہ بھی تھا۔ بہتی ہوئی ندی بھی اور پھر تھوڑا آگے جا کر خشک و بنجر پہاڑی سلسلے کا

آغاز ہورہا تھا۔

''اس حصے کو چھوڑیں صاحب! یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔'' بہرام نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب جگہ ٹھیک نہیں ہے؟ میرے خیال میں تو ہمارے کام کے لیے یہ سب سے آئیڈیل جگہ ہوگی۔ یہاں ہمیں بالکل مختلف قسم کا حیوانیہ اور نباتیہ مل سکتا ہے۔'' اظفر نے فوراً حجت شروع کردی۔

''حیوانیہ اور نباتیہ تو بعد میں ملے گا، پہلے آپ لوگ ہی غائب ہوجاؤ گے۔'' بہرام نے اس کی حجت بازی پر جھلاّ کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟'' اظفر اچھلا۔

''دھمکی نہیں دے رہا سمجھا رہا ہوں۔ جنگل کا یہ حصہ خطرناک ہے۔ ہم لوگ خود بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔'' بہرام ذرا نرم پڑا۔

''کیسا خطرہ؟ میں نے تو سنا ہے کہ یہاں خطرناک قسم کے جانور اور درندے وغیرہ نہیں پائے جاتے۔'' وہ پوری معلومات کے ساتھ وہاں آیا تھا اس لیے آسانی سے بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔

''سنی سنائی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا صاحب! میں پیرآباد کا رہنے والا ہوں اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے جنگل میں جانے والوں کی ایسی لاشیں ملتی دیکھی ہیں جنہیں درندوں نے بُری طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا تھا۔'' اس کی بات سے یکسر اختلاف کرتے ہوئے بہرام نے اس پر اپنے تجربے کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہوگے لیکن میں ان مسائل سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ہم اس سے پہلے بھی جنگلوں میں کام کرتے رہے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں موجود خطروں سے کیسے نمٹنا ہے۔'' اظفر کا انداز بے پروا اور کھلنڈرے لڑکوں جیسا تھا جس سے بہرام کے طیش میں اضافہ ہورہا تھا۔ وہ جتنا اس بندے کو ڈرانے کی کوشش کررہا تھا، وہ اتنی ہی بے جگری کا مظاہرہ کررہا تھا۔

''میرے خیال میں آپ اپنے پاس موجود اسلحے کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو پہلے ہی بتادوں کہ آپ پرمٹ کے بغیر یہاں ایک پرندے یا مچھلی کو بھی ہلاک نہیں کرسکتے۔ خطرناک سے خطرناک درندے کو ہلاک کرنے کی صورت میں بھی آپ کو بھاری جرمانے اور سزا سے نمٹنا پڑے گا۔''

''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جو اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے معصوم جانوروں کا خون کرتے پھریں۔ ہم تو ان جانوروں اور پودوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان سے اور انہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' اظفر کسی جھکّی محقق کا کردار بخوبی نبھا رہا تھا اور اس نے اپنی دلیلوں سے بہرام کو اچھا خاصا زچ کرکے رکھ دیا تھا۔ جب ہی وہ منہ بناتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خاصے تلخ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے صاحب! آپ کی مرضی۔ میں نے آپ کو سب بُرا بھلا سمجھا دیا ہے۔ آپ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو سارے نفع نقصان کی ذمے داری آپ کے اپنے سر ہے۔ مجھے آپ اپنی روانگی کا وقت بتا دیجیے گا، میں انتظامات کردوں گا۔ ویسے اگر خاص طور پر اسی حصے میں جائیں تو دو باتیں ذہن میں رکھیے گا۔ ایک یہ کہ میں یا میرا کوئی آدمی ایسی خطرناک جگہ پر آپ کے ساتھ نہیں جائے گا، دوسرے یہ کہ جنگل کے اس حصے میں آپ کا خطرناک ڈاکوؤں سے بھی سامنا ہوسکتا ہے اور ان سے آپ کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی بھی ذمہ نہیں لے سکتا۔''

''او یار! اب تم نے ڈاکوؤں کی ایک نئی کہانی نکال کر رکھ دی۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم ڈر کر یہیں اس بنگلے سے واپس چلے جائیں؟'' اس بار اظفر نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر بہرام تھوڑا سا بوکھلایا۔

''میں ایسا کیوں چاہوں گا جی... لیکن آپ کو سارے خطروں کی خبر دینا بھی تو میرا فرض ہے۔ آپ میری دی ہوئی کسی خبر کو کہانی سمجھنے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ ادھر جنگل میں سچ مچ ڈاکو ہیں۔ آپ کو ادھر کی اتنی معلومات ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے پولیس نے ادھر آپریشن کرکے ڈاکوؤں کا بہت بڑا گروہ پکڑا تھا لیکن اس گروہ کے سارے لوگ نہیں پکڑے گئے تھے۔ کچھ خطرناک ڈاکو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور ڈر ہے کہ یہ ڈاکو ابھی بھی جنگل میں ہی موجود ہوں۔'' بہرام نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پالیا تھا اور ایک بار پھر نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

''یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے اظفر! یہ یہاں کا رہنے والا ہے اور یہاں کے خطروں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمیں اس کی بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ریسرچ کرنی ہے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی خطرناک علاقے میں ہی جایا

جائے۔ ہم وہاں سے دور رہ کر بھی اپنا کام کر سکتے ہیں۔'' اس بار اظفر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے گروپ کے ایک آدمی نے درمیان میں مداخلت کی اور اسے سمجھانے لگا۔

''عدیل بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اظفر! ہم فیملی والے لوگ ہیں۔ تمہاری طرح چھڑے چھانٹ نہیں کہ ہمیں اپنے پیچھے کسی کی فکر ہی نہ ہو۔ اگر تم نے جنگل کے ڈینجر زون میں جانے کا سوچا تو یہ یاد رکھنا کہ وہاں جانے والے تم اکیلے ہی ہو گے، ہم میں سے کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔'' گروپ کا ایک فرد بولا تو دوسرا بھی فوراً اس کا ساتھ دینے لگا اور پھر اگلے دو منٹ میں صورتِ حال ایسی ہو گئی جس سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ پانچ رکنی اس ٹیم میں کوئی بھی اظفر کا ہم نوا نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے بہرام کو خاصا مطمئن کر دیا اور وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایکٹ کر رہے ہیں اور اس کا ایک ایک ردِّعمل پوری طرح ان کی نظروں میں ہے۔ پانچ رکنی اس ٹیم میں محقق حقیقت میں صرف ایک ہی تھا، باقی چار سی ایف پی کے اہلکار تھے جنہیں جنگل میں چھپے راز کی تلاش کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ اپنی حکمتِ عملی سے جنگل میں داخل ہونے سے قبل ہی یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ انہیں اس وسیع جنگل کے کس حصے سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔

☆☆☆

صبح شازمین کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو خاصا تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے اتنی پُرسکون نیند نصیب ہوئی تھی اور آنکھ کھلتے ہی نظر آنے والے جاوید علی کے چہرے نے اسے یاد دلا دیا تھا کہ یہ پُرسکون نیند اسی کے مرہونِ منت تھی۔ اس سے اپنی ہر پریشانی کہہ دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

''صبح بخیر! تم اب تک یہیں ہو؟ میں تو سمجھی تھی کہ رنجنی بن کر نیچے جا چکے ہو گے؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹتے ہوئے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''رنجنی بن کر نیچے جانے میں خطرہ تھا اس لیے میں یہیں رک گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں جواب دیا لیکن شازمین کے چہرے پر فوراً ہی تشویش کے بادل چھا گئے۔

''کیا ہوا؟ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟'' وہ سراسیمگی سے پوچھنے لگی۔

''گڑبڑ تو ہوئی ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی کچھ بتاؤ تو کہ کیا ہوا ہے؟'' شازمین نے اصرار کیا۔ جاوید علی کے تسلی دینے کے باوجود اس کی آنکھیں بدستور تشویش میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''رات میں کسی نے آشا کے موبائل پر کال کر کے اطلاع دی تھی کہ شالنی کا قتل ہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی اس نے آشا کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ رنجنی پر سخت نظر رکھو۔ آشا تو سو رہی تھی۔ فون کاجل نے سنا اور انٹرکام پر مجھے یہ اطلاع دے کر تمہارے کمرے تک محدود رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے مطابق اس وقت میرے لیے سب سے محفوظ جگہ تمہارا کمرا ہی ہے اس لیے میں اس وقت بھی تمہیں یہاں نظر آ رہا ہوں۔'' اس نے اختصار کے ساتھ شازمین کو حالات سے آگاہ کیا۔

''تم یہاں ہو تو پھر شالنی کے قتل سے تمہارا تعلق کیوں جوڑا جا رہا ہے؟'' شالنی کے قتل کے ساتھ ہی رنجنی پر نظر رکھنے کی اطلاع ایسی تھی جسے سن کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ شاید اسی پر اس قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔ شازمین نے بھی اسی سوچ کے ساتھ یہ سوال کیا تھا۔

''وہ اس لیے کہ شالنی کا قتل تو میں نے نہیں کیا لیکن وہ ماری میری ہی وجہ سے گئی ہے۔ میں نے یہاں رہ کر اس کے ایک جرم کی نشاندہی کر دی تھی جس کے بعد یقیناً اس کے بڑوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ وہ قانون کی نظروں میں آ گئی ہے اور انہوں نے خود ہی اس کا پتّا کاٹ دیا۔'' تفصیلات میں جائے بغیر اس نے شازمین کی بات کا جواب دیا اور پھر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔ ''اب تم جلدی سے اچھے بچوں کی طرح اٹھ کر فریش ہو جاؤ اور ناشتا وغیرہ منگواؤ۔ رات بھر جاگ کر اس وقت خاصی شدید بھوک لگ رہی ہے۔''

''اوہ... تو تم رات بھر سوئے نہیں؟'' شازمین چونکی۔

''میں یہاں پکنک منانے نہیں آیا ہوں محترمہ کہ آرام سے پڑا سوتا رہتا۔ ویسے بھی اس کمرے میں ایک ہی بیڈ ہے اور اس پر آپ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ میں اگر آپ کے ساتھ سونے کی کوشش کرتا تو گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔'' اس کے شوخی سے جواب دینے پر شازمین جھینپ گئی اور اس کے رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی۔

''بس دو منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی آ کر ناشتا منگواتی ہوں۔'' وہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ وہاں اس نے چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگایا اور صرف دانت برش کر

کے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

''ہاں، اب بتاؤ کہ ناشتے میں کیا کھانا پسند کرو گے؟'' انٹرکام کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''جو کچھ اور جتنی مقدار میں تم کھاتی ہو، وہی منگوالو۔ معمول سے ہٹ کر کھانے پینے کا سامان نیچے والوں کو چونکا سکتا ہے، خاص طور پر اس لیے کہ میں غائب ہوں اور انہیں میری تلاش ہو گی۔'' جاوید علی نے اس موقع پر بھی عقل مندی سے کام لیا۔

''لیکن میں تو بہت تھوڑا کھاتی پیتی ہوں۔ تمہارا اتنی کم خوراک میں کیسے گزارہ ہو گا؟'' شازمین تذبذب کا شکار ہوئی۔

''فی الحال مجبوری ہے۔ اسی طرح گزارہ کرنا پڑے گا۔ ویسے میں نے تمہارے ریفریجریٹر میں پھل اور جوسز دیکھے ہیں، تھوڑا بہت ان سے بھی آسرا ہو جائے گا۔ یوں بھی مجھے کوئی لمبے عرصے کے لیے تو یہاں رہنا نہیں ہے جیسے ہی مجھے اپنے لوگوں کی طرف سے اشارہ ملا، ایکشن شروع ہو جائے گا۔''

''اس کے بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟'' اس کی بات سن کر شازمین نے حسرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''جانا تو ہے لیکن کوشش کروں گا کہ بعد میں بھی تم سے رابطہ رکھ سکوں۔'' وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے گال تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی پھر نرمی سے بولا۔ ''چلو تم ناشتا منگواؤ۔''

''کاجل سے کہو کہ میرا ناشتا لے کر میرے کمرے میں آ جائے۔'' شازمین نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے انٹرکام پر حکم صادر کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ابھری۔ جاوید علی تیزی سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ بے شک کاجل اس کی موجودگی سے واقف تھی لیکن وہ اس کے سامنے اپنی اصل شکل میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

''آ جاؤ۔'' اس نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کیا تو شازمین نے دستک دینے والے کو اجازت دی۔

''کاجل کہاں ہے؟ میں نے اپنا ناشتا لانے کے لیے اس سے کہا تھا۔'' باتھ روم کے اندر سے اس نے شازمین کی غصیلی آواز سنی۔

''بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بی بی! اس لیے میں آپ کا ناشتا لے کر آئی ہوں۔'' جواب میں کسی نے عاجزانہ لہجے میں وضاحت پیش کی۔

''کیوں... کیا ہوا اسے؟'' شازمین کے لہجے کا غصہ برقرار تھا۔

''رات سے بخار ہے۔ ابھی دوا کھا کر سو رہی تھیں اس لیے میں نے نہیں جگایا۔'' ایک بار پھر اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ وہ جاگے تو اسے میرے کمرے میں بھیجنا۔'' شازمین کی آواز کے ساتھ کسی کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی لیکن جاوید علی اس وقت تک باہر نہیں نکلا جب تک شازمین نے خود آواز دے کر اسے باہر آنے کو نہیں کہا۔ اس نے باہر آ کر شازمین کے سامنے رکھی ٹرے کا جائزہ لیا۔ ڈبل روٹی، مکھن، جیم اور دودھ کے علاوہ ٹرے میں چائے بھی موجود تھی لیکن شازمین خاصی الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ایکتا ناشتا لے کر آئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ کاجل کو رات سے بخار ہے اور اس وقت وہ دوا کھا کر سو رہی ہے۔'' اس نے جاوید علی کو بتایا۔

''میں ساری گفتگو سن چکا ہوں اور مجھے شک ہے کہ کاجل کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں اس پر شک ہو گیا ہو اور وہ اس سے میرے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔'' اس نے اپنا خیال پیش کیا اور ڈبل روٹی کا ایک سلائس اٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔

''ناشتا کرو۔ اس مسئلے کو بعد میں دیکھ لیں گے۔'' اس نے شازمین کو ہدایت کی تو وہ بھی بے دلی سے ایک سلائس اٹھا کر اس پر جیم لگانے لگی۔

''ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تم دوبارہ کاجل سے انٹرکام پر بات کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ خیریت سے ہوئی تو تم سے ضرور بات کرے گی ورنہ ہم فرض کر لیں گے کہ وہ پھنس چکی ہے اور پھنسنے کی وجہ بنے گا وہ نشہ آور دوا ملا دودھ جو تمہارے کہنے پر اس نے آشا کو پلوایا تھا۔ آشا سمجھ جائے گی کہ کاجل نے اسے میرے پہرے سے غافل کرنے کے لیے..... نشہ آور دودھ پلایا تھا۔ اس شک کو کنفرم کرنے اور اس کے پیچھے موجود وجوہات جاننے کے لیے وہ کاجل سے تفتیش ضرور کرے گی۔'' شازمین نے صرف ایک سلائس کھا کر ہی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور چائے بنا کر پینے لگی تھی۔ جاوید علی نے بھی کچھ اتنی زیادہ رغبت سے ناشتا نہیں کیا حالانکہ وہ پہلے اچھی خاصی بھوک محسوس کر رہا تھا لیکن کاجل کی طرف سے محسوس ہونے والی تشویش اور شازمین کی بے دلی نے اس کی بھی بھوک مار دی تھی۔ شازمین کی طرح خود بھی چائے کی طرف ہاتھ

بڑھاتے ہوئے اس نے اس سے یہ الفاظ کہے۔

''کاجل کی خیریت بھی معلوم ہوجائے گی لیکن تم پہلے یہ دودھ تو پی لو۔'' جاوید علی کو اتنی جلدی ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر شازمین نے اسے ٹوکا۔

''نہیں بس دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے انکار کیا۔

''دل نہیں بھی چاہ رہا تب بھی پی لو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بھاگ دوڑ والا کام شروع ہونے والا ہے اس لیے تمہارے جسم میں توانائی ہونی چاہیے۔'' اس نے دلیل دی جو خاصی معقول تھی۔ جاوید علی نے مسکراتے ہوئے دودھ کا گلاس تھام لیا۔

''میں رات سے یہاں ہوں لیکن میں نے یہاں کوئی چہل پہل محسوس نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے تمہارے سوا اس پورشن میں کوئی موجود ہی نہ ہو، حالانکہ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے بہت دیر سے ذہن میں ابھرتا خیال شازمین کے ساتھ بانٹا۔

''یہاں رہتے رہتے وہ دونوں بھی اچھی خاصی خبطی ہوگئی ہیں اور اپنے اپنے کمروں سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔'' شازمین نے بیزاری سے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، میں تمہارے کمرے میں بالکل محفوظ ہوں اور جب تک چاہوں یہاں آرام سے چھپ کر رہ سکتا ہوں؟''

''ہاں، یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے اگر مجھے گڑبڑ محسوس ہوئی تو یہاں سے بابا کے بیڈروم میں شفٹ کردوں گی۔ اس پورشن میں بھی ان کا ایک بیڈروم موجود ہے اور وہاں داخل ہونے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔'' شازمین نے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس اثنا میں وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہوچکے تھے۔ شازمین ایک بار پھر انٹرکام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں نے ناشتا کرلیا ہے۔ کاجل سے کہو ناشتے کے برتن لے جائے۔'' اس نے دوسری طرف موجود شخص سے کہا۔

''بڑی دیدی تو ابھی تک سو رہی ہیں بی بی! میں آکر برتن لے جاتی ہوں۔'' دوسری طرف سے وہی جواب ملا جس کا ڈر تھا۔

''صرف برتن اٹھانے کی بات نہیں ہے، مجھے کاجل سے کچھ اور بھی کام ہے۔ آخر وہ کب تک سوتی رہے گی؟'' شازمین جھنجلا کر بلند آواز میں بولی۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا بی بی کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کو جو بھی کام ہے، مجھے بتا دیں میں کردوں گی۔'' اس کے غصے کا جواب نرمی سے دیا گیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہے نا کہ میں کاجل کے علاوہ کسی سے اپنا کام کروانا پسند نہیں کرتی۔'' اس نے ریسیور واپس پٹخ دیا اور جاوید علی کی شکل دیکھنے لگی۔

''گڑبڑ ہے محترمہ... گڑبڑ ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرکے دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔'' وہ اپنے سیٹ پر مصروف ہوگیا۔

''ہم لوگوں نے کوٹھی کے باہر پوزیشن لے لی ہے۔ کوٹھی کی تلاشی کا وارنٹ بھی لیا جاچکا ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ قانونی طریقے سے اندر داخل ہوکر معاملات نمٹا سکیں لیکن اگر کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو بھرپور جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔ کارروائی کے لیے رات کے وقت کا انتخاب ہوا ہے لیکن تم کوٹھی میں اپنی یا اپنے کسی ہمدرد کی جان خطرے میں محسوس کرو تو فوراً اشارہ دے دینا، ہم فوراً دھاوا بول دیں گے۔'' اسے جواب دیا گیا۔

''اوکے، تم لوگ تیار رہنا۔ میں تھوڑی دیر میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' اس نے رابطہ منقطع کردیا اور پھر شازمین کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کہو کہ کیا کیا جائے؟ میرے خیال میں تو ہمیں سب سے پہلے یہ کنفرم کرنا چاہیے کہ کاجل سچ مچ خطرے میں ہے بھی یا نہیں؟ اس کے لیے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو نیچے جاکر حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ میں گیا تو فوراً نظر میں آجاؤں گا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا کسی بہانے نیچے جاسکتی ہو؟''

''مجھے نیچے لان کے علاوہ کہیں اور جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' شازمین نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچنی ہوگی۔'' جاوید علی سوچ میں پڑ گیا اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کسی نے یکدم دروازہ کھول دیا۔ اس صورتِ حال پر شازمین بری طرح اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کھلے دروازے میں کھڑی مدھو صاف نظر آرہی تھی۔

شازمین اسے اس جسارت پر کینہ توز نظروں سے گھورنے لگی۔

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

سیرینا راض

سوداے ھس

دلوں کے سودے میں خودغرضی اور بے اعتباری کی آمیزش نہیں ہوتی... وہ بنا کسی ریاکاری کے خالص بنیادوں پر طے پاتے ہیں... دلوں کے معاملے کے درمیان کاروباری سودے نہیں پنپتے... ایک ایسے ہی شخص کی کہانی جو انتہائی ہوشیاری سے اپنے فائدے اور نقصان پر نظر رکھے ہوئے تھا...

ایک سودے کی آڑ میں کھیلے جانے والے کھیل کا انوکھا ماجرا...

اس زیر زمین ریلوے اسٹیشن کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔ امریکا کو دہلا دینے والے نائن الیون واقعے کے بعد ہر جگہ جدید ترین خفیہ کیمرے نصب کردیے گئے تھے تاکہ دہشت گردی کی کسی بھی کارروائی کو روکا جاسکے مگر مین ہٹن کے فلٹن ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم اس تکلف سے عاری تھا۔ مجھے میرے کلائنٹ نے یہاں ملنے کا کہا تھا۔ اس جگہ کے انتخاب کی وجہ یہاں پہنچنے کے بعد سمجھ میں آئی تھی۔ وہ خوش ہوگا کہ اس سنسان پلیٹ فارم پر الیکٹرانک نگرانی کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظروں میں آنے سے بچ سکتا تھا۔ یہ جگہ خفیہ ملاقات کے لیے نہایت موزوں تھی۔ ایرک ہی نہیں، میرے زیادہ تر کلائنٹ ملاقات کے لیے عام طور پر ایسی ہی جگہوں کو ترجیح دیتے تھے جہاں وہ دوسروں کی نظروں میں نہ آسکیں۔

اُس روز شدید سردی تھی۔ وقفے وقفے سے برف باری کا سلسلہ پچھلے بیس گھنٹوں سے جاری تھا۔ میں پلیٹ فارم پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھی، وہ نظر آگیا۔ ایرک بائیڈ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر کھڑا تھا۔

''یہاں کے مقابلے میں تو ہماری کاریں زیادہ گرم ہیں۔'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ میری بات سن کر وہ کچھ نہ بولا، نہ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم دونوں نے ہی چمڑے کے موٹے دستانے ہاتھوں پر چڑھا رکھے تھے۔

''میں یہاں سے کہیں اور نہیں جانے والا۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے میری بات کا جواب دیا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ اتاری۔ ''اسے پہن لو، شاید سردی کچھ کم لگے۔'' وہ جدید تراش خراش کی تھی۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ

گرم بھی ہوگی۔

''شکریہ۔'' میں جینز اور موٹے اون کا بنا نہایت گرم آئرش سویٹر پہنے ہوئے تھی مگر پھر بھی سردی سے ہلکا ہلکا کپکپا رہی تھی۔

''اوکے...'' اس نے جیکٹ دوبارہ پہن لی۔ ''میں ایک آڈٹ کروانا چاہتا ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے مطلب کی وہ بات کی جس کے لیے مجھے یہاں بلایا تھا۔

''اچھا...'' میں نے بھی بے نیازی سے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے کہ تیز رفتاری سے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد کچھ دیر تک وہاں خاموشی کا راج رہا۔ مجھے اس کے جواب کا انتظار تھا۔ کافی دیر بعد اس نے گردن موڑی اور میرے چہرے کی طرف دیکھا، میں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ایرک عمر میں مجھ سے کم از کم پانچ سال چھوٹا ہوگا۔

''مجھے نائیجل گرے نے تمہارا نمبر دیا تھا۔'' آخر کئی منٹ بعد اس نے اپنی خاموشی توڑی۔ ''تم اس کے لیے کیا کچھ کرتی رہی ہو؟'' اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کی بات سن کر میں نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ ''اگر آپ کسی کام کے لیے میری خدمات حاصل کرتے ہیں تو کیا یہ پسند کریں گے کہ بعد میں اس حوالے سے باتیں کرتی پھروں۔'' میں نے شائستہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے سر جھٹک کر فوراً کہا۔

اسی دوران میں زیرِ زمین ریلوے اسٹیشن کی سرنگ سے نہایت سرد ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ میرے رگ و پے میں ٹھنڈ اتر گئی۔ اس کے فوراً بعد ریل کی دھمک سنائی دینے لگی۔ انجن کا زوردار سائرن گونجا اور پھر ہمارے سامنے والی پٹڑی پر ریل گاڑی آگئی۔

''میں نے ایک بزنس معاہدے کو حتمی شکل دی ہے۔'' ریل گاڑی رکنے پر شور تھما تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس وقت جو معاشی حالات اور عالمی کساد بازاری ہے اس میں میرے لیے کاروبار سے نکلنے کا یہی باعزت راستہ ہے کہ فیکٹری بیچ دوں۔''

''سودا مبارک ہو۔''

''سودا اب تک باضابطہ طور پر طے نہیں ہوا ہے، صرف حتمی شکل دی ہے۔'' ایرک نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''سودا طے ہونے میں ایک رکاوٹ ہے۔''

''وہ کیا؟ تم چاہو تو مجھے اس کے بارے میں بتا سکتے ہو۔''

''اسپین میٹل ٹیکنالوجی۔'' ایرک نے فوراً کہا۔ ''یہ خاص طور پر انڈیانا ریاست میں تیار ہوئی۔ دس سال پہلے وہیں سے ہم نے یہ ٹیکنالوجی حاصل کی تھی۔ ہم نے اس سے کامیاب استفادہ کیا اور اب مجھے اپنی فیکٹری اسپین میٹل کا ایک اچھا خریدار مل گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اگلے ہفتے فیکٹری فروخت ہوجائے۔''

''مگر...'' میں نے قطع کلامی کر کے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ میری بات نظر انداز کر کے بولتا رہا۔

''یہ مالی سال کی آخری سہ ماہی ہے''۔ ایرک بدستور بولے جا رہا تھا۔ ''فیکٹری کی بیلنس شیٹ کے مطابق تو سب ٹھیک ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آمدنی کے حساب سے فیکٹری کے بینک اکاؤنٹ میں آنے والا خالص منافع کچھ کم ہے۔ یہی بات میرے لیے پریشانی کی ہے۔'' اس نے گردن موڑی اور میری طرف دیکھا۔ ''کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''ہُونہہ۔'' اس کی بات سن کر میں نے ہنکارا بھرا۔ اسی دوران میں اسٹیشن کے اسپیکر سے مسافروں کو متوجہ کرنے والا اعلان شروع ہوگیا۔ ''کیا یہ تمہارا مسئلہ ہے؟'' جیسے ہی اعلان ختم ہوا، میں نے بات شروع کی۔ ''اگر ایسا ہے تو سب سے پہلے اپنا حساب کتاب چیک کرو، آمدنی اور خرچ کا موازنہ کرو اور بینک اسٹیٹمنٹ سے اس کا تقابلی جائزہ لو... حقیقت سامنے آجائے گی۔'' میں نے سیدھے سادے انداز میں اسے مسئلے کا حل بتایا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحے بھر کا توقف کیا۔ ''ہمارا خریدار سوئس شہری ہے۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ وہ حساب کتاب اور بینک امور کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسا ہوا تو یہ بے قاعدگی سامنے آجائے گی جس کا نتیجہ سودا منسوخ ہونے کی صورت میں نکلے گا۔'' اس کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

''تم نے ارنسٹ اینڈ ینگ کمپنی سے رابطہ کیا؟ وہ اس طرح کے معاملات کی فرانزک چھان بین کے ماہر ہیں۔''

''میں نے یہ کوشش کی تھی۔'' اس نے مری مری آواز میں کہا۔

''تو وہ بھی کچھ تلاش نہیں کر پائے؟'' میں نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد دریافت کیا۔

''بات یہ نہیں ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''انہیں انتظامی عہدوں پر فائز اعلیٰ افسران نے ایسا کرنے سے روکا تھا۔ انہوں نے یہ سب کچھ خفیہ طور پر کیا۔ میں بارہ گھنٹوں کا تھکا دینے والا سفر کر کے شگاگو سے ماہرین کی ٹیم لے کر فیکٹری پہنچا اور وہ کئی روز سر کھپانے کے باوجود کچھ تلاش نہ کر سکے۔ یہ تو مجھے بعد میں اپنے خفیہ ذرائع سے پتا چلا کہ فیکٹری کے کچھ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ان ماہرین پر دباؤ ڈالا کہ حقائق سامنے نہ لائے جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ ''مجھے یقین ہے اس کام کے لیے اُن لوگوں نے بھاری رشوت لی ہوگی۔''

''ذرا مجھے سمجھنے دو۔'' میں نے ایرک سے کہا۔ ''جب چھان بین کے لیے آنے والے ماہرین نے اپنا کام شروع کیا تب کمپیوٹر میں خرابیاں پیدا ہوئیں، اکاؤنٹنگ سوفٹ وئیر کی رفتار سست پڑ گئی ہوگی، فائلوں کا انتظام سنبھالنے والا کلرک بیمار ہو کر چھٹیوں پر چلا گیا ہوگا اور حساب کتاب کی فائلیں مختلف دفاتر میں ہوں گی۔'' میں نے اپنے اندازے سے تفتیشی ماہرین کی ناکامی کی ظاہری وجوہات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''تقریباً ایسا ہی ہوا تھا۔'' ایرک نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے میرے خدشات کی تصدیق کی۔

''تو تم یہ چاہتے ہو کہ اس سے پہلے کہ خریدار حساب کتاب کا تفصیلی جائزہ لے، یہ معاملہ حل ہوجائے۔'' اب مجھے پتا چلا کہ ایرک نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا۔ ''تم کاروبار فروخت کرنے سے پہلے ممکنہ آخری آڈٹ کرانا چاہتے ہو۔'' میں نے وہ بات بیان کی جسے اس نے اب تک کھل کر نہیں کہا تھا۔

''تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔''

''اب میں سمجھی کہ تم کیا چاہتے ہو۔'' میں نے گہری سانس لی۔

میں ایرک سے پہلی بار ملی تھی لیکن جس طرح اس نے میرے سامنے معاملہ رکھا اور اپنی بات ختم کی، وہ مجھے اچھا لگا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ایرک اچھا کلائنٹ ثابت ہوگا۔ ''بہت بہتر... جیسا تم نے کہا، سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔'' میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بات شروع کی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب فیس کا معاملہ بھی طے کر لیا جائے۔''

''جتنی کہو گی، اتنی مل جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے کچھ کاغذات تھمائے جنہیں میں پرواز کے دوران میں پڑھ سکتی تھی۔

ایرک سے فیس کا معاملہ طے ہوجانے اور چھوٹی سی رقم بطور زادِ راہ لے کر سیدھی ائرپورٹ چل دی۔ اس نے میری نشست بھی پہلے سے بُک کرا رکھی تھی۔ میں طویل فضائی سفر کر کے اس کی فیکٹری جا رہی تھی جہاں معاملے کی تحقیقات کر کے حقائق کا پتا چلانا تھا۔

میرے لیے یہ ایک چھوٹا سا کام تھا لیکن معاشی مندی کے دنوں میں خالی ہاتھ بیٹھنے سے تو بہتر ہی تھا کہ جو ملتا ہے، پکڑ لیا جائے۔

ایرک نے میرے سپرد جو کام کیا تھا، وہ حسابی کھاتوں میں بے قاعدگیوں کا تھا۔ میرا پس منظر اگرچہ فوج اور سی آئی اے سے تھا مگر اس کے باوجود اس طرح کی مالیاتی بے قاعدگیوں کے معاملات کی تفتیش میں مجھے اچھا خاصا علم اور تجربہ حاصل ہوچکا تھا۔ فوج سے فراغت کے بعد میں نے سی آئی اے جوائن کی اور چند سال بعد اس سے بھی سبکدوش ہوگئی اور مالیاتی امور کے شعبے میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرلی۔ بطور عورت میں سمجھتی تھی کہ اس طرح کے کام میرے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں کئی معاملات کی خوش اسلوبی سے تفتیش کے بعد میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھ چکا تھا۔

جب میں ائرپورٹ پر اتری تو دن کا وقت تھا۔ مگر سورج کی روشنی کے بجائے وہاں تو بادلوں سے گھرا آسمان تاریک تھا اور برف باری ہو رہی تھی۔ میں نے کرائے پر کار لی۔ فیکٹری

تک پہنچنے کے لیے مزید دو گھنٹے کا سفر طے کرنا تھا۔ سفر لمبا تھا اور میں تنہا تھی۔ راستے میں ایک موٹیل پر رک کر بڑا مگ بھر کر بلیک کافی پی اور چل دی۔ باہر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور برف باری کے باعث دھند نے حدِ نظر بہت کم کر دی تھی۔ میں کار کی ہیڈ لائٹس روشن کیے، بہت محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ گئی۔

فیکٹری کی دو منزلہ عمارت وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔ بیرونی دیواروں پر دھاتیں پگھلانے کے دوران خارج ہونے والے دھوئیں کے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بہت اونچی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ فیکٹری میں کام چل رہا ہے۔

میں نے کار فیکٹری احاطے سے باہر گیٹ کے قریب روکی اور اندازہ کرنے لگی کہ اندر کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔ مجھے کس سے اور کب ملنا ہے۔ کچھ ہی دیر میں پورا منصوبہ تیار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں فیکٹری کا سائرن گونجا۔ صبح کی شفٹ کام ختم کر چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مزدور اپنے ہاتھوں میں ٹفن باکس تھامے، بھاری اوور کوٹ پہنے باہر نکل کر اپنی اپنی کاروں اور موٹر سائیکلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں چاہتی تو سیدھی فیکٹری کے اندر داخل ہو جاتی مگر میں بنا اطلاع کے سب سے پہلے مزدوروں سے بات کرنا چاہتی تھی۔ ایرک نے کہا تھا کہ وہ فیکٹری بیچ رہا ہے مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مزدوروں اور عملے کا ردِعمل کیا ہے۔ میں سب سے پہلے یہی بات جاننا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں فیکٹری کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ ڈرائیو وے سے گزر کر میں نے پارکنگ میں کار روکی اور اندر کی جانب بڑھی۔

''ہائے...'' میں فیکٹری کینٹین میں داخل ہوئی تو ایک میز کے گرد چار پانچ مزدور بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھی۔ ''کیا میں تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟'' مجھے یقین تھا کہ مزدوروں کے خیالات جاننے کے لیے سب سے بہترین جگہ یہی ہے۔

''کیوں نہیں۔'' انہوں نے بیک زبان خوش دلی سے کہا۔

میں نے کرسی گھسیٹی۔ ''شکریہ۔''

''آپ سب اسپن میٹل فیکٹری کے ہی لوگ ہیں؟'' میں نے تصدیقی لہجے میں دریافت کیا۔ انہوں نے سر ہلا دیے۔

''کیا کام ہوتا ہے یہاں پر؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں۔

''تم کون ہو؟'' ایک آواز ابھری۔

''اوہ سوری... میں شیلڈن ہوں... آڈیٹر۔''

''سمجھ گئے۔'' بڑی بڑی مونچھوں اور لمبی داڑھی والے شخص نے سر ہلا کر کہا۔ ''تو آپ بھی اکاؤنٹس کی گڑبڑ چیک کرنے آئی ہیں؟'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

یہ سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ ''جی ہاں۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

''کافی لیں گی؟'' اسی داڑھی والے نے پوچھا۔

''اس شدید سردی میں اس سے اچھی چیز کوئی اور تو فی الحال ہو نہیں سکتی۔''

اس نے کافی اور سینڈوچ کا آرڈر کیا۔

''کیا بناتے ہیں آپ لوگ؟'' مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ پوچھنے کا مناسب موقع ہے۔ کافی اور سینڈوچ آرڈر کر کے وہ میرے میزبان بن چکے تھے۔ میں اس دوستانہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

''سینٹری فیوجز اور کچھ دیگر آلات...'' اس نے جواب دیا۔ ''البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنی تعداد میں بنتے ہیں۔''

''ویسے آج کل تو کاروبار پر مندی طاری ہے۔''

''یہ درست ہے مگر تمہیں کیوں تشویش ہے؟ تم یہاں آڈٹ کرنے آئی ہو، کاروبار کرنے تو نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ حیران ضرور تھا مگر اس کا لہجہ اب بھی دوستانہ تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے میز پر سے نظریں اٹھائیں اور مجھے دیکھا۔ ''پوری امریکی معیشت مندی کا شکار ہے۔ ہر شخص اس کے ہاتھوں پریشان ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ یہی حالات رہے تو پریشان حال لوگ بہت جلد ایک دوسرے کو سڑکوں پر پیٹنا شروع کر دیں گے۔''

''کاروبار مندا ہے تو وہ پھر فیکٹری منافع میں کیوں بیچ رہے ہیں... مجھے ذرا یہ سمجھا دو؟'' بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی والے شخص نے بیچ میں لقمہ دیا۔ اس کے ساتھی اسے مورین کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ''یہ معاشی مندی...'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ ''یہ سب بکواس ہے۔ بدمعاشی ہے مالدار لوگوں کی۔'' مورین کے لہجے سے نفرت ٹپک رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں یہ سن کر چونکی۔ ایرک نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سودے کو مکمل طور پر خفیہ رکھے ہوئے ہے مگر یہاں تو ایک مزدور بھی فیکٹری کی فروخت سے واقف تھا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی۔

''مطلب یہ کہ فیکٹری بک جائے گی۔ مالکان کے ہاتھ مال لگے گا اور نیا مالک فیکٹری اکھاڑ کر لے جائے گا۔ ہم تو بے روزگار ہو جائیں گے نا!'' مورین نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تمہیں کچھ تو بتایا ہوگا انتظامیہ نے؟'' میں نے استفساریہ لہجے میں مورین سے سوال کیا۔

''انہوں نے کچھ نہیں بتایا، بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ چند روز پہلے سوٹ میں ملبوس افسر ٹائپ کے کچھ لوگ آئے تھے، انہوں نے فیکٹری کا معائنہ کیا۔ مزدوروں کی تعداد، ان کے کام اور پیداوار کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ وہ فیکٹری اکھاڑ کر کہیں اور لے جانا چاہتے ہیں۔'' مورین نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''یہی بات ہم مزدوروں کو پریشان کر رہی ہے۔''

ایرک نے فیکٹری سے متعلق جو معلومات مجھے فراہم کی تھیں، اس کے مطابق یہاں سو سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے۔ انتظامی افسران کی تعداد اس کے علاوہ تھی تاہم براہِ راست کوئی جنرل منیجر نہیں تھا۔ ''یہ فیکٹری کون خرید رہا ہے؟ کیا کوئی چینی ہے؟'' میں نے مورین سے سوال کیا۔

''نہیں... سنا ہے کوئی جرمن ہے۔'' مورین کے ساتھ بیٹھے کالٹ نے جواب دیا۔ مورین نے تائید میں سر ہلا دیا۔ یہ سن کر میں مزید حیران ہو گئی۔ ایرک نے تو بتایا تھا کہ خریدار سوئس شہری ہے۔

''ہم نے سنا ہے کہ وہ پلانٹ اکھاڑ کر جرمنی لے جانا چاہتا ہے۔'' مورین نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ ''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ جرمنی مشینوں کی تیاری میں دنیا کا سب سے بہترین ملک سمجھا جاتا ہے تو پھر وہ یہ پلانٹ خرید کر وہاں کیوں لے جا رہا ہے؟'' مورین نے تشویش سے کہا۔

''تو پلانٹ کے ساتھ ساتھ تم لوگ بھی جرمنی جاؤ گے؟'' میں نے مسکرا کر ان سب سے سوال کیا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''یقیناً... ہم سب بھی ضرور جائیں گے۔'' مورین نے کہا۔ ''مگر جرمنی نہیں، دفترِ روزگار کے سامنے لگنے والی بے روزگاروں کی قطار میں۔''

''یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ تم سب کو بے روزگاری کے خطرے کا سامنا ہے۔'' میں نے ان سے ہمدردی ظاہر کی۔ ''ہر طرف بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے، ایسے میں تمہارے لیے یہ سخت امتحان ثابت ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' مورین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فیکٹری کی فروخت نے تو ہماری روزی روٹی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اتنے بُرے معاشی حالات میں فی الحال تو ہمیں ہر طرف تاریکی ہی نظر آ رہی ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ ہماری نوکریاں چلی جائیں گی۔''

کالٹ کے جانے کے بعد مورین نے مجھ سے کہنا شروع کیا۔ ''لیکن پھر بھی، اگر ہماری نوکریاں ختم کی جاتی ہیں تو کم از کم پنشن یا کسی اور قسم کے مالی فوائد تو ضرور دینا چاہئیں تاکہ ہم اس بڑھتی ہوئی بے روزگاری میں خود کو زندہ رکھ سکیں۔'' یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ''فیکٹری میں اتنا کچھ ہے، ہم نے مالکان کو بے تحاشا کما کر دیا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اس نے یہاں سے بھرپور کمائی کی اور مندی کے دنوں میں بھی وہ منافع کے ساتھ فیکٹری بیچ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ''کم از کم اسے ہمارا بھی کچھ خیال کرنا چاہیے۔ ہم برسوں سے اپنا خون پسینا ایک کر کے اسے کما کر دیتے رہے ہیں۔''

''میں جینی سے اس بارے میں بات کروں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے ان کے چہروں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ''وہ فیکٹری کا اکاؤنٹس دیکھتی ہے، جانتے ہو تم لوگ اسے؟''

''ہاں ہاں۔'' کئی آوازیں بیک وقت سنائی دیں۔ ''وہ سرخ بالوں والی لڑکی نا؟''

''ہاں وہی...'' میں نے تصدیق کی۔ ''اس کا کہنا ہے کہ فیکٹری مالک نے اس بات کا بھرپور انتظام کیا ہے کہ فروخت کی صورت میں مزدوروں کے حقوق پر کوئی زد نہ پڑے۔ فیکٹری مالک ایرک نے پنشن فنڈ اور دیگر واجبات کی ادائیگی کے لیے فنڈ مختص کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ اس لیے تمہیں زیادہ فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں بات مکمل کی۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' مورین نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ باقی تینوں کے چہروں پر بھی سوالیہ نشان تھے۔

''مجھے بھی اس بات پر تب ہی یقین آیا تھا، جب اس حوالے سے دستاویزات دیکھیں... ورنہ تم سے یہ کیوں کہتی۔''

''تو کیا ایرک ہمارے حق میں ہے؟'' مورین نے سوال کیا۔

''یا پھر وہ کوئی کھیل کھیلنے جا رہا ہے؟'' کالٹ نے لقمہ دیا۔ اس کی بات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے کہے پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کو تیار نہیں۔

''تم غلط سوچ رہے ہو۔'' میں نے فوراً تردید کی۔ ''پہلے

کیا کچھ ہوا، مجھے اس کا پتا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ فیکٹری مالک کے طور پر اس وقت وہ تمہارے مفادات کے تحفظ کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔"

"مگر سینئر انتظامیہ کی تو اس کے بارے میں کچھ اور ہی رائے ہے۔" کالٹ نے تذبذب بھرے لہجے میں ایک حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ اس ایک جملے نے ایرک کے خدشے کی تصدیق کر دی تھی کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے اور میں سمجھ گئی کہ گڑبڑ سینئر انتظامیہ اور مزدوروں کی ملی بھگت سے کی گئی ہے۔

"مجھے کسی اور کی رائے کا تو پتا نہیں۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے سکوت توڑا۔ "مگر ایک بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم لوگوں کے خدشات بے بنیاد ہیں اور تم جیسا کچھ سوچ رہے ہو یا پھر جیسا کوئی تمہیں بتا رہا ہے، ویسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

"امید کرتے ہیں کہ تمہاری بات سچ ثابت ہو۔" مورین نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں ساڑھے چار بجے تک وہیں بیٹھی رہی۔ مورین اور کالٹ میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ "اب میں چلتی ہوں۔" میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "تم لوگوں سے مل کر، باتیں کر کے بہت اچھا لگا... اپنا خیال رکھنا۔" یہ کہتے ہوئے میں کھڑی ہوگئی۔

وہ بھی کھڑے ہوگئے۔ "تم بھی اپنا خیال رکھنا۔" مورین نے بھی مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

میں کینٹین سے باہر نکلی اور پوچھتی ہوئی انتظامی بلاک کی طرف بڑھی۔ جب میں جان کلیٹن کے کمرے میں پہنچی تو وہ موجود نہیں تھا۔ وہی اس فیکٹری کا کرتا دھرتا اور ایرک کا سب سے بااعتماد ملازم تھا۔ میں نے کمرے کے باہر استقبالیہ پر بیٹھے نوجوان کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ہیلو..." چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ وہ پہنچ گیا۔

"میں ہوں جان... جان کلیٹن۔" اس نے سرد لہجے میں تعارف کرایا۔ "مسٹر ایرک نے آپ کی آمد سے مجھے مطلع کر دیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے غور سے میرا جائزہ لیا۔ "وہ بتا رہے تھے کہ جانچ کے لیے نئی آڈیٹر پہنچ رہی ہے۔ یقین کرو یہاں کوئی گڑبڑ نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔

جان کا قد سوا چھ فٹ سے تھوڑا زیادہ ہوگا۔ عمر چالیس سے اوپر ہوگی۔ بظاہر وہ بہت اچھی صحت کا مالک تھا۔ دھوپ کا قیمتی چشمہ اور مہنگا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ "ہمارا اکاؤنٹس ریکارڈ مکمل طور پر ٹھیک ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے اپ ٹو ڈیٹ رکھا ہوا ہے۔ حساب کتاب میں ذرا بھی گڑبڑ نہیں تو پھر یہ آڈٹ..." اس نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "سمجھ نہیں آرہا کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

ہم دونوں بدستور کمرے کے وسط میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے اب تک رسمی طور پر بھی مجھے بیٹھنے کا نہیں کہا تھا۔

"اگر آپ بات مکمل کر چکے تو میں کچھ کہوں؟" اس کے خاموش ہونے پر میں مسکرا کر بولی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "تمہارے مطابق اگر سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر چوتھی مالیاتی سہ ماہی کے دوران اکاؤنٹ میں منتقل ہونے والی رقم میں ستائیس فیصد کمی کیوں آئی ہے۔"

"ای اینڈ وائی کمپنی کے آڈیٹرز نے حال ہی میں آڈٹ کیا ہے مگر ایک پائی کی بھی ہیر پھیر نہیں پائی گئی۔" جان بدستور یہ باور کرانے پر مصر تھا کہ حسابات میں کوئی گڑبڑ نہیں۔

"عام طور پر دسمبر میں کیش فلو، دوسرے مہینوں کے مقابلے میں کم ہوجاتا ہے مگر پھر بھی..." میں نے اس کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا۔ "تمہارے مطابق آمدنی کے لحاظ سے پچھلے برسوں میں سب سے زیادہ خراب سال کون سا رہا ہے؟" میں نے جان سے پوچھا۔

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کمرے میں نظریں گھماتے ہوئے جواب دیا۔ "ریکارڈ موجود ہے۔ اگر کوئی وضاحت چاہیے تو اسے دیکھ سکتی ہو۔" اس کے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔

"بہت بہتر۔" میں نے آہستہ سے کہا اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دفتر کو نہایت سلیقے سے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ قیمتی فرنیچر اور آرائش کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ دوسری منزل پر واقع یہ کمرا خاصا بڑا تھا۔ دائیں جانب بڑی سی کھڑکی پر پڑا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور باہر جھانکا۔ سامنے مشین شاپ نظر آرہی تھی۔ "چلیں، کام شروع کرتے ہیں۔" میں نے پلٹ کر جان سے کہا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ یہاں اعلیٰ پیمانے کے سینٹری فیوجز تیار ہوتے ہیں، گیس کے استعمال والے آلات بنتے ہیں مگر میڈیکل آلات کیوں تیار کیے جاتے ہیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بنا سوال کیا۔

"نہیں..." اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "ہم بڑے پیمانے پر صنعتی آلات تیار نہیں کرتے اور میڈیکل... میرا مطلب ہے کہ جیسے خون صاف کرنے والے آلات بنانے کے لیے چھوٹی مشینیں درکار ہوتی ہیں، وہ ہمارے پاس ہیں۔ اس لیے انہیں بھی بناتے ہیں۔"

"بڑے خریداروں کی فہرست ہے؟"

"نہیں... ہمارے سب گاہک اوسط سطح کے ہیں۔" جان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور وہ دستاویزات نکالیں جو مجھے ایرک نے دی تھیں۔ یہ گزشتہ دس برس کا مالیاتی ریکارڈ تھا۔ جان کی بھی اس پر نظر پڑ چکی تھی۔ "جہاز میں کچھ وقت مل گیا تھا پڑھنے کے لیے۔" میں نے رپورٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔

آدھی انچ موٹی دستاویزات کا ایک صفحہ کھول کر میں نے رپورٹ جان کی طرف بڑھائی۔

اس نے پڑھا اور سر جھٹک کر میری طرف دیکھا۔ "کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"اگر سودا ہوجاتا ہے تو تم تو پندرہ ملین ڈالرز والوں کے ساتھ ہی نکل جاؤ گے۔ پیچھے جو رہ جائیں گے، یہ بات اُن کے لیے ہے۔"

"ساری رقم نقد نہیں ملنی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کچھ ادائیگی اثاثوں کی صورت میں بھی ہوگی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "چلو چھوڑو، مجھے یقین ہے کہ ان قواعد کی روشنی میں تم مناسب فیصلے کرو گے۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ "فیکٹری کی فروخت کے بعد مزدوروں کو ادائیگی کا فیصلہ معاوضہ کمیٹی کرے گی۔"

"اوہ... تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے طے کر رکھا ہے کہ ملازمین کو فارغ کیے جانے کی صورت میں کیا کچھ ادا کرنا ہوگا۔" میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہمارے مزدور، ہمارے کاروبار کا بہت اہم حصہ ہیں۔" جان نے گمبھیر لہجے میں بات شروع کی۔ "سچ تو یہ ہے کہ انہیں جو کچھ ملے گا، وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ ہمیں اس طرح کے ہنرمندوں کو تیار کرنے میں بڑا عرصہ لگا۔ دوبارہ کام شروع کرنے کی صورت میں ایسے ہنرمند مزدور تیار کرنے میں مزید کئی برس کا وقت لگ سکتا ہے۔"

"درست... مزدوروں کے لیے کیا کچھ طے ہوا ہے، میرا مطلب ہے کہ اس بارے میں تم نے کیا تجاویز دی ہیں؟"

"میں بہت چھوٹا افسر ہوں۔" جان نے میری طرف دیکھا۔ "ویسے بھی مجھے ان باتوں کا علم نہیں۔ میں مذاکراتی ٹیم کا حصہ نہیں ہوں۔"

"تو کون لوگ شامل ہیں ٹیم میں؟" میں نے پوچھا۔

"چھ بڑے اکاؤنٹنٹس اور میں بڑا اکاؤنٹنٹ نہیں۔" جان نے کہا۔

فوج اور سی آئی اے میں ملازمت کے دوران مارشل آرٹ کی بدولت میں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ میں اس وقت کمرے کے وسط میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس بار بھی کامیابی کاغذی دستاویز سے نہیں، مارشل آرٹ کے استعمال سے ہی ملے گی۔ ایک بات میں سمجھ گئی تھی کہ جان سیدھا آدمی نہیں ہے۔ مجھے بھی گھی ٹیڑھی انگلی سے ہی نکالنا تھا۔ میں کھڑکی کی طرف گئی، پردہ کھسکا کر برابر کیا۔ دروازہ لاک کیا اور جان کی طرف پلٹی۔ وہ بدستور کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش جھلک رہی تھی۔ میں اس کے سامنے پہنچ کر کھڑی ہوگئی اور معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ایک زوردار کک اس کی پنڈلی پر ماری۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ایک اور زوردار کک اس کے نصیب میں آئی۔ وہ فرش پر بے دم پڑا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر دو مکے رسید کیے، ایک زوردار ٹھوکر پسلیوں میں ماری اور پھر سکون سے کھڑی ہو کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ درد کی شدت اس کے چہرے سے واضح تھی۔ مجھے محسوس ہوگیا کہ دوا کی ایک ہی خوراک کام دکھا دے گی۔ کچھ دیر بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"اٹھنا مت۔" میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ پستول دیکھ کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "میں یہ سب کچھ کرنا نہیں چاہتی مگر..." بات ادھوری چھوڑ کر میں نے اسے گھورا۔ "یقین کرو، مجھے افسوس ہے مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ وہ سخت خوف زدہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"چھ لاکھ، نوّے ہزار ڈالرز..." میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی جان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"بتاؤ... یہ رقم کہاں گئی؟" اس بار میرا لہجہ درشت اور پستول کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

"لعنت ہو تم پر۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہاں پیٹی کیش میں صرف تیس ڈالرز پڑے ہیں اور تم لاکھوں کی بات

کررہی ہو۔‘‘ جسمانی طور پر وہ مضبوط ہاتھ پاؤں والا شخص تھا لیکن پٹائی نے اسے مٹی چاٹنے پر مجبور کردیا تھا۔

’’ٹھیک ہے، دفتر کے دیگر انتظامی افسران کو بلاؤ۔‘‘

’’سب گھروں کو جاچکے ہیں۔‘‘ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔

’’نہیں۔‘‘ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’تم بکواس کررہے ہو۔ اب تک دفتر میں تمہارا کوئی نہ کوئی ماتحت ضرور ہوگا۔ وہ اس وقت تک دفتر میں ہوتا ہوگا جب تک تمہارے کمرے کی روشنی جلتی رہتی ہوگی۔‘‘ یہ کہہ کر میں کچھ دیر خاموش رہی اور پھر دھمکانے والے لہجے میں کہا۔ ’’فوراً بلاؤ۔‘‘

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔

’’وقت ضائع مت کرو۔‘‘ میں نے چلا کر کہا۔ ’’جلدی بلاؤ ورنہ گولی ماردوں گی۔‘‘ وہ بدستور فرش پر پڑا رہا۔ ’’میں وقت ضائع کرنے کی شوقین نہیں اور نہ ہی اندھا دھند گولیاں چلاتی ہوں۔ تمہارے سینے یا گردے پر ایک گولی چلاؤں گی اور مہلک زخم تمہیں موت کے سفر پر لے جائے گا۔‘‘ میرا لہجہ نہایت سرد تھا۔ ’’تمہیں گولی مار کر میں اس ماتحت کے پاس جاؤں گی جو اس لوٹ مار میں تمہارا دستِ راست ہے۔ پھر اس سے خود پوچھ لوں گی کہ غبن کی گئی رقم کہاں ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے اسے گھورا۔ ’’جلدی فیصلہ کرلو کہ تم اسے بلاؤ گے یا پھر میں جا کر اس سے خود پوچھ لوں؟‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے پستول کا سیفٹی لاک ہٹا دیا۔

’’میں نے جو کچھ کیا، وہ اپنے کارکنوں کے لیے کیا۔‘‘ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے منہ کھولا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ’’یہ کمپنی انہوں نے بنائی تھی، میں نے نہیں۔ یہاں کام کرنے والے مزدوروں کو مدت سے جانتا ہوں۔ اس فیکٹری کو کامیاب بنانے میں مزدوروں نے اپنی جوانی اور خون پسینا لگایا ہے۔‘‘ اس کی آواز بدستور بھرا رہی تھی۔ ’’ایرک فیکٹری بیچ رہا ہے، نیا مالک فیکٹری اکھاڑ کر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ انہیں بے سہارا چھوڑ دینا چاہتا ہے... لعنت ہو اس پر...‘‘ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا اور پسلی سہلانے لگا۔ ’’میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ اسے اتنا مجبور کرسکوں کہ رقم حاصل کرنے سے پہلے وہ فیکٹری مزدوروں کی پنشن کے لیے فنڈز مختص کردے یا پھر...‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’یا فیکٹری مزدوروں کو ہی بیچ دے۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ میں نے ہنکارا بھر کر کہا۔

’’ہم بیلنس شیٹ کی رپورٹنگ سے اختلاف رکھتے تھے۔‘‘ جان نے کہنا شروع کیا۔ اب اس نے کراہنا بند کردیا تھا۔

’’کیوں؟‘‘

’’بیلنس شیٹ میں جان بوجھ کر کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ خدشہ تھا کہ ایرک جمع تفریق کے ذریعے اپنے خاص مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آخر اسے فیکٹری بیچنی تھی۔‘‘ اس نے سانس لیے بغیر کہا۔ ’’ہم سمجھتے تھے کہ اس نے بہت صفائی سے اس طرح کی مالیاتی رپورٹ تیار کی ہے کہ کسی طرح خریدار کو اچھی تصویر دکھا کر لمبا مال کمالے۔‘‘

’’مجھے دکھاؤ کہ ایرک نے مالیاتی رپورٹ میں کس طرح کی گڑبڑ کی ہے۔‘‘

وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور میز کی طرف بڑھا اور لیپ ٹاپ کھولا۔ میں اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے آمدن و خرچ کی وہ بیلنس شیٹ دکھانا شروع کی جو بقول اس کے بالکل درست تھی۔

’’تو مسئلہ یہاں ہے۔‘‘ میں نے ریکارڈ کے تقابلی جائزے کے بعد کہا۔ ’’تم نے یہ سب کچھ پہلے والے آڈیٹروں سے تو چھپالیا مگر میں یقین سے کہتی ہوں کہ ایرک جس خریدار سے سودا طے کرنے کی کوشش کررہا ہے، وہ اس رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوگا۔ وہ ضرور یہ جاننا چاہے گا کہ آمدن و خرچ کا بظاہر تمام ریکارڈ موجود ہونے کے باوجود اتنی بڑی رقم اِدھر اُدھر کیسے ہوگئی۔ اگر خریدار مطمئن نہ ہوا تو یہ سودا منسوخ ہوسکتا ہے۔‘‘

یہ سن کر جان نے سر ہلایا۔

ریکارڈ دیکھنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جان کی بات میں وزن تھا۔ مزدوروں کے حوالے سے میں اس کے خیالات سے کسی حد تک متفق تھی۔

’’کچھ سمجھ آیا؟‘‘ جان نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ہاں... ایک بات سمجھ آئی۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ اس نے جلدی سے پوچھا۔

’’یہ سب جان کر ایرک ہرگز خوش نہیں ہوگا۔‘‘

☆☆☆

کافی دیر بعد جب معاملات پر بات چیت کرکے میں جان کے دفتر سے نکلی تو وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے اکاؤنٹس روم دکھایا۔ میں نے اندر جھانکا تو ایک نوجوان عورت بڑی سی میز پر کاغذات کے پلندے سے اعداد و شمار کا

اندراج کمپیوٹر پر کررہی تھی۔ میں نے مڑ کر جان کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’ارے جینی... تم اب تک یہاں؟‘‘ اس نے دروازہ کھولا اور اسے مخاطب کیا۔ ’’مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اب تک کام کررہی ہو۔‘‘

’’ہاں، کچھ زیادہ کام تھا آج... بس اب تو تقریباً ختم ہو چکا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

سنہری بالوں والی جینی سے جان نے میرا تعارف کرایا۔ یہ وہی جینی تھی جس کا حوالہ میں نے کینٹین میں دیا تھا۔ ’’مسٹر جان... کیا میں جینی سے کچھ باتیں کرسکتی ہوں؟‘‘ جینی سے کچھ رسمی اور چند پیشہ ورانہ سوال و جواب کے بعد میں نے جان کو مخاطب کر کے کہا۔

’’کیوں نہیں...‘‘ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

’’تمہارا بہت بہت شکریہ۔‘‘ وہ باہر جانے کے لیے نکلنے لگا تو میں نے کہا۔ ’’باقی باتیں ہم کل کریں گے۔‘‘ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

’’صرف باتیں...‘‘ اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

’’صرف باتیں ہی ہوں گی۔‘‘ میں نے بھی معذرت خواہانہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر جواب دیا۔

’’ہاں تو جینی...‘‘ اس کے جاتے ہی میں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ ’’معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے تمہارے کام میں خلل پڑا...‘‘

’’کوئی بات نہیں، میں کل صبح جلدی آکر بھی یہ کام نمٹا سکتی ہوں۔‘‘ اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

’’مجھے مسٹر جان نے مزدوروں کی پنشن وغیرہ کے حوالے سے رقم مختص کرنے کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ رقم محفوظ ہے۔‘‘ میں نے بات شروع کی۔ ’’مجھے نہیں لگتا کہ اس کام میں کوئی مسئلہ ہے۔‘‘

’’میرے خیال میں تو پنشن کی ادائیگی میں کوئی مسئلہ ہونا تو نہیں چاہیے۔‘‘ جینی نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

’’لگتا ہے مسٹر جان بہت دور اندیش ہیں۔‘‘

’’ہوسکتا ہے۔‘‘

’’میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خود جان بھی فیکٹری کی فروخت سے متاثر ہوگا، اس لیے اگر وہ صرف اپنی پنشن اور واجبات کے لیے رقم مختص کرتا تو یہ غلط ہوتا۔‘‘ میں نے جان کے لیے دور اندیشی کا لفظ استعمال کیا تھا اور اب اس کی وضاحت کررہی تھی۔ ’’اس نے اپنے بھلے کے لیے سب کے بھلے کا سوچا۔ اس طرح اس پر کوئی بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اب بھی وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مالی مراعات حاصل کرنے کا سوچ رہا ہوگا۔‘‘

’’ارے نہیں۔‘‘ میری بات مکمل ہوتے ہی جینی نے سر کو زور سے جھٹکا دے کر کہا۔ ’’وہ ایسا نہیں کرسکتے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور کہنے لگی۔ ’’مجھے نہیں لگتا کہ مسٹر جان سب کچھ اپنی ذات کے لیے کررہے ہیں۔ ویسے بھی پنشن کی مد میں جو رقم رکھی گئی ہے، وہ مزدور یونین کے توسط سے تقسیم ہوگی۔ یہی جان کا منصوبہ ہے کہ واجبات اور پنشن کی تقسیم میں یونین شریک ہوتا کہ کوئی بدانتظامی نہ ہونے پائے۔‘‘

’’اوہ... ایسا ہی ہونا چاہیے۔‘‘

میں نے جینی سے آرڈر بک دکھانے کو کہا۔ ریکارڈ میں پچھلے پانچ ماہ کے تمام آرڈر موجود تھے۔ کئی پورے کیے جاچکے تھے، کچھ پر کام جاری تھا۔

’’یہ افسوس کی بات ہے کہ خریدار اچھے خاصے چلتے کاروبار کو بند کررہا ہے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح کتنے مزدور اور ملازمین بے روزگار ہوجائیں گے۔‘‘ میں ریکارڈ دیکھنے میں محو تھی، تب جینی نے مجوزہ سودے سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا۔

’’اوہ... واقعی قابلِ افسوس ہے یہ بات۔‘‘

میں نے اب تک جو معلومات حاصل کی تھیں، اس کی بنیاد پر خاصی حیران تھی۔ سوچ رہی تھی کہ خریدار اگر کوئی ایسا شخص ہے جو کاروبار میں ایرک کا حریف تھا تو پھر وہ بہت ذہین ہوگا۔ اس نے مارکیٹ میں ایرک کو شکست دینے کے بجائے حریف کا دھندا ہی بند کردیا تھا، وہ بھی ہنستے کھیلتے اور راضی خوشی۔ ’’تم جانتی ہو یہ مشینری کس ملک بھیجی جائے گی؟‘‘ میں نے آرڈر فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

’’یورپ۔‘‘ اس نے فوراً جواب دیا۔

’’مگر یورپ میں کس جگہ؟‘‘ میں نے فوراً سوال کیا۔

’’میرا خیال ہے شاید جرمنی...‘‘ اس نے غیر یقینی انداز میں جواب دیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں فیکٹری معاملات کے دیگر پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ جب میں جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ’’ریکارڈ تو درست ہے نا... پنشن والے اکاؤنٹ میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟‘‘

’’ایسی کوئی بات مجھے تو نظر نہیں آئی۔‘‘

’’مسٹر جان چاہتے ہیں کہ ہر چیز صاف ستھرے انداز

میں منظم طور پر ہو۔" جینی نے کہا۔ میری تصدیق سے اس کے چہرے پر چھائی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔ "انہوں نے مالی معاملات کے لیے ایک ماہر اکاؤنٹنٹ کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں تا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ۔" یہ سنتے ہی میرے منہ سے نکلا۔ میں سمجھ گئی کہ جینی بہت سادہ لوح ہے۔ وہ صرف اس لیے پریشان تھی کہ کہیں میں اس کے کام میں کیڑے نہ نکال دوں۔ اس طرح جان کو اس پر برسنے کا موقع مل سکتا تھا مگر کام ٹھیک ہونے کا سن کر وہ اتنا خوش ہوئی کہ بنا سوچے سمجھے بول اٹھی۔ میرے لیے وہ اہم انکشاف کر گئی تھی۔

"میرے خیال میں تمہیں جو کام کرنا چاہیے تھا، تم نے وہ عمدگی سے کیا ہے۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "شکریہ... تم نے میرے لیے اپنا خاصا وقت برباد کیا۔" میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

میں جینی سے پوچھ سکتی تھی کہ کیا وہ بھی فیکٹری یونین کی رکن ہے مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اندازہ تھا کہ جینی بھی یقیناً فیکٹری کی فروخت کے بعد اپنی پنشن کے حوالے سے فکرمند ہوگی مگر اس سے باتیں کر کے لگا کہ وہ مجھ پر یہ باور کرانے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی کہ جان اپنا کام بہت اچھے طریقے سے کر رہا ہے۔ "ویسے تمہارے باس نے پنشن کے حوالے سے جو کام کیا، وہ بہت اچھا ہے۔" باہر نکلنے سے پہلے میں نے جینی کو یہ باور کرانے کے لیے کہا کہ جیسے اس کی باتوں میں آگئی ہوں۔

"ہاں... وہ بہت اچھا افسر ہے۔" جینی مسکرائی۔ "کبھی کبھار وہ مجھ پر بھی خاصی مہربانی دکھاتے ہیں۔"

اگرچہ اکاؤنٹس میری مہارت کا بنیادی شعبہ نہیں تھا مگر میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی کمپنی میں بڑے پیمانے پر مالی بدعنوانی اعلیٰ افسران سے شروع ہوتی ہے اور چھوٹے اکاؤنٹنٹ ان کے مہرے ہوتے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو وہ جینی کو بھی ایک مہرہ سمجھتا مگر میں سب کچھ جان چکی تھی۔ یقین ہوگیا کہ اصل کرتا دھرتا جان ہی تھا۔ "اچھا، اب میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں باہر نکل آئی۔ میں جان کی طرف جا رہی تھی مگر ابھی کوریڈور میں ہی تھی کہ وہ سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔

"کچھ ملا؟" اس نے میرے پاس پہنچ کر چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"تم ایک دہائی تک اس فیکٹری کے چیف ایگزیکٹو آفیسر رہے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "فیکٹری تو فروخت ہو رہی ہے، اس کے بعد کیا کرو گے... کچھ سوچا ہے؟" میرا لہجہ استفساریہ تھا۔

"ابھی تک تو نہیں، وقت آئے گا تو دیکھوں گا۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ "تم جا کر ایرک کو بتا دو کہ یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"سوچتی ہوں... ابھی تو کچھ اور بھی چیزیں دیکھنی ہیں۔" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "فی الحال تو جانا چاہتی ہوں۔ مجھے بھرپور نیند لینی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جماہی لی۔ میں واقعی بہت تھک چکی تھی۔

میں باہر جانے والے راستے پر بڑھی۔ وہ بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ گیٹ پر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں پارکنگ میں کھڑی کار کی طرف بڑھی۔ جب میں فیکٹری گیٹ سے نکلی تو بیک ویو مرر میں دیکھا۔ زرد روشنی میں وہ اب تک دروازے پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ دوسری رات کی بات ہے۔ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ سارا دن ریکارڈ میں سر کھپانے کے بعد گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سائڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور موبائل اٹھا لیا۔ "ہیلو..." میں نے نیم غنودگی کی کیفیت میں نمبر دیکھے بنا کال اٹینڈ کی۔

"ایرک بول رہا ہوں۔" اس نے پریشان لہجے میں کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بنا کہنا شروع کیا۔ "تم نے سی این این پر آج صبح کی خبریں دیکھی ہیں؟"

"کیا احمقانہ سوال ہے؟" میں نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ "صبح کے سوا چار بج رہے ہیں۔ میں گہری نیند میں تھی اور اب تک میرے حواس مکمل طور پر بیدار نہیں ہوئے اور تم ہو کہ... خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ ہوا کیا ہے؟" میرے لہجے سے ناراضی ظاہر تھی۔

"میں جاننا چاہتا ہوں میڈیا کو یہ خبر کس نے دی؟" اس نے کچھ بتانے کے بجائے الٹا ایک اور سوال کر دیا۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے جماہی لیتے ہوئے پھر پوچھا۔

"میں نے صرف ہدایت ہی نہیں دی بلکہ اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ اس سودے کی کسی کو بھنک بھی نہ پڑے۔" وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ "اب تک کسی کو کچھ پتا نہیں تھا لیکن تمہیں وہاں بھیجے ہوئے اڑتالیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے کہ خبر ٹی وی کی سرخیوں میں آگئی۔ واشنگٹن پوسٹ اور نیویارک ٹائمز کے پہلے صفحے پر بھی یہ خبر چھپی ہے۔" وہ

بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

"پہلے صفحے پر؟" میں نے زیرِ لب کہا۔ اتنی صبح کسی کو نیند سے جگا کر اس طرح کی بات کرنا تو احمقانہ سوال تھا مگر علی الصباح اخبار پڑھنا اس سے بھی زیادہ احمقانہ فعل ہوتا۔ "فی الحال تو میں تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ میں گہری نیند میں ہوں اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" میرے لہجے سے ناگواری اور بیزاری کا تاثر صاف ظاہر تھا۔

ایرک لائن پر تھا، میں نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا اور ٹی وی آن کیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ ایرک کی فیکٹری کا خریدار ایڈم شیفرڈ جرمنی میں منی لانڈرنگ اور ایٹمی آلات کی اسمگلنگ کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ خبر سننے کے بعد میری سمجھ میں آ گیا کہ فیکٹری کی فروخت سادہ سا سودا نہیں بلکہ بڑے اسکینڈل کی کڑی تھی۔ خبر کے مطابق ایڈم گزشتہ کئی سالوں سے منشیات کی کمائی ہوئی دولت کو مختلف سودوں کے ذریعے جرمنی سے باہر لے جا کر سفید دھن میں تبدیل کر رہا تھا۔ ملزم نے کمپیوٹر ہیکر کی مدد سے مختلف بینکوں کا ڈیٹا ہیک کروا لیا اور جعلی دستاویز کے ذریعے سوئٹزر لینڈ، امریکا اور برطانیہ سمیت کئی ملکوں میں اپنا دھن منتقل کر کے اسے قانونی شکل دے چکا تھا۔ وہ برما سے یورپ منشیات اسمگل کرنے والے گروہ کے لیے بھی کام کر رہا تھا۔ خبر میں ایرک کا نام بھی لیا گیا۔ انکشاف کیا گیا کہ اس سودے کے پیچھے ایڈم کالا دھن سفید کرنے کے علاوہ ایک اور سنگین منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ ایڈم فیکٹری اکھاڑ کر برما لے جانا چاہتا تھا، جہاں وہ سینٹری فیوجز تیار کر کے ان ملکوں کو اسمگل کرتا جو ایٹمی پروگرام شروع کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ ایرک کی فیکٹری میں سینٹری فیوجز بنتے تھے۔ ایڈم یہ سینٹری فیوجز خرید کر شمالی کوریا کو اسمگل کرتا رہا تھا، جہاں وہ ایٹمی پروگرام میں استعمال ہو رہے تھے۔

"خبر سن لی۔" میں نے لیپ ٹاپ آن کیا۔

"میرا کسی دھندے سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف میرا خریدار تھا۔" ایرک نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے علم نہیں کہ وہ سینٹری فیوجز اسمگل کر رہا تھا۔"

"خیر... اب تمہارا نام تو بیچ میں آ ہی گیا ہے۔" میں نے نیویارک ٹائمز کی ویب سائٹ کھولی۔ ایرک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی پہلے صفحے پر خبر موجود تھی۔

"شاید میری چھٹی حس اس خطرے سے خبردار کر رہی تھی، اسی لیے میں نے سودے کی خبر خفیہ رکھنے کی کوشش کی۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔ میں فون کان سے لگائے خبر پڑھ رہی تھی۔ "یہ خبر تمہاری وجہ سے تو لیک نہیں ہوئی؟" کچھ توقف کے بعد ایرک نے پوچھا۔

"تمہارا خیال بالکل بکواس ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمہارا گاہک پکڑا گیا، وہ بھی جرمن پولیس کے ہاتھوں۔ میں یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے کر سکتی تھی؟ مجھ پر شک مت کرو، میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔"

"اوکے..." اس نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ اور باتیں ہوئیں۔ ایرک باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ اس سے قطعی لاعلم تھا۔ وہ باتوں باتوں میں بدستور مجھ پر شک ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سودا تو گیا، بہتر ہے کہ خود کو بچانے کی کوشش کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔

"وہ تو مجرم تھا مگر کوئی ایسا ضرور ہے جس نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔" ایرک نے تشویش سے کہا۔ "ضرور کوئی آستین کا سانپ ہے جو مجھے بھی پھنسوا کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو میں اس مارِ آستین کو پہچاننے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔"

میری بات کے جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ "بہتر ہے اب تم لوٹنے کی کوشش کرو، جتنا جلد ہو سکے۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ "ویسے بھی اب تمہارا وہاں ٹھہرنا فضول ہے۔"

"اوکے... میں ابھی یہاں سے نکل رہی ہوں۔"

"تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔" ایرک نے لائن منقطع کر دی۔

میں بستر سے اٹھی اور سامان پیک کرنے لگی۔ شیشے کی کھڑکی پر پڑا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں سامان پیک کرتے ہوئے بدستور سوچ رہی تھی کہ اسائنمنٹ تو ادھورا رہ گیا۔ فکر کی بات یہ تھی کہ میں نے وقت ضائع کیا تھا، اس کا معاوضہ اب ملے گا بھی یا نہیں۔ کچھ دیر بعد میں موٹیل سے واپس ائرپورٹ جا رہی تھی۔

☆☆☆

نیویارک واپسی کے بعد میں نے تین بار ایرک سے ملنے کی کوشش کی مگر اس نے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب میں اس کے دفتر پہنچی تو استقبالیہ کلرک نے انٹرکام پر ہی مجھے بتا دیا کہ ایرک کے حکم پر میرا دفتر میں داخلہ ممنوع ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت ذلت محسوس ہوئی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ مجھے ہی ساری گڑبڑ کا ذمے دار سمجھ رہا تھا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ایک دن میں سیڈار اسٹریٹ پر گاڑی پارک کر کے نکل رہی تھی کہ وہ نظر آ گیا۔ ایرک اپنی شاندار کار پارک کر کے باہر آ رہا تھا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ یقیناً وہ اپنے آفس سے لوٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا بریف کیس تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اسپن میٹل فیکٹری کی دستاویزات سے بھرا ہوگا۔ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر میں اندھیرے میں دُبک گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے دیکھے۔ میرا خیال تھا جیسے ہی وہ قریب پہنچے گا، میں اچانک اس کے سامنے آجاؤں گی۔ وہ میرے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

''ہیلو مسٹر ایرک بائیڈ!'' میں نے اچانک اس کے سامنے آ کر کہا تو لمحہ بھر کے لیے وہ گڑبڑا گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ''تم میرا فون نہیں اٹھاتے، دفتر میں میرا داخلہ بند کر دیا؟'' میرا لہجہ استفساریہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

ایک منٹ بعد میں اس کے ساتھ، اسی کی کار میں بیٹھی تھی۔ وہ پچھلی نشست پر تھا اور میں اگلی نشست پر۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ اس حالت میں کم از کم وہ مجھ پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اگرچہ وہ میرے لیے بے ضرر تھا لیکن اس نے مجھے بے عزت کیا تھا۔ میں بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''تمہارے وکیل نے فیکٹری فروخت کرنے کی مخالفت کی تھی۔'' میں نے خاموشی توڑی۔ ''اس کی دلیل ٹھوس تھی۔''

''تو تم اس کے پیچھے تھیں؟''

''اے... مجھے تمہارے مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تم فیکٹری کے مالک ہو، اسے بیچنا چاہتے تھے ایک گینگ کو۔''

''یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔''

''تم سینٹری فیوجز بناتے ہو جو گیس سے چلنے والے آلات میں استعمال ہوتے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''شمالی کوریا کا ایٹمی پروگرام اور یورینیم کی افزودگی... میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ ایٹمی پروگرام کامیاب بنانے کے لیے یورینیم کی افزودگی کتنی ضروری ہے اور اس کام کے لیے سینٹری فیوجز کی کیا اہمیت ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' ایرک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ٹی وی، اخبارات... لگتا ہے کہ اب تم نہ تو ٹی وی دیکھتے ہو اور نہ ہی اخبار پڑھتے ہو۔'' میں نے طنز کا بھرپور وار کیا۔ ''تمہارا جرمن پارٹنر... سوری! جرمن خریدار، سینٹری فیوجز اور فیکٹری آج کل میڈیا کا پسندیدہ موضوع ہے۔'' یہ کہہ کر چند لمحوں کا توقف کیا۔ ''حیرت ہے تم اب تک آزاد گھوم رہے ہو۔''

''سب بکواس ہے، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے دانت کچکچا کر جواب دیا۔ ''میں سینٹری فیوجز بناتا اور بیچتا ہوں۔ خریدار اس کا کیا کرتا ہے، مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔''

''بالکل غلط...'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تم سوئس... معاف کرنا، اپنے جرمن پارٹنر کے ساتھ مل کر یہ فیکٹری برما شفٹ کر رہے تھے۔'' میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ''سینٹری فیوجز کی تیاری اور اسمگلنگ کے لیے برما مناسب ملک تھا۔ وہاں قوانین کمزور ہیں۔ تمہیں چھوٹ مل جاتی اسمگلنگ کی۔ ویسے بھی وہاں مزدور کم نرخوں پر ملتے ہیں اور تمہارے پارٹنر کا منشیات نیٹ ورک بھی تو وہیں سے چلتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا تھا کہ وہ جرمن تھا۔ اس نے خود کو سوئس بتایا تھا۔ میں نے اس سے فیکٹری کا سودا کیا تھا۔ یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اسے لے جا کر کہاں لگائے گا... جرمنی میں یا پھر برما میں۔'' اس نے غصے سے جواب دیا۔ پستول کی نال کے سامنے وہ بے بس دکھائی دے رہا تھا مگر پھر بھی خود کو ہر معاملے سے لاتعلق ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ''خیر، یہ بات چھوڑو... میں نے ایٹمی پروگرام میں استعمال ہونے والے آلات کی تحقیقات کے لیے نہ تو تمہاری خدمات حاصل کی ہیں اور نہ ہی تم سی آئی اے یا ایف بی آئی کی ایجنٹ ہو۔'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''میں نے آڈٹ کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں اور وہ معاملہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب تمہارا مجھ سے یا میری فیکٹری کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ''خوامخواہ بیچ میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ۔''

''اڑانا ضروری ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''میں جس کام کے لیے گئی تھی، وہ مکمل کر چکی تھی۔ جان کلیٹن رقم کی خورد برد میں ملوث ہے۔ وہ پنشن اور واجبات فنڈز کی آڑ لے کر پیسا غبن کر رہا ہے۔''

''اچھا، اچھا۔'' یہ سنتے ہی اس نے بیزاری سے کہا۔

''جتنا میں جان سکی ہوں، اس نے مال بنا لیا اور اب بہت جلد تمہیں ڈاج دے کر نکلنے والا ہے۔'' میں اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ جس کام سے گئی تھی، وہ لگ بھگ مکمل کر چکی تھی۔ ''یہی کام تم نے میرے سپرد کیا تھا نا؟'' میں نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا...؟'' یہ سنتے ہی اس نے بے چینی سے پہلو بدل

کر کہا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

''وہی جو تم نے سنا۔'' میں مسکرائی۔ ''صرف ایک مالی سہ ماہی میں وہ ایک ملین ڈالرز رقم اِدھر اُدھر کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت بڑی رقم ریکارڈ میں گڑبڑ کر کے غبن کر چکا ہے۔''

''تم نہیں جانتیں کہ کس کے متعلق یہ بات کر رہی ہو۔'' ایرک نے میری بات سے اختلاف کیا، اس کا لہجہ نرم تھا۔ لگتا تھا وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اب بھی وقت ہے، اسے پکڑا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب فیکٹری کا سودا ہوگا تو اس کا پول کھل جائے گا۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہی اس راز کو فاش کرنے کے پیچھے ہو جس کا الزام تم نے مجھ پر دھرا تھا۔'' وہ غور سے میری بات سن رہا تھا۔ ''ممکن ہے کہ جان خریدار کے مجرمانہ پس منظر سے واقف ہو۔ ویسے بھی تمہارے سوا فیکٹری میں ہر شخص آگاہ تھا کہ خریدار جرمن ہے، ایک تم نے ہی اسے سوئس باشندہ ظاہر کیا تھا۔ ممکن ہے یہ بھی جان کی سازش کا حصہ ہو۔'' اپنی بات مکمل کر کے میں نے گہری سانس لی اور ایرک کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

کافی دیر تک کار کے اندر خاموشی رہی۔ ''تمہاری بات سن کر لگا کہ اس نے مجھے ڈبل کراس کیا ہے۔'' ایرک نے خاموشی کا قفل توڑا۔ یہ سنتے ہی میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔ آخر میں اس سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں ہی غلط تھا۔''

یہ سنتے ہی میرے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے مجھ پر اپنے دفتر کا دروازہ بند کر کے بے عزت کرنے کی کوشش کی اور میں نے اسے اپنے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''جان کلیٹن تو خود فیکٹری کے ممکنہ خریداروں کی فہرست میں کھڑا ہے۔'' میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سنتے ہی وہ اچھل پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔

''یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟'' میری بات سن کر اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' میں ایک بار پھر مسکرا دی۔ پستول بدستور میرے ہاتھ میں تھا البتہ اس کی نال نیچے ہو چکی تھی۔ ''شاید وہ بھی اسپن میٹل کی مارکیٹ میں تمہارا حریف ہوتا مگر یہ بات اہم نہیں۔ وہ پنشن فنڈز کے ذریعے فیکٹری خریدنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ پبلک پرائیویٹ کمپنی بناتا۔ بنیادی طور پر اس کے پاس کچھ رقم تھی، باقی کی رقم کا انتظام وہ فیکٹری کو بینک کے پاس رہن رکھوا کر کر لیتا۔ مالکان مزدور کہلاتے اور ملازم مالک بن کر معاملات چلاتا۔''

''تم جو کچھ کہہ رہی ہو، اسے ثابت کر سکتی ہو؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''ایرک، ایرک، ایرک...'' میں اس کی بات سن کر مسکرائی اور بڑے پیار سے کہا۔ ''میں ثبوت اکٹھے کرنے کا کام نہیں کرتی، صرف حقیقت تک پہنچ کر سچ سامنے لاتی ہوں اور اس کام کا ہی معاوضہ لیتی ہوں۔''

''یہ پندرہ ملین ڈالرز کا سودا ہے۔'' اس نے تشویش سے کہا۔ ''یہ رقم تھوڑی نہیں۔ اس کے لیے آسان نہیں ہوتا اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا... وہ بھی کساد بازاری کے اس دور میں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ ایک بار پھر میری بات پر سے اس کا یقین ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔

''خیر... اب یہ معاملہ اتنا بھی سادہ نہیں جتنا تم ظاہر کر رہے ہو۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ممکن ہی نہیں کہ جان نے اس بارے میں تم سے بات نہ کی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم سے اس نے سودے کی بات کی ہوگی مگر تم نے زیادہ کے لالچ میں اس پر دباؤ ڈالا۔ مزدوروں تک یہ بات پہنچائی اور فیکٹری میں تناؤ پیدا کیا تاکہ کساد بازاری کے اس دور میں منہ مانگے دام وصول کر سکو۔ اصل میں تم تو اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے جس کی آڑ میں تم سودے میں اتنی رقم لیتے کہ مزدوروں کی پنشن کے لیے دی گئی رقم کا خسارہ پورا ہو جاتا۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ میرا خیال نہیں، یقین ہے کہ ریکارڈ میں گڑبڑ کر کے بھاری رقم غبن کی گئی ہے۔'' اس نے بات کا رخ موڑ کر ایک بار پھر اپنا موقف دہرایا۔

''اب خاموشی سے سنو۔'' میں نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ میں اس طویل گفتگو سے بیزار ہو چکی تھی۔ ''تم فیکٹری بیچ رہے ہو اور ملازمین اسے خریدنا چاہتے ہیں۔ یہی سب کے لیے سب سے بہترین حل ہے۔'' میں اب یہ معاملہ ختم کرنا چاہتی تھی۔ میری بات سن کر پہلے تو اس کا رنگ فق ہوا اور پھر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

میں اس بات کی اچھی طرح تحقیق کر چکی تھی کہ یونین، فیکٹری کو خریدنا چاہتی تھی اور تمام مزدور اس بات پر متفق تھے۔ جان بھی یہی کوشش کر رہا تھا۔ اسے مزدوروں کی یونین اور دیگر اسٹاف کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ وہ خریداری کے لیے رقم کا

بندوبست کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

''میں پچھلے چھ دن سی آئی اے کے زیرِ تفتیش رہا اور اب انہوں نے مجھے بے گناہ قرار دے دیا ہے۔'' لمبی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ میری پوری توجہ اس کی طرف تھی۔ ''جرمنی اور امریکا کی مشترکہ ٹیم کے نتیجے میں ثابت ہو گیا کہ سینٹری فیوجز کی قانونی فروخت کا تو میں ذمے دار تھا لیکن ان کی اسمگلنگ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ ایڈم کالا دھن سفید کرنے میں ملوث ہے یا پھر وہ فیکٹری کو جرمنی کے بجائے برما لے جا کر نصب کرنا چاہتا تھا۔ سی آئی اے اور جرمن تحقیقاتی اداروں نے مجھے کلیئر کر دیا ہے اور آج رات دونوں ایجنسیوں کے عہدیدار برلن میں مشترکہ پریس کانفرنس کر کے اس بات کا اعلان کرنے والے ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ فیکٹری تمام الزامات سے پاک ہو گئی۔ اب اس کی فروخت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی... اب ایک اور بات سن لو۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کو پکڑوانے میں جان کا ہاتھ تھا اور اس نے یہ سب کچھ میرے ایما پر کیا۔ جب یونین تمہاری منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہے تو فیکٹری کسی اور کو کیوں بیچی جائے۔''

''تو جان...'' اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہاں وہی...'' میں مسکرا دی۔ ''تمہارا جرمن گاہک کبھی جان کا باس تھا اور جان ہی اس کے کالے دھن کو سفید کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا مگر یہ پندرہ سال پرانی بات ہے۔ جب تم نے جان کی نہ مانی تو پھر اس نے گاہک کا ہی پتّا صاف کر دیا۔''

''مگر جان نے جرمن ایجنسی سے کیسے رابطہ کیا؟''

''اس نے نہیں، میں نے... سی آئی اے کے زمانے سے ان کا ایک اعلیٰ عہدیدار میرا دوست ہے اور میری اطلاع پر چند گھنٹوں میں ہی انہوں نے آپریشن کیا اور وہ پکڑا گیا۔''

''اوہ میرے خدا!'' اس نے سر پکڑ لیا۔

''تم فیکٹری بیچنا چاہتے تھے تو خوش ہو جاؤ۔ تمہیں وہی قیمت مل رہی ہے جو وہ دے رہا تھا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''بولو... بیچتے ہو؟''

اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

اس کی رضامندی ملتے ہی میں نے موبائل فون نکال کر ایک نمبر ملایا۔ ''آ جاؤ۔'' دو منٹ بعد جان، کار کی پچھلی نشست پر ایرک کے ساتھ بیٹھا خریداری کے معاہدے پر دستخط کر رہا تھا۔ چند منٹ میں ہی انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے ایرک کے اکاؤنٹ میں کل رقم کا بیس فیصد ٹرانسفر ہو چکا تھا۔

جب ہم تینوں کار سے باہر نکلے تو ایرک نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے گیا۔ ''میں ایک نئی فیکٹری لگانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ موجودہ کساد بازاری عارضی ہے۔ چند مہینوں میں مندی کا یہ دور ختم ہو جائے گا۔ البتہ اس دوران ہم بہ آسانی بینک سے قرض اور سستے داموں مشینری لے سکتے ہیں۔''

''تو پھر...؟'' میرا لہجہ استفساریہ تھا۔ ''میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟'' میں نے چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے طنزیہ جملہ کسا۔ ''ایک بار تم نے میری خدمات لیں اور پھر مجھ پر اپنے دفتر کے دروازے بند کر دیے۔ اب اور کیا کرنا چاہو گے؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے گردن موڑی اور اس کی طرف دیکھا۔

''ورکنگ پارٹنر... رقم میری، انتظامات تمہارے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''نئی فیکٹری کی تم پارٹنر اور جنرل منیجر بھی ہو گی۔ روپے میں چالیس پیسے تمہارے اور ساٹھ پیسے میرا منافع۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''منظور ہے۔'' میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایک اور پیشکش...'' ایرک نے ادھوری بات کی۔

''وہ کیا؟''

''میری لائف میں بھی کوئی پارٹنر نہیں، اکیلے کام کر کر کے تھک چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھ ماری۔ ''منظور ہے؟''

''سوچیں گے مسٹر پارٹنر۔'' میں نے سر ہلا کر سنہری بالوں کی لٹ جھٹکی۔

''میرے خیال میں مسٹر پارٹنر کی جگہ لائف پارٹنر زیادہ بہتر ہے۔''

یہ سن کر میں مسکرا دی اور خود سپردگی کے عالم میں اس کے گلے لگ گئی۔

''تمہارا پستول چبھ رہا ہے۔'' اس نے میرے کان میں کہا۔

''پستول نہیں، پستول نما لائٹر۔''

''تبھی تم نے میرے دل میں بھی آگ لگا دی۔'' ایرک نے کہا تو میں نے بے ساختہ قہقہہ لگا دیا۔

کچھ فاصلے پر جان فون کان سے لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مزدور یونین کو کامیاب سودے کی خبر سنا رہا ہوگا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں مورین، کالٹ اور ان سب مزدوروں کے چہرے گھوم گئے جو بے روزگاری سے بال بال بچے تھے۔

خاندانی مجرم

جمال دستی

ایک روایت پرست خاندان کے سربراہ کی موت کا پراسرار معما

بچے زندگی کا محور و مرکز ہوتے ہیں... خصوصاً والدین کے لیے... ان کی شرارت اور ذہانت سے ہی ہر لمحہ لطافت سے بھرپور محسوس ہوتا ہے... وقت کے بدلتے رویوں کے باوجود کچھ والدین کی سوچ میں نمایاں تبدیلی نہیں آسکی ہے... اور آج بھی وہ ہر معاملے میں صرف بیٹوں کو ہی فوقیت دیتے ہیں...

برائن کی فون کال میرے لیے غیر متوقع تھی کیونکہ عرصہ دراز سے میرا اس گھرانے سے کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن جب اس نے بتایا کہ اسے میرے ایجنٹ نے فون نمبر دیا ہے تو میری حیرت دور ہو گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہربرٹ ملر کی آخری رسومات کے موقع پر میں حزنیہ دھن بجاؤں۔ وہ جانتا تھا کہ میں کسی زمانے میں اس کی ماں ورنا کا شاگرد رہ چکا ہوں اور اب ایک نامی گرامی موسیقار ہونے کی وجہ سے آخری رسومات میں ماتمی دھن بجانے کے لیے میری خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ وہ اس موقع کو یادگار بنانا چاہتا تھا کیونکہ باپ کی موت کے بعد اس کی دولت کا بڑا حصہ اسے ہی ملتا۔ ورنا کے حصے سے ایک ٹرسٹ قائم کیا جاتا جہاں سے اسے گزارے کے لیے ایک معقول رقم ملتی رہتی اور ایوی، وہ تو شاید اپنے باپ کی تدفین پر بھی نہیں آئے گی۔

میرے پاس فائر برڈ کا نیا ماڈل ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شراب کا کارٹن بڑی آسانی سے رکھا جا سکتا ہے جس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ جانتا ہوں

کہ نشے کی حالت میں گاڑی چلانا منع ہے لیکن طویل سفر کے دوران میں مجھے وھسکی کی بار بار طلب ہوتی ہے اس لیے مجبوراً مجھے یہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ میں نے ایک گیس اسٹیشن پر رک کر بوتل نکالی اور حلق تر کرنے کے بعد جیب سے سکہ نکال کر سلور کریک ہیرالڈ کا تازہ شمارہ خریدا پھر اس بوتل کو دوسری تین بوتلوں کے ساتھ باکس میں رکھ دیا۔ گاڑی میں اس طرح کا کھلا باکس لے کر چلنا خلافِ قانون ہے لیکن میں اس وقت موسیقاروں کے مخصوص لباس یعنی جیکٹ اور بو لگائے ہوئے تھا اور دیکھنے میں خاصا معزز نظر آ رہا تھا اس لیے اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ کوئی مجھے روکے۔

میں نے اپنی گاڑی چرچ کے عقبی حصے میں پارک کی اور اپنی شہنائی اٹھا کر گرجا کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک میری نظر ایوی پر گئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لبادہ پہنا ہوا تھا اور سردی سے بچنے کے لیے سر سے لے کر گردن تک اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے حیرت کے مارے شہنائی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور بولا۔ ”مجھے تمہاری یہاں موجودگی کی توقع نہیں تھی۔“

ایولین اور اس کے باپ کے درمیان کوئی تنازعہ چل رہا تھا جس کی تفصیلات میں کبھی نہ جان سکا۔ البتہ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ان دونوں کے درمیان کشیدگی کی وجہ کسی حد تک میں بھی تھا۔ جب مجھے میوزک کلاس میں داخلہ لینے کے لیے اسکالرشپ ملا تو وہ بھی کالج جانا چاہ رہی تھی لیکن اس کے باپ نے منع کر دیا جبکہ اس نے اپنے بیٹے برائن کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا اور باقاعدگی سے اس کے اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ ایوی گھر چھوڑ کر چلی گئی اور دو سال تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس نے شادی کر لی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

”شاید تمہارا خیال درست ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں یہاں اپنے کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔ میں تجہیز و تکفین کا انتظام کرتی ہوں۔“

مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ باپ کی بے رخی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر بھی چلی گئی تھی پھر اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے کہ اس نے یہ کورس کر لیا۔ ابھی میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”تم جانتے ہو میک کہ ہمارے یہاں ہر دس میں سے صرف ایک تجہیز و تکفین کے مرکز میں پیشہ ور اور قابل ڈائریکٹر ہوتے ہیں گو کہ میں ان جیسی نہیں لیکن کئی ایک سے بہتر ہوں۔“

اب معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ طلاق کے بعد اس کے حصے میں جو رقم آئی اور تھوڑا بہت قرض لے کر اس نے یہ ڈگری حاصل کی ہوگی اور اب وہ اپنا تجہیز و تکفین کا مرکز چلا رہی تھی۔ وہ راستے میں تھی کہ اسے ہربرٹ کے مرنے کی اطلاع ملی۔ وہ ہمیشہ ضروری سامان اپنی گاڑی میں رکھتی تھی لہٰذا اسے باپ کی لاش کو تیار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

اس نے اپنے باپ کو سیاہ تابوت میں رکھا تھا جس کے ہینڈل چاندی کے تھے اور چاروں طرف حاشیہ پر بھی چاندی کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت میں اور ایوی تابوت کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ڈبل بریسٹ نیوی کلر کا سوٹ، ہلکے نیلے رنگ کی قمیص اور سلیٹی رنگ کی ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ سوٹ بہت عمدہ تھا البتہ اوپر کی جیب میں رکھا ہوا رومال مجھے کچھ بے ترتیب سا لگا جیسے کسی نے اسے زبردستی جیب میں ٹھونس دیا ہو۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ایوی سے کہا۔

”اگر تم خیال نہ کرو تو میں اس رومال کو دوبارہ تہ کر کے جیب میں رکھ دوں۔ مجھے یہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔“

”اوہ میک! تم کتنے اچھے ہو۔ واقعی میرا دھیان اس طرف نہیں گیا۔“

میں نے ہربرٹ کی جیب سے رومال نکالا اور دوبارہ تہ کرنے کے لیے اسے کھولا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تہ سے کوئی چیز نکل کر اس کے سینے پر گری ہے۔ وہ ایک لفافہ تھا۔ میں نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا اور رومال کو دوبارہ تہ کیا اور اسے ہربرٹ کے سوٹ کی اوپری جیب میں سلیقے سے رکھ دیا۔ اب میرے حساب سے اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

گرجا کا ہال لوگوں سے بھر گیا تھا۔ میں نے اپنی شہنائی نکالی اور اسے درست کرنے لگا۔ برائن میرے پاس آیا اور میرے ساتھ کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لینے لگا۔ ایوی اگلی نشستوں پر بالکل بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں اس کاغذ کی موجودگی محسوس کی اور سرسری طور پر ایک نظر ڈالی۔ لفافے پر بھیجنے والے کا پتا لکھا ہوا تھا۔ ای۔ جے۔ ملر 12 میکینا ایونیو، سیوکس فالس۔ ایس ڈی گویا یہ لفافہ ایوی کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔ اس کا پورا نام ایولین جین ملر تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ کئی سالوں سے اس کی اپنے

باپ سے بات نہیں ہوئی۔

”مائیکل! تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

مجھے اسے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی مجھے مائیکل کہہ کر نہیں پکارتا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ تھا اور عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی تھی۔

”یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا، صدمہ اتنا شدید تھا کہ ہم تدفین کے انتظامات کے بارے میں سوچ بھی نہ سکے لیکن برائن ان معاملات میں کوئی کافی ہوشیار ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کا تم سے رابطہ ہو گیا۔“

”یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے مسز ملر۔“

”اوہ، تم اب میرے شاگرد نہیں رہے۔ اس لیے یہ تکلف چھوڑو۔“ ورنا پیانو بہت اچھا بجاتی تھی اور میں بہت چھوٹی عمر میں اس کا شاگرد بن گیا تھا۔ بظاہر وہ ایک ایسی گھریلو عورت نظر آتی تھی جس نے اپنی ساری مہارت باورچی خانے کے لیے وقف کر دی تھی لیکن تین سالوں میں، میں جان گیا کہ اس نے اپنے چہرے پر ایک مصنوعی نقاب اوڑھ رکھا ہے اور حقیقت وہ نہیں جو کہ نظر آتی ہے۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی وجہ سے چالیس سال تک ہربرٹ کی بیوی کا کردار نبھاتی رہی۔

”مجھے افسوس ہے۔“ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”برائن نے بھی نہیں بتایا کہ ہربرٹ کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“

ورنا نے میرا ہاتھ اس طرح دبایا جیسے وہ مجھ سے تعزیت کر رہی ہو اور بولی۔ ”کسی کو بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس کا بلڈ پریشر تھوڑا سا زیادہ رہنے لگا تھا۔ اس سے ہٹ کر اس کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ دیکھنے میں تندرست و توانا لگتا تھا لیکن ایک روز وہ ایسا سویا کہ اس کی آنکھ ہی نہ کھل سکی اور میں ابھی تک اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ شاید اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔“

☆☆☆

میں نے برائن کی فرمائش پر ایک حزنیہ دھن چھیڑی جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے باپ کی پسندیدہ دھن تھی حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے بعد ستائشی تقاریر کا دور شروع ہو گیا۔ برائن نے مجھ سے صرف ایک دھن بجانے کے لیے کہا تھا اور مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ مجھے صرف ایک دھن کے پچاس ڈالر دے گا۔ میرا خیال درست نکلا۔ برائن نے اس پروگرام میں مزید دو دھنوں کا اضافہ کر دیا تھا۔

برائن نے اپنی تقریر میں باپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ کس طرح اس کی تعلیم و تربیت ہوئی اور ہربرٹ نے اسے میڈیکل کالج میں بھیجنے کے لیے کتنی قربانیاں دیں۔ اس موقع پر میں نے ایوی کی طرف دیکھا تو وہ لاتعلق سی نظر آئی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کی باتیں سن بھی رہی ہے یا نہیں۔ برائن نے اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ سلور کریک میں اپنی پریکٹس شروع کرے گا تا کہ قصبے کے لوگوں کی خدمت کر سکے جن سے اس کے باپ کو بہت محبت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہربرٹ کی موت سے اس کا مشن ختم نہیں ہوگا۔ وہ اپنے باپ کی زمین پر ایک نیا کلینک بنائے گا تا کہ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہربرٹ کے اثاثوں کا بڑا حصہ برائن کو ہی ملنا تھا اور اس طرح وہ بہ آسانی اس زمین پر اپنا کلینک شروع کر سکتا تھا جہاں کئی دوسرے ڈاکٹر پریکٹس کرنے کے خواہش مند تھے برائن کے لیے اس زمین کا مالک بن جانے کے بعد اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا بہت آسان ہو جاتا۔

ورنا نے بھی اپنی تقریر میں ہربرٹ کی سماجی خدمات کے حوالے سے بات کی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس کی کوئی مثال پیش نہ کر سکے لیکن ایسا نہیں تھا۔ کسی زمانے میں وہ گرجا میں آرگن بجایا کرتا تھا لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جن سے انہیں بعد میں کوئی فائدہ ملنے کی امید ہو لیکن ورنا کا کہنا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کام میں بہتری آتی گئی اور وہ شادی کی تقریبات میں بھی یہ ساز بجانے لگا۔ وہ اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا اور اس کا مقصد نئے شادی شدہ جوڑوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔

میرے لیے سب سے زیادہ تعجب خیز ایک نوجوان کیون کی موجودگی تھی جو ورنا کے بعد تقریر کرنے آیا۔ ہربرٹ نے مرنے سے دو ہفتے پہلے اس کی شادی میں ساز بجایا تھا۔ اس نے اپنی نشست پر واپس جاتے ہوئے کہا کہ وہ اور اس کی بیوی اس سلسلے میں ہربرٹ کے بے حد مشکور ہیں۔ میری نگاہیں اس کے تعاقب میں تھیں، وہ اپنی نشست پر بیٹھ کر رومال سے آنسو صاف کر رہا تھا۔ کسی اجنبی کا ہربرٹ کے لیے آنسو بہانا ایک عجیب سی بات تھی۔

کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ان بیس سالوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ جب اس نے مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کے جرم میں قصبہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، کیا اس کے دل میں بیٹی

کے لیے کوئی نرم گوشہ ہو گیا تھا؟ کیا وہ اجنبیوں کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آنے لگا تھا۔ کیا اس میں بھی میرے لیے ایک پیغام تھا کہ میں اس کی آخری رسومات میں حزنیہ دھن بجاؤں۔

جب ایوی کا نمبر آیا تو میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا کہے گی۔ اس نے بولنا شروع کیا۔ ”موت بھی موسموں کی تبدیلی کی طرح ہے۔ سردیوں کے موسم میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اس کے بعد بہار آئے گی بالکل اسی طرح ہر زندگی کا اختتام موت پر ہوتا ہے لیکن ہم اس پر یقین نہیں رکھتے اور نہیں سوچتے کہ ایک دن ہمیں بھی مرنا ہے۔ کیونکہ ہم اپنی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس کی تیاری کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا اور پھر اچانک ہی اپنے پیاروں کو درد اور صدمے کی کیفیت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں ہم کبھی نہیں سوچتے۔

میرے والد کوئی غیر ذمے دار یا بے پروا انسان نہیں تھے۔ اور یہ بات میں ہمیشہ سے جانتی تھی گو کہ میں نے اس وقت بھی انہیں اس کا کریڈٹ نہیں دیا جبکہ اس کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنی موت کے حوالے سے پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ایک ہفتے پہلے مجھے ان کی جانب سے ایک خط ملا اور مجھے فخر ہے کہ اس ناقابلِ فراموش لمحے کو سینے سے لگائے میں بقیہ زندگی دوسرے لوگوں کو اس تیاری میں مدد دے سکوں گی۔“

اس نے لمحہ بھر کے لیے نیچے کی جانب دیکھا جیسے اپنے خیالات مجتمع کرنے کی کوشش میں ہو لیکن مزید کچھ نہ بولی اور خاموشی سے اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایوی نے اپنے باپ کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا۔ اس میں کسی ایسی سیلز گرل کے لہجے کی جھلک نظر آ رہی تھی جو اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہو۔ اس پر یقیناً اس کے باپ کی روح بھی فخر محسوس کر رہی ہوگی۔

اب میری باری تھی۔ میں اختتامی دھن بجانے کے لیے ڈائس پر آیا اور برائن ملر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جو اپنی بہن کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”اگر تم پیانو پر کوئی دھن بجا سکو تو میں مزید پچاس ڈالر دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم اب بھی پیانو بجاتے ہو نا؟“ برائن نے میرے عقب میں آتے ہوئے کہا۔ اس وقت میں اپنا ساز غلاف میں رکھ رہا تھا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم کس قسم کی دھن چاہتے ہو؟“

”کوئی بھی سنجیدہ دھن سنا دو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔ وقتی طور پر میرے ذہن میں کوئی ایسی دھن نہیں آ رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ پیانو پر بیٹھتے ہی میں کچھ نہ کچھ یاد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنا ساز اٹھایا اور اسے رکھنے کے لیے اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے جیب سے وہ لفافہ نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ کسی نے پنسل سے اس پر کچھ نام لکھ رکھے تھے۔ جن کی ترتیب یوں تھی۔

ایولین؟؟

برائن؟

ورنا؟

کیون؟

میک

میں یہ فہرست دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے نام کے آگے سوالیہ نشان نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں وھسکی کے کھلے ہوئے باکس کی طرف گیا اور چمڑے میں لپٹی ہوئی بوتل میں تھوڑی سی شراب نکالی۔ یہ بوتل میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ قریب میں کوئی بار نہ ہونے کی صورت میں میرے کام آ سکے۔

یہ نام کس نے لکھے۔ ہربرٹ یا کسی اور شخص نے جو اس فہرست کو اس کی جیب میں رکھ سکتا ہو۔ لیکن اسے رومال سے ڈھانپنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ فہرست بھی لاش کے ساتھ ہی دفن ہو جائے۔ سوچنے کی بات یہ بھی کہ ہربرٹ کی لاش پر یہ کاغذ کیوں رکھا گیا؟

مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں کچن میں گیا اور ایک سینڈوچ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا جو انہوں نے مہمانوں کے لیے بنائے تھے۔ مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ فہرست میں میرا نام کیوں لکھا گیا۔ دو گھنٹے بعد مجھے اس قصبے سے چلے جانا تھا اور دوبارہ واپسی کی کوئی امید نہیں تھی اگر ایوی کی وجہ سے آنا پڑ جائے تو وہ دوسری بات تھی۔

اب میرے لیے ایوی سے تجدید تعلقات کرنا زیادہ آسان تھا۔ ہم بچپن کے ساتھی تھے اور پہلے کے مقابلے میں ایک دوسرے کے لیے بہتر انداز میں سوچ سکتے تھے۔ اس کی موجودگی میں مجھے یہ احساس شدت سے ہوتا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنا سامان کندھے پر اٹھائے ہوٹلوں میں شب و روز گزارتا ہے اور وہ مجھے اپنے ریستوران میں ساز بجانے کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ رہ کر شاید میں کوئی

بہتر کام کر سکتا۔

میں پیانو پر آ کر بیٹھ گیا اور میرے دماغ میں جو پہلی حزنیہ دھن آئی، وہ میں نے بجانا شروع کر دی۔ میری نظریں ایوی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مجھے کچن سے نکلتی دکھائی دی۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو .... لمحہ بھر کو وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی اور جب میں نے دوبارہ دیکھا تو برائن اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ میں موسیقی کے شور میں ان کی گفتگو سننے سے قاصر لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا کہ برائن نے مجھے پیانو بجانے کے لیے کیوں کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایوی اس کی بات سنے بغیر چلی جائے۔

وہ بڑے تحمل سے اس کی تیز و تند گفتگو سن رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے اپنا سر ہلایا اور شانے بھی اچکائے۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس کا زوردار تھپڑ برائن کے گال پر لگا تھا۔ میں نے ساز روکنا مناسب نہ سمجھا۔ میری مداخلت سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے پاس آئی اور پیانو پر جھکتے ہوئے بولی۔

”مجھے ڈرنک کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

”اس کے لیے تمہیں میری کار تک جانا ہوگا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔“

☆☆☆

”یہ سب کیا تھا؟“ میں نے اسے بوتل پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ میری کار کے بونٹ پر بیٹھ گئی اور ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”برائن پاگل ہو گیا ہے۔“

”یہ کون سی نئی بات ہے۔“

”اس کے پاگل پن کی انتہا یہ ہے کہ وہ مجھ پر اپنے باپ کو قتل کرنے کا الزام لگا رہا ہے۔“

میں نے اپنے جبڑے سختی سے بھینچ لیے اور اس سے پہلے کہ ایوی اس پر توجہ دیتی، میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر ایک گھونٹ بھرا۔ ایوی کا نام بھی اس فہرست میں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ برائن کا نام کیوں لکھا گیا۔

”کیا اس کو تھپڑ مارنے کی یہی وجہ تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے پیسے چاہئیں۔ اس نے وہ کاغذات دیکھ لیے تھے جو میں نے کچھ عرصے قبل ڈیڈی کو بھیجے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ان سے انتقام لینا چاہتی تھی۔“

”کیا واقعی تمہیں اس کی دولت سے غرض نہیں تھی؟“

”کیا تمہیں یاد نہیں کہ جب میں نے آخری بار پیسے مانگے تو انہوں نے جواب میں یہی کہا تھا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم پر پیسے خرچ کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی بچے ہی پیدا کرتی ہیں۔ ان کی یہ بات سن کر میں مایوس ہو گئی اور اپنا راستہ الگ بنا لیا۔ جب میں نے پہلے اس سے پیسے نہیں لیے تو آئندہ بھی کچھ مانگنے یا لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”وہ کاغذات کیسے تھے؟“ مجھے اپنی جیب میں رکھے ہوئے لفافے کا خیال آ گیا۔

”پبلسٹی!“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں ایک اور کاروبار شروع کر رہی ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ لوگوں کو اپنی موت کے بارے میں سوچنا چاہیے اسی لیے میں انہیں زندگی کا بیمہ خریدنے کا مشورہ دیتی ہوں۔ اگر ایک ہزار لوگوں کو خطوط اور کتابچے ارسال کرو تو اس میں سے بمشکل تیس افراد جواب دیتے ہیں۔“

”گویا تم نے اسے خط نہیں لکھا تھا؟“

”نہیں بلکہ میری فرم نے یہ خط اور کتابچہ بھیجا تھا۔ دراصل ہم نے بڑی تعداد میں یہ خطوط چھاپ رکھے ہیں اور ان پر میرے دستخط اور عہدہ بھی موجود ہے۔ دیکھنے میں یہ اصلی لگتے ہیں اور اس طرح میرا وقت بچ جاتا ہے۔ میری سیکریٹری یہ خطوط مختلف لوگوں کو بھیجتی رہتی ہے۔“

”گویا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ہربرٹ یہی سمجھا ہوگا کہ تم نے انشورنس پالیسی بیچنے کے لیے اسے ذاتی طور پر خط لکھا ہے۔“

ایوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا اس نے تمہیں اس خط کا جواب دیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ شاید نہ دیا ہو۔ میں گزشتہ دو ہفتے سے سفر میں ہوں جبکہ ظاہر ہے کہ سارے خطوط دفتر کے پتے پر آتے ہیں اور میرا اسٹاف ہی انہیں دیکھتا ہے۔“

”لیکن تم نے اپنی تقریر میں تو کہا تھا کہ ہربرٹ نے مرنے سے پہلے تمہیں خط لکھا تھا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ تم نے اس وقت جھوٹ بولا تھا یا اب بول رہی ہو؟“

”اوہ، وہ صرف ایک جذباتی حربہ تھا۔“

”میں بھی اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔“

ہم نے ایک دوسرے کو طنزیہ انداز میں دیکھا۔ اس کی باتوں پر یقین کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں سیکریٹری اور اسٹاف کا تذکرہ کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے

ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کارپوریٹ فرم چلا رہی ہو۔ لیکن حقیقت میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہاں اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو اس کی باتوں پر یقین کیا جا سکتا تھا میرے دل میں جو خلش تھی، اسے دور کرنے کے لیے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''ایوی، جب تم یہاں آئیں تو تمہیں ہربرٹ کی جانب سے اس کے جنازے کے بارے میں دی جانے والی ہدایات کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تھا۔ بائرن کا کہنا ہے کہ ہربرٹ خاص طور سے چاہتا تھا کہ میں ہی اس موقع پر حزنیہ دھن بجاؤں۔''

''وہ یہی چاہتا تھا۔'' ایوی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ تمہارا ملنا مشکل ہوگا شاید تم ہوائی یا اس جیسی کسی دوسری جگہ نہ چلے گئے ہو۔ اس نے سب لوگوں کی فہرست تیار کر رکھی تھی کہ کون لوگ اس کے جنازے میں شرکت کریں گے۔ کون تقریر کرے گا اور کون اسے لباس پہنائے گا۔ جو پہلے سے ہی الماری میں لٹکا ہوا تھا اور مجھے صرف اسے تیار کرنا تھا۔''

''ضرور کسی نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہوگا۔'' میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''اس کا امکان ہے۔ مردہ خانے کے لوگوں نے ہی اسے تیار کیا تھا۔''

''اور وہ رومال؟''

''اس کے بارے میں کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''کیا وہ پہلے سے اس سوٹ میں رکھا ہوا تھا؟''

''ہاں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔''

اب بہت سی باتیں مجھ پر واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ ہربرٹ ملر کو اپنی بیٹی یا اس کی فرم کی جانب سے انشورنس پالیسی خریدنے کے بارے میں ایک خط ملتا ہے، یہ واضح نہیں ہو سکا کہ اس نے اس خط کا کیا جواب دیا۔ البتہ اس نے لفافے کے ایک ٹکڑے پر کچھ لوگوں کے ناموں کی فہرست ضرور بنائی۔ تین ہفتے بعد اس کی موت واقع ہو گئی لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنی آخری رسومات کے بارے میں واضح ہدایات دیں اور کاغذ کا وہ ٹکڑا اس سوٹ کی جیب میں رکھ دیا جو تدفین کے موقع پر اسے پہنایا جاتا اور پھر اسے ایک رومال سے ڈھانپ دیا۔ کیا اسے امید تھی کہ کوئی اس کاغذ کو دیکھے گا لیکن کون اتنی زحمت کرتا۔ اس کے مقابلے میں یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے وکیل کے نام خط لکھ دیتا۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے اس رومال کو نکال کر دوبارہ تہ کر کے کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔'' ایوی ممنون ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ ان دنوں جنازے کی تیاری بھی شادی کی طرح ہوتی ہے لہٰذا اس میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ تم ہمیشہ سے ہی کپڑوں پر گہری توجہ دیتے ہو۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ واقعی مجھ میں یہ کمزوری تھی۔ کپڑے پہنتے وقت میں قمیص، ٹائی، رمال اور خاص طور پر جوتوں کو اچھی طرح دیکھتا تھا۔ اس کے بعد کف لنکس کی باری آتی تھی۔ کیا ہربرٹ اسی لیے میری موجودگی چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس بے ترتیب رومال پر میری نظر ضرور جائے گی اور اس طرح میں وہ فہرست دیکھ سکوں گا۔ کیا اسی لیے اس نے میرا نام اس فہرست میں شامل کیا تھا اور اس کے آگے سوالیہ نشان بھی نہیں لگایا تھا۔

ایوی نے بوتل خالی کی اور کار کے بونٹ سے اتر آئی۔ اب اس کا رخ اپنی کار کی جانب تھا۔ اس نے اپنی گاڑی میں ایک سیاہ رنگ کا لوہے کا صندوق رکھا ہوا تھا جس کے کنارے سلور کلر کے تھے اور اس پر ایک بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اندر ایک بورڈ تھا جس میں کیمیکلز کی مختلف سائز کی بوتلوں کے لیے سوراخ بنے ہوتے تھے۔ ڈھکنے کے اندرونی حصے میں چمڑے کی چھوٹی چھوٹی جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں مختلف نوعیت کے چھوٹے اوزار، دستانے، روئی کے پیکٹ، برش اور دیگر مختلف اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ جن کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے مجھے ایک جوڑی ربر کے دستانے دیتے ہوئے کہا۔ ''انہیں پہن لو۔ کہیں کسی کیمیکل سے تمہیں نقصان نہ پہنچے۔''

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا مطلب سمجھتا۔ وہ اچانک ہی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے بکس کا بغور جائزہ لیا اور بولی۔ ''کسی نے میرے سامان کو چھیڑا ہے۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

''بالکل، ان بوتلوں کو کسی نے ہاتھ لگایا ہے۔''

''مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگ رہا۔''

''دیکھو۔'' وہ ایک بوتل مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑا سا کیمیکل باہر کی جانب چھلک گیا ہے اور خشک ہونے پر اس نے پوڈر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب یہاں ایک دھبا نظر آ رہا ہے۔''

میں نے اس جانب دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی اور بولا۔ ''یہ تو انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں اس پر ایک اور پوڈر ڈالوں تو یہ نشان واضح ہو جائے گا لیکن میں اتنی زحمت کیوں کروں؟''

''تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس نے یہ حرکت کی ہے؟'' میں نے کہا۔

''میری کوئی چیز غائب نہیں ہوئی اس لیے پولیس میں شکایت نہیں کی جا سکتی اگر کسی کا پتا چل بھی جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

اس نے ایک بار پھر اپنے سامان کی طرف دیکھا۔

''کیا اس سامان میں کوئی ایسی چیز ہے جو کسی شخص کی جان لے سکے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا پھر اپنے کندھے اچکا دیے۔

''کیا کسی شخص کے پاس تمہارے باپ کو مارنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟''

''یہ بڑا عجیب سوال ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہر شخص کے پاس کسی کو قتل کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ جن میں، میں بھی شامل ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔''

میں ایوی پر شک کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن کسی نہ کسی کو اس کی کار میں رکھے ہوئے بکس کے بارے میں علم تھا اور شاید یہ جاننے کے لیے ہی اس کے سامان کو چھیڑا گیا تھا کہ کہیں اس میں کوئی زہر تو نہیں ہے۔

وہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میک! کیا تم کوئی ایسی بات جانتے ہو جو مجھے معلوم نہیں؟''

فوری طور پر میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے وہ فہرست دکھاؤں یا نہیں اگر اسی نے ہربرٹ کو قتل کیا ہے تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟

''یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے باپ سے بہت ناراض تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کو مارنے سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ وصیت کے مطابق اس کے اثاثوں کا بڑا حصہ برائن کو ملے گا اور بقیہ رقم مما کے گزارے کے لیے مخصوص کر دی جائے گی۔ میں تو یہاں سے خالی ہاتھ ہی جاؤں گی۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہربرٹ نے اس کے نام کے آگے دو مرتبہ سوالیہ نشان کیوں لگایا تھا۔ میں نے اسے وہ فہرست تھما دی اور اسے اپنی سوچ سے بھی آگاہ کر دیا۔

اس نے اپنا بکس بند کر کے اسے تالا لگایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''برائن یہ حرکت نہیں کر سکتا۔''

''تم اپنی ماں کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔''

''فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن برائن ایسا نہیں کر سکتا۔''

''تم یہ بات اتنے یقین سے کیوں کہہ رہی ہو جبکہ ہربرٹ کے مرنے سے اسے ہی سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہے۔ کم از کم وہ اس قیمتی زمین کا مالک بن گیا جس کی اسے کلینک کے لیے ضرورت تھی۔''

''وہ اس زمین کے لیے جب بھی کہتا، اسے مل جاتی۔ ڈیڈی اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔''

''اس لڑکے کیون کے بارے میں کیا خیال ہے جو ماتمی تقریب کے دوران رو رہا تھا؟''

''اسے تو آنا ہی تھا۔ اس فہرست میں انہی لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں جن کی موجودگی ڈیڈی نے ضروری سمجھی۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر کہنے لگی۔ ''دیکھو میک! اس بارے میں مزید غور و فکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ممکن ہے کہ ڈیڈی نے یہ فہرست اس لیے تیار کی ہو کہ انہیں ڈر تھا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اور اسی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی کار میں بیٹھو اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟ اس لیے کہ کسی نے تمہیں یہ معما حل کرنے پر مامور کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر نہ جانے کی کیا وجہ ہے؟'' وہ جرح کرنے کے انداز میں بولی۔

''کیونکہ ابھی مجھے تمہارے بھائی سے پیسے لینے ہیں۔''

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ مجھے اس کا یہ انداز ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زمین اور آسمان بھی اس کے ساتھ ہی قہقہے لگا رہے ہیں۔

میں اندر جا کر مزید دھنیں بجانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی برائن کو ایک کونے میں لے جا کر پیسے وصول کرتا۔ مجھے ایوی سے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اس کے پاس ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ ہے۔ دوسری صورت میں کوئی موٹیل تلاش کرنا پڑتا جہاں ہم دونوں کو ڈنر کے ساتھ ساتھ ایک کمرا بھی مل سکے اور وہاں ہربرٹ کا بھوت ہمیں پریشان نہ کر سکے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ اپنے دفتر ایک فون کر لوں۔ میرا کئی دنوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ گو کہ کافی دیر ہو گئی ہے لیکن میری سیکریٹری ابھی وہیں ہو گی۔''

''کیوں؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ ڈیڈی نے انشورنس پالیسی خریدی تھی یا نہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ نہ جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور جذبات بے قابو ہونے لگے۔ اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

☆☆☆

میں واپس اندر چلا آیا اور پیانو پر ایک دھن چھیڑ دی۔ ورنا میرے پاس آئی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے ابھی تک موسیقی سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرایا اور میری انگلیاں تیزی سے پیانو پر چلنے لگیں۔ ''بہت سے لوگ تمہیں مایوس کریں گے۔'' وہ میرے چہرے پر اپنی سرد نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کس جواب کی توقع کر رہی تھی۔ وہ اس عمر میں بھی مضبوط اور صحت مند نظر آ رہی تھی اور لگتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ فلوریڈا بھی جا سکتی ہے۔ جہاں ساحل کے کنارے کوئی پرانی عمارت خرید کر لوگوں کو پیانو بجانا سکھائے گی۔ اسے ہمیشہ سے ہی نوجوانوں کا ساتھ پسند تھا۔

''میرے خیال میں یہ معمولی باتیں ہیں اور تمہیں ان پر اتنی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتے۔''

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے صرف اشتعال انگیز باتیں ہی یاد رہتی ہیں جن سے مجھے دکھ ہوتا ہے اور جب میں ہربرٹ کے بارے میں سوچتی ہوں تو ایسی سب باتیں ذہن میں گونجنے لگتی ہیں۔ مثلاً جب وہ اپنے پیالے میں چمچہ چلا چلا کر بچا کھچا دلیا بھی سمیٹنے کی کوشش کرتا یا نہانے کے بعد اپنے کپڑے لانڈری کی ٹوکری میں رکھنے کے بجائے باتھ روم میں ہی چھوڑ کر آ جاتا، اس وقت تو مجھے بہت ہی غصہ آتا جب وہ کوئی ساز بجاتے ہوئے بار بار اپنی انگلیاں چاٹتا۔''

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی؟''

پھر مجھے ایک امدادی شو یاد آ گیا جہاں ہربرٹ آرگن بجاتے ہوئے بار بار اپنا ہاتھ منہ کی طرف لے جا رہا تھا گو کہ یہ بہت پرانا واقعہ تھا لیکن ابھی تک میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھا اور جب ورنا نے اس کا ذکر چھیڑا تو مجھے یاد آ گیا۔

''ہاں، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ہربرٹ اپنی مرضی کا مالک تھا اور اسے اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی بیوی کا درجہ نہیں دیا اسی لیے میں ہربرٹ کی باتوں کو یاد رکھنا نہیں چاہتی حالانکہ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ورنا کا نام بھی تو ہربرٹ کی فہرست میں شامل تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہربرٹ کے پاس یہ سوچنے کی معقول وجہ تھی کہ ورنا بھی اس کی موت کی خواہاں ہے۔ ممکن ہے کہ ورنا کے ذہن میں کسی ایسی جگہ کا تصور ہو جہاں وہ باقی زندگی سکون سے گزار سکے۔ اس کی باتوں سے تو یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ہربرٹ سے شادی کرنے کے بعد سے ہی وہ ایسے اقدامات کے بارے میں سوچنے لگی ہو۔

''اب تم کیا کرو گی؟'' میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ہربرٹ نے میری گزر بسر کا معقول انتظام کر دیا ہے گو کہ میں اس سے زیادہ کی حق دار تھی لیکن میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں یہیں رہ کر انتظار کروں گی کہ برائن کب شادی کرتا ہے اور کب اسے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میری

ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

آخری جملہ شاید اس نے برائن کو سنانے کے لیے ہی کہا تھا جو نہ جانے کب میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میک! تقریباً سب لوگ جا چکے ہیں۔ تم بھی پیانو بجانا بند کر دو۔'' اس نے اپنی ماں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں تمہیں چیک لکھ دوں؟''

''شکریہ! تم مجھے نقد رقم دے دو۔''

برائن نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بٹوے سے پچاس کے دو نوٹ نکال کر مجھے تھما دیے۔ گویا اس کی جیب میں پیسے تھے لیکن وہ چیک لکھنے کا بہانہ کر کے مجھے ٹال رہا تھا۔

''مسٹر میک!'' کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کچن کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک لڑکا مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔

''تمہارے لیے ایک فون کال ہے۔ تم یہاں آ کر فون سن سکتے ہو۔'' اس لڑکے نے بلند آواز سے کہا۔

''تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔'' ورنا بولی۔ وہ ابھی تک اسی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ برائن پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ ''میں کچھ دیر یہاں بیٹھ کر سانس لے لوں پھر اپنا راستہ پکڑوں گی۔''

میں اس سے ہاتھ ملا کر فون سننے کچن میں چلا آیا۔ دوسری جانب سے ایوی بول رہی تھی۔

''میک! میری بات غور سے سنو۔ میں نے اپنے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ ہربرٹ ملر نے انشورنس پالیسی خریدی تھی۔ جس کے کاغذات گزشتہ مہینے تیار ہوئے تھے لیکن ہم نے اسے اس ماہ کی پانچ تاریخ کو سرٹیفکیٹ بھیجا جو اسے سات تاریخ کو مل گیا ہو گا یعنی اس کے انتقال سے دو ہفتے پہلے۔''

''پالیسی کی مالیت کتنی ہے؟'' میں نے یہ دیکھنے کے لیے گردن گھمائی کہ ورنا یا کوئی اور استقبالیہ کمرے میں تو موجود نہیں لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''پچیس ہزار ڈالر۔'' ایوی نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔''

''ورنا کے تو مزے آ گئے۔'' میرے دل میں شک کا ناگ ایک بار پھر سر اٹھانے لگا۔

''ورنا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''آپ کسی کو بھی اپنا وارث بنا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ورنا ہی ہو۔ دفتر کے ریکارڈ کے مطابق یہ پالیسی کیون یورگ کے نام پر ہے اور بیمے کی رقم اسی کو ملے گی۔''

''یہ وہی لڑکا ہے جس کی شادی پر ہربرٹ نے ساز بجایا تھا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں یہ وہی ہے۔'' وہ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد بولی۔ ''میں اس خاندان کو جانتی ہوں۔ اس کی ماں میری یورگ شادی سے پہلے میری ایرن تھی۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو لیکن وہ ایک کیٹرنگ کمپنی میں کام کرتی تھی جو شہر کے مرکز میں واقع دفاتر میں دوپہر کا کھانا فراہم کیا کرتی تھی۔ ان میں ڈیڈی کا دفتر بھی شامل تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایوی؟'' مجھے اس انکشاف پر بالکل یقین نہیں آیا۔

''جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہی حقیقت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کیون، ہربرٹ کا بیٹا ہو۔''

میرے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے اور جسم کے مساموں سے پسینا بہنے لگا۔

''کیا تم ابھی تک وہیں ہو؟'' ایوی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اب مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ اسے کوئی ایسا زہر دیا گیا جو آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا ہے اور یہ حرکت اسی کی ہو سکتی ہے جسے یہ معلوم ہو کہ ہربرٹ کو انگلیاں چاٹنے کی عادت تھی۔''

''تم وہاں سے نکل آؤ۔'' وہ ایک وقفے کے بعد بولی۔ ''میں تمہیں رینو، میں ملوں گی۔ وہاں بیٹھ کر سوچیں گے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔''

میں نے ٹیلی فون اپنی جگہ پر رکھ دیا اور دیوار کے ساتھ سر لگا کر کچھ سوچنے لگا۔ صرف ایوی اور ورنا کو ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ ہربرٹ نے اپنا بیمہ کروایا ہے۔ ایوی کو اس لیے معلوم تھا کہ یہ پالیسی اس کے توسط سے خریدی گئی تھی اور ورنا کو اتفاقاً یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ ایوی کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ ہربرٹ نے پالیسی خریدی یا نہیں لیکن اگر وہ اس کی تصدیق کرتی تو اسے اطمینان ہو جاتا۔ البتہ ورنا کے لیے اس خبر میں دلچسپی کا پہلو تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہربرٹ کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی میں محبت کا کوئی دخل نہیں تھا اور وہ محض اس رشتے کو نبھانے کے لیے باوقار انداز اپنائے ہوئے تھی۔ شاید ہربرٹ کو بھی اتنی مہلت نہیں ملی کہ وہ اپنی

وصیت کے بارے میں وکیل کو لکھ سکتا۔ اسی لیے اس نے چند ناموں کی فہرست بنانے پر اکتفا کیا جنہیں وہ اپنے جنازے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا اور سرد ہوا سے میرے بال اڑنے لگے تھے۔ گرجا سے آنے والی روشنیاں سڑک کی تاریکی دور کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ اس لیے مجھے اپنی کار تک پہنچنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ابھی میں اس سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا کہ میں نے کسی سائے کو دیکھا، وہ میری کار کے دروازے سے چپکا ہوا کھڑا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں زور سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے پستول کا رخ میری جانب کرلیا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔

''مائیکل! گاڑی کی چابیاں مجھے دے دو۔'' مجھے ورنا کی آواز سنائی دی۔ ہوا کی وجہ سے کھمبے پر لگا ہوا بلب ادھر ادھر جھول رہا تھا۔ میں نے اس کی مدھم روشنی میں ورنا کو دیکھا جو اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑی تھی۔

میں کار کی چابی کے بارے میں سوچنے لگا اگر میں نے اس کا مطالبہ پورا نہ کیا تو کیا وہ مجھے گولی مار سکتی ہے؟

''مجھے افسوس ہے کہ تم اس معاملے میں شامل ہو گئے۔'' وہ قدرے نرمی سے بولی۔ ''مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ ایوی معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گی، وہ ہمیشہ کی ہی تیز ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ اس نے کچن کے دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر یا دفتر کے ایکسٹینشن پر ہماری گفتگو سن لی ہے۔ جس کے بعد اس کا اطمینان رخصت ہو گیا ہوگا۔

''مائیکل! چابیاں دو۔'' وہ غراتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا اس امید پر کہ ٹکر مار کر اسے گرا دوں لیکن وہ میرا ارادہ بھانپ گئی اور سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اب نہیں رکنا ہوگا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے تھوڑا سا وقت مل جائے۔''

میں نے لرزتے ہاتھوں سے کار کی چابی اسے پکڑا دی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچ پاتا، اس نے گاڑی... ریورس کی اور تیزی سے پارکنگ لاٹ سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے سگنل پر گاڑی روکی اور مشرق کی طرف سفر کرنے لگی۔

میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں اپنا سر تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا پھر مجھے خیال آیا کہ میرا بگل بھی گاڑی میں ہی ہے گویا جب تک کار واپس نہیں ملتی۔ میں ایک طرح سے بیکار ہو گیا تھا۔

پھر مجھے گاڑی میں رکھے وھسکی کے کھلے ہوئے کارٹن کا خیال آیا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کہیں اس پر میرا نام تو نہیں لکھا ہوا تھا۔ امید تو یہی تھی کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں نے سر اٹھا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور کار میرے سامنے آکر رک گئی۔ اس میں سے ایوی برآمد ہوئی اور اس نے قریب آکر میرا بازو پکڑ لیا۔

''میک! تم ٹھیک تو ہو؟''

''کسی حد تک۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ورنا نے فون پر ہونے والی ہماری گفتگو سن لی تھی۔''

''کیا اس نے تم پر حملہ کیا تھا؟''

''ایوی! وہ ستر برس کی عورت مجھ پر کیسے حملہ کر سکتی ہے البتہ اس نے مجھ پر ریوالور ضرور تان لیا تھا اور میری گاڑی چھین کر لے گئی۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔'' اس نے پُرسکون انداز میں قہقہہ لگایا۔

''کیا، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''جب میں یہاں آرہی تھی تو میں نے تمہاری کار کو جاتے ہوئے دیکھا۔ رکنے کا موقع نہیں تھا اس لیے ایک بلاک آگے جا کر ٹھہر گئی۔ جب وہ کار میرے پاس سے گزری تو میں نے دیکھا کہ اسے تم نہیں چلا رہے تھے۔ میں تفصیل تو نہیں جان سکی لیکن جو دیکھا وہی کافی تھا اسی لیے یہاں چلی آئی، کیا تم نے پولیس کو فون کر دیا؟''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور بولی۔ ''کیا وہ کسی کو قتل کرنے جا رہی تھی؟''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کیون کی جانب ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔'' اس دلچسپ صورتِ حال پر میرا قہقہے لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔ بے چاری ورنا جس نے ساری زندگی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

''پھر پولیس اس گاڑی کا پیچھا کیوں کر رہی تھی؟'' ایوی نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا لیکن وہ شراب کا کھلا ہوا باکس رکھنے کے الزام میں ضرور پکڑی جائے گی اور پھر سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

راکافرڈ

مختار آزاد

ایف بی آئی کے ایجنٹ کے لیے دردِ سر بن جانے والے کیس کی سنسنی خیز روداد

دانستہ یا نادانستہ سرزد ہو جانے والے جرائم کا حساب تو دینا پڑتا ہے... کچھ حساب ایسے ہوتے ہیں... جو عمر بھر انسان کو الجھائے رکھتے ہیں... کوششوں کے باوجود وہ سود و زیاں کے ان جھمیلوں سے نکل نہیں پاتے ... ایک ایسے ہی کردار کا احاطہ کرتی تیز رفتار کہانی... جو حساب بے باق ہو جانے کے باوجود مسلسل جواب دہی میں الجھا ہوا تھا...

ایف بی آئی کی اسپیشل ایجنٹ ڈونا شیفرڈ چمکتی دمکتی کار کو شمالی ورجینیا سیفٹی ہائی وے سے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے واقع وسیع و عریض پارکنگ میں درجنوں کاریں کھڑی تھیں۔ شروع میں پارکنگ کی گنجائش تھی مگر گہرے سرخ رنگ کی وہ کار پارکنگ لاٹ کے اس جانب بڑھتی رہی جہاں ڈونا کھڑی تھی۔ ڈونا کو اسی کا انتظار تھا۔ وہ اس سے پہلی بار ملاقات تھی مگر جانتی تھی کہ جس کی منتظر ہے، وہ خود بھی اس سے ملنے کا مشتاق ہوگا۔ راجر نے اپنی گاڑی کی جو نشانی

بتائی تھی، اس میں پہلی نشانی کار کا گہرا سرخ رنگ، دوسری پہچان برانڈ اور تیسری اس کی نمبر پلیٹ تھی۔ جس انداز سے وہ کار پارکنگ لاٹ کے سب سے آخری حصے کی طرف بڑھ رہی تھی، اس سے ڈونا کو یقین تھا کہ اس کا ملاقاتی پہنچ چکا ہے۔ وہ جہاں موجود تھی، اس سے دو سو گز کے قریب فاصلے پر چند روز پہلے خونی حادثہ ہو چکا تھا۔ حادثے کے بعد کار میں آگ لگ گئی تھی، جس سے کار چلانے والی عورت اتنی بُری طرح جھلسی کہ اس کی شناخت ناممکن ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ اسی حادثے کے سلسلے میں اس کا بیان لینے آئی تھی۔ وہ حادثے کا چشم دید گواہ تھا۔ کم از کم پولیس کے سامنے اس نے یہی دعویٰ کیا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا لیکن بہار کے آخری دنوں کی وہ دھوپ خاصی تیز تھی۔ سرخ کار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پیپر کلپ بورڈ بغل میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھ کر کار کی نمبر پلیٹ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ سرخ کار اس کی پرانی سیڈان کے برابر آ کر رک گئی۔ پرائیویٹ نمبر پلیٹ والی سیڈان کار ڈونا خفیہ آپریشن کے دوران استعمال کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خفیہ مشن پر تھی۔ اس کا نام، پہچان، پیشہ اور شخصیت سب کچھ نقلی تھا۔ ''ایل ایم وائی نائن تھری...'' وہ نمبر پلیٹ پڑھ رہی تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور کلنٹن کوپر باہر نکلا۔ مضبوط ہاتھ پیروں والا کوپر بہت پُر اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ سوا چھ فٹ کے کلنٹن کی عمر بہتر سال تھی لیکن اچھی صحت اور کسرتی جسم کے باعث وہ عمر سے کم لگ رہا تھا۔ اسے پہچانتے ہی ڈونا نے اپنی حکمتِ عملی کو دل میں دہرایا۔

کوپر عمدہ تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ یہ اور بات کہ اس لباس سے چھچھورا پن صاف ظاہر تھا۔ وہ جس ادا سے کار سے اترا، اس سے لگ رہا تھا کہ جیسے حسیناؤں کے جھرمٹ میں کوئی پلے بوائے آن پہنچا ہو۔ کسی طور نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک حادثے کا عینی شاہد ہونے کی حیثیت میں بیان دینے کے لیے آیا ہے۔

اسے آگے بڑھتا دیکھ کر وہ چوکنا ہو گئی۔ جانتی تھی کہ کوپر کا شوق تھا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر متاثر ہوں اور ویسے بھی ڈونا کے بارے میں اس کی دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ اتنی خوب رُو ضرور ہے کہ دل پھینک ایک بار اس پر نظر پڑنے کے بعد مرعوب کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہوں گے۔ اکہرے جسم، خوبصورت سیاہ آنکھیں، بھورے بال، لمبا قد... اسے یقین تھا کہ کوپر اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی۔ یہ بھی اس کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

سادہ لباس میں ملبوس ڈونا نے اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر نہایت احتیاط سے جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مائکرو ریکارڈنگ سسٹم کا بٹن آن کر دیا۔ یہ کرتے ہوئے اس نے خاصی احتیاط برتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر کوپر کو ذرا سا بھی شک ہوا کہ یہ عورت ایف بی آئی کی اسپیشل ایجنٹ ہے اور اسے ایک بار پھر جیل بھجوانے کے مشن پر ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ وہ تربیت یافتہ ایجنٹ تھی...اور اس طرح کے لوگوں سے دو دو ہاتھ کر سکتی تھی مگر ہمیشہ سے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ سرِ عام تماشا بننے سے بچا جائے۔

کلنٹن کوپر بیس سال پہلے ایف بی آئی کی نظروں میں آیا تھا۔ وہ کار انشورنس کمپنی سے فراڈ کے الزام میں پکڑا گیا تھا اور جرم ثابت ہونے پر دس سال کی سزا کاٹنے کے بعد رہا تو ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود ایف بی آئی کی اس فہرست میں شامل تھا جن پر رہائی کے بعد مدتوں نظریں رکھی جاتی ہیں۔

ڈونا سکون سے کھڑی تھی۔ پیپر کلپ بورڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے کوپر کے قریب آنے کا انتظار تھا۔ کوپر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، معنی خیز انداز میں ڈونا کو تکتا ہوا، اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو ڈونا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''میں انیتا جیمز ہوں۔''

''اوہ...'' کوپر نے فوراً ڈونا کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ جس عورت کی آواز میں نے فون پر سنی، وہ اتنی زیادہ حسین ہو گی۔''

''شکریہ۔'' ڈونا نے مسکرا کر کہا۔ ''حادثے کے زخمیوں کے وکیل کے لیے بطور تفتیش کار کام کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دل ربا انداز سے مسکرا دی۔

''ایرل راجرز۔'' اس نے ڈونا کے ہاتھ کو گرم جوشی سے جھٹکا دیتے ہوئے تعارف کروایا۔ یہ اس کی عرفیت تھی اور زیادہ تر لوگ اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مس جیمز۔''

''انیتا جیمز۔'' ڈونا نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا۔ اس آپریشن کے لیے اس کا یہی نام تھا۔ سیڈان کار کی رجسٹریشن اور وزیٹنگ کارڈ پر بھی یہی نام درج تھا۔ کارڈ پر اس کا فون نمبر اور ای میل

ایڈریس بھی درج تھا۔ ان تینوں چیزوں کی تصدیق اس سیڈان کی رجسٹریشن سے کی جا سکتی تھی جو اس وقت پارکنگ میں کھڑی تھی۔ یہ کارڈ بھی اس نے اپنے منصوبے کے تحت تیار کرایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوپر اس کے بارے میں خفیہ طور پر کچھ جاننے کی کوشش کی تو موٹر رجسٹریشن کی ویب سائٹ سے تصدیق کر سکے گا۔

''ملاقات کے لیے وقت نکالنے کا شکریہ۔'' یہ کہہ کر اس نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''آپ نے ملنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا، میرے دفتر میں بھی یہ ملاقات ہو سکتی تھی؟'' ڈونا نے کوپر المعروف راجر کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے دفتر بھی آ سکتا تھا مگر مجھے کھلے ماحول میں باتیں کرنا اچھا لگتا ہے...'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا ''خصوصاً اجنبی عورتوں سے۔''

''میرے لیے دفتر اور باہر سب برابر ہے۔'' ڈونا نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے تو صرف تمہارا بیان لینا تھا، اب چاہے یہاں دو یا دفتر میں۔ کام تو صرف کام ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ ''کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے کوپر کو دیکھا۔

''تم مجھے یہاں کی نہیں لگتی ہو۔'' کوپر نے جواب دینے کے بجائے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ ''لگتا ہے تمہاری ابتدائی زندگی ٹیکساس میں گزری اور جوانی کی اٹھان بھی اسی ریاست کی گرم فضاؤں کی دین ہے۔'' اس نے ہالی ووڈ کے تیسرے درجے کے رومانٹک ہیرو کی طرح دانت نکالتے ہوئے اس کے حسن کی تعریف کی۔

''میرے بارے میں اتنا درست تجزیہ۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور اس کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ''غضب کی قیافہ شناسی ہے تمہاری۔ واقعی میں ٹیکساس سے حال ہی میں یہاں منتقل ہوئی ہوں۔ تم نے بالکل ٹھیک پہچانا مگر ایک بات ہے۔''

''وہ کیا؟'' کوپر نے چونک کر پوچھا۔

''میں مناسس پارک کے فارم ہاؤس میں رہتی تھی مگر وہاں نہ تو کوئی باڑ تھی اور نہ ہی میں گھوڑے پالتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ڈونا کو ایف بی آئی ریکارڈ سے پتا چلا تھا کہ پہلی بار جب کوپر کو فراڈ کے جرم میں گرفتار کیا گیا، تب وہ مناسس پارک میں ہی رہتا تھا۔ کوپر کے ساتھ اس کے تین بالغ بیٹوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا تاہم انہوں نے باپ کے جرم سے ہر قسم کی لاتعلقی ظاہر کی تھی۔ عدالت نے عدم ثبوت پر اس کے تینوں بیٹوں کو بری کر دیا تھا۔

''واقعی... تم مناسس پارک کی رہنے والی ہو؟'' کوپر نے ایسے کہا جیسے اسے یہ سن کر یقین نہ آیا ہو۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔''

''میرے بہت سے جاننے والے اب بھی مناسس پارک میں رہتے ہیں۔'' کوپر نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تمہاری طرح خوش قسمت نہیں۔'' ڈونا کے لہجے سے افسردگی جھلک رہی تھی۔ ''تمہاری بات کچھ اور ہے۔ تمہارے وہاں بھی جاننے والے ہیں اور یہاں بھی شناساؤں کی کوئی کمی نہیں مگر بدقسمتی سے نہ تو وہاں میرا کوئی رشتے دار ہے اور نہ ہی یہاں کوئی دوست۔''

''خود کو بدقسمت نہ کہو۔'' کوپر نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''رہی دوستی کی بات تو مجھ سے دوستی کر لو، کسی اور سے دوستی کر لو... دوستوں کا کیا ہے، ملتے ہیں بچھڑتے ہیں اور پھر مل جاتے ہیں۔''

''میں اتنی خوش قسمت بھی نہیں ہوں۔'' وہ فوراً بولی۔ ''ایک تو پرائیویٹ تفتیش کار کے کام میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔ دوسرے یہاں پر بھی مجھے اب تک کوئی اچھا کام نہیں مل پایا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ''لگتا ہے ورجینیا میں خاصی مندی ہے، ورنہ میں نے تو سنا تھا کہ یہاں پرائیویٹ تفتیش کاروں کو اچھا خاصا معاوضہ ملتا ہے۔ یہی سوچ کر میں یہاں منتقل ہوئی تھی کہ چلو نئے علاقے میں نیا کام کر کے، زندگی کی نئی ابتدا کروں گی مگر...'' وہ کہتے کہتے رکی اور کچھ توقف کے بعد افسردہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''لگتا ہے یہاں منتقل ہونے کا میرا فیصلہ درست نہیں تھا۔''

کوپر بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو کہنے لگا۔ ''تو وہ تمہیں اچھا معاوضہ نہیں دے رہے؟'' یہ کہتے ہوئے بظاہر اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

ڈونا نے اس کی بات سن کر سر اٹھایا، کندھے اچکائے۔ ''میری تفتیش کے نتیجے میں وہ خود تو اچھا خاصا پیسا بنا لیتے ہیں مگر مجھے اتنا نہیں دیتے جتنا میری محنت کے نتیجے میں خود حاصل کر لیتے ہیں۔''

"کچھ وقت دو۔" اس نے ڈونا کے سراپا کا ایک بار پھر بغور جائزہ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" اس کے لہجے سے بظاہر لگ رہا تھا جیسے وہ ڈونا کو یقین دلانے کی کوشش کررہا ہو جیسے اس کی ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہوں۔ "نئی جگہ پر انسان کو شروع شروع میں اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو بہتر ہے کہ کام کی بات کرلی جائے۔" یہ کہہ کر وہ کلپ بورڈ پر لگے کاغذات پڑھنے لگی۔ کچھ دیر کاغذات پر نظر دوڑانے کے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا اور اسے دیکھا۔ "بہتر ہے کہ وہاں بیٹھ کر بات کرلیں۔" اس نے درخت کے نیچے بچھی خالی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" کوپر نے کہا تو وہ دونوں درخت کی طرف بڑھے۔

"تمام تر تفصیلات سے یہ بات پتا چلی ہے کہ حادثے کے فوراً بعد جائے وقوعہ پر کوئی پولیس والا نہیں پہنچا تھا۔ پولیس کو اطلاع بھی تم نے ہی دی تھی؟"

"تمہاری بات درست ہے مگر تم ورجینیا پولیس کو نہیں جانتیں۔" کوپر نے مسکرا کر ڈونا کو دیکھا۔ "جب تک حادثے کی نوعیت سنگین نہ ہو، ورجینیا پولیس جائے حادثے کا رخ ہی نہیں کرتی۔ ویسے بھی ذمّے دار ڈرائیور تو بھاگ گیا تھا اور میں اس کار کا نمبر بھی نوٹ نہیں کرسکا تھا لیکن میں جائے حادثہ پر تھا اور سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس لحاظ سے پولیس کو اطلاع دینا میری اخلاقی ذمّے داری تھی۔ میں نے اپنی یہ ذمے داری پوری کی۔"

"تم نے خود آگ بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس آگ بجھانے والا سیلنڈر نہیں تھا، دوسرے آگ بہت تیزی سے بھڑکی تھی۔"

"اچھا۔" ڈونا نے بے یقین نظروں سے کوپر کو دیکھا اور پھر کلپ بورڈ پر لگے کاغذات کو الٹ پلٹ کر سادہ کاغذ نکالا، اسے سب سے اوپر لگایا اور جیب سے پین نکالا۔ "ذرا تفصیل سے بتاؤ، اس دن کیا کچھ ہوا تھا؟" یہ کہہ کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے کوپر کو دیکھا۔

یہ سن کر وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر پارکنگ کی طرف نظریں دوڑائیں اور گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ "سمجھو وہ سڑک ہے اور میں اس طرف سے آرہا تھا۔" کوپر نے اسے حادثے کا آنکھوں دیکھا حال سنانا شروع کیا۔ "میں بڑے آرام سے گاڑی چلا رہا تھا۔ راستہ بالکل صاف تھا۔ دور دور تک نہ تو کوئی انسان تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی ماسوائے اس کار کے جس نے بہت تیزی سے مجھے اوورٹیک کیا۔ جیسے ہی اس تیز رفتار کار نے اوورٹیک کیا، اچانک ایک گاڑی ادھر درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سامنے سڑک پر آگئی۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ کس طرح حادثے کا سبب بننے والی کار سائڈ سے نکل کر تیزی سے سڑک پر آئی تھی۔ "جیسے ہی درختوں کے جھنڈ سے وہ کار نکل کر سڑک پر آئی، اچانک دوسری کار اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کے بعد زور سے بریک چرچرانے کی آواز آئی۔ میں نے بھی جلدی سے بریک لگائے۔ اسی دوران میں زوردار دھماکا ہوا۔ دونوں کاریں دھماکے سے ایک دوسرے سے ٹکرا چکی تھیں۔ میں نے جلدی سے سائڈ میں اپنی کار روکی اور باہر نکلا تو دیکھا کہ جس کار نے مجھے اوورٹیک کیا تھا، اس کی ایک سائڈ بری طرح تباہ ہوگئی مگر دوسری کار تصادم سے درخت سے ٹکرائی۔ دوسری کار کے ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی کو گھمایا اور یہ جا، وہ جا مگر دوسری گاڑی... اس سے پہلے کہ میں اس کار کے قریب پہنچتا، اچانک دھماکا ہوا اور گاڑی شعلوں میں گھر گئی۔ کچھ دیر تک تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں مگر پھر جیسے ہی میں میرے اوسان قابو میں آئے، فوراً موبائل فون سے پولیس کو اطلاع کردی۔"

"بہت خوب!" اس نے نہایت تیز رفتاری سے اس کا بیان قلم بند کیا اور پھر ستائشی لہجے میں کہا۔ "تمہارا بیان میری تحقیقات میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے غور سے کوپر کو دیکھا۔ "تم نے جس طرح واقعہ بیان کیا، اسے سن کر تو لگتا ہے کہ کبھی تم بھی ٹریفک حادثے کے تفتیش کار رہے ہوگے۔ اتنی عمدگی سے تم نے تفصیلات بتائی ہیں، اسے سن کر ایک لمحے کو تو خود مجھے بھی یہ محسوس ہوا جیسے سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہورہا ہے۔" ڈونا نے اس کی تعریف کی۔

"ایسا ہرگز نہیں۔" کوپر نے جلدی سے کہا۔ ڈونا کی بات سن کر اس کے ماتھے پر پسینے کی چند بوندیں نمودار ہوگئیں۔ "ویسے تو میں کبھی بھی ٹریفک حادثے کا تفتیش کار نہیں رہا البتہ لڑکپن میں ایک وکیل کے پاس کچھ عرصہ ملازمت کی تھی۔ وہ ٹریفک حادثات اور انشورنس کے مقدمات لڑتا تھا۔ وہیں پر اس طرح کی باتیں سنا کرتا تھا، شاید اس لیے نہایت تفصیل سے تمہیں حادثے کا منظر بتانے میں کامیاب ہوا ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے یہ بات کہی۔

"تو کیا وہ سب حادثات سچے ہوتے تھے یا پھر وکیل حادثوں کی آڑ میں موٹر انشورنس کمپنیوں سے مال اینٹھنے کا کچھ کام کرتا تھا؟" یہ کہتے ہوئے ڈونا کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ وہ اس کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ "میرا مطلب ہے جعلی ٹریفک حادثات؟"

"شاید ایسا ہی ہو... یا ممکن ہے تم غلط کہہ رہی ہو۔" کوپر نے شرٹ کے کف اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تب میں چھوٹا تھا، اس بارے میں زیادہ نہیں جان سکا تھا کہ ٹریفک حادثات جعلی بھی ہوسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گہری نظروں سے ڈونا کی طرف دیکھا اور ناگوار لہجے میں کہنے لگا۔ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ جعلی حادثات رچا کر فراڈیے مال بنا رہے ہیں۔"

"میرے کہنے کا مقصد تم پر تنقید کرنا نہیں تھا۔" ڈونا نے کوپر کے لہجے کی ناگواری بھانپتے ہی کہا۔

یہ سنتے ہی کوپر نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایسے ہونٹ سکیڑے جیسے "نہ" کہنے والا ہو مگر کچھ نہیں بولا۔ "یہ بہت خطرناک کام ہے، آئندہ میں ایسا خطرہ مول نہیں لوں گا۔" کچھ توقف کے بعد اس نے چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اپنا وقت برباد کیا، تمہاری درخواست پر یہاں ملنے آیا۔ ایک اچھے شہری کی طرح جو کچھ دیکھا وہ بتایا، قانون کی مدد کی مگر..." یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور ڈونا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس حماقت سے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ حادثہ آنکھوں کے سامنے ہی کیوں نہ ہو، گواہ پھر بھی مت بنو۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" ڈونا نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"شاید... لیکن تمہاری باتوں سے یہ لگ رہا ہے جیسے میں کرائے کا گواہ ہوں۔" اس کے لہجے سے ناراضی صاف ظاہر تھی۔

"تمہاری دل آزاری کی معذرت چاہتی ہوں مگر میرے کہنے کا مطلب وہ نہیں تھا، جو تم سمجھے۔" ڈونا نے معذرت خواہانہ انداز میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "خیر... اگر تم میری بات پر ناراض ہو تو یہ تمہارا حق ہے مگر میں ایک تفتیش کار ہوں اور اس طرح کی باتیں سن کر اکثر بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہوجاتے ہیں مگر کیا کروں، یہ سوالات میری مجبوری ہیں۔ یہ میری پیشہ ورانہ ذمّے داری ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم باتیں پورے دھیان سے سنتی ہو۔" کوپر کا لہجہ ایک بار پھر دوستانہ تھا۔

"شکریہ... میں کام کی بات پر پوری توجہ دیتی ہوں۔" ڈونا نے جواباً کہا۔ "میرے خیال میں اب ساری باتیں ہوچکی ہیں، ہمیں چلنا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بالکل..." کوپر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں پارکنگ کی طرف واپس جارہے تھے۔

ڈونا اپنی سیڈان کار کی طرف بڑھی۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ کلپ بورڈ اور جیکٹ اتار کر سیٹ پر پھینکی اور دروازہ بند کیا۔ اسی دوران میں اپنی سرخ کار کی طرف بڑھتے بڑھتے کوپر رکا اور اس کی طرف پلٹا۔

"واقعی تم نے اس کیس میں تفصیلی بیان دے کر میری بہت مدد کی ہے۔" کوپر قریب پہنچا تو ڈونا نے مسکرا کر کہا۔

"میں تمہیں صرف بائے کہنے آیا تھا۔" کوپر نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"میرا وزیٹنگ کارڈ تمہارے پاس ہے۔ ایسی کوئی بات جو تم بتانا بھول گئے ہو، یاد آجائے تو موبائل نمبر پر رابطہ کرسکتے ہو۔"

"شکریہ۔" وہ مسکرایا۔ "اگر کوئی بات یاد آئی تو ضرور فون کروں گا۔"

میکے والوں کے لیے قیمتی میز پوش... اور میرے گھر والوں کے لیے یہ ذلیل سا کاغذی دسترخوان...!

ڈونا نے کچھ نہیں کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
کوپر سے ملاقات کے بعد جب وہ پارکنگ سے باہر نکلی، اس وقت شام کے سوا چار بج رہے تھے۔ وہ پندرہ منٹ تک شہر کے مختلف راستوں پر بے مقصد گاڑی گھماتی رہی۔ اس دوران میں اس کی نظریں بار بار بیک ویو مرر پر پڑ رہی تھیں۔ وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ کہیں کوپر یا اس کے آدمی تعاقب تو نہیں کر رہے۔ اچھی طرح یقین کر لینے کے بعد اس نے مضافاتی سڑک کے کنارے کار روکی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس نے مائکرو سی ڈی ریکارڈر نکالا اور ہیڈ فون کانوں سے لگا کر کوپر سے ہونے والی گفتگو سننے لگی۔ اس نے دو بار سی ڈی ریوائنڈ کر کے سنی مگر اس میں ایسا کچھ نہیں تھا جس سے کوئی مطلب نکالا جا سکتا۔ ”بڈھا بہت ہی چالاک ہے۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ریکارڈر بند کر کے برابر والی سیٹ پر پھینک دیا۔ اس نے تیزی سے گاڑی گھمائی۔ اس کا رخ اب ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔

ڈونا کو یقین کی حد تک شک تھا کہ حادثے میں آگ لگنے سے تباہ ہونے والی کار ناکارہ ہوگی مگر یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ عورت کون تھی جس کی جھلسی ہوئی لاش حادثے کا شکار بننے والی کار سے ملی تھی۔ اب تک اس لاش کا نہ تو کوئی وارث سامنے آیا تھا اور نہ ہی پولیس کے پاس اب تک کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہوئی تھی۔ جب تک لاش کی شناخت نہ ہوتی، تب تک کار انشورنس کا کلیم داخل نہیں ہوتا۔

کوپر کا بیان دراصل ایک ڈراما تھا، ڈونا بیان لینے کی آڑ میں اس کی شخصیت کا نفسیاتی جائزہ لینا چاہتی تھی۔ اس کا داغ دار ماضی ثابت کرتا تھا کہ وہ جعلساز ہے مگر اس کی عمر دیکھ کر ڈونا سوچ رہی تھی کہ شاید اب وہ یہ نہیں چاہے گا کہ جیل جائے اور پھر مر کر ہی باہر نکلے۔ اس وقت کوپر بہتر سال کا تھا اور اگر دوبارہ جعلسازی ثابت ہوتی تو کم از کم اسے تیس برس کے لیے اندر جانا پڑتا۔ اب کون چاہے گا کہ اس عمر میں جیل جائے اور زندگی کے آخری سال پنجرے میں قید رہ کر موت کا انتظار کرے۔ ویسے بھی کوپر سے مل کر اسے احساس ہوا کہ وہ زندہ دل تھا۔ زندگی کے آخری برسوں کا بھرپور لطف لینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

جب ڈونا نے کوپر فراڈ کیس پر تفتیش شروع کی تو سب سے پہلے یہ تصدیق کی کہ حادثے کے نتیجے میں تباہ ہونے والی کار کی مالیت کتنی ہوگی۔ اسے شک تھا کہ وہ کار بہت زیادہ مہنگی نہیں ہوگی اور پھر ورجینیا میں رجسٹرڈ گاڑیوں کے کمپیوٹر ریکارڈ نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ کار 1980ء ماڈل کی ٹویوٹا تھی جو ورنر آرنلڈ کے نام پر پہلی بار رجسٹرڈ ہوئی۔ اس کی موت کے بعد یہ کار ٹرسٹ کی ملکیت میں چلی گئی جس نے اسے ایڈم اسمتھ نامی شخص کو نیلامی میں فروخت کر دیا۔ اس کے بعد آخری مالک ہنری جانسن تھا۔ موٹر رجسٹریشن اور تنسیخ ریکارڈ کے مطابق مذکورہ کار کئی سال پہلے ناکارہ قرار دے دی گئی تھی جس کے بعد اس پر عائد ٹیکس ختم کر کے اسے سڑکوں پہ رواں دواں گاڑیوں کی فہرست سے خارج کیا جا چکا تھا۔ ڈونا کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک طرف تو کار کو ناکارہ قرار دے دیا گیا تھا تو پھر وہ کس طرح انشورنس کے قابل ہوگئی؟ یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن میں جھما کا ہوا۔ وہ اس کا سارا کھیل سمجھ چکی تھی۔

کوپر ناکارہ گاڑیوں کو لے کر موٹر رجسٹریشن کا جعلی ریکارڈ تیار کر کے ان کی انشورنس کرواتا ہوگا۔ ڈونا کا خیال تھا کہ اس کام میں وہ تنہا نہیں، کوئی ایسا ضرور ہے جو سوفٹ ویئر جعلسازی اور کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ میں ردوبدل کے علاوہ قانونی پیچیدگیوں کے بارے میں اس کی مدد کرتا ہوگا۔ ڈونا سوچ رہی تھی کہ جو شخص پبلک ڈیٹا میں ہیر پھیر کر کے ناکارہ گاڑی کی جعلی رجسٹریشن کی بنیاد پر انشورنس کروا سکتا ہے، وہ ایک گاڑی کی کئی کمپنیوں سے انشورنس بھی کروانے کا سوچ سکتا ہے تاکہ ایک حادثہ اور کئی کلیم مل سکیں۔

ڈونا نے موبائل نکالا اور گلین ٹونر کا نمبر ملانے لگی۔ گلین ایف بی آئی کے انفارمیشن ٹیکنالوجی شعبے کا سربراہ تھا۔ سائبر کرائم کی تفتیش میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

”کیا ہوا؟“ گلین نے فون اٹینڈ کرتے ہی پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈونا ایک اہم کیس پر کام کر رہی ہے۔

”مجھے کچھ معلومات چاہئیں۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”ایس ایم ایس پر تمہیں ایک کار کا رجسٹریشن نمبر بھیج رہی ہوں۔ تم موٹر شناختی نمبر سے اس کی تصدیق کرو۔ پتا چلاؤ کہ اس نمبر کی گاڑی کن کن ریاستوں میں رجسٹرڈ کی گئی اور آخری بار اس کی ازسرِنو رجسٹریشن کس ریاست میں کرائی گئی تھی۔ میں نے ورجینیا اور قریب کی دیگر چار پانچ ریاستوں میں ان کی رجسٹریشن کا پتا چلانے کی کوشش کی ہے لیکن پبلک ڈیٹا میں کار کا ریکارڈ موجود نہیں۔“

”نمبر بھیجو، میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ گلین نے جواب دیا۔ ”مگر مسئلہ کیا ہے؟“

یہ سن کر ڈونا نے اسے کلنٹن کوپر سے ملاقات اور فراڈ کی تفصیلات بتائیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر کوپر یہ کام کر رہا ہے تو کمپیوٹر ریکارڈ میں ہیر پھیر کر کے ناکارہ گاڑیوں کو حادثے میں تباہ کر کے انشورنس کلیم داخل کرتا ہوگا۔ اس کام کے لیے کوئی ماہر ہیکر اس کے گروہ میں شامل ہوگا۔“ اس نے گلین کو اپنے شک کے بارے میں بتایا۔ ”مگر ایک سوال کا جواب باقی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

”وہ کیا؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی گلین نے پوچھا۔

”جو کار تازہ ترین حادثے میں تباہ ہوئی، وہ کئی سال پہلے ناکارہ قرار دی گئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کار اگر انشورنس کلیم وصول کرنے کے لیے تباہ کی گئی ہے تو پھر رجسٹریشن ریکارڈ کے بغیر انشورنس کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر انشورنس کی رقم حاصل کرنا کوپر کا مقصد نہیں تو پھر حادثے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“

”تم درست سوچ رہی ہو۔“ گلین اس کی پوری بات سمجھ گیا تھا۔ ”وہ سائبر فراڈ بھی کر رہا ہے۔ جھوٹے انشورنس کلیم کے علاوہ وہ سائبر کرائم کر رہا ہے۔ اس نے یقیناً ہمارے ڈیٹا تک رسائی حاصل کر لی ہے اور اس کی مدد سے وہ جعلی ویب سائٹس کے ذریعے موٹر رجسٹریشن کر کے ناکارہ گاڑیوں کی انشورنس کروا رہا ہے۔ اس پر دو جرم ثابت ہوتے ہیں۔ انشورنس کمپنی سے فراڈ اور سرکاری ریکارڈ کی چوری۔ اس پر فوجداری کے ساتھ سائبر کرائم ایکٹ کے تحت بھی مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ڈونا نے اس کی بات مکمل ہونے پر کہا۔ ”مگر میری تفتیش کے مطابق اب تک ورجینیا کی کسی بھی انشورنس کمپنی میں ایسا کوئی کلیم داخل نہیں ہوا، جس سے شک ہو کہ کوپر نے واقعی یہ سب کچھ کیا ہو مگر اس کے باوجود مجھے تمہاری بات میں وزن محسوس ہوتا ہے۔“

”ممکن ہے یہ ڈبل رجسٹریشن فراڈ ہو یا پھر...“

”یہی بات ہے۔“ ڈونا نے چہک کر کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم پتا چلاؤ کہ کیا واقعی ان گاڑیوں کی امریکا کی کسی اور ریاست میں رجسٹریشن ہوئی ہے یا نہیں۔ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو، تب تک اس پر ہاتھ ڈالنا جلد بازی ہوگی۔ دوسرے ہمیں یہ پتا چلانا ہے کہ اگر کلیم حاصل کرنا مقصد نہیں تو اس حادثے کے پیچھے ملزم کا اور کیا مقصد پوشیدہ ہو سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ ”تم فون رکھو، میں ابھی تمہیں کار کی رجسٹریشن، انجن اور چیسس نمبر ایس ایم ایس کرتی ہوں۔ بس تم فوراً اس کام میں لگ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے، تم نمبر بھیجو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کوشش کرتا ہوں کہ نہ صرف ان کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ چیک کرواؤں بلکہ مینول رجسٹریشن بھی۔“

”اس کام میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟“

”میرا خیال ہے کل صبح تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہیے۔“ گلین نے کہا۔

”اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے کال منقطع کی اور موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اب اور کیا کچھ کرنا ہوگا۔

ڈونا نے انیتا جیمز کی حیثیت سے خود کو کلنٹن کوپر سے متعارف کرواتے ہوئے جس وکیل کی تفتیش کار ہونے کا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا تھا، اس پر وکیل کے دفتر کا اور خود اس کا موبائل نمبر بھی درج تھا۔ اس نے ملٹن کو فون کر کے بتانا ضروری سمجھا کہ وہ کوپر سے مل چکی ہے۔ ملٹن پیریز وکیل تھا لیکن خفیہ طور پر وہ ایف بی آئی کا ایجنٹ بھی تھا۔ وہ چاہتی تو اسے ایس ایم ایس پر بھی بتا دیتی مگر اس نے فون کرنا مناسب سمجھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر کوپر سے ملٹن رابطہ کرے تو اسے یہ تو پتا ہونا چاہیے کہ وہ اس سے مل چکی ہے۔

”ہیلو، کون بول رہا ہے؟“ ملٹن نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

ڈونا نے خفیہ نام سے اپنا تعارف کرایا۔ ”سر! میں گواہ سے ملی ہوں اور ان کا بیان لے لیا ہے۔“

”خوب...“ اس نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”کب ملاقات ہوئی؟“

”آج سہ پہر۔“ اس نے ایسے جواب دیا جیسے وہ اصل میں ملٹن کی اسسٹنٹ ہو۔ ”میں اپنی رپورٹ لکھ رہی ہوں، آج رات تک ای میل کر دوں گی۔“ وہ بدستور کوشش کر رہی تھی کہ اگر کوئی اس کا فون ہیک بھی کر لے، تب بھی اس کی اصلیت جان نہ پائے۔ ”مسٹر راجر سے ملاقات بہت مفید رہی۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے میرے تمام سوالوں کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔“

اس کی بات سن کر ملٹن خاموش رہا۔ ٹیلی فون لائن رابطے میں تھی مگر ان دونوں کی خاموشی کے باعث مکمل سناٹا تھا۔ وہ دونوں اس خاموشی کی وجہ سمجھتے تھے اور جان بوجھ کر

چپ ہوئے تھے۔ چند لمحوں کی اس خاموشی کے دوران ڈونا کی پوری توجہ فون لائن پر مرکوز تھی مگر وہاں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ تھی۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ اگر کوئی یہ کال سن رہا تھا تو وہ سمجھتا کہ ملٹن کچھ سوچنے لگا تھا۔ ''کوئی مسئلہ...'' آخر اس نے سکوت توڑا۔

''نہیں سر!'' ڈونا نے تابع داری سے جواب دیا۔

''او کے... تم رپورٹ مکمل کر کے بھیج دو... بائے۔'' یہ کہہ کر ملٹن نے لائن منقطع کردی۔

کچھ دیر تک وہ بیٹھی اپنے کام نمٹاتی رہی اور جب وہ کثیر المنزلہ تجارتی پلازا کی بالائی منزل پر خفیہ طور پر قائم کیے گئے ایف بی آئی ایجنٹس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکلی تو شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

ڈونا نے اپنی سیڈان کار اسٹارٹ کی اور کچھ میل کی دوری پر واقع ٹائی سن کارنر والے راستے پر آگے بڑھنے لگی۔ وہ کل شام ہی اپنا گھر چھوڑ کر وہاں واقع ایک کمرے کے فلیٹ میں منتقل ہوئی تھی۔ یہ فلیٹ بھی اس کے خفیہ مشن کا حصہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوپر سے ملاقات کے بعد اسے ذرا بھی شک ہو کہ وہ اس سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ وہ ہر حال میں ملزم پر پکا ہاتھ ڈالنے کی قائل تھی۔ جس فلیٹ میں وہ منتقل ہوئی تھی، اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی، وہ گھر پہنچتے ہی کھانا بنانا چاہ رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی اور پھر وہیں صوفے پر نیم دراز ہو کر لیپ ٹاپ کھول کر کوپر کا بیان ٹائپ کرنے لگی۔ وہ ملٹن کے لیے رپورٹ تیار کررہی تھی۔ ویسے بھی اس ساری تفتیش کا سلسلہ ملٹن کے فون سے ہی شروع ہوا تھا۔

ملٹن شہر کے معروف وکیلوں میں سے ایک تھا۔ کئی برسوں سے وہ ایف بی آئی کے لیے خفیہ طور پر کام کررہا تھا۔ اس نے ہی ایف بی آئی کو رپورٹ دی تھی کہ پولیس نے اسے ایک ایسی کار کی تفتیشی رپورٹ تیار کرنے کو کہا ہے جس میں ایک عورت جھلس کر مری تھی۔ پولیس کے مطابق اب تک کار کا کوئی دعوے دار اور لاش کا وارث سامنے نہیں آیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ مزید انتظار کرنے کے بجائے از خود اس کی تفتیشی رپورٹ کسی معروف ادارے سے تیار کروالے تاکہ جب کار کا دعوے دار سامنے آئے تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا کلیم داخل کرسکے۔

ویسے بھی جب تک انشورنس کے لیے رپورٹ تیار نہ ہو جاتی، کار کو جائے حادثے پر سے اٹھانا مشکل تھا۔ ملٹن نے ایف بی آئی کو بتایا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر جس بات پر وہ چونکا، وہ حادثے کا عینی شاہد تھا۔ کلنٹن کوپر المعروف ایرل راجر کیس کو وہ جانتا تھا۔ ملٹن نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے وہ حادثہ ہی ہو مگر کوپر کے ماضی نے اسے شک میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے ایف بی آئی ریجنل چیف پر زور دیا تھا کہ وہ کوپر کے خلاف تحقیقات کروائے، ممکن ہو تو اسے حراست میں لیا جائے۔ ملٹن جانتا تھا کہ کوپر بدستور ان کی واچ لسٹ پر ہے۔

ملٹن کی اطلاع کے بعد ایف بی آئی کے شعبۂ دھوکا دہی میں کوپر کی تمام فائلیں ایک بار پھر کھل گئیں۔ اگرچہ رہائی کے باوجود اس پر نظریں رکھی جارہی تھیں لیکن دس سال بعد پہلی بار اس کے خلاف کوئی اطلاع ملی تھی، ورنہ تو اس کی فائل پر نظر رکھنے والے بھی اسے تقریباً بھولتے جارہے تھے۔ کیس ڈونا کو دیا گیا اور پھر طے ہوا کہ وہ ملٹن لاء ایسوسی ایٹ کی اسسٹنٹ کے طور پر کوپر سے ملے گی۔

ڈونا کو یقین تھا کہ ساٹھ سالہ ملٹن نہایت تجربہ کار وکیل ہے اور وہ بہترین تفتیش کار۔ اسے امید تھی کہ بہت جلد کیس حل ہو جائے گا۔ اگرچہ کوپر مصدقہ مجرم تھا اور اپنے کیے کی سزا بھی کاٹ چکا تھا۔ اب جب تک اس کے خلاف ٹھوس ثبوت نہیں مل جاتے، بہرحال وہ اسے ملزم تسلیم کرنے پر مجبور تھی۔

ایک کمرے کے اپارٹمنٹ کے پُرسکون لیونگ روم میں بیٹھی ڈونا کوپر سے ملاقات کا احوال اور اس کے بیان کو لکھ رہی تھی۔ اسے رات کو ہی یہ رپورٹ ملٹن کو بھیجنی تھی۔ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کررہی تھی اور انیتا کی حیثیت سے وہ ہر صورت اپنی ذمّے داری پوری کرنا چاہتی تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ملٹن نے بھی اصرار کیا تھا کہ اس کیس کی تفتیش میں جو کچھ اس کے علم میں آئے، وہ انیتا کی حیثیت سے اسے تحریری طور پر ارسال کرے۔

☆☆☆

دن کے دس بج رہے تھے۔ ڈونا کوپر کیس کا تفتیشی ریکارڈ اپ ڈیٹ کررہی تھی جب گلین نے اسے فون کیا۔ اس نے موبائل اسکرین پر نمبر دیکھا۔ ''ہاں گلین، کیا ہوا؟''

''کچھ معلومات ملی ہیں۔'' اس نے بھی رسمی تکلفات میں پڑے بنا کہا۔

''کیا پتا چلا؟''

''جس گاڑی کا نمبر بھیجا ہے، وہ گزشتہ تین برسوں کے دوران تین ریاستوں میں انشورڈ کرائی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مزید دو ریاستوں میں وہ پچھلے دو سال کے دوران نہایت خطرناک حادثے کے باعث تباہ ہوئی اور دونوں ریاستوں کی دو پرائیویٹ انشورنس کمپنی سے اس کے عوض بھاری کلیم حاصل کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ریاست میں کار چوری کا دعویٰ دائر کر کے معاوضہ وصول کیا گیا۔''

''اوہ...'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''مطلب یہ کہ کوپر ملوث ہے۔''

''ضروری نہیں۔'' گلین نے قطع کلامی کی۔ ''مزے کی بات یہ ہے کہ پانچوں ریاستوں کے موٹر رجسٹریشن ریکارڈ میں اس کار کا اندراج نہیں مگر پھر بھی انشورنس ہوئی۔''

''یعنی جعلی رجسٹریشن... مطلب سائبر کرائم!''

''ممکن ہے تم درست سوچ رہی ہو۔'' گلین نے جواب دیا۔ ''میں آفیشل ایڈریس پر ای میل بھیج رہا ہوں۔ تم یہ پتا چلاؤ کہ جن ریاستوں کی کمپنیوں سے کلیم وصول کیا گیا، کیا اُن دنوں کوپر وہیں مقیم تھا۔''

''بہت اچھا نکتہ بیان کیا ہے تم نے۔'' ڈونا نے قطع کلامی کی۔ ''فوراً ای میل بھیجو۔''

''آگے سنو...'' گلین نے اس کی سنی ان سنی کی۔ ''ورجینیا موٹر رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ میں اس نمبر کی کوئی کار رجسٹرڈ نہیں البتہ سیفٹی ڈرائیو کمپنی میں تین ماہ پہلے اس کی بھاری انشورنس کروائی گئی تھی۔''

''کسی نے انشورنس کلیم کیا ہے وہاں پر؟'' ڈونا نے پھر اس کی بات کاٹی۔

''اب تک تو نہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم ای میل بھیجو... بائے۔'' ڈونا نے کال منقطع کردی۔

کئی روز کے بعد کوپر کیس میں اسے اہم سراغ ملا تھا۔ گلین نے وقت تو خاصا لیا تھا لیکن اس کی تفتیش نہایت مفید ثابت ہوئی۔ ڈونا نے جب مزید تحقیقات کی تو پتا چلا کہ پچھلے پانچ سالوں سے وہ یہیں مقیم تھا۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کے فارم ہاؤس پر اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور گھوڑوں کی فارمنگ کر کے اپنا شوق پورا کرنے کے ساتھ ساتھ پیسے بھی کما رہا تھا۔ ڈونا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ صرف تین سالوں

دھکا لگاؤ... پانچ منٹ پہلے پیٹرول کے دام گرے ہیں۔
یہاں سیل بند ہے... اگلا پمپ کھلا ہوگا

کے دوران پانچ ریاستوں میں وہ کس طرح ایک ہی گاڑی کے نمبر پر فراڈ کر کے مال کماتا رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ براہِ راست سامنے آنے کے بجائے اپنے کارندوں کے ذریعے دھندا کررہا ہے۔ اس کے لیے حیرانی کی بات یہ بھی تھی کہ انشورنس کمپنی سے جن لوگوں نے کلیم حاصل کیے، ان کی عمریں پچیس سے تیس سال کے درمیان تھیں۔ ڈونا کو شک ہوا کہ کہیں اس کے بیٹے تو اس کے شریکِ کار نہیں مگر جب اس نے تفتیش کی تو پتا چلا کہ اس کے دو بیٹے اس کی قید کے دوران ہی ایک حادثے میں چل بسے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا ورجینیا میں ڈیری فارمنگ کا نہایت منافع بخش کاروبار کررہا تھا۔ پچھے پانچ سالوں سے وہ اپنے اسی بڑے بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا جس کی عمر بیالیس سال تھی۔ ڈونا نے کلیم وصول کرنے والوں اور اس کی عمر میں فرق اور اس کی مالی حیثیت کے باعث اسے مشتبہ افراد کی فہرست سے خارج کردیا تھا۔

ڈونا نے ایف بی آئی کے ایک خفیہ ایجنٹ کو کوپر کی خفیہ نگرانی پر لگا رکھا تھا مگر اس نے بھی یہی رپورٹ دی تھی کہ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ گھر سے زیادہ باہر نہیں نکلتا۔ اس کے لینڈ لائن فون پر آبزرویشن تھی اور موبائل فون ریکارڈ روزانہ کی بنیاد پر چیک ہو رہا تھا مگر اب تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی کہ جس پر شبہ کیا جاسکے۔ ملٹن اس کیس سے متعلق ہونے کی وجہ سے اب تک کی ہر کارروائی سے آگاہ تھا۔ اب تک وہ اسی بات پر قائم تھا کہ ہو نہ ہو، کوپر اس حادثے میں ملوث ہے مگر اپنے دعوے کے جواب میں

اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

☆☆☆

تقریباً دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر اب تک کیس اسی مقام پر اٹکا ہوا تھا جہاں پر ڈونا نے کوپر کا بیان لیا تھا۔ وہ ہر زاویے سے چھان پھٹک کر چکی تھی مگر اب تک نہ تو کوئی لاش کا دعوے دار سامنے آیا اور نہ ہی کسی نے کلیم داخل کرنے کے لیے پولیس یا انشورنس کمپنی سے رجوع کیا۔ آخر ڈونا نے معاملے کی تفتیش کے لیے نیا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایجنٹ ٹونی نے ایک ہفتے کی نگرانی کے بعد کوپر کے تمام تر روزمرہ کے بارے میں رپورٹ اسے تھما دی۔ رپورٹ کے مطابق ہر شام پانچ بجے وہ کیفے بلیومون جاتا اور تقریباً ایک گھنٹے تک وہیں رہتا۔ دوسرے دن شام کے سوا پانچ بج رہے تھے جب ڈونا بھی کیفے بلیومون پہنچ گئی۔

''ہیلو...'' ڈونا اندر داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسی دوران کوپر نے بھی اسے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔

''ہائے... کیا حال ہیں؟'' وہ اس کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''تم یہاں کیسے؟'' کوپر نے کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بس یونہی...'' ڈونا نے واجبی سے انداز میں جواب دیا۔

اس کے بیٹھتے ہی کوپر نے ویٹر کو بلایا اور ایک کافی آرڈر کی۔ تھوڑی دیر بعد کافی آگئی۔ کافی پینے کے دوران دونوں اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کرتے رہے۔ ان کی میز شیشے کی کھڑکی کے سامنے تھی جس کے پار سڑک اور ڈوبتے سورج کا منظر بہت دلکش نظر آرہا تھا۔

''ٹیکساس کے گرم ریگستانی ماحول میں سورج غروب ہونے کا منظر اس سے زیادہ دلکش ہوتا ہے۔'' ڈونا نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''سچ کہتی ہو۔'' اس نے گہری سرد سانس لی۔ ''ٹھنڈے علاقوں میں غروبِ آفتاب کی دلکشی کو تو چھوڑو، اس کی نارنجی رنگت ہی نظر نہیں آتی۔ ٹیکساس کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ غروبِ آفتاب کی نارنجی رنگت زمین پر بھی نارنجی رنگ بکھیر دیتی ہے۔ مٹی بھی اس رنگ میں بھیگی محسوس ہوتی ہے۔''

''لگتا ہے تم ٹیکساس سے جذباتی اُنسیت رکھتے ہو؟''

''بالکل... میری جائے پیدائش ہے۔''

''تو وہیں کیوں نہیں چلے جاتے؟'' ڈونا نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''تمہاری یہ بات بھی درست ہے مگر اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اکیلا جا کر وہاں بس جاؤں۔''

''شادی کرلو۔'' ڈونا نے مشورہ دیا۔

''تم کرو گی مجھ سے شادی؟'' یہ سنتے ہی کوپر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مم... میں۔'' اس کی بات سنتے ہی ڈونا گڑبڑا گئی۔ ''مگر میں تو تمہاری بیٹی کی عمر کی ہوں گی۔''

''ہوتی ہو تو ہو، میں کون سا سنجیدہ ہوں شادی میں۔'' یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ سنتے ہی وہ بھی مسکرادی۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈونا نے کوپر کی شخصیت سے متعلق جو تصور قائم کیا ہوا تھا، اس کے پس منظر میں وہ اسے دل پھینک ہی سمجھتی تھی۔ اس لیے شادی کی بات سن کر دل ہی دل میں ڈر گئی تھی مگر جب وہ کھلکھلا کر ہنسا، تب وہ سمجھی کہ کوپر مذاق کررہا ہے۔

''خیر چھوڑو اس بات کو... تم سناؤ سب ٹھیک ہے۔ ورجینیا سٹی میں دل لگ گیا؟ دوست بنائے یا نہیں؟'' کوپر نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

''بس... زندگی گزر رہی ہے، کام سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ کہیں آؤں جاؤں۔'' ڈونا نے چہرے پر پریشانی کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔

''وہیں کام کررہی ہو؟''

''فی الحال... مگر مجھے لگتا ہے کہ اسے چھوڑنا ہی پڑے گا۔'' ڈونا نے کہا۔

''کیوں...؟''

''ایک تو پیسے بہت کم، اوپر سے گدھوں کی طرح کام۔'' ڈونا نے درد بھرے انداز میں اسے مصائب کی جھوٹی داستان سناتے ہوئے کہا۔ ''چلو، یہ سب تو آدمی برداشت کرلے مگر اس کی نک چڑھی بیوی...''

''کیا...'' یہ سنتے ہی کوپر نے چونک کر کہا۔ اس کے چہرے پر حیرانی صاف نظر آرہی تھی۔ ڈونا غور سے اس کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ''تم ملی ہو اس کی بیوی سے؟'' کچھ دیر بعد اس نے خود کو نارمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اب تک تو نہیں اور دعا ہے کہ آئندہ بھی اس سے ملاقات نہ ہو۔'' ڈونا نے جواب میں بتایا۔ ''وہ فون پر ہی

میری کلاس لیے رکھتی ہے تو پھر بالمشافہ ملنے پر نہ جانے کیا کچھ کرے۔''

''حیرت ہے۔'' کوپر بڑبڑایا۔

''کس بات پر؟''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ ''ویسے ملٹن کی بیوی تمہیں کیوں پریشان کرتی ہے؟''

''شاید وہ سمجھتی ہے کہ ایک عورت اس کے دکھ کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔'' ڈونا یہ کہہ کر رکی اور غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''میں تو اس کی فرمائش پر بازاروں کے چکر لگا لگا کر تھک گئی ہوں۔ بستر پر پڑی ہے مگر پھر بھی میک اپ، لباس، شوز... مجال ہے کہ اس کے شوق میں بیماری سے کچھ کمی آئی ہو۔''

''کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔'' کوپر نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں...'' ڈونا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس اب دو چار دن کی ہی بات اور رہ گئی ہے۔''

''تو کیا وہ مرنے والی ہے؟'' کوپر نے یہ سنتے ہی طنز بھرا جملہ کسا۔

''یہ تو نہیں جانتی مگر مسٹر ملٹن اپنی بیوی کو اس کے والدین کے پاس بھیجنے والے ہیں۔ کل ہی انہوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ کروایا ہے برلن کے لیے۔''

''برلن... تو کیا وہ جرمن ہے؟''

''مسٹر ملٹن نے تو یہی بتایا ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''کہہ رہے تھے کہ ان کی مسز کے والدین برلن کے نواح میں رہتے ہیں۔''

''اور کیا کہہ رہے تھے مسٹر ملٹن؟'' کوپر نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔

''کہہ رہے تھے ان کی مسز کا خیال ہے کہ وہ برلن میں زیادہ خوش رہیں گی۔ خود مسٹر ملٹن کا خیال ہے کہ انہوں نے بہت پیسا کما لیا۔ وہ بھی سوچ رہے ہیں کہ وہیں جا کر بس جائیں اور باقی زندگی سکون سے بسر کریں۔''

''اچھا...'' کوپر نے ہنکارا ابھر کر کہا۔ ''ویسے آئیڈیا کچھ برا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

ڈونا کا خیال تھا کہ کوپر ملٹن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوگا، ماسوائے اس کے کہ وہ ایک وکیل ہے مگر جس طرح وہ اس کی بیوی کے تذکرے پر چونکا، جس طرح اس نے کرید کر برلن کی بات پوچھی تو وہ اسے شک میں مبتلا کرگئی۔ اس نے بطور انتیا اپنے دکھوں کی جھوٹی کہانی سنائی تھی کہ اسے کوپر کی ہمدردی مل سکے مگر اس نے تو شک کا ایک اور دروازہ کھول دیا تھا۔ دونوں خاموشی سے شیشے کے باہر دیکھ رہے تھے۔ سورج ڈوب چکا تھا، آسمان پر گہری سرخی چھائی ہوئی تھی۔

''میرے نکلنے کا وقت ہوچکا ہے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر ڈونا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں بھی چلتی ہوں، ویسے بڑا اچھا وقت گزرا یہاں پر۔ خاصا پُرسکون ماحول ہے۔'' اس نے کھڑے ہوکر وینٹی بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بٹوے سے پیسے نکالے اور کافی مگ کے نیچے رکھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے باہر آئے۔ ''میری گاڑی وہاں کھڑی ہے، اب میں چلتا ہوں۔''

''تم سے مل کر بہت ہی اچھا لگا۔ لگتا ہے مجھے ورجینیا کے اجنبی ماحول میں دوست مل گیا ہے۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے کوپر کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تم جب چاہو، مجھ سے مل سکتی ہو۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میرا موبائل نمبر تمہارے پاس ہوگا۔ ویسے ہر شام پانچ سے چھ بجے تک میں یہیں ہوتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، پھر ملیں گے۔'' ڈونا نے الوداعی انداز میں اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کی پرانی سیڈان کار کھڑی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہی ہوگی، تب بھی کوپر اسے دیکھ رہا ہوگا۔

جب تک وہ کار اسٹارٹ کرتی، تب تک کوپر کی سرخ لنکولن پارکنگ سے نکل چکی تھی۔ اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ڈونا نے اپنی ٹی شرٹ کے کالر میں لگا خفیہ مائک نکال کر بیگ کھول کر اس میں رکھا۔ کیفے میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگ میں رکھا منی سی ڈی ریکارڈر آن کردیا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ذہن میں اس سے ہونے والی ساری گفتگو کو دہراتے ہوئے غور کرنے لگی۔

کوپر سے اس کی ملاقات کا مقصد صرف اس سے دوستی گانٹھنا تھا تاکہ اس کے قریب رہ کر وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ آیا وہ اب تک کار انشورنس فراڈ کے دھندے میں ملوث ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر جس حادثے کا

وہ عینی شاہد تھا، اس کا دعوے دار اب تک سامنے کیوں نہیں آیا۔ یہی وہ سوال تھا جو اس کے شک کو تقویت دے رہا تھا کہ ضروری نہیں کہ معاملہ صرف انشورنس کا ہو، بات کچھ اور بھی ہوسکتی ہے لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ تفتیش شروع ہوئی تھی کوپر پر شک سے اور اب وہ کوپر کو علیحدہ کر کے معاملے کو دیکھتی تو اس کی نوعیت ہی بدل جاتی۔ کیس ایف بی آئی کے دائرے سے نکل کر مکمل طور پر پولیس کی ذمے داری رہ جاتی۔

ڈونا کو بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ مسز ملٹن کے تذکرے پر وہ کیوں چونکا تھا؟ یہ بات اسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ ڈونا اس کی ہمدردی حاصل کر کے اس کے قریب ہونا چاہتی تھی تاکہ کوپر اس پر اعتماد کرسکے۔ دوسرا یہ کہ وہ ملٹن کی فرم سے تعلق توڑ کر اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ اب آزاد ہے۔ یوں ڈونا ایسا گراؤنڈ بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کوپر اس پر اعتبار کرتے ہوئے باتوں باتوں میں شاید فراڈ کیس کے حوالے سے کچھ سراغ فراہم کردے۔

گھر پہنچنے کے بعد ڈونا نے ڈنر تیار کیا اور کھانے کے بعد لیونگ روم میں بیٹھ کر کوپر سے گفتگو کی ریکارڈنگ سننے لگی۔ کئی بار اس نے سنا مگر وہ اب تک سمجھ نہیں پائی کہ مسز ملٹن کے ذکر پر اس کے تاثرات اور لہجے میں تبدیلی کیوں آئی تھی۔ ایک بات وہ طے کرچکی تھی کہ مسز ملٹن کو وہ نہ صرف جانتا تھا بلکہ کچھ قریب سے جانتا تھا۔ اس نے مسز ملٹن کے ذکر پر کوپر کے لہجے میں تبدیلی کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیپ ٹاپ میں آواز کے اتار چڑھاؤ کو جانچنے کا جدید ترین سافٹ ویئر موجود تھا اور صرف پندرہ منٹ کے اندر اندر کمپیوٹر نے تصدیق کردی کہ مسز ملٹن کے تذکرے پر کوپر کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اس کی دماغی حالت سے مشروط تھا۔ اس نام کو سنتے ہی دماغ میں کچھ ایسی لہریں پیدا ہوئیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ جو کچھ سن رہا تھا، اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بات اس کے لیے صرف غیر متوقع یا جھوٹی نہیں بلکہ ناقابلِ یقین تھی۔

کمپیوٹر نے مسز ملٹن کے تذکرے پر کوپر کے دماغ میں ہونے والی تبدیلیوں کا تھری ڈی چارٹ بھی تیار کردیا تھا جس کے تجزیے سے مسز ملٹن کے ذکر پر کوپر کے دماغ کے نیوران میں ہونے والی تبدیلیوں کو کوئی بھی دماغی سائنس کا ماہر پڑھ سکتا تھا۔ اس نے دماغ کے چارٹ کا کلر پرنٹ نکالا اور پھر کچھ دیر تک اسے پڑھنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ نہ پائی۔ اس نے پرنٹ ایک طرف رکھا اور موبائل فون اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ ”پروفیسر جانسن...؟“

”بول رہا ہوں۔“ وہ دماغی کیفیت کے ماہر اور ورجینیا یونیورسٹی کے سربراہ تھے۔

”ڈونا... ایف بی آئی سے۔“

”ہاں... کہو کیا حال ہیں؟ بڑے دنوں بعد تمہاری آواز سنائی دی ہے۔“

”سر! کچھ مصروفیات ہی ایسی تھیں۔“ ڈونا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”ایک مسئلہ درپیش ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہیے۔“

”کہو، میں حاضر ہوں۔“ پروفیسر نے جواب دیا۔

”سر! میرے پاس ایک برین امپیکٹ تھری ڈی نقشہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کو پڑھ دیں۔“

”ٹھیک ہے، تم ابھی سافٹ کاپی ای میل کردو، میں کل صبح تمہیں بتادوں گا۔“ سرجن نے جواب دیا۔

”جی ابھی میل کرتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔“ یہ کہہ اس نے لائن منقطع کی اور فون ایک طرف رکھ کر ای میل کرنے لگی۔

ای میل کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر پرنٹ لے کر بیٹھ گئی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔ کوپر کی گفتگو اس کے ذہن میں گونجتی رہی۔ وہ مسز ملٹن اور کوپر کے درمیان اس تعلق کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے چونکنے کا سبب بنا تھا مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی۔ وہ مسز ملٹن کو نہیں جانتی تھی اور نہ ہی ملٹن سے اس کا کوئی قریبی تعلق تھا مگر کوپر کے تاثرات نے اس کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا لیکن اب تک اس کی سوچ کو واضح سمت نہیں مل پائی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ لیونگ روم کے صوفے پر ہی سوگئی۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے، ڈونا کوپر کیس کی تفتیشی فائل اپ ڈیٹ کر رہی تھی اسی دوران موبائل کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو سر!“

”میں نے تمہارا کام کردیا۔“ دوسری طرف پروفیسر جانسن تھا۔ ”لنچ پر ملو۔ یونیورسٹی کیفے میں لنچ کریں گے، وہیں بیٹھ کر تمہیں سمجھادوں گا۔“

”بہت بہتر۔“ ڈونا نے جواب دیا۔ ”پونے ایک تک پہنچتی ہوں۔“

”میں انتظار کروں گا... بائے۔“ یہ کہہ کر اس نے لائن منقطع کردی۔

یونیورسٹی کیفے کا پیزا ڈونا کو بہت پسند تھا۔ وہ کئی بار صرف پیزا کھانے کے لیے یہاں جاچکی تھی۔ پروفیسر جانسن کے ساتھ لنچ پر بھی اس نے پیزا ہی لیا۔ ”تو آپ نے اس پرنٹ کا تفصیلی مطالعہ کرلیا۔“ ڈونا نے پیزا کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کو پڑھنے میں میرے لیے مشکل کیا تھی۔ وہ تو بہت ہی سادہ سا تھا۔“ پروفیسر جانسن نے فرائیڈ رائس سے چمچ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا پتا چلا؟“

”بہت عام سی بات تھی۔“ پروفیسر نے کھانا کھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے جو ریکارڈنگ اور امیج بھیجا تھا، میں نے اسے بھی غور سے سنا اور دماغ پر اس کا ردِعمل بھی جانچا۔ مسز ملٹن کا تذکرہ سن کر اس کے دماغ کے تین نیوران ایسے تھے، جن پر عمل اور ردِعمل ہوا۔“ پروفیسر اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ڈونا پیزا بھول کر اس کی باتوں میں محو تھی۔ ”اس کا دماغ بتاتا ہے کہ وہ مسز ملٹن کو جانتا ہے۔ اس نام پر دوسرا ردِعمل یہ تھا کہ وہ نام جو اس نے سنا، اس سے جڑے تذکرے کو بیان کرنے والے کو وہ کم علم سمجھ رہا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اس نام کو سن کر اس نے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر پھر اپنے دماغ کے اس سگنل کو اپنے اعصاب کے شدید تناؤ سے خود ہی روکنے کی کوشش بھی کی۔“

”اوہ میرے خدا... لگتا ہے معاملہ کچھ اور بھی ہے۔“ جیسے ہی وہ اپنی بات مکمل کر کے فرائیڈ رائس کی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوا، ڈونا نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ”کوئی اور ایسی بات جو مسز ملٹن کے نام پر اس کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، ایک بات... صرف مسز ملٹن کے نام اور تذکرے پر ہی اس کے دماغ نے ردِعمل ظاہر کیا۔ جب میں نے ریکارڈنگ سے اس کا تقابلی تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ جب اس کی برلن منتقلی کا ذکر آیا تو اس کے دماغ نے کہنے والے کو فوراً احمق قرار دیا تھا۔“

”ہاں، یاد آیا۔“ یہ سنتے ہی وہ چونکی اور کنپٹی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے کہنے لگی۔ ”جب میں نے کہا کہ بس دو چار دن کی بات اور ہے، مسز ملٹن برلن جانے والی ہیں تو یہ سن کر اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی تھی۔“

”وہ تمہارے احمق پن یا لاعلمی کا اعتراف تھا۔“ یہ سن کر پروفیسر نے شرارتی انداز میں کہا۔ ”برا مت ماننا، یہ میں نہیں، اس کا دماغ کہہ رہا تھا۔“

ہا... آں... حسین صبح ہے لیکن ہوٹل کا ایک اور دن کا کرایہ چڑھ جائے گا... بارہ ہزار میں یہ صبح بہت مہنگی ہے

”شاید وہ ٹھیک سمجھا، اگر نہ سمجھتا تو میں یہ بات کیسے جان سکتی تھی؟“

”نیورولوجی سائنس کی مدد سے۔“ پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارے مطلب کی بات ہوگئی، اب سکون سے کھانا کھاؤ۔“ پروفیسر نے پیار بھری سرزنش کی۔

”اوکے سر!“ ڈونا نے بھی سعادت مند طالب علم کی طرح جواب دیا اور جلدی جلدی پیزا پر ہاتھ صاف کرنے لگی۔

دفتر واپس پہنچ کر وہ ازسرِنو کوپر کیس پر غور کرنے لگی۔ اس نے پرانے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ اب کیس کی نئی فائل کھول دی تھی۔ وہ کیس کو نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر نے اسے تحریری طور پر بھی اپنے تجزیے کی رپورٹ دے دی تھی تاکہ اسے کیس ریکارڈ کا حصہ بنایا جاسکے۔ اب ڈونا کی توجہ مسز ملٹن اور کوپر کے درمیان تعلق پر تھی۔

مسز ملٹن کے حوالے سے اب تک جو معلومات اس نے حاصل کی تھیں، ان کے مطابق اس کا نام روتھ اور عمر پینتالیس سال کے قریب تھی۔ اس نے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کی تھی اور کئی برس تک مائکرو سافٹ کمپنی میں بطور پروگرامر کام کرتی رہی تھی۔ اس کا نسلی تعلق برلن سے تھا۔ وہ امریکا پڑھنے کے لیے آئی اور پھر ملٹن سے شادی کے بعد یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ وہ اپنے شوہر سے کئی برس چھوٹی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی میں ملٹن کے سوا

www.paksociety.com

کوئی اور مرد نہیں آیا تھا۔ وہ پچھلے دو سال سے جگر کے سرطان میں مبتلا تھی اور اسی وجہ سے اس نے ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ الگ تھلگ رہنے والی عورت تھی۔ اس کے دوستوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی اور جب سے وہ گھر پر تھی، تب سے اس کا لگ بھگ باہر کی دنیا سے ناتا ٹوٹ چکا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب کوپر سے ہی پینگیں بڑھانا پڑیں گی۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر خود کلامی کی۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ مسٹر ملٹن کو کیس کے اس نئے زاویے کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اب یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان تھی کہ آخر ملٹن نے اسے انیتا کی حیثیت سے کیس کی تحریری رپورٹ بھیجنے اور تفتیش کی ہر بات سے آگاہ کرنے پر زور کیوں دیا تھا؟

شام کے پانچ بج رہے تھے جب وہ کیفے بلیو مون میں داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول نیم تاریک تھا۔ جب اندھیرے میں اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ اسی میز کی طرف بڑھی، جہاں کل شام وہ کوپر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں مگر وہ اسے نظر نہیں آیا۔ ڈونا اس رخ سے بیٹھی تھی کہ اگر وہ اندر داخل ہو تو فوراً اسے دیکھ سکے۔ ویسے بھی شام کے وقت کچھ زیادہ لوگ کیفے میں موجود نہیں تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب زیادہ تر لوگ دفتر سے واپسی پر بار کا رخ کرتے ہیں، کیفے کا نہیں۔ ڈونا آج کوپر سے گفتگو کی مکمل تیاری کر کے آئی تھی۔ اس نے کافی آرڈر کی اور شیشے کی کھڑکی سے نیلا آسمان تکنے لگی۔ اس کے بیگ میں ریکارڈر آن تھا۔

''ہیلو مسٹر راجر۔'' جیسے ہی ویٹر اس کے لیے کافی لایا، کوپر ہیٹ اتارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ڈونا نے اونچی آواز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ہیلو بے بی۔'' اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''پلیز... ایک اور بلیک کافی۔'' ڈونا کل یہ بات جان گئی تھی کہ اسے بلیک کافی پسند ہے اسی لیے اس نے برابر سے گزرتے ہوئے ویٹر کو آرڈر دیا۔

''اور کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تمہیں بھی میری طرح یہ کیفے اور یہ میز پسند آ گئی ہے۔''

''کل یہاں بیٹھ کر مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔''

''یہاں بیٹھ کر نہیں، مجھ سے باتیں کر کے۔'' یہ کہہ کر کوپر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''خوبصورت لڑکیاں سچ کیوں نہیں بولتی ہیں؟''

''ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر آج میں خود کو بہت آزاد محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے خوشی سے چہکتے لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟ کہیں مسٹر ملٹن کی...''

''اس کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔'' اس نے قطع کلامی کی۔ ''اب میں واپس مناسس پارک جانے کا سوچ رہی ہوں۔''

''اوہ... چھوٹی سی بیروزگار لڑکی، آخر اپنا وطن یاد آ گیا تمہیں۔''

''نہیں... ایسی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کمبخت مسز ملٹن نے تو میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ نوکرانی سمجھ لیا تھا مجھے۔ جا خود رہی ہے اور شاپنگ مجھ سے کروا رہی ہے۔ فون پہ فون... یہ کر دو، وہ کر دو... جان عذاب میں ڈال دی تھی اس نے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ کوپر خاموش تھا مگر اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ''ویسے بھی ورجینیا مجھے راس نہیں آیا۔ جتنا یہاں کما رہی تھی، اتنا تو وہاں پر بھی کما سکتی تھی۔''

''کب جا رہی ہو مناسس پارک؟'' کوپر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پرسوں صبح...''

''اوہ... تو اس کا مطلب کہ اب تم صرف دو روز کی مہمان ہو یہاں پر۔''

''دو روز نہیں، صرف کل کا دن۔'' ڈونا نے مسکرا کر کہا۔

''تو اگر میں یہ کہوں کہ تم آج کی شام میرے ساتھ ڈنر کرو اور کل صبح سے لنچ تک میرے ساتھ گھومو پھرو، شہر کو دیکھو، مزے کرو تو... کیا کہو گی تم اس بارے میں؟'' کوپر نے شفقت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''بہت اچھی تجویز ہے مگر میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔''

''ارے پریشانی کیسی، تم اتنی اچھی دوست بن چکی ہو میری۔'' کوپر نے فوراً کہا۔

''یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات خوبصورت لڑکیوں والی۔'' کوپر نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ''چھ بجے یہاں سے نکلیں گے اور پھر مزے کریں گے۔''

''واقعی ملٹن کی ملازمت چھوڑنے کو انجوائے کرنا چاہیے۔'' ڈونا نے ہنس کر کہا اور کافی پینے لگی۔

کیفے سے نکلنے کے بعد دونوں ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ ڈونا کو واقعی کوپر پسند آیا تھا۔ پہلی ملاقات میں اس کا تاثر تھا کہ وہ دل پھینک بڈھا ہے لیکن اب اس کی رائے بدل چکی تھی۔ وہ بہت بے تکلف، ہمدرد اور صاف گو شخص تھا۔ اس کے ساتھ ایسے پیش آ رہا تھا جیسے وہ اس کی کمسن بیٹی ہے، جسے وہ انگلی تھما کر گھمانے پھرانے کے لیے گھر سے لے کر نکلا ہے۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جب کوپر نے فاسٹ فوڈ ریستوران کے سامنے گاڑی روکی۔ ''میرے خیال میں اب ڈنر ہو جائے۔ اس کے بعد میں تمہیں کیفے بلیو مون چھوڑ دوں گا۔ تم اپنی گاڑی لے کر گھر نکل جانا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' ڈونا نے چہک کر جواب دیا۔

ڈنر کے بعد وہ ریستوران سے باہر نکلے تو ڈونا نے چھوٹی بچی کی طرح آئس کریم کی فرمائش کر دی۔

''چلو... پہلے آئس کریم کھا لیتے ہیں۔'' وہ اسے لے کر سامنے کی طرف بڑھا جہاں کئی آئس کریم پارلر تھے۔ دونوں نے آئس کریم کون لی اور وہیں بینچ پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ ''لگتا ہے، تم ملٹن سے زیادہ اس کی بیوی سے چھٹکارا پانے پر خوش ہو، ورنہ تو میں نے آج تک کسی تازہ تازہ بیروزگار کو اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا۔''

''ٹھیک سمجھے۔''

''تم مسز ملٹن سے ملتی رہی ہو، دیکھنے میں کیسی ہے وہ؟'' کوپر نے آنکھ مارتے ہوئے شرارتی انداز میں کہا۔

''میں تو ایک بار بھی نہیں ملی اس سے، بس وہ فون پر فرمائشیں کرتی تھی اور میں سارا سامان خرید کر مسٹر ملٹن کو دے دیتی تھی۔''

''اوہ... غائبانہ مصیبت۔'' کوپر نے کہا۔

''تمہیں کیوں اتنی زیادہ دلچسپی ہو رہی ہے مسز ملٹن کی ذات میں؟'' ڈونا نے بھی شرارتی انداز میں آنکھ مارتے ہوئے جملہ کسا۔

''چلو... اگر میں تم سے کہوں کہ مسز ملٹن نام کی کوئی عورت فی الحال اس دنیا میں نہیں ہے تو...''

''تو پھر میں تمہیں جھوٹا کہوں گی یا پاگل۔''

غضب خدا کا... ہم بدنام ہو جائیں گے... چور ساری تصویریں چھوڑ کر قیمتی فریم لے گئے

''اگر تمہاری دونوں باتیں غلط ثابت ہوں تو...'' کوپر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' کوپر نے بے تکلفی سے کہا۔

''کیسے...؟''

''ایسے کہ مسز ملٹن نامی کوئی عورت اس دنیا میں اب نہیں اور اس کے بعد ملٹن نے دوسری شادی نہیں کی ہے، کم از کم اس وقت تک تو ہرگز نہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے چونک کر کہا۔

''لعنت بھیجو ملٹن پر۔'' کوپر نے گفتگو ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

''خیر، مجھے کیا۔'' ڈونا نے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر مزے لے لے کر آئس کریم کھانے لگی۔

''اب چلیں۔'' ڈونا نے جیسے ہی آئس کریم ختم کی، کوپر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں۔''

رات کے پونے نو بج رہے تھے۔ کوپر کی سرخ لنکولن کا رخ کیفے بلیو مون کی طرف تھا جہاں ڈونا کی کار کھڑی تھی۔ راستے میں کوپر نے پمپ پر پیٹرول بھروانے کے لیے کار روکی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کار سے اتری اور واش روم کی طرف بڑھی۔ ''ہاں... فوراً کیفے بلیو مون کی پارکنگ میں پہنچو۔ کوپر کو گرفتار کرنا ہے۔'' اس نے واش روم سے موبائل پر اپنے اسسٹنٹ کو فون کیا۔ ''دس منٹ میں ہم

وہیں ہوں گے۔ پارکنگ میں میری سیڈان کار کھڑی ہے، وہیں پہنچ کر انتظار کرو۔"

"او کے... ہم پہنچ رہے ہیں۔"

ڈونا نے موبائل جینز کی جیب میں ڈالا اور کچھ دیر تک واش روم میں کھڑی رہی۔ وہ دراصل وقت حاصل کرنا چاہ رہی تھی تاکہ ان کے پہنچنے سے پہلے اس کے آدمی وہاں پہنچ جائیں۔ تقریباً پانچ سات منٹ بعد وہ واش روم سے نکلی۔ "سوری... ذرا دیر ہوگئی۔" وہ ٹشو پیپر سے اپنے گیلے ہاتھ پونچھ رہی تھی۔

"ارے کوئی بات نہیں... چلو بیٹھو۔" کوپر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد کیفے بلیو مون کی پارکنگ میں کوپر نے گاڑی روکی مگر اس سے پہلے کہ ڈونا گاڑی سے اترتی، کچھ مسلح لوگ اندھیرے سے نکل کر سامنے آئے۔ تھوڑی دیر بعد کوپر کو گرفتار کر کے ورجینیا میں واقع ایف بی آئی کے خفیہ تفتیشی سینٹر پر لے جایا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔

☆☆☆

ڈونا نے اس تفتیش کے لیے اپنا نام جینی رکھا تھا۔ جب تفتیشی سینٹر میں کوپر کی آنکھوں پر سے پٹی کھولی گئی تو ڈونا کو سامنے دیکھ کر پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ "یہ سب کیا ہے مس انیتا جیمز۔"

"انیتا جیمز نہیں مس جینی..." یہ کہہ کر اس نے کوپر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں ہوں اسپیشل ایجنٹ ایف بی آئی اور تم ہو میرے ملزم۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟" وہ منمنایا۔

"صرف کیا ہی نہیں، ماضی میں بھی کرتے رہے ہو۔ کار انشورنس فراڈ، دس سال سزا اور اب حادثے کے عینی شاہد... بتاؤ یہ سارا چکر ہے کیا؟"

"جو جانتا تھا، وہ تو میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"میں سچ سننا چاہتی ہوں اور مسز ملٹن..."

"میں اسے نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے..." یہ کہہ کر ڈونا نے اپنے ساتھی کو پکارا۔ "ٹونی! تھرڈ ڈگری ٹارچر کا انتظام کرو۔"

"پلیز پلیز... ایسا نہ کرو۔" تشدد کی تیاری کا سنتے ہی وہ چلایا۔ "میں سب کچھ سچ سچ بتانے کو تیار ہوں مگر میں بے قصور ہوں۔"

"اگر بے قصور ہو تو..."

"وعدہ کرو مجھے چھوڑ دو گی۔ میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا مگر پلیز... میں جیل میں مرنا نہیں چاہتا۔" اس نے رقت بھرے لہجے میں التجا کی۔

"او کے..." یہ کہہ کر ڈونا نے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "گواہ کے تحفظ کا قانون موجود ہے۔ تم واقعی بے گناہ پائے گئے تو ہم اس قانون کے تحت تمہیں تحفظ دے سکتے ہیں البتہ..."

"میں سب کچھ بتا دوں گا، بس مجھے جیل مت بھیجنا۔" وہ پھر چلایا۔

"کیمرا آن کرو اور بیان کی ویڈیو ریکارڈنگ شروع کرو۔" ڈونا نے اسسٹنٹ کو ہدایت کی۔ کچھ ہی دیر بعد کوپر بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔

کوپر نے ایف بی آئی کو بتایا کہ ملٹن ٹیکساس کا رہنے والا ہے اور وہی کار انشورنس فراڈ گینگ کا سرغنہ ہے۔ اس نے ہی گرفتاری کے بعد کوپر کو دھمکی دی تھی کہ اگر زبان کھولی تو اس کے تینوں بیٹے مار دیے جائیں گے۔ ایک بار اس نے جیل میں پولیس کو سچ بتانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے جواب میں دوسرے ہی روز اس کے دو چھوٹے بیٹے روڈ حادثے میں مارے گئے۔ یہ ملٹن کی طرف سے اشارہ تھا کہ اگر اس نے کچھ کہا تو تیسرا بیٹا بھی جان سے جائے گا۔ اسی وجہ سے اس نے چپ سادھ لی اور خاموشی سے سزا کاٹ کر ورجینیا چلا آیا جہاں اس کا بڑا بیٹا ڈیری فارمنگ کا بزنس جما چکا تھا۔

کوپر نے بتایا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ ملٹن کہاں ہے۔ سال بھر پہلے اچانک اس سے ایک ریستوران میں ملاقات ہوئی۔ کار انشورنس فراڈ کے ذریعے وہ بہت مال بنا چکا تھا۔ اس نے قانونی حلقوں میں بھی نیک نامی بنا لی تھی۔ کوپر کا کہنا تھا کہ ملٹن نے اسے ایک بار پھر دھندے کی پیشکش کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی اعلیٰ درجے کی ہیکر ہے۔ وہ اتنی عمدگی سے انٹرنیٹ کے ذریعے پبلک ڈیٹا ریکارڈ تک رسائی کر کے ایسی گاڑیوں کا اندراج کر دیتی ہے، جنہیں ناکارہ قرار دے کر رجسٹریشن ریکارڈ سے حذف کیا جا چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا گینگ بہ آسانی انشورنس کروا لیتا تھا۔

سب سے سنسنی خیز انکشاف کوپر نے یہ کیا کہ جس کار حادثے کا وہ عینی شاہد تھا، اس میں جھلس کر مرنے والی عورت ملٹن کی بیوی تھی اور وہ ناٹک انشورنس کے لیے نہیں بلکہ قتل کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔ روتھ، ملٹن کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جرائم میں بھی برابر کی شریک تھی اور کئی ریاستوں میں ان کے کارندے کامیابی سے جعلسازی کا دھندا کر رہے تھے مگر کینسر ہونے کے بعد اس کا ضمیر جاگ گیا

تھا۔ اس نے شوہر سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی تمام دولت کا نصف اسے دے تاکہ وہ حادثات میں معذور ہونے والوں کے لیے ٹرسٹ بنا سکے مگر ملٹن نے انکار کر دیا جس کے بعد اس نے مطالبہ کیا کہ وہ ازخود اسے طلاق دے۔ ملٹن جانتا تھا کہ طلاق کی صورت میں اسے اپنی آدھی جائداد روتھ کو دینا پڑے گی۔ اسی لیے اس نے یہ ڈراما رچایا اور اسے عینی شاہد بننے پر تیار کر لیا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اسے پھر پھنسوا دے گا۔ کوپر نے انکشاف کیا کہ ملٹن نے پہلے اپنے ہاتھوں سے بیوی کو قتل کیا اور پھر اس کی لاش کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر یہ ڈراما رچایا۔ کوپر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ اپنے سارے اثاثے فروخت کر کے رقم پیرس منتقل کر رہا ہے۔ وہ بیوی کی برلن منتقلی کا ڈراما رچا کر خود بھی وہیں جا کر آباد ہونے کا ناٹک کرنے والا ہے۔ اس آڑ میں وہ پیرس جا کر باقی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

کوپر کے انکشافات کے بعد ایف بی آئی فوراً حرکت میں آئی۔ راتوں رات مسٹر ملٹن کو گرفتار کیا گیا اور صبح ہونے سے پہلے ہی اس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا۔ صبح سویرے مسٹر ملٹن کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا تاہم کوپر بدستور ایف بی آئی کی تحویل میں تھا۔

کئی روز کی تفتیش کے بعد بھی کوپر کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوا۔ آخر اسے بے گناہ قرار دے کر پانچ ہزار ڈالرز جرمانہ وصول کر کے رہا کر دیا گیا۔ ایف بی آئی نے ملٹن کو ہی نہیں، اس کے اعتراف کی روشنی میں پانچ مختلف ریاستوں میں پھیلے ہوئے اس کے درجن بھر جعلساز کارندوں کو بھی پکڑ لیا۔ کوپر کو ملٹن اور دیگر جعلسازوں کی گرفتاری میں مدد دینے پر شکریے کا خط بھی دیا گیا۔

☆☆☆

کوپر کیس کی فائل بند ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اس کا نام زیرِ نگرانی رہنے والے سزا یافتگان کی فہرست سے بھی خارج کر دیا گیا تھا۔ اس روز شام کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ ڈونا اپنے گھر لوٹ رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ اس کے دل میں کافی پینے کی خواہش ہوئی۔ کیفے بلیو مون راستے میں پڑتا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور اندر داخل ہونے لگی تو اسے کوپر کا خیال آیا۔ اس نے نظریں گھما کر دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص میز پر بیٹھا آسمان تکنے میں محو تھا۔ "ہیلو مسٹر کلنٹن کوپر..." اس نے بالکل قریب پہنچ کر زور سے کہا۔

"ارے تم... ایجنٹ حسینہ۔" وہ چونکا اور ڈونا پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"میں ایجنٹ حسینہ نہیں، میرا نام ہے..."

"انیتا جیمز، جینی یا کچھ اور۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "بیٹھیے، مس ڈونا شیفرڈ..." اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

"انیتا کے پہلی بار ملنے سے بھی کئی گھنٹوں پہلے سے۔"

"کیا...؟"

"میں اس وقت بھی تمہاری حقیقت جانتا تھا۔"

"مگر..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کوپر اس کے لیے کافی آرڈر کر رہا تھا۔

"مگر تم میرا نام اور یہ سب کچھ کیسے جانتے تھے؟" ویٹر کے جاتے ہی ڈونا نے بے تابی سے پوچھا۔

"وعدہ کرو کہ گرفتار نہیں کرو گی۔" اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

ڈونا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"مجھے ملٹن نے بتایا تھا۔" کوپر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" ڈونا چونکی۔

"اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ ابھی صرف ایف بی آئی کو پیچھے لگایا ہے، اگر کبھی اس کی بیوی کے قتل سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی تو مرنے کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔"

"اوہ میرے خدا۔" اس نے یہ سنتے ہی سر تھام لیا۔

"مگر پھر بھی تم..."

"میں اپنے دو بے گناہ بچوں کے قاتل کو جیل میں مرتا دیکھنا چاہتا تھا۔" کوپر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر ڈونا چند لمحے تک سر تھامے خاموش بیٹھی رہی اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی۔ "سچ ہے... چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔"

"غلط..." یہ سنتے ہی کوپر نے برجستگی سے کہا۔ "فراڈی ہیرا پھیری سے تو جائے، پر قاتل سے نہ بچنے پائے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ "جیسے میں اور ملٹن۔"

یہ سنتے ہی ڈونا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ برسوں بعد وہ پہلی بار کھلے دل سے ہنس رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ قاتل انجام کو پہنچا جس کے خلاف کوپر کے دو بیٹوں کے قتل کا مقدمہ کسی پولیس اسٹیشن میں درج نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی قاتل انجام کو پہنچا۔ سچ ہے، اللہ سب دیکھتا ہے۔

زادِ ہمزاد

سرور اکرام

زندگی کی بنیادی اساس امید ہے... بیکراں محرومیاں انسان کی ناامیدی کا باعث بنتی ہیں... وقت کی گردشوں نے اس کی بھی مجبوریاں بڑھا دی تھیں۔ امید... یقین اور جذبۂ عشق... سب کچھ لاحاصل میں بدلتے جارہے تھے... اس ناامیدی کے منجدھار میں اچانک ہی اسے ایک امید کی ناؤ مل گئی... اور اس ناو کے سہارے اس نے اپنی ناکام زندگی کا سفر گزارنے کی ٹھان لی...

رہ حیات میں مل جانے والے زاد ہمزاد

کی ہم نشینی کا ماجرائے فسوں

سرورق کی

پہلی کہانی

کہانی اس دن سے شروع ہوتی ہے جب اس نے زندگی سے بیزار ہوکر مرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں اس نے اپنے جگری دوست افضل سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ افضل پیسے والا آدمی ہے۔ اس کی داستان سن کر وہ اس کی مدد کرنے کو تیار ہوجائے گا اور اسے کسی بھی حال میں خودکشی نہیں کرنے دے گا۔

یہ سوچ کر وہ افضل کے پاس پہنچ گیا۔ جو اپنے شاندار سے دفتر کے کمرے میں اپنی خوبصورت سی سیکریٹری کے ساتھ عشق کرنے میں مصروف تھا۔

اس وقت اس کی سیکریٹری بڑی بے تکلفی سے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب انٹرکام پر رئیس کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ ''سر! کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''ارے بھائی، اس وقت میری میز پر بہت کام پھیلا ہوا ہے۔'' افضل نے اپنی سیکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! وہ آپ سے ہر حال میں ملنا چاہتے ہیں۔ اپنا نام رئیس بتاتے ہیں۔''

''صرف نام کا رئیس ہے... یا دیکھنے میں بھی رئیس لگتا ہے؟''

''نو سر، دیکھنے میں تو بہت پھٹیچر سا آدمی ہے۔''

''اوہ، پھر تو وہی ہوگا۔ بھیج دو اسے۔''

اس دوران میں سیکریٹری شائستہ حالت میں آ گئی۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' اس نے ایک ادا سے پوچھا۔

''تم جاؤ، میں جب تک اس سے نمٹ لیتا ہوں۔''

سیکریٹری باہر جارہی تھی جب رئیس کمرے میں داخل ہوا۔ رئیس نے اسے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں لینی شروع کر دیں۔ سیکریٹری مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔ رئیس، افضل کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اسی طرح ٹھنڈی سانسیں لیتے رہو۔'' افضل نے کہا۔ ''کمرے کا اے سی خراب ہوگیا ہے۔ کچھ دیر کے لیے ٹھنڈ ہوجائے گی۔''

''چلو، تم بھی میرا مذاق اڑا لو۔'' رئیس نے کہا۔

''کیا بات ہے، اتنے افسردہ کیوں ہو رہے ہو؟''

''افضل! تم میرے دوست ہو۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔''

''میرے بھائی، میں تم سے ایک مشورہ لینے آیا ہوں۔'' رئیس نے کہا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس موقع پر دو چار آنسو بھی نکل آئیں لیکن اس میں ناکام رہا۔

''صرف مشورہ ہی لینے آئے ہو نا؟'' افضل نے شک بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، صرف مشورہ۔''

''چلو، وہ تو ہر وقت دینے کو تیار ہوں۔'' افضل نے کہا۔ ''بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر؟''

''اب تم مجھے بتاؤ کہ کون سا طریقہ مناسب رہے گا۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

''اس لیے کہ زندہ رہنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔'' رئیس نے کہا۔ ''تم جانتے ہو میری جاب ختم ہو چکی ہے۔ مکان کا کرایہ نہیں دے سکا ہوں۔ بینک میں پیسے نہیں ہیں۔ ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ صرف بے چاری غزالہ ہے لیکن اس کی محبت بھی کہاں تک کام آئے گی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' اس بار افضل نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ بتاؤ، تم نے اپنے اس فیصلے سے غزالہ کو آگاہ کر دیا ہے؟''

''نہیں، ابھی اسے نہیں بتایا۔''

''تو اسے بتا دو۔ تاکہ وہ ذہنی طور پر تمہاری موت کے لیے تیار ہوجائے۔'' افضل نے کہا۔

اس کی اس بے رحمانہ بات پر مجھے دکھ ہوا لیکن میں گول کر گیا۔ ''افضل! کم سے کم یہ تو پوچھ لو کہ میں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

''ویسے تو میں کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔'' افضل نے کہا۔ ''لیکن تم میرے دوست ہو اسی لیے پوچھ رہا ہوں لیکن ذرا مختصر بتانا۔ مجھے ابھی ایک میٹنگ میں جانا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے ہوئے بتا دیا کہ میرے ساتھ کتنے مسائل ہیں اور سوائے مرنے کے اور کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔

میری داستان سن کر اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ وہ سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ یہی کہ میری مدد کس طرح کی جائے۔

بالآخر کچھ دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ ''دیکھو دوست! بہت ہی المناک کہانی ہے تمہاری... لیکن میں تمہاری مدد اس لیے نہیں کرسکتا کہ میں آج کل مالی بحران کا شکار ہوں۔ میں پرسوں ہانگ کانگ جارہا ہوں۔ وہاں سے انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ ذرا ریلیکس ہونے کے لیے۔ اپنی سیکریٹری کو اسی لیے ساتھ لے جارہا ہوں۔''

''اور میرے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟'' رئیس نے پوچھا۔

''تمہارے لیے میں کیا سوچوں، تم نے خود سوچ لیا ہے۔'' افضل نے کہا۔ ''البتہ ایک مشورہ ضرور دے سکتا ہوں کہ تم زہر وغیرہ کے چکر میں مت پڑنا۔ کیونکہ آج کل زہر میں بھی ملاوٹ ہورہی ہے۔ خوامخواہ پیٹ خراب ہوجائے گا اور ہاں ریل کی پٹری پر لیٹنے والا طریقہ بھی کام نہیں آئے گا کیونکہ ٹرینیں دو دو تین تین دن لیٹ ہورہی ہیں۔ خوامخواہ پٹری پر لیٹے رہ جاؤ گے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ مجھے اور کوئی مشورہ نہیں چاہیے۔'' رئیس جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

افضل، رئیس سے اس لیے ہاتھ نہیں ملا سکا تھا کہ افضل کا ضروری فون آ گیا تھا۔ رئیس بہت بددل ہو کر اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔

اسے دوسری ملاقات غزالہ سے کرنی تھی جو اس کی محبت تھی۔ جو اس سے پیار کرتی تھی اور اس انتظار میں رہتی تھی کہ کبھی نہ کبھی رئیس کے دن بدل جائیں گے۔

رئیس نے اس آخری ملاقات کے لیے بہت جذباتی ڈائیلاگ سوچ رکھے تھے۔ اس نے فون کر کے غزالہ کو اسی پارک میں بلا لیا جہاں دونوں ملا کرتے تھے۔

غزالہ اس پارک میں آ گئی۔ ''ہاں رئیس! بتاؤ، نوکری ملی؟''

''نوکری تو نہیں ملی لیکن میں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے۔'' رئیس نے بتایا۔

''کیا مصیبت ہے۔ کیا صرف یہی بتانے کے لیے بلایا تھا؟'' غزالہ نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے آج میری کزن کی مہندی ہے۔ مجھے اس میں ڈانس بھی کرنا ہے۔''

''غزالہ! کیا میری خودکشی کے بعد بھی تم ڈانس کرو گی؟''

''دیکھو رئیس! مجھے افسوس تو ہو گا لیکن افسوس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے کزن کی مہندی اٹینڈ نہ کروں۔''

''ٹھیک ہے۔ بے رحم حسینہ، خدا حافظ۔''

''خدا حافظ رئیس، لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے خودکشی کر لی ہے، اوہ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ ایسی بات پوچھ رہی ہوں۔ اخبار میں تو آ ہی جائے گا۔''

رئیس دل ہی دل میں اسے بُرا بھلا کہتا ہوا پارک سے باہر آ گیا۔ اب دنیا سے واقعی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اس کی طرف توجہ کرتا۔ نفسا نفسی کا دور تھا۔ افضل جیسے دوست نے اپنا بے رحم رویہ اپنایا تھا۔ غزالہ نے ایسا برتاؤ کیا تھا جیسے وہ اپنی خودکشی کی نہیں، شادی کی اطلاع دینے آیا ہو۔

وہ اپنی آگ میں جلتا ہوا ساحل تک آ گیا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سمندر میں ڈوب کر اپنی جان دے دے گا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سمندر میں ڈوبنے والا بہت رومینٹک موت مرتا ہے۔

وہ بھی سمندر کی لہروں کو بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ وہ جس جگہ تھا۔ وہاں بہت کم لوگ تھے۔ اگر تھے بھی تو اس سے کافی دور تھے۔

زندگی سمندر کی طرح اس کے سامنے پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ اس سمندر میں ڈوبنے جا رہا تھا۔ اچانک کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

رئیس نے اسے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہی تھا۔ اس کے اندر کا انسان اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

رئیس کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے اندر کا انسان اس کی طرح مفلوک الحال نہیں بلکہ بہت قیمتی لباس میں تھا۔

''کیا تم خودکشی کرنے جا رہے ہو؟'' اس کے اندر کے انسان نے پوچھا۔

''ہاں۔'' رئیس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں تم سے کچھ چھپا نہیں سکتا، کیونکہ تم سب جانتے ہو۔''

''میں نے تمہارا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا۔'' اندر کے انسان نے کہا۔ ''اور میں تمہیں بتاؤں خود میں بھی خودکشی کے ارادے سے آیا ہوں۔''

''ظاہر ہے جب میں مر جاؤں گا تو تم بھی مر جاؤ گے۔ کیونکہ تم میرے اندر کے انسان ہو۔''

''بے وقوف انسان، میں اندر کا انسان نہیں ہوں بلکہ تاج سلطانی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔''

''ارے۔'' اب رئیس نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ شخص واقعی رئیس... جیسا تھا۔ ویسا ہی قد، ویسا ہی چہرہ ویسی ہی آواز۔ فرق یہ تھا کہ وہ غریب تھا اور تاج سلطانی پیسے والا دکھائی دے رہا تھا۔

''واقعی، تم تو بالکل مجھ جیسے ہو۔'' رئیس نے کہا۔

''اسی لیے تو میں تمہاری طرف متوجہ ہوا تھا۔'' تاج نے بتایا۔ ''کیونکہ میں بھی تمہاری طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے جا رہا ہوں۔''

''لیکن تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' رئیس نے پوچھا۔ ''میرے خیال میں تم ایک پیسے والے آدمی ہو، تمہارے پاس تو بہت کچھ ہو گا؟''

''ہاں، بہت کچھ ہے میرے پاس۔'' اس نے کہا۔ ''ایک خوب صورت گھر، بیوی، اپنی فرم ہے۔ بینک میں پیسے ہیں۔ غرضیکہ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کے لیے تم صرف سوچ سکتے ہو۔ اس کے باوجود مجھے سکون نہیں ہے۔ دنیا بھر کے مسائل ہیں میرے ساتھ۔ سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''افسوس ہوا یہ سن کر۔ چلو ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سمندر میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

''نہیں، شاید اب ہم دونوں کو خودکشی کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل

دیا ہے۔''

''لیکن میں نے تو نہیں بدلا۔'' رئیس نے کہا۔ ''مجھے تو ہر حال میں مرنا ہے۔''

''بے وقوف مت بنو۔ آؤ میرے ساتھ۔ اگر مرنا ہی ہے تو دو چار دن ٹھہر جاؤ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''تم آؤ تو سہی۔ ایک بار میرے ساتھ آ جاؤ پھر تم ہمیشہ کے لیے اپنے ارادے سے باز آ جاؤ گے۔ زندگی تمہیں بہت خوب صورت لگنے لگے گی۔''

اس نے رئیس کا ہاتھ تھاما اور وہ اسے سامنے کھڑی ہوئی ایک خوب صورت نئی گاڑی کی طرف لے آیا۔ ''چلو بیٹھ جاؤ۔'' اس نے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

رئیس مرعوب کن احساس کے ساتھ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ تاج نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

رئیس کو وہ ایک خوب صورت سے فلیٹ میں لے آیا۔

''کیا تم یہیں رہتے ہو؟'' رئیس نے پوچھا۔

''نہیں، میں یہاں نہیں رہتا۔ یہاں صرف سکون کے لیے آ کر رک جاتا ہوں۔'' تاج نے بتایا۔ ''ویسے میرا ایک بہت بڑا گھر بھی ہے جہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔''

رئیس نے دیکھا کہ وہ ایک شاندار فلیٹ تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ فرنیچر بھی قیمتی تھا۔

''میرے دوست۔'' تاج نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہو؟ میرے پاس ہے کیا جس کا سودا کرو گے؟''

''میں تم سے تمہاری شخصیت لینا چاہتا ہوں۔'' تاج نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ تم تاج بن جاؤ گے اور میں رئیس۔ ہم دونوں بالکل ایک جیسے ہیں اس لیے ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ میں تمہیں اپنے بارے میں نہ صرف بتاؤں گا بلکہ تربیت بھی دوں گا۔ تمہیں ہر وہ چیز بتا دوں گا جس کا تعلق میری ذات سے ہو گا۔ اسی طرح تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے اور مجھے رئیس ہونے کی تربیت دو گے۔''

''لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟ کیونکہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔''

''یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ نقصان میں تو میں رہوں گا۔ تم میرے گھر میں رہو گے۔ میری بیوی تمہیں اپنا شوہر سمجھے گی۔ تمہارے پاس گاڑی ہو گی۔ بینک بیلنس ہو گا۔ اپنی فرم ہو گی۔ ملازمین ہوں گے۔ کسی بندے کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے؟''

''دیکھو، تم مجھے حیران کر رہے ہو۔'' رئیس نے کہا۔ ''بدلے میں تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے تمہاری زندگی مل جائے گی۔ اس کے سوا مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔''

رئیس نے کچھ جرح کے بعد اس کی بات مان لی۔

وہ اسی فلیٹ میں رہنے لگا۔ تاج صبح ناشتے کے بعد اس کے پاس آ جاتا اور اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیتا۔

اپنے خاندان کے بارے میں۔ دوستوں کے بارے میں۔ پرانی باتیں۔ ذرا ذرا سی خوشیاں اور دکھ کے واقعات اس کے علاوہ اپنے دستخط کی پریکٹس... پسند ناپسند۔

دوسری طرف رئیس بھی اسے اپنے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ پندرہ دن کی مشق کے بعد دونوں مکمل طور پر تبدیل ہو چکے تھے۔

رئیس، تاج ہو گیا اور تاج، رئیس بن گیا تھا۔

☆☆☆

رئیس ایک شام دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تاج کے گھر میں داخل ہو گیا۔

وہ تاج کی کار ڈرائیو کرتا ہوا پہنچا تھا جس طرح تاج ڈرائیو کیا کرتا تھا۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔

چوکیدار کے برابر سے گزرتے ہوئے رئیس نے اس کی خیریت معلوم کی۔ جس طرح تاج معلوم کیا کرتا تھا۔

وہ بہت زیادہ نروس ہو رہا تھا۔ اسے ایک ایسا شاندار کردار ادا کرنا تھا جو شاید ہی کسی نے ادا کیا ہو۔ تاج کی بیوی مہوش برآمدے ہی میں کھڑی تھی۔

اسے دیکھ کر رئیس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ تاج نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر رئیس نے تاج ہی کے انداز میں کہا۔ ''ہیلو ہنی۔''

''ہیلو۔'' مہوش نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آج جلدی آ گئے؟''

''ہاں، سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے واپس آ گیا۔''

''آپ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے

لگواتی ہوں۔"

"شیور۔"

رئیس کو بتا دیا گیا تھا کہ اس کا کمرا کس طرف ہے اور راستے میں کیا کیا ہے۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ اپنی یعنی تاج کی خواب گاہ میں آ گیا۔

واش روم سامنے تھا۔ تاج کا ایک جوڑا غسل خانے میں موجود تھا۔ غسل خانے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کرلیا۔

اس کے لیے سب کچھ بہت نیا نیا اور خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت گھر، اتنی خوب صورت بیوی۔ اتنی پُرسکون اور آرام دہ زندگی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

اسے اب جا کر اطمینان ہونے لگا تھا کہ وہ اپنا کردار بخوبی ادا کر رہا ہے۔ چوکیدار اسے تاج سمجھا تھا۔ تاج کی بیوی مہوش نے اسے اپنا شوہر سمجھا تھا۔

فی الحال اس کی اداکاری میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ نہا کر اور دوسرے کپڑے پہن کر جب واش روم سے باہر آیا تو مہوش چائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آج ماسٹر صاحب آئے ہوئے تھے۔" مہوش نے اس کے لیے چائے انڈیلتے ہوئے بتایا۔

رئیس گڑبڑا کر رہ گیا۔ یہ ماسٹر صاحب کون ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے تاج نے ان کے بارے میں بھی رئیس کو بتایا ہو لیکن رئیس اس وقت بھول چکا تھا۔

وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ اس دوران میں مہوش اس سے بولتی رہی۔ "بے چارے بہت پریشان ہیں۔ جب سے ان کی بیوی مفلوج ہوئی ہیں۔ ان پر بہت ذمّے داریاں آ گئی ہیں۔"

اس وقت رئیس کو یاد آ گیا کہ یہ ماسٹر صاحب کون ہو سکتے تھے۔ تاج نے ان کے بارے میں رئیس کو بتا دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہر مہینے انہیں پانچ ہزار روپے دیا کرتا ہے۔

"تم کیا چاہتی ہو۔ ماسٹر صاحب کے پیسے بڑھا دیے جائیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، کم از کم دو ہزار بڑھا دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بڑھ گئے۔ کوئی اور حکم؟"

مہوش مسکرا دی۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ ابھی تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ اس نے کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ اب ایک مرحلہ اور تھا۔ دفتر جانے کا۔ وہاں کے لوگوں سے ملنے کا۔ دفتری معاملات سنبھالنے کا۔ وہاں گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

یہ بھی امکان تھا کہ تاج اسے دفتر کے بارے میں کچھ بتانا بھول گیا ہو۔

لیکن دفتر جانے سے پہلے کچھ اور بھی تھا۔

اور اس کے تصور سے رئیس کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اس گھر میں رات گزارنے کا مسئلہ۔ رات کیسے گزاری جاتی۔ اسے یہ رات ماسٹر بیڈ روم میں گزارنا تھی۔ تاج کی بیوی رئیس کے ساتھ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

کیا وہ خود پر قابو رکھ سکے گا؟

کیا مہوش کو اندازہ نہیں ہو جائے گا کہ وہ تاج نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

اگر وہ پہلی رات بہ آسانی گزار جاتا تو پھر آگے کے معاملات سنبھل سکتے تھے لیکن کیسے؟ وہ ایک کمرے میں رات گزارنے کے باوجود مہوش سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ شوہر تھا اس کا۔ چاہے کسی اور کے روپ میں سہی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ مہوش کے ساتھ لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ مہوش اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ تاج نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد دونوں ٹی وی وغیرہ دیکھنے کے بجائے لان میں بیٹھ جایا کرتے ہیں۔

آج بھی دونوں لان میں آ کر بیٹھے تھے۔ مہوش اس سے باتیں کرتی رہی تھی اور وہ تاج کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اسے جواب دیتا رہا پھر اچانک مہوش نے پوچھ لیا۔ "کیا آپ کو میری سہیلی نیلوفر یاد ہے؟"

"نیلوفر!" رئیس اپنے ذہن پر زور دیتا رہا۔ تاج نے ایسے نام کا ذکر نہیں کیا تھا۔

مہوش نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ "آپ کو کیسے یاد ہو گی کتنے دن ہو گئے ملے ہوئے۔ اور وہ بھی ذرا سی دیر کے لیے ملے تھے۔"

"یہ بات تو ہے۔" رئیس مسکرا دیا۔ "اب تم میری یادداشت کا امتحان لے رہی ہو تو بات دوسری ہے۔"

کچھ دیر بعد مہوش نے خود ہی کہا۔ "آج مجھے کچھ تھکن سی ہو رہی ہے۔ میں سونے کے لیے جا رہی ہوں۔"

"ہاں، جاؤ آرام کرو۔ میں بھی آ رہا ہوں۔"

مہوش چلی گئی۔ رئیس اپنی سوچوں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ اب تک جو کچھ بھی تھا، وہ بہت حیران کرنے والا تھا۔

تاج کا اس طرح اس سے ملنا اور دونوں کا اپنی اپنی شخصیت بدلنا... صرف فلموں یا کہانیوں میں ایسا ہوتا ہوگا

لیکن یہاں اس کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کا امکان تھا۔ تاج بھی آخر کہاں تک اپنی ساری باتیں اس کے ذہن میں انڈیل سکتا تھا۔ یقیناً کہیں نہ کہیں چوک ہو گئی ہو گی اور اس کی وہی چوک رئیس کے لیے عذاب بن جاتی۔

اب اسے کمرے میں جانا تھا۔ وہ صبح تک لان میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا۔ مہوش گہری نیند سو رہی تھی۔

دوسری صبح وہ خدا کا نام لے کر خود ہی گاڑی چلاتا ہوا دفتر گیا۔ تاج کا بھی یہی معمول تھا۔

دفتر میں ہر ایک نے بغیر کسی شک و شبہے کے اس کا استقبال کیا۔ تاج نے اتنے مختصر عرصے میں ٹریننگ اس انداز سے کر دی تھی کہ وہ تاج ہی ہو گیا تھا۔

صرف منیجر نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے سر! آج آپ کی آواز کچھ بیٹھی بیٹھی سی ہے؟"

"ہاں، رات بھر گلا خراب رہا ہے۔"

اس کے بعد منیجر نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اسے دفتری امور کے بارے میں بتاتا رہا۔ تاج کی ایک خوب صورت سیکریٹری بھی تھی۔

تاج نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا نام شیری ہے۔ تاج اور شیری کے درمیان بہت بے تکلفی بھی ہے۔ یہ بے تکلفی ہر انداز کی ہے۔

تاج اس کو اکثر اسی فلیٹ میں لے جاتا تھا جہاں اس نے رئیس کو کچھ دنوں کے لیے رکھا تھا۔ اب وہ فلیٹ بھی رئیس ہی کے پاس تھا۔

رئیس کے لیے شیری سے ملاقات کا مرحلہ بھی آسان ثابت ہوا۔ اس نے بھی کسی شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

لیکن شام کو دفتر سے گھر واپسی پر گیٹ سے باہر تاج کو دیکھ کر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ تاج عام سے لباس میں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے ایک رومال اپنے چہرے پر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رئیس بھی اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن وہ گاڑی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ رئیس نے گاڑی روک دی۔ تاج نے کھڑکی کے پاس آ کر چہرے سے رومال ہٹا دیا۔ "رئیس! یہ میں ہوں تاج۔"

تاج اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"میں کچھ دور جا کر اُتر جاؤں گا۔" تاج نے بتایا۔ "اس وقت میں تم سے یہ کہنے کے لیے ملا ہوں کہ میرا ایک کزن بھی ہے۔ میں اس کے بارے میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔ وہ کم بخت ہر وقت اپنے ساتھ ایک کتا رکھتا ہے اور جب بھی ہمارے یہاں آتا ہے تو اس کا کتا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"تم کوشش کرو کہ اس کے کتے کے سامنے نہ آؤ۔" تاج نے کہا۔ "کیونکہ جانوروں میں سونگھنے کی حیرت انگیز صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ میری بُو سے آشنا ہے اسی لیے وہ تم پر ضرور حملہ کرے گا۔ کیونکہ تمہاری بو اس کے لیے اجنبی ہو گی۔"

"میرے خدا! یہ تو تم نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔" رئیس گھبرا گیا۔ "تم بتاؤ، اس کتے سے کیسے نمٹا جائے؟"

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ تم سچویشن کے مطابق جو چاہو' وہ کر سکتے ہو۔ اگر اسے کسی طرح مار سکتے ہو تو مار دو۔ اس کے لیے زہر کی موت آسان ہو گی۔"

"اور یہ زہر کہاں سے لاؤں؟"

"کہیں سے بھی مل سکتا ہے۔ تمہیں ایک ٹپ دے رہا ہوں۔ مہوش اس کتے کے لیے کتوں کی خوراک کے پیکٹس منگوا کر رکھتی ہے۔ تم ان میں زہر انجیکٹ کر سکتے ہو۔"

"ہاں، یہ صحیح رہے گا۔"

"لیکن یاد رکھو، تم اس کتے کے سامنے مت آنا ورنہ وہ چیر کر رکھ دے گا۔"

"کمال کرتے ہو۔" رئیس جِھلّا گیا۔ "جب وہ شخص اپنے کتے کو لے کر پہنچ ہی جائے گا تو اس کے سامنے تو آنا ہی پڑے گا۔"

"پریشان مت ہو۔" تاج نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تنویر کبھی بغیر اطلاع کے نہیں آتا۔ وہ آنے سے پہلے ہمیشہ فون کرتا ہے۔ جیسے ہی اس کا فون آئے تم کتوں کی خوراک کو زہر آلود کر کے کسی بہانے اس مکان سے نکل جانا۔ چلو اب تم مجھے یہی اتار دو۔"

رئیس نے گاڑی روک دی۔ تاج اللہ حافظ کہہ کر گاڑی سے اُتر گیا۔

تاج کے گھر جانے کے بعد رئیس کو پہلی بار کسی خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے گاڑی گیٹ پر روک کر معمول کے مطابق ہارن دیا تو اندر سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ اسی وقت چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔

"تنویر صاحب آئے ہیں کیا؟" رئیس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"جی صاحب، ابھی ابھی آئے ہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔ "ان کی گاڑی دھلنے کے لیے گئی ہوئی ہے۔"

"اوہ، میں دفتر میں کوئی چیز بھول آیا ہوں۔" رئیس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کوئی پوچھے تو کہہ دینا کچھ دیر میں واپس آئیں گے۔"

اس نے بہت تیزی سے گاڑی ریورس کی۔ چوکیدار حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ ایک پارک میں آکر بیٹھ گیا۔

اس مکان میں آنے اور تاج کا بھیس بدلنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اس نے خود کو کسی پرابلم میں محسوس کیا۔ اب تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن اس کم بخت تنویر کی آمد نے اس کے لیے خطرہ پیدا کر دیا۔

اور تنویر سے زیادہ اس کا کتا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر تاج نے اسے خبردار نہ کر دیا ہوتا تو وہ واقعی بے موت مارا گیا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کب تک اس پارک میں بیٹھا رہے۔ وہ اس پہلے امتحان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

تاج نے بتایا تھا کہ تنویر ہمیشہ فون کر کے آیا کرتا ہے۔ اس دن اچانک کیسے پہنچ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر گھر کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف مہوش ہی تھی۔ "ارے کہاں چلے گئے تھے آپ، چوکیدار بتا رہا تھا کہ آپ گیٹ سے واپس ہو گئے؟"

"ہاں، ایک کام یاد آ گیا تھا۔"

"تنویر بھائی بھی آپ کا انتظار کر کے واپس چلے گئے۔"

رئیس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔"

وہ پارک کے گیٹ کی طرف بڑھا اور اسی وقت اس کی چھٹی حس نے کسی خطرے کا احساس دلا دیا۔ یہ خطرہ اس کے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بہت سی عورتیں اور مرد پارک میں موجود تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اسے کس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے اور اس کی چھٹی حس اسے... کیا بتانا چاہ رہی ہے۔

رئیس کو اپنی اس حس پر بہت بھروسا تھا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا اور اس بار بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ اس نے گیٹ کے باہر ہی اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔

گاڑی تک پہنچتے پہنچتے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی چھٹی حس نے غلط خبردار نہیں کیا تھا۔ دو آدمی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ بظاہر وہ اس سے بے نیاز ہو کر چل رہے تھے لیکن رئیس کو پتا چل چکا تھا کہ دونوں اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایک گاڑی اس کی گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی۔ جس میں وہی دونوں ہو سکتے تھے۔ اگرچہ وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ وہی دونوں ہیں۔

تاج بن جانے کے بعد یہ دوسرا خطرہ اس کے سامنے آیا تھا۔

اس گاڑی نے گھر کے گیٹ تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ رئیس گھر میں آجانے کے باوجود پریشان سا رہا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لٹیرے ہوں۔ آج کل اس قسم کی وارداتیں بہت عام ہو گئی ہیں یا کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی کوئی خطرے کی بات۔

تاج نے یہ سارا ڈراما یونہی نہیں کیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ ضرور ہوگا۔ ورنہ کون اس طرح اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی بیوی تک کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے۔

وہ رات بھی اس کے امتحان کی رات تھی۔

وہ ماسٹر بیڈ روم ہی میں تھا۔ مہوش اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ رئیس بھی ایک انسان ہی تھا۔ جذبوں اور خواہشوں سے بھرا ہوا۔

اس کے برابر میں ایک انتہائی خوب صورت عورت لیٹی ہوئی تھی جو ایک طرح سے اس کی بیوی تھی۔ رئیس کو اس پر پورا حق حاصل تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن وہ کچھ نہیں کر پایا۔ اس نے کروٹ بدل لی تھی۔

دوسری صبح مہوش نے ناشتے کے وقت اسے بتایا۔ "ڈیڈ، کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔"

تاج نے رئیس کو مہوش کے باپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ مہوش نے پھر کہا۔ "وہ مرڈر... کیس ابھی تک چل ہی رہا ہے۔ اب یہ کیس ڈیڈ کے پاس آ گیا ہے۔"

رئیس کا ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔ مہوش کے بیان سے تو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا باپ کوئی پولیس آفیسر ہے اور وہ کسی مرڈر.... کیس کی تفتیش کر رہا ہے۔

"ارے آپ نے ہاتھ کیوں روک لیا۔ ناشتا تو ختم

کریں۔"
"نہیں، بس ٹھیک ہے۔ کھا چکا ہوں۔"
مہوش کہنے لگی۔ "پتا نہیں ڈیڈ کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ کئی بار آپ سے تفتیش کر چکے ہیں۔ آخر آپ کا اس سیاست داں کے قتل سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"
اب خطرہ کسی بم کی طرح اس کے سر پر پھٹ پڑا تھا۔
کیا تاج کسی سیاست داں کے قتل میں ملوث تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے رئیس کو اس گڑھے میں دھکیل دیا ہو۔
رئیس کو اندازہ تھا کہ پولیس والوں کی نگاہیں کتنی تیز ہوتی ہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ رئیس کو بھانپ لے... اگر ایسا ہوا تو پھر رئیس کی کیا پوزیشن رہ جاتی؟
شاید وہ بہت بری طرح پھنس چکا تھا۔
اسے اپنی پچھلی زندگی بہت غنیمت محسوس ہونے لگی تھی جس زندگی میں اس قسم کی کوئی الجھن نہیں تھی۔ کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ تھا اور اس کے لاابالی قسم کے دوست تھے۔ سوائے بے روزگاری کے اسے اور کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن اب..."
اسی وقت ملازم نے آکر اطلاع دی۔ "بی بی! آپ کے ڈیڈی آگئے ہیں۔"
"کہاں ہیں ڈیڈ؟" مہوش نے پوچھا۔
"ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"
"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"
ملازم کے جانے کے بعد مہوش نے رئیس کی طرف دیکھا۔ "سنیں، اس وقت آپ یہاں سے نکل لیں۔"
"نکل لوں؟"
"ہاں، میں نہیں چاہتی کہ کہ ڈیڈ آپ سے الٹے سیدھے سوالات کریں۔ میں انہیں سنبھال لوں گی۔ آپ چلے جائیں۔" مہوش نے اسے فرار کا راستہ دکھا دیا تھا۔
وہ کچن کے راستے باہر آگیا۔ اس کی گاڑی گیٹ کے اندر ہی کھڑی تھی لیکن اس نے گاڑی نہیں لی تھی۔ وہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ چوکیدار نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔
رئیس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ اس گھر کی طرف جہاں تاج، رئیس بنا ہوا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ تاج کے پاس جا کر اس سے کہے گا کہ وہ یہ ڈراما ختم کر رہا ہے۔ اسے ایسی دولت نہیں چاہیے۔ صرف دو ہی دنوں میں اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

ایک بار پھر وہ اپنے پرانے محلے میں تھا۔ جہاں وہ سکون کی زندگی گزار رہا تھا پھر ایک شیطان کی طرح تاج اس کے سر پر سوار ہوگیا۔
وہ ابھی اپنی گلی میں ہی تھا کہ اس کے محلے کا دوست بابو اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ "ابے یار! تو کہاں غائب ہوگیا تھا؟"
"کہیں نہیں، میں تو یہیں تھا۔"
"جھوٹ مت بول یار! جب دیکھو تالا بند۔ جب دیکھو تالا بند۔ تیرا تو کوئی پتا ہی نہیں تھا۔ ہم لوگ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید تو نے خودکشی کرلی ہے۔"
"یہ کیسے معلوم؟"
"تیرا دوست ہے نا افضل، اس نے بتایا تھا۔"
"بابو! تو سچ بتا، کیا میں کبھی محلے میں دکھائی نہیں دیا؟"
"نہیں یار، بتا تو رہا ہوں۔ اتنے دنوں کے بعد آج تیری صورت دکھائی دی ہے۔"
رئیس سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ڈراما ہوا ہے۔ تاج اسے پھنسا کر خود کہیں غائب ہوگیا تھا۔ وہ اس طرف آیا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت مہوش کے ڈیڈ کے سامنے تھا۔
وہ اپنے محلے سے مایوس ہوکر باہر نکلا ہی تھا کہ پولیس موبائل نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ موبائل کے پیچھے ایک کار میں مہوش کا باپ بیٹھا ہوا تھا۔
"تاج!" اس نے رئیس سے کہا۔ "خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردو۔"
"لیکن جناب! آپ میری بات تو سنیں۔"
"سوری، میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی سختی کی جائے۔ تم بہرحال میری بیٹی کے شوہر ہو۔"
"نہیں جناب، میں..."
"جو کچھ کہنا ہے میرے آفس پہنچ کر کہنا۔ ہم تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔"
رئیس کو کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا گیا۔
مہوش کا باپ رستم علی اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔
"ہاں، اب بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"جناب عالی! بات یہ ہے کہ میں تاج نہیں ہوں۔" رئیس نے کہا۔
"اچھا تو پھر کون ہو تم؟"

"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں جناب! میں تاج نہیں ہوں۔ میرا نام رئیس ہے۔"
"بکواس بند کرو۔ اگر تم رئیس ہو تو پھر میری بیٹی کے گھر میں کیسے آگئے؟"
"اس لیے جناب کہ میں لالچ میں آگیا تھا۔" رئیس نے کہا۔ "میرا بس اتنا ہی قصور ہے۔ آپ اس کی جو چاہے سزا دیں لیکن یقین کریں میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔"
"بتاؤ، یہ سب کیسے ہوا۔ اگر بقول تمہارے تم رئیس ہو تو پھر تاج کیسے بن گئے؟"
رئیس نے جلدی جلدی اسے ساری کہانی سنا دی۔ وہ کس طرح خودکشی کے ارادے سے ساحل کی طرف گیا تھا۔ کس طرح تاج سے ملاقات ہوئی۔ جو بالکل اسی کی شکل کا تھا اور کس طرح تاج نے اسے تاج بنانے کی ٹریننگ دی۔ وغیرہ وغیرہ۔
"بس جناب! یہ ہے میری کہانی۔" رئیس نے کہا۔ "آپ میرے محلے والوں سے جا کر پوچھ لیں۔ میرے دوستوں سے پوچھ لیں۔ سب میرے رئیس ہونے کی گواہی دیں گے۔"
"بے وقوف انسان تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے تمہاری بات پر یقین کرلیا ہے؟" رستم علی نے کہا۔ "تم تاج ہو، میرے داماد، مہوش کے شوہر۔"
"نہیں جناب، میں تاج نہیں ہوں۔"
"خاموش، جب میں نے مہوش سے تمہاری شادی کی تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ اندر سے ایک کرمنل بھی ہو۔ شبیر شاہ نے تمہارے ساتھ مل کر کاروبار کیا تھا۔ اس نے اپنا کالا دھن تمہارے کاروبار میں اس لیے لگایا تھا کہ اس پر انگلیاں نہ اٹھائی جائیں۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑا سیاست داں ہے اور اسے عوام کا ہمدرد وغیرہ سمجھا جاتا تھا۔"
"نہیں جناب! میں نے شبیر شاہ کا نام سن رکھا ہے۔ اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تو اس آدمی کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اس نے تاج کے ساتھ کاروبار کیا ہوگا۔"
"اور تاج تم ہو۔" رستم علی میز پر گھونسا مار کر بولا۔ "تمہارے سوا تاج اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ اس کی گواہی میری بیٹی مہوش دے گی۔ چوکیدار دے گا۔ دوسرے ملازم دیں گے۔ تمہارے دفتر کا پورا اسٹاف دے گا۔ میرے خاندان کے لوگ دیں گے۔ میں دوں گا۔ اب اور کیا چاہیے تمہیں؟"

اچانک رئیس کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آگیا۔
"سر! کوئی اور ہے جو میرے تاج ہونے کی گواہی نہیں دے گا کیونکہ اس کی گواہی سب سے زیادہ معتبر ہوگی۔"
"اور وہ کون ہے؟"
"تاج کے کزن تنویر کا کُتّا۔" رئیس نے بتایا۔ "آپ تو پولیس والے ہیں۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ جانوروں میں بو محسوس کرلینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔"
"ہوں۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے پُرخیال انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ "جانوروں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہ امتحان بھی لے لیتے ہیں۔ اگر وہ کتا تمہیں دیکھ کر بھڑک گیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم تاج نہیں ہو۔"
"منظور ہے سر! آپ منگوا لیں اس کتے کو۔"
رستم علی نے اسی وقت فون پر بات کی۔ "تنویر! میں تمہارا ماموں بول رہا ہوں، رستم علی۔ تم سے ایک کام ہے۔ تم فوراً میرے دفتر آجاؤ اور ہاں، اپنے کتے کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"
اس نے ریسیور رکھ کر رئیس کی طرف دیکھا۔ "اب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ کتے کے آتے ہی سچ اور جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔"
اور کتے کے آتے ہی سچ اور جھوٹ کا پتا چل گیا۔
کتے نے رئیس کے پاس آکر پہلے تو اس کو سونگھا پھر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "دیکھ لیا تم نے۔" رستم علی دہاڑا۔ "کتے نے بھی تم کو پہچان لیا ہے۔ تم تاج ہو۔"
"کیا بات ہے ماموں جان؟" تنویر نے پوچھا۔
"پہلے یہ بتاؤ، کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" رستم نے رئیس کی طرف اشارہ کیا۔
"کیسی بات کر رہے ہیں، یہ تاج ہے۔" تنویر نے کہا۔
"لیکن یہ اپنے آپ کو رئیس کہہ رہا ہے۔ جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ تاج ہے۔ مہوش کا شوہر۔"
"اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں نے تو آپ کو منع کیا تھا کہ آپ مہوش کی شادی اس شخص سے نہ کریں۔ یہ مشکوک کردار کا آدمی ہے لیکن آپ نے میری بات ہی نہیں سنی لیکن بات کیا ہوئی ہے؟"
"وہی شبیر شاہ مرڈر کیس کا معاملہ ہے۔" رستم علی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "تنویر تم نہیں جانتے۔ میرے لیے یہ کتنا بڑا امتحان ہے۔ خود میرا داماد ہی قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ کیس میرے پاس نہیں تھا کیونکہ اوپر والے جانتے تھے کہ

تاج نے شبیر شاہ کا مرڈر کیا ہے لیکن میری وجہ سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا بلکہ اس کے بارے میں ٹھوس ثبوت فراہم کر دیے اور جب یہ کنفرم ہو گیا کہ یہ کارنامہ تاج ہی کا ہے تو پھر یہ کیس میرے حوالے کر دیا گیا۔‘‘

’’آخر کیوں، یہ کیس آپ کے حوالے کیوں ہوا؟‘‘ تنویر نے پوچھا۔

’’صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ میں پولیس اور قوم کا وفادار ہوں یا اپنی بیٹی اور داماد کا۔‘‘ رستم علی کے لہجے میں تلخی تھی۔ ’’تم خود سوچ سکتے ہو کہ یہ میرے لیے کتنا بڑا امتحان تھا لیکن میں نے فرض کو ترجیح دی اور اب ایک ملزم تمہارے سامنے موجود ہے۔‘‘

رئیس کا ذہن اس وقت کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

وہ صرف سُن رہا تھا۔ رستم علی کی آوازیں، تنویر کی آوازیں، اسے تاج بنا دیا گیا تھا اور اصلی تاج بڑی ہوشیاری سے نہ جانے کہاں فرار ہو گیا تھا۔

انتہا یہ تھی کہ تنویر کے کتے تک نے اسے تاج کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟

’’ماموں!‘‘ اس نے تنویر کی آواز سنی۔ ’’آپ کے لیے یہ واقعی بہت بڑا امتحان ہے۔‘‘

’’اب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تاج نہیں کوئی اور ہے اس لیے تمہارے کتے کو منگوایا تھا۔ کتا بھی اس کو اجنبی نہیں سمجھ رہا ہے۔ ورنہ اب تک اس پر حملہ کر چکا ہوتا۔‘‘

’’جناب! خدا کے لیے میری بات سنیں۔ میں واقعی تاج نہیں ہوں۔ رئیس نام ہے میرا۔ میں جس محلے میں رہتا ہوں، اس محلے کے لوگ گواہی دیں گے۔‘‘

’’ماموں، یہ بتائیں آپ نے اس کے محلے والوں سے پوچھا جس کے بارے میں یہ بتا رہا ہے۔‘‘

’’تنویر کیا میں پاگل ہوں جو خوامخواہ اپنا وقت ضائع کروں؟‘‘ رستم علی نے جھلّا کر کہا۔

’’نہیں ماموں، انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ اس کے محلے والوں کو بلا لیں۔‘‘

’’جی جناب! وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔‘‘ رئیس جلدی سے بولا۔ ’’یہ لوگ آ کر بتا دیں گے کہ میں برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہا ہوں۔‘‘

’’چلو نام پتے لکھواؤ۔‘‘ رستم نے کہا۔

رئیس نے محلے کے دو دکان داروں اور ایک اپنے دوست کے نام اور پتے لکھوا دیے تھے۔

’’ٹھیک ہے، انہیں بلا لیتے ہیں۔‘‘ رستم علی نے اپنی گردن ہلائی پھر دروازے کے باہر کھڑے ہوئے پولیس والوں کو حکم دیا کہ اسے کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔

☆☆☆

رئیس کے لیے یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا۔

واقعات کچھ یوں تھے کہ تاج نام کے ایک بزنس مین نے شاید کروڑوں کی رقم کے لیے ایک سیاست داں کا خون کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بچ نکلے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ چونکہ ایک پولیس آفیسر کا داماد بھی تھا اسی لیے اس کے خلاف خفیہ طور پر تحقیقات ہوتی رہیں اور جب اس کے خلاف سارے ثبوت مل گئے تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ گرفتار ہونے والا قربانی کا بکرا تھا۔ بدقسمتی سے جس کی صورت اس آدمی سے ملتی ہوئی تھی۔

قربانی کے بکرے نے بھی ذرا سی آسائش کے لیے ان باریکیوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اور وہ اس آدمی کے جال میں پھنستا چلا گیا۔

اور اب اس کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اس کے محلے کے دکان دار اور ایک اس کا دوست۔ لیکن کیا ان کی گواہی کے بعد بھی اس کی جان چھوٹ سکتی تھی؟

نہیں، اس نے ایک طرح سے فراڈ کیا تھا کسی اور کے مکان میں رہ رہا تھا۔ کسی اور کی بیوی کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ کسی اور کے مکان اور اس کے دفتر پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بچ نہیں سکتا تھا لیکن قتل کے جرم سے تو بہتر تھا۔ اس قسم کے فراڈ میں اسے دو تین سال کی سزا ہو سکتی تھی لیکن قتل کے جرم میں۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

پھر ایک اور بھیانک خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ یہ انتہائی ہولناک بات تھی۔ اسے ہر حال میں تاج کو تلاش کرنا تھا۔ ورنہ اس پر یہ الزام لگ سکتا تھا کہ اس نے تاج کو قتل کر کے اس کی جگہ لے لی ہے۔

اور تاج کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس نے تاج کو اغوا کر کے اپنے پاس رکھا ہو گا اور تاج کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد تاج کو ٹھکانے لگا دیا ہو گا۔

رئیس کے پورے بدن میں چیونٹیاں سی چلنے لگیں۔ اگر سیاست داں کے قتل سے اس کی جان بھی چھوٹ جاتی تو بھی تاج کا قتل اس کے گلے ڈال دیا جاتا۔

وہ اس وقت کو رو رہا تھا جب تاج سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ کاش وہ اس ملاقات سے پہلے خودکشی کر چکا ہوتا۔

یہ زندگی تو موت سے زیادہ بھیانک تھی۔

پولیس کے ایک حوالدار نے اس کی کوٹھری کے پاس آ کر اسے مخاطب کیا۔ ’’اوئے چلو، تمہارے تینوں بندے آ گئے ہیں۔ صاحب بُلا رہے ہیں تمہیں۔‘‘

وہ بوجھل قدموں سے پولیس والے کے ساتھ رستم علی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے تینوں جاننے والے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں دکان دار اور ایک اس کا دوست۔ ان کے علاوہ اس کمرے میں دو اور پولیس آفیسر بھی تھے۔

’’تم لوگ کیا اس آدمی کو جانتے ہو؟‘‘ رستم علی نے رئیس کی طرف اشارہ کیا۔

’’نہیں جناب! ہم اس کو نہیں جانتے۔‘‘ ان تینوں نے جواب دیا۔

رئیس چکرا کر رہ گیا۔ ’’کیا کہہ رہے ہو تم لوگ؟ کیا تم مجھے نہیں جانتے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس بار بھی ان تینوں کا یہی جواب تھا۔

☆☆☆

رئیس کو ایک بار پھر اسی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

اب اس کے ذہن کی دھند اتنی گاڑھی ہو چکی تھی کہ وہ بے حس ہو گیا تھا۔ ایک خوفناک قسم کی بیزاری اور لاتعلقی اس پر مسلط ہو گئی تھی۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا، شاید کسی اور کے ساتھ ہو رہا تھا اور وہ صرف تماشائی تھا یا جو پہلے بھی تھا۔ وہ صرف ایک خواب تھا۔

اور خواب کے ختم ہونے پر جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے بستر پر ہوتا۔ اس کمرے میں ہوتا جو اس کے برسوں کا ساتھی تھا۔

یا کوئی فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چل رہی تھی اور ان واقعات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ مہوش کی آواز اسے خوابوں اور خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی تھی۔ وہ نہ جانے کس وقت اس کی کوٹھری میں آ گئی تھی۔ رئیس کو اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔

’’تاج! آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟‘‘ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ’’تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم تاج نہیں ہو۔ میں بیوی ہوں تمہاری۔ تمہارے دکھ درد کی ساتھی۔ دیکھو میں نے ڈیڈ سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہاری سزا کم کروانے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں صرف یہ بیان دینا ہے کہ شبیر شاہ نے تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور تم نے اپنے دفاع میں اس کا خون کیا ہے۔‘‘

’’خدا کے لیے تم لوگ میری بات کا یقین کر لو۔ میں تاج نہیں ہوں۔ رئیس ہوں۔‘‘ رئیس نے کہا۔ ’’تاج مجھے دھوکے سے اپنی جگہ بیٹھا کر خود فرار ہو گیا ہے۔‘‘

’’تاج! میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں کہ تم سزا سے بچنے کے لیے پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہے ہو جبکہ سچائی یہی ہے کہ تم نے شبیر شاہ کا خون کیا تھا۔ خدا کے لیے کہہ دو کہ یہ ایک حادثہ تھا۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیسی بیوی ہو۔‘‘ رئیس نے کہا۔ ’’میں نے تو یہ سنا تھا کہ بیویاں اپنے شوہروں کو ان کے بدن کی بو سے پہچان لیتی ہیں اور تمہارا یہ حال ہے کہ تم ایک غیر مرد کو اپنا شوہر کہے جا رہی ہو۔‘‘

’’تاج! میرا خیال ہے کہ تمہارا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔‘‘ مہوش باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ ’’اور اب تمہارے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔‘‘

’’بیٹی کوٹھری سے باہر آ جاؤ۔‘‘ رستم علی کی آواز سنائی دی۔ وہ کوٹھری کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ’’مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم میرے کمرے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔‘‘

’’ڈیڈ! تاج کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ اپنے آپ کو رئیس کیوں کہہ رہے ہیں؟‘‘

’’سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹی! تم ایسا کرو گھر واپس چلی جاؤ۔ میں بھی کچھ دیر میں تمہارے پاس واپس آ رہا ہوں۔‘‘

مہوش اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ رستم علی، رئیس کے پاس آ گیا۔ ’’دیکھو اب اس بحث کو جانے دو کہ تم تاج ہو یا کوئی اور ہو۔ کیونکہ تم نے جو ضد پکڑ رکھی ہے۔ تم اس سے کبھی نہیں ہٹو گے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ تم اب بچ نہیں سکو گے۔ تمہارے خلاف بے شمار ثبوت ہیں اور میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب! اب میں آپ کو کسی طرح بھی یقین نہیں دلا سکوں گا۔‘‘

’’سنو، میری بات سنو۔‘‘ رستم علی کی آواز دھیمی ہو گئی۔ ’’آج رات تمہیں اس کوٹھری میں رہنا ہے۔ میری وجہ سے یہاں تم پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی اور کوئی تکلیف بھی نہیں ہو گی اور کل صبح...‘‘ رستم علی کچھ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

''جی جناب! بتائیں کل صبح کیا ہونے والا ہے؟''

''کل ہم تمہیں عدالت کے سامنے پیش کریں گے۔'' رستم علی نے بتایا۔ ''لیکن ایسا ہو نہیں سکے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''خدا مجھے معاف کرے۔ میں مہوش کی محبت میں اپنے فرض سے غداری کروں گا۔ زندگی میں پہلی بار...''

''میں نہیں سمجھا جناب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' رئیس نے پوچھا۔

''تمہیں فرار کرا دیا جائے گا۔'' رستم علی نے اپنی بات مکمل کی۔

''کیا؟ مجھے فرار کرا دیا جائے گا۔''

''ہاں۔'' رستم علی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم فرار ہو جاؤ گے۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر رئیس کی طرف بڑھا دی۔ ''تم یہاں نہیں رہو گے۔ دوسرے شہر چلے جاؤ گے۔ جہاں تمہارے لیے سارا بندوبست کر دیا گیا ہے۔''

''لیکن جناب! مجھے فرار ہونے کی کیا ضرورت، جبکہ میں تاج ہی نہیں ہوں۔''

''اس احمقانہ بکواس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' رستم علی نے کہا۔ ''کسی کو بھی تمہاری بات پر یقین نہیں آئے گا۔ تم خود سوچو، سب تمہیں تاج کی حیثیت سے جانتے ہیں..... تم دیکھ چکے ہو کہ خود تمہارے محلے والے تمہیں نہیں جانتے۔''

''اسی بات پر تو حیرت ہو رہی ہے۔''

''کس بات کی حیرت! کیونکہ تم تاج ہو اور وہ لوگ کسی تاج کو نہیں جانتے۔ جبکہ کسی رئیس کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' رستم علی نے کہا۔ ''اب تم یہ بتا دو کہ تم اپنے احمقانہ بیان پر قائم رہ کر خود اپنے لیے موت کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہو یا فرار ہو کر اپنی زندگی بچانا چاہتے ہو؟''

رئیس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے جناب! میں فرار ہونے کے لیے تیار ہوں...''

☆☆☆

یہ قافلہ صبح نو بجے عدالت کے لیے روانہ ہوا۔

اسے ایک کھلی موبائل میں بٹھایا گیا تھا۔ رئیس کا دل ڈوب رہا تھا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اسے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی لیکن دو پولیس والے اس کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کے اعصاب بُری طرح چیخ رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ کسی بھیانک خواب کی طرح تھا۔ یہ سب کچھ اس کے تصور سے بہت باہر کی چیز تھی۔

اس کی جیب میں دو لاکھ روپے تھے لیکن کیا وہ دو لاکھ سے اپنی زندگی گزار سکتا تھا۔ اسے تاج کی حیثیت سے زندہ رہنا تھا یا رئیس کی حیثیت سے؟

بے شمار سوالات تھے۔ لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ اپنی زندگی بچانا تھا۔ وہ اگر عدالت تک پہنچ جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

موبائل ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس کے ایک طرف جھاڑیاں تھیں۔ اسی وقت ایک پولیس والے نے ...... ڈرائیور سے کہا۔ ''بھائی! ذرا ایک منٹ کے لیے گاڑی روک دے۔''

''کیوں؟''

''سمجھا کر یار! بہت زور کا آ رہا ہے۔''

گاڑی چلانے والے نے گاڑی روک دی۔ یہ رئیس کے لیے اشارہ تھا، اسے بتا دیا گیا تھا کہ ایک خاص جگہ ذرا سی دیر کے لیے گاڑی رکے گی اور اسے فرار ہونا پڑے گا۔

موبائل کے رکتے ہی پولیس والے کے ساتھ ساتھ وہ بھی کود کر گاڑی سے باہر آ گیا اور پوری قوت کے ساتھ ایک طرف دوڑ لگا دی۔

اس کا رخ جھاڑیوں کی طرف تھا۔ پولیس والے شور کر رہے تھے۔ اسی وقت دو سنسناتی ہوئی گولیاں اس کے برابر سے گزریں۔

ایسا تو کچھ بھی نہیں ہونا تھا پھر اس پر گولیاں کیوں برسائی گئی تھیں۔ دو گولیاں اور چلیں اور اس نے ایک گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔ یہ گڑھا اتفاقاً اسے دکھائی دے گیا تھا۔

اب گولیاں تو نہیں چل رہی تھیں لیکن جھاڑیوں میں اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ پولیس والے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔

انہی آوازوں کے درمیان اس نے ایک آواز پہچان لی۔ یہ آواز رستم علی کی تھی جو پولیس والوں پر ناراض ہو رہا تھا۔ ''یاد رکھو، اگر وہ بچ کر نکل گیا تو کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ ڈھونڈو اس کو۔ وہ کہاں جا سکتا ہے۔''

''سر جی! میرا خیال ہے کہ وہ دوسری طرف نکل گیا ہے۔'' دوسری آواز آئی۔

''اتنی جلدی کیسے نکل سکتا ہے۔ تم لوگ سامنے کا بھی نشانہ نہیں لے سکتے۔''

رئیس کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ تو سازش یہ تھی کہ اسے فرار ہونے کا موقع دے کر پیچھے سے گولی مار دی جائے اور بڑی آسانی سے یہ کہہ دیا جائے کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔

لیکن رستم علی ایسا کیوں کر رہا تھا۔ تاج تو اس کا داماد تھا تو کیا وہ اپنے داماد کو اس طرح مارنا چاہتا ہے۔ بہت ہی الجھی ہوئی صورتِ حال تھی۔

رئیس سانسیں روکے ہوئے اس گڑھے میں بیٹھا تھا۔ کسی بھی وقت موت آ کر اسے دبوچ سکتی تھی۔ یہ لوگ اسے گرفتار نہیں کرتے بلکہ گولی مار دیتے۔ ان لوگوں کا یہی منصوبہ تھا۔

آوازیں آتی رہیں پھر دور ہوتی چلی گئیں۔ شاید وہ سب اسے تلاش کرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے تھے۔ پھر گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے اور روانہ ہونے کی آوازیں آئیں لیکن وہ اسی گڑھے میں دبکا رہا۔ اس کے لیے خود کو بچانے سے زیادہ اور کسی بات کی اہمیت نہیں تھی۔

بہت دیر بعد وہ اس گڑھے سے باہر نکل آیا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ جہاں کھڑا تھا، وہاں سے سڑک ... کچھ فاصلے پر تھی۔ ہو سکتا تھا کہ ان اطراف میں اسی انداز کی خاموشی رہتی ہو۔

دو لاکھ روپے اس کی جیب میں تھے۔ لیکن اس کے اگلے پل کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ پولیس اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوگی۔

مصیبت یہ تھی کہ وہ نہ تو تاج بن کر رہ سکتا تھا۔ اور نہ ہی رئیس بن کر اپنے گھر جا سکتا تھا یہ بات اس کے ذہن میں اب تک کھٹک رہی تھی کہ اس کے محلے والوں اور اس کے دوست نے اسے رئیس کی حیثیت سے کیوں نہیں پہچانا تھا؟

اگر وہ لوگ ابھی بھی اس کا ساتھ دیں تو اس کی زندگی بچ سکتی تھی۔ اب اس کے لیے زندہ رہنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ وہ کسی طرح اپنے آپ کو رئیس ثابت کر دے۔ بھول جائے کہ تاج نام کا کوئی شخص اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس پوری کہانی کو گول کر جائے۔ وہ رئیس تھا اور رئیس ہی کی حیثیت سے اس نے زندگی گزاری ہے۔

وہ تاج، مہوش یا رستم علی وغیرہ کسی کو نہیں جانتا تھا۔ یہ لوگ کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اس وقت دن کے بارہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ اپنے محلے سے بہت فاصلے پر تھا لیکن اسے راستے معلوم تھے۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس والوں کی نگاہوں سے چھپ کر وہ کس طرح اپنے گھر پہنچ سکتا ہے۔ اس نے سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی کر لی تھی۔

لیکن وہ اپنے محلے میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے دور ہی سے پولیس کی دو موبائل اپنی گلی کے کونے پر دیکھ لی تھیں۔

رستم علی چالاک آدمی تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ فرار ہو کر اپنے گھر کی طرف آ سکتا ہے اسی لیے اس نے پہلے سے ناکا لگا رکھا تھا۔

''کیوں جناب اترنا نہیں ہے کیا؟'' ٹیکسی والے نے پوچھا۔

''نہیں بھائی، مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے صدر کی طرف لے چلو۔''

اب سے پہلے اس کے ساتھ اس قسم کے واقعات کبھی پیش نہیں آئے تھے۔ اس لیے اس کے ذہن نے ذہنی جمناسٹک بھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ کسی ماہر مجرم ہی کی طرح سوچ رہا تھا۔

پولیس سے بچنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ وہ کہاں جائے۔ کسی ہوٹل میں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پولیس بہ آسانی اس تک پہنچ سکتی تھی۔

پھر اسے اپنا ایک دوست دلدار یاد آ گیا جو شہر کے ایک دور دراز .... علاقے لانڈھی میں اکیلا رہتا تھا۔ ایک فیکٹری میں وہ سپروائزر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اس لیے اس نے رہائش فیکٹری کے قریب ہی رکھی تھی۔

وہ وقت پر کام آنے والا آدمی تھا۔

رئیس نے لانڈھی جانے والی بس پکڑ لی۔ اس کا دوست دلدار اپنے کوارٹر ہی میں موجود تھا۔ رئیس کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ''یار! تو بھی کمال کا آدمی ہے۔ مجھ سے کہہ کر گیا کہ دس پندرہ دنوں کے بعد آؤں گا اور دو گھنٹے میں واپس چلا آ رہا ہے۔''

''کب بول کر گیا تھا؟'' رئیس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آج صبح اور کب۔'' دلدار نے بتایا۔

☆☆☆

دلدار اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلا گیا۔

رئیس نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ شاید وہ حیرت سے بے ہوش ہو جاتا۔ رئیس کو یاد آ گیا جب وہ تاج کو اپنے دوستوں کے بارے میں سب کچھ بتا رہا تھا تو اس نے دلدار کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ اس کا ایڈریس بھی بتا دیا تھا اور وہ چالاک شخص رئیس بن کر دلدار ہی کے پاس

آ کر رہنے لگا تھا۔

اور وہ بھی اس مہارت سے کہ بے چارے دلدار کو احساس ہی نہیں ہو پایا کہ وہ کس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ دلدار نے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت تو ہے، تم آج کل کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"دلدار! اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں تو کیا تم یقین کر لو گے؟"

"کیوں نہیں، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرے دوست! میں ایک خطرناک جال میں پھنس گیا ہوں۔" رئیس نے کہا۔ "اور اس جال سے نکلنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری جان بتاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"کیا تم یقین کر لو گے کہ تمہارے ساتھ جو شخص رہ رہا تھا، وہ میں نہیں تھا۔"

"واہ تو پھر وہ تمہارا بھوت ہوگا۔"

"بھوت ہی سمجھ لو اس کم بخت کو۔" رئیس نے ایک گہری سانس لی۔ "پلیز، اب تم میری پوری کہانی سن لو تو تمہیں یقین آ جائے گا۔"

"سناؤ، کیا کہانی ہے تمہاری؟"

رئیس نے شروع سے لے کر اب تک کے سارے واقعات سنا دیے۔ دلدار کہانی سننے کے بعد حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ تم نہیں تھے؟"

"ہاں، وہ میں نہیں تھا۔"

"کیسے یقین کیا جائے؟" دلدار نے کہا۔ "وہ تو وہی سب باتیں کر رہا تھا جو تم کر سکتے ہو۔"

"میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے میرے دوست۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر بھی تم ذرا ذہن پر زور دو۔ کوئی ایسی بات جو میرے حوالے سے اجنبی لگی ہو۔"

"ہاں، صرف ایک بات ہے۔" دلدار نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔ "ابھی امتحان ہو جاتا ہے۔"

"جلدی بتاؤ یار، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں یاد ہے، ہم ایک بار ہالیجی جھیل کی طرف نہانے گئے تھے۔ تم نے جمپ لگائی تھی لیکن تم پتھر سے ٹکرا گئے تھے۔"

"ہاں اور میری پشت پر چوٹ آئی تھی۔ جس کا نشان آج تک باقی ہے۔ ہاں، یاد آیا۔ میں نے شاید یہ بات اس شخص کو نہیں بتائی تھی۔ نہ جانے کس طرح اتنی بڑی بات رہ گئی۔"

"تم مجھے اپنی قمیص اتار کر دکھاؤ۔"

"یہ لو۔" رئیس نے اپنی قمیص اتار دی۔ "اب دیکھ لو۔"

"ہاں، یقین آ گیا کہ تم رئیس ہی ہو۔" دلدار نے کہا۔ "کیونکہ یہ نشان اس کی پشت پر نہیں تھا۔"

"اب بتاؤ، میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے تم کیا کہو گے؟"

"سوائے حیرت کے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اور اب میں ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا ہوں۔" رئیس نے کہا۔ "رستم علی مجھے پورے شہر میں تلاش کرتا پھر رہا ہوگا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص اپنے داماد کو پولیس مقابلے میں کیوں مارنا چاہتا ہے۔"

"صرف اس لیے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ میں تاج نہیں ہوں، رئیس ہوں۔" رئیس نے بتایا۔

"کیا، کیا وہ یہ بات جانتا ہے؟"

"ہاں، میرے دوست! ان حالات میں مبتلا ہونے کے بعد میری چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھی ہیں۔" رئیس نے کہا۔ "مجھ پر بہت کچھ واضح ہو چکا ہے۔ باقاعدہ پلاننگ کر کے مجھے پھانسا گیا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے محلے والوں اور میرے دوستوں نے مجھے کیوں نہیں پہچانا۔ انہوں نے کیوں انکار کر دیا؟"

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ رستم علی نے ان پر دباؤ ڈالا ہوگا۔" دلدار نے کہا۔

"ہاں، یہی ہو سکتا ہے۔ اب مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔" دلدار نے کہا۔ "میرے دوست تم یہاں بھی محفوظ نہیں ہو۔ اگر اس سازش میں تاج شامل ہے تو اس کے ذہن میں میرا نام ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ تم یہاں میرے پاس ہو۔ ایسی صورت میں وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"میرے خدا! میں تو بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔"

"تم اپنی بے وقوفی سے اس حال کو پہنچے ہو۔" دلدار نے کہا۔ "چلو، میں تمہارا بندوبست کہیں اور کروا دیتا ہوں۔ ورنہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

جب وہ دونوں اس کوارٹر سے کچھ فاصلے پر تھے تو پولیس کی دو موبائل نے دلدار کے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

"تم پریشان مت ہو۔" رئیس نے دلدار کو دلاسا دیا۔ "تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ رئیس اس طرف آیا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ صبح بول کر گیا ہے کہ دس پندرہ دنوں کے بعد آئے گا۔"

"کیا وہ لوگ میری بات کا یقین کر لیں گے؟"

"یقین کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ تاج تو آج صبح ہی تمہارے یہاں سے گیا تھا۔"

دلدار، رئیس کو اپنے ساتھ اپنے ایک اور دوست اعظم کے کوارٹر میں لے آیا۔ یہ کوارٹر کورنگی سو کوارٹر میں تھا۔ جس کا وہاں سے اچھا خاصا فاصلہ تھا۔

دلدار نے اعظم کو ساری کہانی نہیں سنائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ میرا یہ دوست کسی مصیبت میں ہے اور کچھ دنوں کے لیے اسے پناہ چاہیے۔

اعظم نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔

"اب تم آرام اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔" رئیس نے دلدار سے کہا۔ "کیونکہ تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

دلدار اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اعظم، رئیس کے کھانے پینے کے لیے بہت سا سامان لے آیا تھا۔ اس نے رئیس کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں رکھتے ہوئے کہا۔ "باؤ جی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہو سکتا ہے۔ تم شاید پولیس کے چکر میں پھنس گئے ہو؟"

"ہاں یار، ایسا ہی معاملہ ہے۔" رئیس نے ایک گہری سانس لی۔ "اور وہ بھی بلاوجہ، میں خوامخواہ ایک لالچ میں آ گیا تھا۔ اس لالچ نے یہ دن دکھائے ہیں۔"

"باؤ جی! اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتاؤ، ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آ جاؤں۔"

"ہاں یار، اب دوستوں ہی پر بھروسا کرنا پڑے گا۔" رئیس نے کہا۔ "میری کہانی سن کر شاید تم کو یقین بھی نہ آئے لیکن یہ بالکل سچ ہے۔"

"چلو، تم مجھے بتاؤ تو سہی، آگے اوپر والا مالک ہے۔"

رئیس نے اسے بھی اپنی کہانی سنا دی تھی۔ "او باؤ، یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔" اعظم نے فوراً کہا۔ "تم کو بھی اتنی عقل ہونی چاہیے کہ یہ سوچ لیتے کہ کوئی بندہ آخر اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کیوں کر رہا ہے؟"

"بس بھائی! انسان تو اپنی فطرت میں لالچی ہوتا ہے۔" رئیس نے کہا۔ "میں بھی اچھی زندگی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔"

"خیر، تم فکر نہ کرو۔ آرام سے یہیں رہو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ جب تک میں حالات کو دیکھتا ہوں۔"

"بھائی! سب سے پہلا کام تو یہی ہے کہ جا کر دلدار کی خیریت معلوم کر آؤ۔ دیکھو تو سہی، پولیس نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔"

"میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔" اعظم نے کہا۔ "دلدار کے پاس موبائل بھی تو نہیں ہوتا۔ ورنہ یہیں سے معلوم ہو جاتا۔"

"یہ اچھا ہے کہ اس کے پاس موبائل نہیں ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے پولیس والے اس کے نام آنے والی کالز ٹریس بھی کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں سب ہی پھنس جاتے۔"

"ہاں، یہ بھی تم نے ٹھیک کہا باؤ۔ خیر، میں معلوم کر کے آتا ہوں۔"

اعظم دو گھنٹوں کے بعد واپس آیا۔

"سب ٹھیک ہے باؤ۔" اس نے خبر سنائی۔ "پولیس آئی تھی اس کے پاس، اس نے یہی بتایا کہ رئیس صبح ہی چلا گیا ہے اور یہ بول کر گیا ہے کہ دس پندرہ دنوں کے بعد واپس آئے گا۔ اس کے بعد وہ اب تک نہیں آیا ہے پھر پولیس والے یہ سن کر واپس چلے گئے۔"

"چلو، یہاں تک تو ٹھیک ہی ہوا۔ ویسے تم اسے منع کر دیتے کہ وہ اس طرف آنے میں احتیاط کرے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس والے اس کی نگرانی بھی کر رہے ہوں۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ میں اسے سمجھا کر آیا ہوں۔"

دوسری صبح اعظم ناشتے کے سامان کے ساتھ ساتھ اخبار بھی لے کر آ گیا تھا۔ "گڑبڑ تو ہو ہی گئی باؤ۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ تمہارے جاننے والوں کے یہاں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔"

رئیس نے خبر پڑھنی شروع کر دی۔ وہ ایک پریس کانفرنس کی خبر تھی اور وہ ہنگامی پریس کانفرنس رستم علی نے اپنے دفتر میں کی تھی۔ "میں ایک فرض شناس پولیس آفیسر پہلے ہوں اور ایک بیٹی کا باپ اور ایک داماد کا سسر بعد میں ہوں۔

مجھے شادی کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ تاج مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا شخص ہے۔ پھر اس نے شبیر شاہ کا قتل کر دیا۔ مجھے تو شبہ ہو گیا تھا لیکن میں کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے گرفتار کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ بدقسمتی سے میرے افسران یہ سمجھ رہے تھے کہ تاج میرا داماد ہے اس لیے میں جانب داری برتوں گا جب خود میں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کیے تو یہ کیس مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا گیا۔

''اور میں نے اسے گرفتار بھی کر لیا۔ اس کا باقاعدہ ریمانڈ لیا گیا اور عدالت جاتے ہوئے وہ فرار ہو گیا اور اب تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ میں خود اور میری پولیس فورس اس کی تلاش میں ہے اور جیسے ہی وہ مل گیا اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔''

رئیس اس خبر کو پڑھ کر گم صم ہو کر رہ گیا۔ رستم علی نے اس کے فرار کی راہیں بند کر دی تھیں۔ وہ اب کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

''رئیس باؤ۔'' اعظم نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں بھی یہ بیان راستے میں پڑھ چکا ہوں۔ یہ رستم علی تو بہت کمینہ انسان ثابت ہو رہا ہے۔''

''اعظم! اگر اس بار میں رستم علی کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ ایک لمحے کی دیر کیے بغیر مجھے گولی مار دے گا۔''

''تو پھر بتاؤ، تم کس طرح اپنی بے گناہی ثابت کرو گے۔''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کاش صرف ایک بار وہ تاج مجھے مل جائے تو میں اپنا حساب برابر کر لوں گا۔''

''لیکن وہ ملے گا کہاں سے؟''

''خود رستم علی کے گھر سے۔'' رئیس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تاج کو خود رستم علی نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔''

''لیکن اس ڈرامے کا فائدہ کیا ہے؟''

''دیکھو رستم علی کو یہ معلوم ہے کہ شبیر شاہ کا خون تاج نے کیا ہے۔ معاملہ چونکہ اس کے بس سے باہر کا ہے، وہ تاج کو بچانا بھی چاہے تو نہیں بچا سکتا اسی لیے اس نے ایک بہت گھناؤنا کھیل کھیلا اور تم اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہو کہ تاج کو اپنی صورت شکل کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے اس آدمی یعنی مجھے پوری طرح تاج بنا کر اپنے گھر میں داخل کرا دیا اور خود منظر نامے سے غائب ہو گیا۔ دلدار کے یہاں رہنے لگا۔''

''بات تو پھر وہی ہے کہ رستم علی کو کیا معلوم کہ اس کی بیٹی کے گھر میں رہنے والا کوئی اور ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ بات اسے معلوم ہے۔'' رئیس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ خود تاج نے فون کے ذریعے مہوش کو بتایا ہو اور مہوش نے رستم علی سے بات کی ہو۔ پھر سب نے مل کر یہ سازش تیار کر لی ہو۔''

''اور وہ سازش کیا ہو سکتی ہے رئیس باؤ؟''

''بہت سامنے کی سازش ہے بھائی۔'' رئیس نے کہا۔ ''مجھے تاج کہہ کر مار دیا جائے۔ اس طرح یہ سمجھا جائے گا کہ ایک فرض شناس آفیسر نے اپنے داماد کو گولی مار دی۔ اور دوسری طرف وہ داماد رئیس بن کر مہوش کے ساتھ اپنی زندگی گزارتا رہے گا۔ اس شہر میں نہ سہی کہیں اور سہی۔ کیونکہ رئیس کے خلاف تو کوئی کیس نہیں ہے۔''

''لیکن باؤ، ایک بات ہے کبھی تو پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ جو رہ رہا ہے، وہ تاج ہے اور اگر تاج کو مار دیا گیا ہے تو پھر دوسرا کون ہے۔ وہ کس طرح یہ سارا... کھیل سنبھالے گا؟''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' رئیس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں کوئی اور ہی بات ہو۔ ابھی اس کا پتا نہیں چل سکے گا۔ وہ تو تاج کے ملنے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔''

''اور یہ تاج کہاں ملے گا؟''

''میرے اندازے کے مطابق اس کے بارے میں مہوش اور رستم علی ہی بتا سکتے ہیں۔'' رئیس نے کہا۔ ''اعظم! تم یہ بتاؤ، تم کس حد تک میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''جو تم کہو۔'' اعظم نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو یاروں کے یار ہیں۔''

''اعظم! تمہیں اس مکان کی نگرانی کرنی ہے۔'' رئیس نے بتایا۔ ''خاص طور پر مہوش پر نظر رکھنی ہے۔ اس کا آنا جانا چیک کرنا ہو گا۔ کہاں جاتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تاج کہیں اور چھپا ہو اور مہوش اس سے ملنے کے لیے جاتی ہو۔ بس تمہیں اس بات کا پتا چلانا ہے۔''

''میں یہ بھی کر دوں گا باؤ! تم فکر ہی مت کرو۔''

☆☆☆

تاج کا پتا چل گیا تھا۔

وہ شہر کے.... مضافاتی علاقے کے ایک مکان میں چھپا ہوا تھا۔ اعظم نے کئی بار مہوش کا پیچھا کیا تھا۔ مہوش اسی مکان میں آتی جاتی تھی۔

اعظم بتا رہا تھا۔ ''باؤ! یہ لوگ بہت احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس عورت کے پاس گاڑی

ہے لیکن وہ ٹیکسی کر کے جاتی ہے اور وہ بھی دور اترتی ہے اور پیدل اس مکان تک جاتی ہے۔ ہاں، اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھیلے بھی ہوتے ہیں۔"

وہ یقیناً کھانے پینے کا سامان لے کر جاتی ہوگی۔" رئیس نے کہا۔ "لیکن ابھی تک ان کی سازش سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ تاج آخر کب تک چھپا رہ سکتا ہے۔"

"اسے اس کے بل سے نکالنا ہوگا باؤ۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

"تو اسے نکالنے کی کوئی ترکیب بتاؤ؟"

"یہ دو چار دن وہاں کا جائزہ لینے کے بعد بتاؤں گا۔" اعظم نے کہا۔ "ویسے اس مکان میں تاج کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔"

"یہ ظاہر ہے اعظم اور وہ اس وقت تک چھپا رہے گا جب تک پولیس رئیس کو نہ مار دے پھر وہ رئیس بن کر سامنے آجائے گا۔ تم ایسا کرو، مجھے وہ مکان دکھا دو۔ آخر میں کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں باؤ۔" اعظم نے کہا۔ "ہمیں تھوڑی سی ہمت کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ وقت اسی طرح گزرتا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تاج اس مکان میں اکیلا ہی رہتا ہوگا۔" رئیس کچھ سوچ کر بولا۔ "وہ لوگ ابھی اس کا راز ظاہر ہونے کا خطرہ نہیں لے سکتے۔"

"بالکل یہی بات ہوگی۔"

"تو کیا ہم دونوں اس کے مکان میں داخل نہیں ہو سکتے؟" رئیس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہو سکتے اور باؤ لڑائی دنگے کی پروا مت کرنا۔ میں اکیلا ہی اسے سنبھال لوں گا۔"

"تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم آج ہی رات چھاپا ماریں گے۔" رئیس نے بتایا۔

"بندہ بھی تیار ہے باؤ۔ میں پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔"

رئیس کو تیاری کیا کرنی تھی۔ بس اسے اعظم کے ساتھ چل دینا تھا۔ جبکہ اعظم کا یہ کہنا تھا کہ وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لیے انہیں کوئی سامان ساتھ رکھ لینا چاہیے۔"

وہ رئیس کے منع کرنے کے باوجود سامان کی تلاش میں چلا گیا۔ دو گھنٹوں کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"یہ دیکھو باؤ۔" اس نے ایک ٹی ٹی دکھائی۔ "یہ ہے تو بہت چھوٹی، لیکن بہت کام کی چیز ہے۔ بندہ اس کے سامنے سانس ہی نہیں لے سکتا۔"

"اعظم! میں کوئی خون خرابا نہیں چاہتا ہوں۔" رئیس گھبرا کر بولا۔

"نہ باؤ، اس میں خون خرابے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ صرف اس کو دھمکانا ہے۔" اعظم نے کہا۔ "پھر دوسری بات یہ ہے جی کہ کوئی بھی بندہ اتنی آسانی سے تو قابو میں نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

اعظم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پھر جب اپنی بقا کا سوال تھا تو خود کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

رات دس کے بعد دونوں روانہ ہوئے۔

یہ علاقہ سعود آباد کہلاتا تھا۔ یہ بھی اوسط طبقے کی آبادی تھی۔ اعظم نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے سامنے کھیل کا میدان تھا۔ مکان کی چہار دیواری اتنی اونچی تھی کہ وہ پھلانگ کر اندر نہیں جا سکتے تھے۔

"اب بتاؤ، ہم اندر کس طرح جائیں؟" رئیس نے پوچھا۔

"دروازہ کھلوا کر اندر چلتے ہیں۔" اعظم نے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کام شروع کیا ہے تو اس کو ختم بھی کرنا ہے۔ ورنہ ساری زندگی رُلتے رہو گے۔"

"یہ بات تو ہے۔"

"یہ لو، یہ ٹی ٹی اپنے پاس رکھ لو۔" اعظم نے کہا۔ "دروازہ کھولنے والے کے سینے پر رکھ دینا۔ سالے کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

اعظم نے ٹی ٹی اس کی طرف بڑھا دی۔ رئیس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے دی۔ ایک بار۔ دو بار۔ تیسری بار۔

پھر دروازہ کھل گیا۔ رئیس نے دروازہ کھولنے والے کے سینے پر ٹی ٹی رکھ دی تھی اور اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا... وہ رستم علی تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی کھڑے ہوئے تھے اور اعظم کی ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک بار پھر رستم علی کے سامنے تھا۔

اس بار یہ قید سرکاری نہیں بلکہ غیر سرکاری تھی۔ رستم اسے اپنے ساتھ کہیں لے آیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اسی لیے اسے اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

اعظم نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ وہ رئیس کو رستم علی کے جال میں پھنسا کر جا چکا تھا اور رئیس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اسے کوئی موقع نہیں ملے گا۔

وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں تھا۔

اسے ایک کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ رستم علی اس کے سامنے کھڑا طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آخر پھنس گئے نا۔" اس نے کہا۔ "کتنا بھاگو گے؟"

"جناب! ایک بات بتا دیں۔ میں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ آپ تو اچھی جانتے ہیں کہ مجھے اس جال میں پھانسا گیا ہے۔ پھر آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ تم ایک کمزور اور بے وقعت انسان ہو۔" رستم علی نے کہا۔ "جبکہ میں طاقتور ہوں۔ اور تاج طاقت ور ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ کمزوروں کو طاقت وروں کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔ تم ہمارے لیے قربانی دے رہے ہو۔"

"اور وہ تاج کہاں ہے؟"

"وہ بھی ہمارے پاس ہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "تمہاری بد قسمتی ہے کہ تم تاج کے ہم شکل نکلے۔ اسی لیے ہم نے یہ سوچا کہ دونوں میں سے ایک کا نام زندہ رہے اور دوسرے کا جسم۔ اسی لیے تمہارا نام زندہ رہے گا اور تاج کا جسم۔"

"ایک بات بتائیں، میری موت کے بعد آپ میرے نام سے کس طرح فائدہ اٹھا سکیں گے؟"

"ظاہر ہے کہ تمہیں مارنے کے بعد تاج کے طور پر تمہاری لاش کو سامنے لایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جو جرم کیا ہے، وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد کی کہانی سننا چاہتے ہو؟"

"ہاں سنا دیں، تاکہ میری الجھن دور ہو۔" رئیس نے کہا۔

"اس کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ شوہر کی موت کے بعد مہوش بہت اداس رہنے لگے گی۔ کیونکہ تاج صرف اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ محبت بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مہوش کو یہ نہیں معلوم تھا کہ تاج ایک کرمنل ہے۔ بہر حال تاج کی موت کے بعد اچانک اسے رئیس نام کا ایک شخص مل گیا۔ جو بالکل تاج کی طرح تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے تاج زندہ ہو کر آ گیا ہو۔ مہوش مجھ سے ضد کرتی ہے۔ اور میں نے اس کی خواہش کو دیکھتے ہوئے رئیس سے اس کی شادی کر دی۔ اور اب وہ دونوں خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں سمجھ گیا، اور تاج کو کوئی چیلنج بھی نہیں کر سکے گا کیونکہ میں تاج کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔"

"تو بس یہ ہے ہماری سیدھی سادی پلاننگ۔" رستم علی مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے نوجوان کہ تم بے موت مارے جاؤ گے لیکن کیا کیا جائے۔ کسی ایک کی بقا کے لیے کسی ایک کی قربانی تو ضروری ہے۔"

"تم ایک کمینے انسان ہو رستم علی۔" رئیس پھٹ پڑا۔ "تم پولیس کی وردی میں ڈاکو ہو۔ بھیڑیے ہو۔"

"کچھ بھی کہتے رہو۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہاں، یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔"

"میری آخری خواہش تمہاری موت ہے رستم علی۔"

"سوری، تمہاری یہ خواہش تو پوری نہیں ہوسکتی۔ ویسے میں نے تمہارے لیے بہت اچھا کھانا منگوایا ہے۔"

☆☆☆

اس کی کہانی ختم ہونے والی تھی۔

کیسی رات تھی یہ۔ اور وہ کیسی سازشوں کے پھندے میں پھنس گیا تھا۔ کیا قصور تھا اس کا۔ وہ ایک آدمی کا ہم شکل تھا۔ بس اس کے علاوہ اس نے اور کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اور اس جرم پر اس کے سامنے موت لا کر کھڑی کر دی گئی تھی۔

صرف اس کا نام زندہ رہ جاتا۔ اس کے سارے دوست، رشتے دار سب تاج کو رئیس ہی سمجھتے اور رئیس کی قسمت پر رشک کرتے کہ ایک مفلس کی شادی ایک دولت مند اور خوب صورت لڑکی سے ہوگئی۔

اسے اندازہ تھا کہ کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ ہر طرف رستم علی ہی کے آدمی تھے۔ انتہا یہ تھی کہ اعظم تک اس کا آدمی ثابت ہوا تھا۔

اس وقت صرف اس کا خدا ہی اسے بچا سکتا تھا۔

یہ شاید اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ کل صبح یہ بے رحم لوگ اسے لے جا کر گولی مار دیتے لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔ وہاں سے فرار کا کوئی تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

دروازہ بہت مضبوط تھا اور ظاہر ہے کہ دروازے کے باہر رستم علی نے اپنے آدمیوں کے پہرے لگا دیے ہوں گے۔ وہ اسے کبھی بھاگنے نہیں دیں گے۔

پھر اچانک دروازہ کھل گیا۔

اس کا وقت شاید قریب آچکا تھا۔ آنے والی مہوش تھی۔ رستم علی کی بیٹی۔ تاج کی بیوی۔ جو بہت دلچسپی اور گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ ''واقعی کمال ہے۔ تم تو سو فیصد تاج ہو۔ اسی لیے میں اتنے دنوں تک تمہیں اپنا شوہر سمجھتی رہی۔''

''دیکھو، کیا اس اتفاق میں میرا کوئی قصور ہے؟'' رئیس نے پوچھا۔

''ہاں، تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہیں اس وقت انکار کر دینا چاہیے تھا جب تاج نے تمہارے سامنے یہ انوکھی اسکیم رکھی تھی۔ لیکن تم نے موقع غنیمت سمجھا۔ تم آرام دہ زندگی کے لالچ میں آگئے اور اب تمہاری موت تمہارے سر پر آگئی ہے۔''

''خدا کے لیے کوئی راستہ نکالو۔'' رئیس نے کہا۔ ''بچالو مجھے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تم نے خود اندازہ لگا لیا ہوگا۔ میں اس وقت تمہارے شوہر کے روپ میں تمہارے سامنے تھا۔ اس کے باوجود میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔ مجھے یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ تم ایک شریف لیکن بے وقوف انسان ہو اسی لیے تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے آئی ہوں۔''

''کیا؟'' رئیس چونک پڑا۔

''ہاں۔'' مہوش نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ ڈیڈ کا اپنا فارم ہاؤس ہے۔ یہاں رات کے وقت ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ ڈیڈ نے بتا دیا تھا کہ انہوں نے تم کو کہاں رکھا ہے۔ اسی لیے میں سیدھی یہاں آگئی۔ اب نکلو یہاں سے۔''

''اور وہ چوکیدار اور...'' رئیس نے پوچھا۔

''وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔'' مہوش نے بتایا۔

''آؤ۔''

دھڑکتے دل کے ساتھ رئیس اس کے ساتھ ہولیا۔ یہ واقعی ایک بہت بڑا فارم ہاؤس تھا۔ جو اس رات کے اندھیرے اور سناٹے میں بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں دبے پاؤں فارم ہاؤس کے گیٹ پر آئے۔ مہوش نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پھر دونوں اسی احتیاط کے ساتھ فارم ہاؤس کے باہر آگئے۔

مہوش نے کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی کھڑی کر رکھی تھی۔

''چلو بیٹھ جاؤ۔'' اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن میں جاؤں گا کہاں؟'' رئیس نے پوچھا۔ ''ہر طرف تو تمہارے ڈیڈ کے آدمی ہوں گے۔''

''میں نہیں ہم۔'' مہوش نے کہا۔ ''کیونکہ میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔''

☆☆☆

مہوش اسے ایک اپارٹمنٹ میں لے آئی تھی۔

''یہ میری ایک دوست کا اپارٹمنٹ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ائر ہوسٹس ہے۔ آج کل انگلینڈ گئی ہوئی ہے.... اس اپارٹمنٹ کی چابی میرے پاس رہتی ہے۔''

''کیا تاج کو یا تمہارے ڈیڈ کو اس کے بارے میں نہیں معلوم؟''

''نہیں، اتفاق سے وہ دونوں ہی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' مہوش نے کہا۔ ''تم بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے اور کچھ کھانے کے لیے لے کر آتی ہوں۔''

رئیس ایک بار پھر موت کے منہ سے نکل آیا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ زندگی نے اسے کتنی دیر یا کتنے دنوں کی مہلت دی ہوگی۔

مہوش اس کے لیے چائے اور بسکٹ وغیرہ لے کر آگئی۔ ''تم یہاں کچھ دن اطمینان سے گزار سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مہوش! لیکن میرا مستقبل کیا ہوگا۔ کیا میں اسی طرح ادھر سے ادھر ہوتا رہوں گا؟''

''دیکھو، جس خدا نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ وہی خدا تمہارے لیے کوئی راستہ بھی نکالے گا۔ کیونکہ تمہارا کوئی زیادہ قصور نہیں ہے۔''

''مہوش! ایک بات بتاؤ، کیا میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں، تم کسی بھروسے ہی پر میرے ساتھ یہاں تک آئے ہو۔'' مہوش نے کہا۔ ''ورنہ میں تمہارے پاس کیوں آتی۔ اپنے ڈیڈ کے خلاف کیوں جاتی؟''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ساتھ دھوپ چھاؤں کا یہ کیسا کھیل ہے۔ کبھی تو بدنصیب ہو جاتا ہوں پھر خوش نصیب۔ اس کے بعد پھر بدنصیب۔''

''رئیس! میرا خیال ہے کہ اب تمہارے اچھے دن آنے والے ہیں۔'' مہوش نے کہا۔ ''بہرحال، اب میں چلتی ہوں۔ تم کوشش کرنا کہ کھڑکی کی طرف مت جاؤ۔ ایسا نہ ہو کوئی تمہیں دیکھ لے۔''

''تم کب آؤ گی؟''

''کل صبح۔'' مہوش نے بتایا۔ ''اس دوران میں تم آرام سے رہو گے۔''

مہوش کے جانے کے بعد رئیس پھر اندیشوں میں مبتلا ہوگیا۔ کیا واقعی وہ بچ نکلا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور تماشا ہونے والا ہے؟

اب اس کا کسی پر بھروسا کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سب سے پہلے تاج نے دھوکا کیا۔ محلے والوں اور دوست نے دھوکا دیا اور پھر اعظم اسے موت کے منہ میں لے آیا۔

مہوش تو اسی بے رحم اور سازشی شخص کی بیٹی تھی پھر اس پر کیسے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس اپارٹمنٹ میں اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور اب رئیس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا خوف بھی بڑھتا جارہا تھا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دروازے پر دستک کے ساتھ کچھ لوگ اندر آکر اسے مار بھی سکتے تھے۔

اور دروازے پر دستک ہی ہورہی تھی۔

رئیس اچھل پڑا۔ اس دستک کا اندازہ اگرچہ جارحانہ نہیں تھا۔ یہ پولیس والوں کی دستک تو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ دبے قدموں دروازے کے پاس آگیا۔

ایک بار پھر دستک ہوئی۔ اور اس بار کسی نے آواز دی۔ ''اس آواز کو سن کر رئیس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ آواز تاج کی تھی۔ اسی تاج کی جسے وہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

☆☆☆

رئیس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔

تاج اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ رئیس نے پھرتی سے دروازہ بند کرلیا تھا۔

''تم... تم یہاں کیسے آگئے؟'' تاج نے حیرت سے پوچھا۔

''دھوکے باز، ظالم اور بے رحم انسان۔ میں تجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، کسی کو نہیں معلوم کہ...''

''ہاں بتا، کیا نہیں معلوم۔''

''تمہیں کیوں بتاؤں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

رئیس نے اس کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ تاج بھی کمزور نہیں تھا۔ ان دونوں کی زندگی کا سوال تھا اسی لیے دونوں بے آواز لڑ رہے تھے۔

تاج نے گھونسے مار مار کر رئیس کے جبڑے توڑ دیے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔ اس نے خود کو گرنے سے بچانے

کے لیے دیوار کا سہارا لے لیا لیکن تاج کے ایک اور گھونسے نے اسے فرش پر گرا دیا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح مہوش جب فلیٹ میں داخل ہوئی تو کمرے میں لاش دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

''مہوش!'' ایک طرف سے تاج کی آواز آئی۔ ''جاؤ ڈیڈ کو فون کر کے بتادو کہ میرے ہاتھ سے ایک اور خون ہو گیا ہے۔ میں نے رئیس کو مار ڈالا ہے۔''

''تاج تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔'' مہوش نے کہا۔ ''اس بے چارے نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے تھے۔''

''تو اس کا یہ مطلب تو نہیں نا کہ میں خود کو اس کے حوالے کر دیتا، پھر ڈیڈ بھی تو یہی چاہتے تھے۔''

''ہاں ڈیڈ تو یہی چاہتے تھے لیکن میں نہیں چاہتی تھی۔'' مہوش دھیرے سے بولی۔

''اوہ، اب سمجھا۔ شاید اسی لیے تم اسے ڈیڈ کے چنگل سے چھڑا کر یہاں لائی تھیں۔''

''ہاں، اسی لیے لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اپارٹمنٹ تمہاری نگاہوں میں ہوگا۔ تم یہاں بھی آجاؤ گے۔''

تاج مہوش کے پاس آگیا تھا۔ ''مہوش! تمہاری ائرہوسٹس دوست میری بھی دوست رہی ہے۔ اور یہ بات تمہیں نہیں معلوم تھی۔''

''ہاں، میں نہیں جانتی تھی۔ ورنہ میں اسے کبھی یہاں نہیں لاتی۔''

''چلو، جو ہونا تھا۔ اب ڈیڈ کو فون کر کے بتادو کہ ان کے مجرم کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔''

''ہاں، وہ تو کرنا ہی ہوگا۔ ویسے مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔''

''بے وقوف لوگوں کی زندگی اور موت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔'' تاج نے تلخی سے کہا۔ ''اس کو اسی طرح مرنا تھا بلکہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا تھا۔ بالآخر وہی مرا ہے جس کی اس دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی۔''

مہوش نے رستم علی کو فون کر دیا۔

رستم علی ذرا سی دیر میں اکیلا ہی پہنچا تھا۔ ''تاج! تم نے یہ کانٹا بھی اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اب فوراً مہوش کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنے محکمے کو فون کر رہا ہوں۔ اور ہاں، تم اس وقت تک سامنے نہیں آؤ گے۔ جب تک میں نہ کہوں۔''

''یس ڈیڈ۔''

''اور یاد رکھو، آج سے تاج مر چکا ہے۔ یہ اس کی لاش ہے۔ اور تم رئیس ہو اور کچھ دنوں کے بعد مہوش سے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔''

''یس ڈیڈ!'' تاج نے کہا۔ ''میں یہ سب جانتا ہوں۔''

''مہوش! تم تاج کے ساتھ چلی جاؤ۔'' رستم علی نے کہا۔ ''تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''نو ڈیڈ۔'' مہوش نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ''میں اب اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ مجرمانہ ذہنیت کا ایک بدکردار شخص ہے۔'' مہوش نے کہا۔ ''یہ ایک قاتل ہے اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور اب اس نے ایک اور بے گناہ کا خون کر دیا ہے۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو؟'' رستم علی غصے سے بولا۔ ''اس مرحلے پر تمہارا یہ سب کہنا فضول ہے۔ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ۔''

''ہو سکتا ہے کبھی بھول جاؤں لیکن ابھی نہیں۔ میں ابھی اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔''

''تم گھر چلی جاؤ۔ تم سے بعد میں بات ہوگی۔''

تاج وہیں کھڑا رہ گیا۔ ''میں کیا کروں ڈیڈ؟''

''کچھ بھی نہیں۔ تم وہیں جاؤ جہاں تم کو رکھا گیا ہے۔ مہوش کی فکر نہ کرو۔ وہ اس وقت غصے میں ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔''

''یس ڈیڈ۔'' تاج کمرے سے باہر چلا گیا۔

رستم علی نے اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد اپنے محکمے کو فون کر کے بتا دیا۔ ''آپ لوگ آجائیں، میں نے تاج کی لاش دریافت کر لی ہے۔''

☆☆☆

مہوش اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

تاج اس کا شوہر تھا۔ کسی زمانے میں اس کی محبت ہی تھا لیکن شادی کے بعد اس کے کرتوت سامنے آنے لگے تھے۔ اس نے مہوش کے باپ رستم علی کو نہ جانے کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ وہ اس سے چشم پوشی کرتا رہتا تھا۔ اور الٹا مہوش سے کہا کرتا۔ ''تم ہر وقت تاج کو ٹوکتی مت رہا کرو۔ اس طرح اس کے مزاج میں ضد شامل ہوتی جا رہی ہے۔''

''لیکن ڈیڈ وہ تو مجرمانہ راہوں پر چل نکلا ہے۔''

''آج کل کے نوجوان ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' رستم علی کہا کرتا۔ ''کچھ دنوں کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

لیکن تاج کی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں۔اس نے کاروبار کے حوالے سے بڑے بڑے فراڈ کیے۔ بالآخر ایک سیاست داں کا مرڈر کر بیٹھا۔

یہ قتل کروڑوں کے چکر میں ہوا تھا۔ مہوش کو معلوم تھا کہ اس مرڈر میں تاج کے ساتھ ساتھ در پردہ رستم علی بھی ملوث ہے۔

دونوں سسر اور داماد نے اس بھیانک جرم کو چھپانے کی سازش تیار کرلی۔

رئیس ان کی نگاہوں میں بہت پہلے آچکا تھا۔ تاج کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ رئیس بالکل اسی کی طرح کا ہے۔ وہی قدوقامت، وہی انداز۔ وہی آواز سب کچھ وہی۔

رستم علی کے کہنے پر تاج نے رئیس کی نگرانی کرنی شروع کردی۔ وہ خود اس کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اور ایک دن اس نے ساحل پر رئیس سے ملاقات کرلی۔

اس کے بعد رئیس کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسے تاج بنا دیا گیا اور تاج خود رئیس بن گیا۔

مہوش شروع ہی سے اس سازش کے خلاف تھی۔ بظاہر وہ اپنے باپ اور شوہر کا ساتھ دے رہی تھی۔ لیکن اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہورہا تھا۔

پھر جب رئیس، تاج بن کر اس کے ساتھ رہنے کے لیے آگیا تھا تو اسے رئیس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ یہ بے وقوف قربانی کا بکرا بننے جارہا تھا۔

اس کے بعد حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے کہ مہوش کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اب تاج نے رئیس کو مار دیا تھا۔

اس بے چارے کی کہانی ختم ہوگئی تھی۔

دوسرے دن کے اخبارات نے خبر لگائی تھی۔ ''پولیس آفیسر رستم علی کا داماد تاج اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

مہوش نے بھی یہ خبر پڑھ لی تھی۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ کاش وہ کسی کو بتا سکتی کہ لوگ جسے تاج کی لاش سمجھ رہے ہیں وہ تاج نہیں، رئیس نام کا ایک نوجوان ہے جو اپنے مستقبل کی تلاش میں نکلا تھا۔

وہ خودکشی کرنے نکلا تھا لیکن قتل والی موت اس کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔

کیا زبردست ڈراما تھا۔ اپنی عدت گزارنے کے بعد اس کی ملاقات رئیس سے ہونے والی تھی۔ اور رئیس کی صورت میں اسے اپنا مرحوم شوہر یاد آجاتا۔

دونوں کے درمیان ملاقاتیں ہوتیں۔ اور باپ اپنی غم زدہ بیٹی کی شادی کروا دیتا۔ اس طرح تاج، رئیس کی شکل میں مسٹر کلیئر ہو کر دنیا کے سامنے آجاتا اور کسی کو شک بھی نہیں ہو پاتا کہ یہ کون ہے۔

داماد کو بچانے کے لیے اس کے باپ نے یہ کیسا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے سازشی ذہن نے کس طرح کام کیا تھا۔ کیا خود مہوش بھی اس سازش کا حصہ بن سکتی تھی؟

اسے احساس ہورہا تھا کہ شاید وہ ایسا نہیں کرسکے گی۔ کسی بے گناہ کی لاش پر کھڑے ہو کر وہ اپنا مستقبل محفوظ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اسے اب تاج سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کی مکار اور مجرمانہ مسکراہٹ تک اس کی برداشت سے باہر تھی۔

یہ طے پایا تھا کہ تین چار مہینوں تک تاج اور مہوش ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ مہوش اپنے گھر میں اپنی عدت کے دن گزارے گی جبکہ تاج اسی محلے اور اسی مکان میں چلا جائے گا جہاں کبھی بے چارہ رئیس رہا کرتا تھا۔

اس کا دل بہت بوجھل ہورہا تھا۔

یہ کیسی قدریں تھیں۔ کیا انسان کے لیے دولت ہی سب کچھ ہوگئی تھی۔ کوئی انسانیت نہیں۔ کوئی خدا کا خوف نہیں۔

اس وقت وہ اپنے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ جب گھنٹی کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف تاج تھا۔ ''مہوش! میں تاج بول رہا ہوں۔''

''ہاں، میں نے آواز پہچان لی ہے تمہاری۔'' مہوش نے کہا۔

''مہوش! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اور یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''لیکن میں نہیں مل سکتی۔ کیونکہ تمہاری موت کے بعد میں تمہاری عدت گزار رہی ہوں۔''

''اوہو، رہنے دو اس ڈرامے کو۔'' تاج نے کہا۔ ''تم بس کچھ دیر کے لیے آجاؤ۔''

''کہاں آجاؤں؟'' مہوش نے پوچھا۔

''کسی ایسی جگہ جہاں کوئی جاننے والا ہمیں دیکھ نہ سکے اور جہاں میں تم سے باتیں کرسکوں۔''

''تاج! نہ جانے کیوں میرا دل دل نہیں چاہ رہا۔ دو چار مہینوں کے بعد تم سے دوبارہ شادی تو ہونی ہے پھر اتنی جلدی کیا ہے؟''

''جلدی ہے۔ کیونکہ میں جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں۔ وہ بہت اہم ہے۔'' تاج نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے، میں آرہی ہوں۔''

لیکن اپنے آپ کو چادر میں چھپا کر آنا۔'' تاج نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور کہانی بن جائے۔''

☆☆☆

تاج اور مہوش ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

مہوش بیزاری محسوس کررہی تھی۔ اگر تاج اتنا زور نہیں دیتا تو وہ کبھی نہیں آتی۔ ''ہاں بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مہوش! میں تمہیں اپنے اور رئیس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''میں یہ کہانی کئی بار سن چکی ہوں۔'' مہوش نے کہا۔ ''تم کوئی اور بات کرو۔''

''لیکن یہ بالکل نئی کہانی ہے۔ تم نے پہلے نہیں سنی ہو گی۔''

''چلو بتاؤ، کیا کہانی ہے؟''

''یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب میں تمہاری ائرہوسٹس دوست کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔'' تاج نے بتایا۔ ''اب تم یہ بھول جاؤ کہ مجھے اس کے اپارٹمنٹ کا پتا کیسے معلوم۔ اور میری اس سے جان پہچان کس طرح ہوئی۔''

''چلو، میں تم سے یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔'' مہوش نے کہا۔ ''تم آگے بتاؤ۔''

''پھر یہ ہوا کہ رئیس نے پوری قوت کے ساتھ مجھ پر حملہ کردیا۔ اس شخص نے اپنا انتقام لینے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردی تھی۔ وہ جنونی ہورہا تھا۔ شروع میں وہ مجھ پر حاوی ہوگیا۔ کیونکہ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا لیکن اس کے دو چار گھونسوں کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہمارے درمیان خونریز جنگ ہونے لگی۔ اسی دوران وہ پوری قوت کے ساتھ دیوار سے جا کر ٹکرا گیا۔ اور...''

''بس بس، آگے مت سناؤ۔'' مہوش نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ''میں تصور ہی نہیں کرسکتی۔ پھر جو کچھ ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔''

''نہیں، یہی تو وہ بات ہے جو میں نے تمہیں بتانے کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' تاج نے کہا۔ ''اس کے دیوار سے ٹکرا کر گرنے کے بعد کی کہانی کسی کو نہیں معلوم... اور وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔''

''چلو، وہ بھی سنا دو۔''

''اس کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ رئیس صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اور جب میں یعنی تاج اس کے پاس اسے دیکھنے کے لیے پہنچا تو اس نے پوری طاقت سے تاج پر حملہ کردیا اور تاج کو مار دیا۔''

''کیا مطلب؟'' مہوش چونک پڑی۔ ''تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مرنے والا رئیس نہیں بلکہ تاج تھا۔ اور جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوا تمہیں یہ کہانی سنا رہا ہے۔ وہ تاج نہیں رئیس ہے۔''

''نہیں، یہ ناممکن ہے۔ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔''

''مہوش! میں نے تم پر مکمل بھروسا کرتے ہوئے تمہیں اتنا بڑا راز بتا دیا ہے۔ میں اگر چاہتا تو تاج بن کر تمہارے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔''

مہوش ایک سکتے اور خواب کی سی کیفیت میں یہ سب سن رہی تھی۔ سامنے بیٹھا ہوا شخص جو کچھ بھی بتا رہا تھا وہ اگر سچ تھا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ تاج اپنی سزا کے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

''کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟'' رئیس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں، تم جو کچھ بتا رہے ہو' وہ بہت حیرت انگیز ہے۔''

''یہ سچ ہے مہوش! میں تاج نہیں۔ رئیس ہوں اور اس کا ثبوت ہے میرے پاس۔''

''اور وہ ثبوت کیا ہے؟''

''میری پشت پر چوٹ کا نشان۔'' رئیس نے بتایا۔ ''جو تم نے تاج کی پشت پر نہیں دیکھا ہوگا۔''

''نہیں۔''

''تو پھر یہ مان لو کہ میں رئیس ہوں۔ اب میں نے اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اگر چاہو تو...''

''نہیں۔'' مہوش نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہ سکتی کہ عدت گزارنے کے بعد مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔''

''اور یہ شادی حقیقی ہوگی۔'' رئیس مسکرا دیا۔ ''کیونکہ تمہاری دوبارہ شادی اسی شوہر سے نہیں بلکہ ایک نئے آدمی سے ہورہی ہے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' مہوش نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور الجھی ہوئی زندگی ایک بار پھر واضح اور روشن ہوتی چلی گئی۔

سرورق کی دوسری کہانی

وطن فروش

کسی بھی مقصد کو پانے کے لیے ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے... تبھی منزل مقصود تک رسائی ممکن ترہوتی ہے... ایک ایسے ہی نوجوان کی داستان جسے ہر جگہ نظرانداز کیا جاتا تھا... ہر شخص اس کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کر اسے کسی قابل نہیں گردانتا تھا... مایوسی اور یاسیت کے اندھیروں میں ڈوبے ایک لاچار کی بے بسی و بے کسی...

ایک وطن فروش کے دلیرانہ اقدام

ماہِ آزادی کے موقع پر خصوصی کہانی

میں بن سنور کر ماریہ کے سامنے پہنچا تو اس نے حیرت سے سرتاپا میرا جائزہ لیا پھر کھلکھلا کرہنس پڑی۔

اپنی من موہنی صورت کی طرح اس کی ہنسی بھی بہت خوب صورت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے جلترنگ بج رہے ہوں۔ ہنستے ہوئے اس کے خوب صورت اور ہموار دانت موتیوں کی طرح جھلملاتے تھے۔ اس کا سرخ وسفید چہرہ مزید سرخ ہو جاتا تھا اور گالوں میں ڈمپل پڑ جاتے تھے۔

میں نے اس کی ہنسی کا قطعی بُرا نہیں مانا اور اسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ ہنس چکی تو میں نے پوچھا۔ ”عزیزہ! آپ اتنے توبہ شکن انداز میں کس بات پر ہنس رہی تھیں؟“

اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور ایک مرتبہ پھر ہنسنے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ”یہ تم جوکر بن کر کہاں جارہے ہو؟“

”جوکر!“ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں اس قسم کے خطابات کا عادی تھا اس لیے اس کا طنز بھی برداشت کرلیا اور بولا۔ ”میں تمہیں جوکر لگ رہا ہوں؟“ میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا۔

”ارے، میں تو مذاق کر رہی تھی، تم تو اس مذاق کو دل پر لے گئے۔“ ماریہ جلدی سے بولی۔ ”تم تو بالکل ہیرو لگتے ہو ہیرو!“

اس نے مذاق پہلے نہیں کیا تھا لیکن اب کر رہی تھی۔ میں خود بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کیا ہوں۔ چار فٹ تین انچ قد اور ایک سوتیس پاؤنڈ وزن پر کوئی آدمی کچھ بھی لگ سکتا تھا لیکن ہیرو نہیں لگ سکتا تھا۔

”لیکن تم اتنے بن ٹھن کر جا کہاں رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ڈیٹ پر جارہا ہوں۔“ میں نے کالر سے فرضی گرد جھاڑی۔

”ڈیٹ پر؟“ وہ چونکی۔ ”کیا خدانخواستہ کوئی مقدمہ چل رہا ہے تم پر؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تو پھر جلدی جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عدالت کے باہر تمہارے نام کی پکار پڑے اور تم غیر حاضر ہو۔“

وہ کبھی سنجیدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ میں تو برانڈڈ جینز، جیکٹ اور لانگ شوز اس کے لیے پہن کر آیا تھا اور وہ مجھے کورٹ جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور واپسی کے لیے مڑا تو وہ بولی۔ ”سنو، واپسی میں دیسی گھی والے مرغ چھولے لیتے آنا۔ کورٹ کے باہر ہی تو ملتے ہیں نا؟“

”میں سٹی کورٹ نہیں بلکہ سپریم کورٹ جارہا ہوں۔“ میں نے جل کر کہا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔

میں بچپن ہی سے ایسا منحنی تھا۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور چھوٹی ایک بہن تھی۔ وہ دونوں اماں اور ابا کی طرح خوب صورت اور دراز قد تھے۔ بھائی نے میرے مختلف نام رکھے ہوئے تھے جیسے سوکھا چھوارا، ٹھٹھرایا ہوا چنا، ٹنگو وغیرہ۔

مجھے پہلے تو ان کے اس تحقیر آمیز انداز پر بہت دکھ ہوتا تھا لیکن پھر میں آہستہ آہستہ اس کا عادی ہوگیا۔ ہاں، اللہ نے مجھے ایک خوبی سے دل بھر کے نوازا تھا اور وہ تھی ذہانت۔ میں ان لوگوں سے جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن ذہنی طور پر وہ لوگ میرے سامنے بونے تھے۔ میں اپنے اس ذہن کا فائدہ اٹھا کر زاہد بھائی کو ابا کے ہاتھوں پٹوا دیا کرتا تھا۔ سارہ مجھ سے چھوٹی تھی۔ بچپن میں تو اس سے بھی خوب لڑائی رہتی تھی لیکن اب اس نے لڑنا چھوڑ دیا تھا اور مجھ سے دوستی کرلی تھی۔

اسکول میں پہنچا تو وہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ طاقتور لڑکے مجھے ذرا سی بات پر پیٹ کر رکھ دیتے تھے۔ میں خاموشی سے مار کھاتا رہتا اور ہر تھپڑ اور گھونسے پر ان کے لیے نئی سزا تجویز کرتا رہتا۔ پھر میں انہیں ایسی صورتِ حال میں پھنسا دیتا کہ ان کی دگنی پٹائی ہوجاتی۔

اسکول کے اساتذہ البتہ مجھ سے بہت خوش تھے۔ میں ہر کلاس میں پوزیشن لیتا تھا۔ میٹرک میں جب میں نے پورے کراچی بورڈ میں پہلی پوزیشن لی تو سب کے منہ بند ہوگئے۔ اخبار میں میری تصویر چھپی تو پورے محلے میں میری دھاک بیٹھ گئی۔ ابا کی نظروں میں بھی مجھے اب وہ تحقیر نظر نہیں آتی تھی۔

دوسال پہلے زاہد بھائی نے میٹرک بہت مشکل سے ڈی گریڈ میں پاس کیا تھا۔ ابا انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر تو دور کی بات ہے، ان میں تو کمپاؤنڈر بننے کی اہلیت بھی نہیں تھی۔ سارہ اس وقت آٹھویں کلاس میں تھی اور اب چونکہ وہ میری سرپرستی میں تھی اس لیے اس نے بھی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ اب میں جتنی دیر گھر میں رہتا، سارہ میرے ساتھ رہتی۔

ماریہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کے والد عبدالقدوس بوہری بازار میں برتنوں کی ایک دکان کے مالک تھے۔ محلے کے سب بچے انہیں چچا قدوس کہتے تھے۔ ماریہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے وہ کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔

وہ سارہ کی ہم عمر تھی۔ ہم لوگوں کا بچپن ایک ساتھ کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے گزرا تھا۔ وہ بھی آٹھویں کلاس میں تھی لیکن سالانہ امتحان میں فیل ہوگئی تھی۔ فیل ہونے پر وہ بہت دیر تک روتی رہی، اس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا۔ پھر جب تک چچا قدوس نے اسے پیزا ہٹ کا پیزا منگوا کر نہیں دیا، اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔

پیزا اور آئس کریم کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر آگئی۔

میں نے کہا۔ ”ماریہ! مجھے بہت افسوس ہوا کہ ....“

”تم تو بات بھی مت کرو۔“ ماریہ نے میری بات کاٹ دی۔ ”تمہاری تو شکل مجھے زہر لگ رہی ہے۔“

”ویسے تو میری شکل واقعی زہر لگتی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”لیکن اس وقت کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں۔“ ماریہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ”تم نے اپنی

بہن کو تو خوب پڑھایا، اتنا پڑھایا کہ اس نے پوزیشن لے لی لیکن تم نے مجھ سے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ ماریہ.... تم بھی مجھ سے پڑھ لیا کرو۔"

"میں نے تو دبے لفظوں میں کئی دفعہ کہا لیکن تمہیں تو... ٹی وی کے ڈراموں اور فیس بک سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"تو تم نے دبے لفظوں میں کیوں کہا؟" ماریہ چمک کر بولی۔ "صاف صاف کہتے۔"

چلو، اب میں تم سے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ کل سے تم بھی پڑھنے آجاؤ۔"

اسی وقت سارہ وہاں آگئی اور مجھ سے بولی۔ "شاہد بھائی! آپ میری دوست کو کیوں پریشان کررہے ہیں؟"

"پریشان کررہا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ابھی تو میں نے انہیں پڑھانا بھی شروع نہیں کیا ہے۔"

"پڑھانا؟" سارہ نے حیران ہو کر کہا۔ "ماریہ! پڑھاتے وقت شاہد بھائی بہت سختی کرتے ہیں۔ تم وہ سختیاں برداشت کرلوگی؟"

"کرنا ہی پڑیں گی ورنہ اگلے سال پھر فیل ہوجاؤں گی۔ تم نے وہ شعر نہیں سنا کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے۔"

یوں وہ گل وگلزار ہونے کے لیے مجھ سے پڑھنے لگی۔

اب میں فرسٹ ایئر میں تھا اور حسبِ معمول خوب دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں سارہ اور ماریہ کو پڑھا بھی رہا تھا۔

کالج میں میرے لیے مزید پریشانی تھی۔ اسکول میں تو پھر بھی کچھ روک تھام ہوتی ہے، کالج میں لڑکے اور لڑکیاں سبھی بے لگام ہوجاتے ہیں۔ لڑکے مجھ پر پھبتیاں کستے تو لڑکیاں بھی مسکرانے لگتیں۔ میں کلاس روم کے بعد لائبریری میں وقت گزارنے لگا۔

اسکول کی بات اور تھی۔ وہاں تو میں نے اپنی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کے بل بوتے پر اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ تمام اساتذہ بھی مجھ سے خوش تھے اور لڑکے بھی اب میرا مضحکہ نہیں اڑاتے تھے۔ البتہ میرے خطابات سوکھا چھوارا اور ٹنگو نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

مجھے اپنی پوزیشن کی بنیاد پر کراچی کے بہترین کالج میں داخلہ مل گیا۔ بھائی جان نے سنا تو پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مبارک باد دی۔

مجھ سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ میں مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میں بہت فخر سے کہتا تھا کہ میں پاکستان آرمی میں جاؤں گا۔

میری اس بات پر کچھ لوگ تو منہ دبا کر ہنستے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو انتہائی صفائی سے کہا کرتے کہ پاکستان پر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ وہ بونوں کی فوج بھرتی کرلے۔

میں کبھی ایسی باتوں سے ناامید نہیں ہوا۔

کالج کا پہلا دن مجھ پر بہت گراں گزرا۔ وہ ایک مخلوط تعلیمی ادارہ تھا اس لیے وہاں لڑکیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ان میں سے کچھ حسینائیں تو ایسی تھیں جنہیں دیکھو تو نظر ہٹنے کا نام نہ لے۔

کالج کا تقریباً ہر لڑکا کسی نہ کسی لڑکی پر فریفتہ تھا۔

مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ مجھ سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ تو مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔

میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ خالی پیریڈز میں لائبریری میں وقت گزارنے لگا۔

اس پر بھی لڑکوں نے مجھے کئی خطابات سے نوازا۔

کلاس میں بھی مجھے کوئی آگے والی بینچوں پر نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ میں کبھی کبھی اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتا تھا کہ اگر تو میرے قد میں مزید اضافہ کردیتا، میرے وزن میں پچاس ساٹھ پاؤنڈز بڑھا دیتا اور میری گہری سانولی رنگت کو سرخ وسفید نہ سہی، کھلتی ہوئی گندمی ہی کردیتا تو تیرے خزانے میں کیا کمی واقع ہوجاتی؟

کالج میں اسکول والی وہ سختی تو نہیں تھی لیکن ہر لیکچرار اپنا پیریڈ ضرور لیتا تھا۔

ایک دن میتھس کے پیریڈ میں پروفیسر شہاب نے ہم سب کو الجبرا کا ایک سوال دیا۔ اس وقت کلاس کا ذہین ترین اور مقبول طالبِ علم شہزاد طالبِ علموں اور اساتذہ میں ہر دلعزیز تھا۔

چند منٹ بعد پروفیسر شہاب نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے سوال حل کرلیا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ الجبرا کا وہ سوال فوری طور پر میرے پلے بھی نہیں پڑا تھا لیکن میرے ذہن میں اس کا فارمولا تھا جو ذہن پر زور دینے کے بعد بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

کلاس میں کوئی طالبِ علم ایسا نہیں تھا جسے وہ سوال آتا ہو۔ شہزاد بھی منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ "سر! آپ ہی یہ سوال حل کر کے بتادیں۔"

پروفیسر صاحب بلیک بورڈ کی طرف مڑے اور سوال

حل کرنا شروع کردیا۔ وہ بار بار بورڈ پر لکھتے رہے اور ڈسٹر سے مٹاتے رہے۔ ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

اس سوال کا جواب تھا "1"۔

کئی دفعہ بورڈ پر لکھنے اور مٹانے کے بعد انہوں نے کسی نہ کسی طرح ایک بٹا تیس نکال لیا۔

اسی دوران میں میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے اس سوال کا فارمولا یاد آگیا۔ میں نے فوراً اپنی کاپی پر وہ سوال حل کیا جو محض پانچ اسٹیپس میں تھا۔

پروفیسر صاحب نے رومال سے اپنی پیشانی کا پسینا پونچھا اور بولے۔ "1 بٹا تیس ضرب تیس، برابر ہے 1 کے۔ یہی اس سوال کا جواب ہے۔"

"سر! یہ تیس کہاں سے آیا؟" میں نے پوچھا۔

پروفیسر صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا، پھر بولے۔ "کس احمق نے تمہیں میٹرک میں پاس کردیا۔ بے وقوف یہ فارمولا ہے۔"

"نو سر!" میں نے کہا۔ "ایسا کوئی فارمولا نہیں ہے۔"

"تو پھر تم اس فارمولے کے بغیر یہ سوال حل کر کے دکھاؤ۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پوری کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔

میں اس سوال کو ابھی فوراً حل کرسکتا تھا لیکن میں نے پوری کلاس کے سامنے ان کی سبکی ہونے کے خیال سے کہا۔ "سر! اس وقت تو مجھے یاد نہیں آرہا ہے، میں کل آپ کو بتاؤں گا۔"

اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا اور شہزاد نے کہا۔ "کل تو کبھی آتی ہی نہیں ہے چھوارے۔"

کوئی اور بولا۔ "کل کرے سو آج کر، آج کرے سو اب۔" وہ واجد تھا۔ ہندی فلموں کا رسیا۔ اس نے یہ محاورہ بھی شاید ہندی فلموں ہی سے سیکھا تھا۔

لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ کلاس میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا تھا۔

"خاموش!" اچانک پروفیسر شہاب نے ڈپٹ کر کہا۔ ساری کلاس کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ وہ خاصے دبنگ پروفیسر تھے اور ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔

پیریڈ ختم ہوا تو پوری کلاس نے مجھے مذاق کا نشانہ بنا لیا۔ کوئی مجھے افلاطون کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ اور۔

میں خاموشی سے نکلا اور ٹہلتا ہوا لان کی طرف چلا گیا۔

پھر میں پروفیسر شہاب کے روم کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ طالبِ علموں سے بغیر کسی وجہ کے نہیں ملتے۔ عموماً وہ خود ہی کسی لڑکے یا لڑکی کو اپنے کمرے میں بلایا کرتے تھے۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ان کی رعب دار آواز سنائی دی۔ "یس کم ان۔"

میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بپھر گئے اور بولے۔ "تم ..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ ڈپٹ کر بولے۔ "تم بہت بڑے ماہر ریاضی دان ہو؟ تم نے ساری کلاس کے سامنے مجھے بے عزت کردیا۔"

"سر! معذرت چاہتا ہوں۔ آپ پہلے میری پوری بات سن لیں۔"

"بولو۔" وہ درشت لہجے میں بولے۔ "میرے پاس زیادہ فضول وقت نہیں ہے۔"

"سر! وہ سوال مجھے آتا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے فارمولا بھی یاد تھا اور میں نے اسے حل بھی کرلیا تھا لیکن ....."

"لیکن کیا؟" اس مرتبہ ان کے لہجے میں وہ سختی نہیں تھی۔

"میں نے اس خیال سے وہ سوال بورڈ پر حل نہیں کیا کہ پھر پوری کلاس کے سامنے آپ کی سبکی ہوتی۔ آپ میرے استاد ہیں، مجھ سے بہت زیادہ جانتے ہیں لیکن بعض اوقات ماہر ترین انسان کو بھی سامنے کی بات نظر نہیں آتی۔" یہ کہہ کر میں نے وہ کاپی ان کی طرف بڑھا دی جس پر میں نے سوال حل کیا تھا۔ "سر! یہ ہے وہ سوال۔"

انہوں نے ایک نظر کاپی پر ڈالی پھر مجھے دیکھا۔ دوبارہ غور سے کاپی کو دیکھا اور نرم لہجے میں بولے۔ "مجھے افسوس ہے بیٹا! میں نے پوری کلاس کے سامنے تمہاری بے عزتی کی، تحقیر کی۔ مجھے معاف کردو۔"

"ارے سر! یہ کیا کررہے ہیں آپ؟" میں نے جلدی سے کہا۔ "استاد کی ڈانٹ ڈپٹ سے شاگرد کی بے عزتی نہیں ہوتی۔"

"تمہارا بہت شکریہ بیٹا!" انہوں نے ممنونیت سے کہا۔ "تم نے میری عزت رکھ کر مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"سر پلیز!" میں نے جلدی سے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کریں۔" میں نے جانے کے ارادے سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"ایک منٹ بیٹا!" انہوں نے مجھے روک لیا۔ "میں بھی کیسا استاد ہوں کہ مجھے تمہارا نام تک معلوم نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

''سر! میرا نام شاہد ہے اور...''

''شاہد!'' وہ چونک کر بولے۔ ''تم وہ شاہد ہو جس نے میٹرک میں پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن لی ہے؟''

''جی سر!'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''دیکھو، آئندہ کوئی بھی مسئلہ ہو، بلا جھجک میرے پاس چلے آنا۔''

''جی سر!'' میں نے سر جھکا کر کہا اور ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

دوسرے دن جب پروفیسر صاحب کلاس میں آئے تو ان کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ حسبِ معمول سنجیدگی سے پڑھانے میں مصروف ہوگئے۔

اس دوران میں شہزاد نے کہا۔ ''سر! وہ کل والا سوال.... وہ....''

''وہ اصل میں میری ہی غلطی تھی۔ میں غلط فارمولا اپلائی کر رہا تھا۔''

انہوں نے بلیک بورڈ پر وہی سوال حل کر دیا اور بولے۔ ''یہ سوال اس طرح حل ہوگا۔ شاہد نے ٹھیک کہا تھا کہ فارمولا غلط ہے۔''

پھر انگلش، اردو، فزکس ہر ٹیچر میری صلاحیتوں کا لوہا مان گیا۔

کلاس کے کچھ لڑکے اب مجھ سے نوٹس وغیرہ لینے لگے۔

ایک دن میں لائبریری سے نکل رہا تھا کہ پیچھے سے مجھے کسی نے آواز دی۔ ''سنیے۔''

میں چونک کر مڑا۔ وہ نمرہ تھی۔ کلاس کی انتہائی حسین اور مغرور لڑکی۔ میں اس کے طرزِ مخاطب پر حیران رہ گیا۔ وہ تو کسی سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں تھی۔

''جی فرمایئے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟'' اس نے پوچھا۔

آس پاس سے گزرنے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''وقت بھی نکال لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ فرمائیں؟''

''ذرا میرے ساتھ آیئے۔'' اس نے کہا۔

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میں اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

اچانک کسی نے پھبتی کسی۔ ''پہلوئے حور میں لنگور!''

میں تو اس قسم کے جملوں کا عادی تھا، نمرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ مجھے کالج لان کے ایک الگ تھلگ گوشے میں لے گئی اور بولی۔ ''شاہد صاحب! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''آپ تو خود اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہیں، میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ بس آپ روزانہ کچھ وقت نکال کر مجھے انگلش پڑھا دیا کریں۔''

''آپ تو انگلش میڈیم اسکول سے پڑھ کر آئی ہیں۔ آپ....''

''میں انگلش میڈیم سے پڑھ کر ضرور آئی ہوں لیکن انگلش پوئٹری میرے پلے نہیں پڑتی۔''

''حیرت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے میں روزانہ تو نہیں، ہاں جب بھی وقت ملا، انگریزی شاعری پڑھانے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ شاہد صاحب۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کی طرح حسین تھی لیکن اس میں وہ بات نہیں تھی جو ماریہ کی مسکراہٹ میں تھی۔ اس دن پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں ماریہ کو پسند کرنے لگا ہوں۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کون سا وقت ہو جب میں آپ کو پڑھا سکوں۔ بہرحال، میں وقت نکال لوں گا۔''

اسی وقت پیریڈ ختم ہونے کا گھنٹا بجا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کلاس کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے شہزاد اچانک میرے سامنے آگیا۔ وہ قہر آلود نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں اس وقت اس کے سامنے بالکل بچہ لگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے شہزاد! تم نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟''

''تُو اس نمرہ سے کیا باتیں کر رہا تھا چوہے کی اولاد؟''

''باتیں میں نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ کر رہی تھی۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''دیکھ چھوارے!'' اس نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''آئندہ اگر تُو اس کے آس پاس بھی نظر آیا تو تیری ساری افلاطونیت ناک کے رستے بہا دوں گا۔''

''یہی بات اگر تم نمرہ سے کہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

جواب میں اس نے میرے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ ''مجھ سے زیادہ بک بک مت کر۔ تجھ سے جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔''

اس کے تھپڑ سے میرے بائیں گال میں گویا انگارے سے بھر گئے تھے۔ میرے کان میں بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ مار مار کے شہزاد کا حلیہ بگاڑ دوں لیکن دل چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اس پر ہاتھ اٹھاتا تو وہ شاید میری ہڈی پسلی ہی ایک کر دیتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ ''میری بات یاد رکھنا، اگر اب میں نے تجھے نمرہ کے نزدیک بھی دیکھا تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تو کم از کم تین مہینے تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔'' اس نے میرا گریبان چھوڑتے ہوئے مجھے زوردار جھٹکا دیا تو میں الٹ کر پیچھے جا گرا۔ گرنے سے چوٹیں تو آئی ہی تھیں لیکن اس سے بڑھ کر توہین کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کیونکہ اس دوران میں کالج کے کئی لڑکے اور لڑکیاں وہاں اکٹھے ہوگئے تھے لیکن ان میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ بیچ بچاؤ بھی کرا دیتے۔

میں نے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑے، کتابیں سمیٹیں اور کلاس روم کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسرے دن میں نمرہ سے کٹا کٹا رہا، وہ نظر بھی آئی تو میں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ میں اس دن لائبریری میں بھی نہیں بیٹھا کیونکہ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی لائبریری تک بھی آ سکتی تھی۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل یہی سوچتا رہا کہ میں شہزاد سے اپنی اس توہین کا بدلہ کیسے لوں؟

تیسرے دن نمرہ نے اچانک مجھے ایک جگہ گھیر لیا اور بولی۔ ''شاہد صاحب! آپ کیا آج کل بہت زیادہ مصروف ہیں یا اپنا وعدہ بھول گئے ہیں؟''

''مصروف تو میں ضرور ہوں لیکن اپنا وعدہ نہیں بھولا ہوں۔'' میں نے کہا اور اردگرد دیکھنے لگا کہ شہزاد یا اس کا کوئی چمچہ تو آس پاس موجود نہیں ہے۔

''پھر آپ مجھے کب پڑھائیں گے؟''

''نمرہ! کالج میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ کے والدین کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے گھر آ کر آپ کو پڑھا دیا کروں؟''

''ارے، اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اس نے ایک کاغذ پر اپنے گھر کا پتا لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں آج شام چھ بجے آپ کے گھر آؤں گا۔''

میں وہاں سے کلاس میں چلا گیا۔ وہ آخری کلاس تھی۔ میں کالج کے پلے گراؤنڈ سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شہزاد اور اس کے دو چمچوں نے مجھے ایک مرتبہ پھر گھیر لیا۔ اس دفعہ ان کے عزائم خطرناک تھے۔

شہزاد نے بپھر کر کہا۔ ''میں نے اس دن تجھے آرام سے سمجھایا تھا تو بات تیری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟''

''اگر تم یا تمہارا کوئی دوست دیکھ ہی رہا تھا تو اس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ میں خود نمرہ کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ وہ میرے پاس آئی تھی۔''

''تو بہت بڑا یوسفِ ثانی ہے جو نمرہ خود تیرے پاس آئے گی؟'' یہ کہہ کر اس نے زوردار گھونسا میرے چہرے پر رسید کر دیا۔

میں الٹ کر گرا تو ان تینوں نے مجھے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ عین ممکن ہے کہ اس دن زمین میرے مکروہ وجود کے بوجھ سے آزاد ہو جاتی کہ کوئی ڈپٹ کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

میرے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان لوگوں نے میرے سر پر بھی کوئی بھاری چیز ماری تھی جس کی وجہ سے میرا سر پھٹ گیا تھا اور سر سے بہنے والا خون میرے چہرے پر آ گیا تھا۔ خون کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میرا حمایتی کون ہے؟ وہ حمایتی ہے یا پھر کالج کا کوئی لڑکا جو اپنے تجسس کی خاطر یہ سوال کر رہا ہے؟

''تم اپنے کام سے کام رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' شہزاد کی آواز آئی۔

''تم تین ہٹے کٹے آدمی مل کر ایک کمزور شخص کو مار رہے ہو۔ یہ بھی کوئی مردانگی ہے؟''

''تو اگر اس کا حمایتی ہے تو تُو آ جا میدان میں۔'' شہزاد نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک منٹ ویٹ کرو، میں ابھی تمہاری غنڈا گردی نکالتا ہوں۔'' پھر وہ شاید کسی سے سیل فون پر بات کرنے لگا۔

''دارا بھائی!'' اس نے کہا۔ ''پلے گراؤنڈ پہنچیں۔ یہ کمینہ شہزاد اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک کمزور لڑکے کو جانوروں کی طرح مار رہا ہے۔'' پھر وہ شہزاد سے مخاطب ہوا۔ ''اگر مرد کے بچے ہو تو یہیں ٹھہرو۔ ابھی دارا بھائی تمہاری کھال کھینچنے کے لیے آ رہا ہے۔''

دارا کا میں نے صرف نام سنا تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کالج کی کس کلاس میں پڑھتا ہے۔

اچانک مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میرے ہمدرد کی آواز آئی۔ ”اب بھاگے کہاں جارہے ہو بزدلو! دارا بھائی کا نام سن کر کیا پینٹ گیلی ہوگئی؟“

لیکن شہزاد کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہوگئیں۔

پھر شاید میں بے ہوش ہوگیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میں ایک صاف ستھرے کمرے میں تھا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی اسپتال کا کمرا ہے۔ میری دائیں جانب اسٹینڈ پر خون کا بیگ لٹک رہا تھا جس میں سے قطرہ قطرہ خون میری شریانوں میں اتر رہا تھا۔ میرے سر اور جسم کے دوسرے حصوں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے اٹھنا چاہا تو کراہ کر پھر بیڈ پر گر گیا۔ جسم سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھی تھیں۔

میرے کراہنے کی آواز سن کر ہی ایک نرس اندر آئی تھی۔

اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ شدید زخمی ہیں، اٹھنے کی کوشش نہ کریں۔“

”مجھے کیا ہوا ہے سسٹر؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ کچھ لوگ آپ کو یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ آپ اپنے گھر والوں کا ٹیلی فون نمبر بتائیں تاکہ انہیں انفارم کیا جاسکے۔“

”میرے سیل فون میں گھر والوں کے نمبر موجود ہیں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”ہمیں آپ کے پاس سے کوئی سیل فون ملا، نہ آپ کی کوئی اور شناختی علامت۔“

”میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے سسٹر!“ میں نے نحیف لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس وقت کوئی نمبر یاد نہیں ہے۔“

”اچھا، آپ آرام کریں۔ میں آپ کو انجکشن دے دیتی ہوں، آپ کا درد کم ہوجائے گا۔“

نرس نے انجکشن تیار کیا اور میرے بازو میں لگا دیا۔

میرے ذہن پر دھند سی چھا گئی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ مجھے تو شہزاد اور اس کے غنڈوں نے گھیرا تھا، یہ نرس تو کسی ایکسیڈنٹ کی کہانی سنا رہی ہے۔

یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کمرا وہی تھا لیکن اس وقت وہاں نرس کے علاوہ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔

اچانک میرے کانوں میں ماریہ کی آواز آئی۔

”تم .... ٹھیک تو ہو شاہد؟ اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

میں نے گھوم کر دیکھا تو وہاں نہ صرف ماریہ بلکہ سارہ، ابو اور امی بھی موجود تھیں۔

امی نے اٹھ کر پیار سے میری پیشانی چومی اور بولیں۔

”بیٹا! تم موٹر سائیکل پر کس کے ساتھ جارہے تھے کہ یہ ایکسیڈنٹ کرا بیٹھے؟“

”میرا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا ہے امی!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”مجھے شہزاد اور اس کے غنڈوں نے مارا ہے۔“

”کون شہزاد؟“ ابو نے چونک کر پوچھا۔ ماریہ بھی حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

”ہے ایک بگڑا رئیس زادہ۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تم سے اس کی کیا دشمنی ہے؟“ ماریہ نے پوچھا۔

”آپ لوگ مریض کو زیادہ پریشان مت کریں۔“ ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ پلیز باہر جائیں۔“

ابو نے کہا۔ ”تم ٹھیک ہوجاؤ۔ پھر میں سب کو دیکھ لوں گا۔“

ان کے جاتے ہی پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اندر جھانکا۔ ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آفیسر پلیز! ابھی پیشنٹ کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ وہ کوئی بیان دے سکے۔“

”ٹھیک ہے، میں بعد میں آجاؤں گا۔“ انسپکٹر نے کہا اور اپنا منحوس تھوبڑا لے کر وہاں سے چلا گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خود بھی رخصت ہوگیا۔ اس مار پیٹ میں میرا بایاں ہاتھ فریکچر ہوگیا تھا۔ سر پر ایک زخم تھا جس میں سات ٹانکے آئے تھے۔ میرے ایک پیر میں بھی شدید چوٹ تھی لیکن اس میں فریکچر نہیں تھا۔ جسم کے دوسرے حصوں پر بھی شدید ضربات تھیں لیکن فریکچر نہیں تھا، اندرونی چوٹیں تھیں جس کے لیے مجھے ڈاکٹرز مٹھی بھر ٹیبلٹس کھلا رہے تھے اور صبح شام میرے جسم کو انجکشنوں سے چھید رہے تھے۔ جسم سے ہر ٹیس اٹھنے پر میں دل ہی دل میں عہد کرتا تھا کہ شہزاد کو اس کی ایسی سزا دوں گا کہ اس کا سب ہیرو پن ہوا میں اڑ جائے گا۔ لیکن کیسے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ڈنک مار رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بات پولیس تک پہنچے۔ میں اپنا انتقام خود ہی لینے کا عادی تھا۔ پولیس کو تو وہ پیسے کھلا کر نہ صرف ”مک مکا“ کر لیتا بلکہ الٹا مجھے کسی الزام میں پھنسا دیتا۔

دو گھنٹے تک اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں پولیس کے سامنے شہزاد کا نام نہیں لوں گا۔ امی اور ابو کے سامنے تو میری زبان سے اضطراری انداز میں شہزاد کا نام نکل گیا تھا۔

دو گھنٹے بعد میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا اور نرس سے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''سسٹر! میرے گھر والوں کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟''

''آپ کے والد آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ بے چارے نہ جانے کتنے اسپتالوں اور کتنے پولیس اسٹیشن دیکھنے کے بعد یہاں پہنچے تھے۔''

''مجھے یہاں کون لے کر آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نوجوان لڑکا تھا۔ اس نے بتایا کہ آپ زخمی حالت میں سڑک کے کنارے پڑے تھے۔''

اسی وقت اس منحوس سب انسپکٹر نے پھر اندر جھانکا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مکروہ چہرے اور بے ڈول جسم سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

نرس نے اسے دیکھ کر سرد لہجے میں کہا۔ ''آفیسر! آپ پہلے ڈاکٹر سے پرمیشن حاصل کریں۔''

''آپ بھی تو ڈاکٹر سے کم نہیں ہیں میڈم!'' سب انسپکٹر نے چھچھورے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر سے زیادہ تو مریض کی حالت آپ ہی جانتی ہیں۔''

''سوری!'' نرس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر صاحب ہی کریں گے کہ پیشنٹ اس وقت کسی قسم کا ذہنی دباؤ برداشت کرنے کی پوزیشن میں ہے یا نہیں۔''

نرس کے جانے کے بعد وہ منحوس صورت انسپکٹر بھی وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر کے ساتھ آیا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ ''آپ کو ضابطے کی جو کارروائی بھی کرنا ہے، وہ جلدی کرلیں۔ مریض کو زیادہ پریشان مت کیجیے گا۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ مکروہ صورت پولیس والا کرسی کھینچ کر میرے بیڈ کے نزدیک بیٹھ گیا اور اپنی بغل میں دبی ہوئی ایک بوسیدہ سی فائل نکال کر بولا۔ ''آپ کا نام؟''

''حیرت ہے، آپ کو ابھی تک ڈاکٹرز نے میرا نام نہیں بتایا۔ میرا نام شاہد علی ولد زاہد علی، سکنہ تین سو بارہ، فیڈرل بی ایریا کراچی۔''

پولیس والے نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''کیا اس سے پہلے بھی کبھی پولیس کو بیان دے چکے ہو؟''

''کام کی بات کرو انسپکٹر۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تمہارا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''ایکسیڈنٹ کیسے ہوتا ہے؟'' میں نے الٹا سوال کر دیا۔ ''میں سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک گاڑی نے مجھے ٹکر ماری اور میں گر پڑا۔''

''گاڑی میں کون لوگ سوار تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا، آپ گاڑی کے سوار کی بات کر رہے ہیں۔'' میں نے نحیف لہجے میں کہا۔

''آپ کی کسی سے دشمنی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھ جیسے آدمی کی کسی سے دشمنی کیوں ہو گی؟'' میں نے کہا۔

''کسی پر شک ہے آپ کو؟'' اس نے وہی گھسا پٹا سوال کیا جو اسے سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔

''مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کو یہاں کون لے کر آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس وقت ہوش ہی کب تھا۔''

''یہاں دستخط کر دیں۔'' اس نے فائل میری طرف بڑھا دی۔ ''یہ ضابطے کی کارروائی ہے۔''

''میں پہلے ایک نظر پڑھ تو لوں۔'' میں نے کہا۔

''میری تحریر آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' سب انسپکٹر جھنجلا کر بولا۔

''آپ نے تو ہاتھ سے لکھا ہے آفیسر! میں تو پیر سے لکھا ہوا بھی پڑھ لیتا ہوں۔'' میں نے یہ کہہ کر اس پرچے کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس میں وہی کچھ تھا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ میں نے وہ بیان پڑھ کر اس پر دستخط کر دیے اور دستخط بھی اس انداز میں کیے کہ وہ اس میں مزید کچھ نہ بڑھا سکے۔

اس کے بعد بھی وہ مجھ سے کرید کرید کر پوچھتا رہا کہ آدمی کے سو دوست دو دشمن ہوتے ہیں۔ آپ کی کسی نہ کسی سے تو دشمنی ہو گی۔

''انسپکٹر صاحب! آپ میرا جثہ دیکھیں، میری شکل دیکھیں، مجھ سے تو کوئی دشمنی کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

اسی وقت ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''آپ نے اگر ضابطے کی کارروائی مکمل کر لی ہو تو اب پیشنٹ کو مزید ڈسٹرب نہ کریں۔''

سب انسپکٹر منہ بناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

شام کو دو لڑکے مجھ سے ملنے آئے۔ وہ قیمتی لباس میں تھے اور حلیوں سے کھاتے پیتے گھرانوں کے لگ رہے تھے لیکن ان کے انداز میں بہت تکبر تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''چھوارے! تو نے پولیس کے سامنے شہزاد کا نام نہ لے کر بہت عقل مندی کا کام کیا ہے ورنہ ہم اس مرتبہ اس کمرے میں تیرا جھٹکا کر دیتے۔''

''شہزاد؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کون شہزاد؟''

''زیادہ بننے کی کوشش مت کر اوئے! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ کون شہزاد؟''

''دیکھو، میں تمہیں جانتا ہوں نہ شہزاد کو.... اس لیے فوری طور پر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اگر تم لوگ ایک منٹ کے اندر اندر یہاں سے دفع نہ ہوئے تو اپنے انجام کے تم خود ذمے دار ہو گے۔''

''کیا کرے گا تُو؟'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

اسی وقت ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو وہ دونوں ڈاکٹر کو دیکھ کر مسکرائے اور مجھ سے بولے۔ ''یار شاہد! یہ بیٹھے بٹھائے تم نے کیا کر لیا۔ اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ خون کا بیگ اب بھی اسٹینڈ پر لٹک رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا خاصا خون ضائع ہو چکا تھا۔ یوں بھی میرے جسم میں خون ہی کتنا تھا؟

تھوڑی دیر بعد سارہ اور ابو آ گئے۔ ابو بھی میری حالت سے بہت مطمئن تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''شاہد! تم نے کسی شہزاد کا نام لیا تھا؟''

''ابو! مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ شہزاد کی گاڑی نہیں تھی۔ شہزاد تو اس وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ موجود تھا جو میرا بھی دوست ہے۔ وہ دونوں ابھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' پھر میں نے سارہ سے پوچھا۔ ''آج کیا ماریہ نہیں آئی؟''

''آئی تھی۔'' سارہ نے جواب دیا۔ ''لیکن یہاں پہنچ کر اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ وہ مجھ سے کہہ کر گئی ہے کہ میرا یہیں انتظار کرنا۔''

''ایسا کیا ضروری کام یاد آ گیا اسے؟'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''بیٹا! ابھی میری ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی تھی۔'' ابو نے کہا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ تمہیں ہفتے، دس دن تک اسپتال سے ڈسچارج کر دیں گے۔''

اس دن امی نہیں آئی تھیں۔ ابو کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ سارہ نے کہہ دیا کہ میں ماریہ کا انتظار کروں گی۔ وہ یہیں آئے گی۔

''ماریہ آخر کہاں جا سکتی ہے؟'' میں نے سارہ سے پوچھا۔

''میں تو خود حیران ہوں۔'' سارہ نے کہا۔ ''وہ آپ کے کمرے کی کھڑکی تک آئی، کچھ دیر یہاں ٹھہری، میں اور ابو اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ابو پھل وغیرہ لینے کے لیے رک گئے تھے۔ وہ وہیں سے واپس چلی گئی۔''

سارہ میرے پاس مزید آدھا گھنٹا بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سارہ! تم گھر چلی جاؤ۔ زیادہ دیر ہو جائے گی تو پھر واپس جانے میں مسئلہ ہو گا۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور ماریہ اندر داخل ہوئی۔ وہ چہرے سے بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے ذرا سانس تو لینے دو۔'' ماریہ نے کہا اور میز پر رکھا ہوا جگ اٹھا کر اس سے گلاس بھرا اور ایک سانس میں پورا پانی پی گئی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ خود ہی بولی۔

''جب میں یہاں پہنچی تو تمہارے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی لڑکا تمہیں دھمکی دے رہا تھا کہ اگر تم نے شہزاد کا نام لیا ہوتا تو وہ اس کمرے میں ہی تمہیں مار دیتا۔''

میرا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ ''تم .... تم وہ سب باتیں سن رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، پھر ڈاکٹر صاحب آ گئے تو ان دونوں کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ دونوں انتہائی چھچھورے قسم کے لڑکے تھے۔ میں نے ان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''تم نے!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم نے ان کا پیچھا کیا؟''

''ہاں، تمہارے لیے میں اتنا تو کر ہی سکتی ہوں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''وہ دونوں ایک بائک پر سوار تھے۔ اسپتال کے باہر بہت سے رکشا اور ٹیکسیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے کہا۔ بھائی! ذرا اس موٹر سائیکل کا پیچھا کرو۔ موٹر سائیکل والا انتہائی آوارہ لڑکا ہے، وہ میرے بھائی کو ورغلا کر لے جا رہا ہے۔ میں آج اسے چھوڑوں گی نہیں۔''

"باجی! آپ اکیلی کیا کریں گی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "اگر آپ کہیں تو میں آپ کی کوئی مدد کروں؟"

"نہیں بھائی!" میں نے کہا۔ "میں صرف ان کا ٹھکانا دیکھ کر پولیس کو ٹیلی فون کردوں گی۔ میرے ایک ماموں کرائم برانچ میں ایس ایس پی ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی پولیس فوری طور پر حرکت میں آجائے گی اور ان کے ٹھکانے پر چھاپا مارے گی۔"

"کرائم برانچ کے ایس ایس پی کا نام سن کر ٹیکسی والا مزید محتاط ہوگیا اور ان کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ دونوں نارتھ ناظم آباد کے ایک کمپلیکس پر رکے اور اپنی بائک لاک کرنے لگے۔

"میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے خود بھی اندر کی طرف چل دی۔ اس دوران میں وہ دونوں لفٹ تک پہنچ گئے تھے۔ میں بھی لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہوگئی جیسے مجھے بھی کسی فلور پر جانا ہے۔ وہاں دو تین لڑکیاں اور ان لڑکوں کے علاوہ دو آدمی اور بھی تھے۔ انہوں نے ساتویں فلور کا بٹن دبایا۔

لفٹ ساتویں فلور پر رکی تو ان لڑکوں کے ساتھ ادھیڑ عمر کے ایک صاحب اور میں اس فلور پر اترے۔ وہ اس بلڈنگ کے فلیٹ نمبر 703 میں چلے گئے۔ میں نے کوریڈور کا ایک چکر لگایا اور واپس آرہی تھی کہ جالی دار دروازے سے ان دونوں کی آوازیں سنیں۔ "وہ سالا پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ اب تو بھول کر بھی شہزاد بھائی کا نام نہیں لے گا۔"

"لیکن یار! یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ عین وقت پر اسے بچانے کے لیے وہاں کون پہنچ گیا؟"

"یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ ویسے وہ اب اس لڑکی کی طرف رخ بھی نہیں کرے گا۔"

"اسی وقت سامنے سے ایک خاتون آتی دکھائی دیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گئی اور لفٹ کے ذریعے بلڈنگ سے نیچے آگئی۔"

"وہ انتہائی بدمعاش لوگ ہیں ماریہ! تمہیں آخر ان کے پیچھے جانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"تم پہلے یہ بتاؤ کہ یہ کس لڑکی کا چکر ہے؟" ماریہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں اسے میں نے تفصیل سے نمرہ کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

پھر میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں اس شہزاد کو چھوڑوں گا نہیں۔"

ماریہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "تم.... تم اس کا کیا بگاڑ لوگے؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"شاہد! جو کچھ بھی کرنا، ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔" ماریہ نے کہا۔

"تم فکر مت کرو۔ شہزاد کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی ہڈی پسلی ایک کرنے والے کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔"

سارہ اور ماریہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئیں۔

اچانک دروازہ کھلا اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ دروازے پر نمرہ کھڑی تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی میرے بیڈ تک پہنچی اور بولی۔ "اب کیسی طبیعت ہے شاہد؟"

"جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"آخر وہ گاڑی والا تھا کون جس نے تمہیں ٹکر ماری؟"

"اگر یہ معلوم ہوتا تو میں اب تک اسے پولیس کے حوالے کرچکا ہوتا۔"

مجھے اس کے سامنے خوامخواہ احساسِ کمتری ہورہا تھا۔ ایک تو میری شکل یوں بھی اچھی نہیں تھی، اوپر سے چہرے پر جگہ جگہ لگے ہوئے اسٹیچنگ ٹیپس نے میری حالت مزید بگاڑ دی تھی۔

نمرہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی اور میں پھر شہزاد سے انتقام لینے کے کسی ایسے طریقے پر غور کرنے لگا جس کے ذریعے اسے ایسا سبق سکھاؤں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔

☆☆☆

میں اسپتال سے دو مہینے پہلے فارغ ہوچکا تھا۔ اب میں ہر طرح سے ٹھیک تھا۔ بس شہزاد کی مار پیٹ سے میرے چہرے پر کچھ نئے نشانات بن گئے تھے جن سے میرے چہرے کی بدصورتی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اسپتال میں میری مزاج پرسی کو پروفیسر شہاب بھی آئے تھے۔ اور تو اور ایک دفعہ شہزاد بھی اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ادھے! تو نے میرا نام نہ لے کر بہت اچھا کیا ورنہ....."

"دیکھو شہزاد!" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہوا، میں اسے بھول چکا ہوں، اس لیے اب تم بھی اسے بھول جاؤ۔"

"گڈ!" وہ مکاری سے مسکرایا۔ "تُو عقل مند تو ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" پھر وہ سنجیدہ ہوکر بولا۔ "ہاں، اب بھولے سے بھی نمرہ کی طرف رخ مت کرنا ورنہ لوگ تیری مزاج پرسی کو اسپتال نہیں آئیں گے، فاتحہ پڑھنے قبرستان جائیں گے۔"

میں نے خون کے گھونٹ پی کر اس کی یہ بات سنی تھی لیکن اس وقت کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں دو مہینے بعد کالج پہنچا تو امتحان سر پر تھے اور میں نے اس دوران میں ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا، اس لیے امتحان دینا فضول تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرا ایک تعلیمی سال ضائع ہوا تھا۔

میرے پیر میں شدید چوٹ لگی تھی اس لیے میں کچھ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

شہزاد نے مجھے دیکھا تو چونک کر بولا۔ "آؤ تیمور لنگ! تم ٹوٹ پھوٹ کر پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے؟"

"تم نے تیمور لنگ کا صرف نام سنا ہے یا اس کے بارے میں کچھ جانتے بھی ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اوادّھے!" شہزاد نے کہا۔ "زیادہ بک بک مت کر، چل اپنا راستہ ناپ۔"

میں اس کی کڑوی کسیلی باتوں کو بھی پی گیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ میرے آگے بڑھتے ہی اس کے چمچوں نے فرمائشی قہقہے لگائے۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "شہزاد! تُو نے مجھے تیمور لنگ کہا ہے تو میں تجھے تیمور لنگ ہی بن کر دکھاؤں گا۔ تیمور لنگ کئی جنگوں میں بُری طرح تباہ ہوا، اس کی فوج تتر بتر ہوئی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور مستقل مزاجی سے اپنے کام میں جتا رہا۔ آخر اس نے اپنے ایک ایک مخالف کو تہ تیغ کردیا۔ مجھ میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ وہ تندومند اور توانا آدمی تھا۔ میں کمزور، دبلا پتلا اور ٹوٹا پھوٹا ایک شخص تھا لیکن میرا اور اس کا جذبہ مشترک تھا۔ میں بھی اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔

اس سال مجھے امتحان تو دینا نہیں تھا اس لیے میرا سارا وقت شہزاد اور اس کے چمچوں سے انتقام کے طریقے سوچنے میں گزرتا رہا۔

میں آپ کو یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میں ہر قسم کا تالا بہت آسانی سے کھول لیتا تھا۔ اس کی پریکٹس بھی میں نے اس وقت کی تھی جب بھیا میری قیمتی چیزیں ہتھیا کر اپنی الماری میں بند کردیتے تھے۔

میرے اسکول کے ایک کلاس فیلو کے والد تالے اور چابی بنانے کا کام کرتے تھے اور اپنے فن میں بہت ماہر تھے۔ میں ایک دن اپنے دوست کے ساتھ اتفاق سے ان کے پاس چلا گیا۔ ان کا کام خاصا مشکل لیکن دلچسپ تھا۔

پھر میں اکثر ان کے پاس جانے لگا اور غیر محسوس طور پر تالوں کی ساخت اور ان کے کھولنے کے طریقوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ انہوں نے میری دلچسپی دیکھی تو وہ بھی مجھے ضروری باتیں بتانے لگے۔

ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھ لیا۔ "انکل! آپ تو یہ کام اوزاروں سے کرتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کے پاس کوئی بھی اوزار نہ ہو اور کوئی تالا کھولنا پڑ جائے تو آپ کیا کریں گے؟"

وہ مسکرائے اور بولے۔ "تم ابھی بچے ہو، یہ کام تو لوہے کی ایک سخت تار یا خواتین کی ہیئر پن سے بھی ہوسکتا ہے۔"

پھر دو دن کی محنت کے بعد میں ہیئر پن سے ہر قسم کا تالا کھولنے میں طاق ہوگیا۔

انکل نے مجھ سے کہا۔ "کبھی بھی کسی کے کہنے پر کوئی تالا مت کھولنا، چاہے وہ تمہارا کوئی قریبی رشتے دار یا بھائی ہی کیوں نہ ہو، ورنہ آئندہ جب بھی چوری کی کوئی واردات ہوگی، لوگوں کو تم پر لازمی شبہ ہوگا۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے، اتنا آسان ہے نہیں۔"

☆☆☆

امتحانات شروع ہونے میں دس پندرہ دن باقی تھے۔ میں نے دن رات کی محنت کے بعد یہ سراغ لگالیا تھا کہ پرچے کس پریس میں چھپ رہے ہیں۔ پرچے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ رہے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ پریس سے پرچوں کا ایک بنڈل چرا کر شہزاد کے کمرے میں رکھ دوں گا اور خفیہ فون کے ذریعے پرنسپل صاحب اور پولیس کو اطلاع دے دوں گا کہ امتحان کا پرچہ نہ صرف آؤٹ ہوچکا ہے بلکہ اس کا ایک بنڈل شہزاد کے کمرے میں موجود ہے۔ شہزاد ہاسٹل کے ایک کمرے پر قابض تھا اور نوابوں کی طرح وہاں رہتا تھا۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا، اکیلے ہی کرنا تھا۔ میں اس کام میں کسی کو بھی شریک نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے مقررہ دن نہ صرف دو تین مختلف سائز کی ہیئر پنیں لیں بلکہ کچھ چابیاں اور دو تین ...... ریتیاں جو گھنے

کے کام آتی ہیں، بھی اپنے مختصر سے بیگ میں رکھ کر انہیں کمر سے باندھ لیا۔

میں پریس کے علاقے کا دو دن پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا۔ اس علاقے کا چوکیدار ہر بیس منٹ بعد وہاں سے سیٹی بجاتا ہوا گزرتا تھا۔ پریس کا چوکیدار بارہ بجے کے بعد لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ زیادہ خطرہ مجھے اسی سے تھا۔

میں اس علاقے میں پہنچا تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ دن کے وقت یہ حال ہوتا تھا کہ وہاں پیدل چلنے کو راستہ بھی نہیں ملتا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا اس پریس تک پہنچ گیا۔ تالا کھولنا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن پریس کا شٹر اٹھانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں نے اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ جس طرف پریس مالکان کا آفس تھا، وہاں شٹر کے بجائے گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ گرل تو میں بہت آسانی سے بے آواز کھول سکتا تھا۔

میں نے تالوں کا جائزہ لیا اور ابھی اپنے بیگ سے ہیئر پن نکالنے ہی والا تھا کہ چوکیدار کی سیٹی سن کر میں چونک گیا۔ وہاں خاصا اندھیرا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ہیئر پن کی مدد سے نہایت آسانی سے چند سیکنڈوں میں دونوں تالے کھول لیے اور گرل آہستہ سے ایک طرف کھسکا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا دروازہ بھی بند تھا لیکن اس میں ہضمی قفل لگا ہوا تھا۔ مجھے چوکیدار کے آنے سے پہلے پہلے وہ تالا کھولنا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ہیئر پن آزمائی اور پہلی ہی کوشش میں تالا کھل گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر پہلے تو گرل کو برابر کیا اور اندرونی دروازہ بند کر لیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا لیکن میرے پاس چائنا ٹارچ تھی جو انتہائی محدود پیمانے پر روشنی کرتی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ٹارچ روشن کی۔ وہ پریس کے اسٹاف کا کمرا تھا۔ دیوار گیر ریک کاغذات سے بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر بھی کاغذات کے بنڈل پڑے تھے۔ اس میں کچھ سادہ تھے اور کچھ چھپے ہوئے۔ میں نے چھپے ہوئے بنڈلوں پر روشنی ڈالی تو میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ انگلش کا پرچہ تھا۔ میں نے اس میں سے صرف پندرہ بیس پرچے نکالے اور انہیں اپنی پینٹ کی پاکٹ میں ٹھونس کر شرٹ باہر نکال لی تاکہ وہ کسی کو نظر نہ آسکیں۔ آج کل تو امتحانی پرچوں کی بہت احتیاط ہوتی ہے اور عموماً وہ پرائیویٹ پریس میں چھپتے بھی نہیں ہیں کیونکہ بورڈز اور یونیورسٹی نے اپنے پریس لگا لیے ہیں۔

میں نے واپسی پر بھی اسی طرح دروازہ اور گرل بند کی اور چوکیدار کے جاتے ہی میں بھی وہاں سے نکل گیا۔ میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ کاش میرے پاس بائک ہوتی تو میں دس منٹ میں کالج پہنچ سکتا تھا پھر میں نے سوچا کہ مجھے اس وقت کالج ہاسٹل جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں اس وقت گھر چلا جاتا ہوں، کل صبح کالج جا کر کسی بھی وقت یہ پرچے شہزاد کے کمرے میں رکھ دوں گا۔

اس وقت الیکٹرانک میڈیا کا تو اتنا زور نہیں تھا لیکن پرنٹ میڈیا بہت زیادہ فعال تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ خفیہ کال کر کے اخبارات کے کچھ رپورٹرز کو بھی وہاں بلا لوں گا۔

کافی دور پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک رکشا نظر آیا۔ میں نے اس سے فیڈرل بی ایریا چلنے کو کہا۔

گھر میں داخل ہو کر پہلے تو میں نے وہ پرچے خاکی رنگ کے ایک لفافے میں رکھے اور لفافے پر ٹیپ لگا کر اسے سیل کر دیا۔

پھر میں اطمینان سے لمبی تان کر سو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو وال کلاک ساڑھے نو بجا رہی تھی۔

میں نے تیار ہو کر جلدی جلدی ناشتا کیا اور خاکی لفافے کو چھوٹے سے ایک بریف کیس میں رکھا، پھر یہ سوچ کر باہر نکال لیا کہ کالج میں ہر شخص بریف کیس دیکھ کر چونکے گا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بریف کیس استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے اس خاکی لفافے کو ایک ذرا بڑے سفید لفافے میں رکھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور کتابیں بھی لیں اور کالج روانہ ہو گیا۔

شہزاد حسبِ معمول لان میں موجود تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے سامنے جانے سے گریز کیا اور ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ گیا۔

میں جانتا تھا کہ اگلا پیریڈ فزکس کا ہے۔ شہزاد فزکس اور انگلش کا پیریڈ کبھی مس نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے جب شہزاد کلاس میں ہو تو اس کے چمچے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔

پیریڈ شروع ہوا تو میں ٹہلتا ہوا ہاسٹل کی طرف نکل گیا۔ اس وقت وہاں بالکل سناٹا تھا۔ بس ایک دو کمروں سے لڑکوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ وہ لڑکے تھے جو یا تو بیماری کی وجہ سے یا یوں ہی تفریحاً کلاس اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔

میں شہزاد کے کمرے پر پہنچا، اردگرد کا جائزہ لیا اور چشم زدن میں تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسے میں اگر شہزاد یا اس کا روم میٹ آجاتا تو میں بے موت مارا جاتا۔ میں نے شہزاد کا سوٹ کیس دیکھا، وہ لاک نہیں تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تہوں کے نیچے پرچوں کا وہ لفافہ رکھ دیا۔ اس

سے پہلے میں نے اس خاکی لفافے کو سفید لفافے سے نکال لیا تھا۔ پھر میں نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ایک کپڑا اٹھا کر ان تمام جگہوں کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ میں نے کمرے سے ایک رومال اٹھا کر اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا تاکہ دروازے پر میری انگلیوں کے نشانات نہ رہ جائیں۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ باہر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ قدموں کی وہ چاپ شہزاد کے کمرے کے باہر آکر رک گئی۔ آہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک سے زیادہ افراد کے قدموں کی آواز ہے۔

میں نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ دروازے پر وہی دونوں لڑکے کھڑے تھے جو اسپتال میں مجھے دھمکیاں دے کر آئے تھے۔

ان میں سے ایک نے دروازے پر دستک دی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ اس نے دوبارہ دستک دی لیکن میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔

''یار! شہزاد بھائی اس وقت کلاس میں ہوں گے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ تم کمرے میں چلو، میں ابھی آرہا ہوں۔'' دوسرے نے کہا۔

''تو وہ پیریڈ ختم ہونے کے بعد ہی آئیں گے نا؟'' پہلے لڑکے کی آواز آئی۔

''یار! چابی بھی نہیں ہے۔ اب یہ بوتلیں میں کہاں رکھوں؟''

میں نے کی ہول سے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں بڑا سا ایک شاپر تھا۔ اس میں دو بوتلیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شراب کی بوتلیں ہیں۔

''یار! ابھی پیریڈ ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اس وقت تک یہ بوتلیں ہم کیفے ٹیریا کے سامنے گھنی جھاڑیوں میں چھپا سکتے ہیں۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد وہاں سے نکال لیں گے۔''

وہ دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مزید دو منٹ انتظار کیا پھر پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا، کمرے کا ہضمی قفل خودکار طریقے سے بند ہو گیا۔ میں نے انتہائی سرعت سے اپنی انگلیوں کے ممکنہ نشانات صاف کیے اور ٹہلتا ہوا ہاسٹل سے باہر نکل آیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ مجھے وہاں کسی نے جاتے دیکھا، نہ نکلتے۔

باہر نکل کر میں نے سب سے پہلے کالج کے پرنسپل صاحب کو ایک پی سی او سے ٹیلی فون کیا کہ فرسٹ ایئر کا انگلش کا پرچہ نہ صرف آؤٹ ہو چکا ہے بلکہ وہ اس وقت کالج کے ایک طالب علم شہزاد کے کمرے میں موجود ہے۔ سلسلہ منقطع کر کے میں نے علاقے کے پولیس اسٹیشن کو ٹیلی فون کیا اور آواز میں رعب پیدا کر کے کہا۔ ''مجھے انچارج صاحب سے بات کرنا ہے۔''

''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں ڈی آئی جی کرائمز کا بھتیجا بول رہا ہوں۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

فوراً ہی انچارج لائن پر آگیا اور بولا۔ ''میں بہادر علی انچارج پولیس اسٹیشن بول رہا ہوں۔ حکم کریں جناب!''

''انچارج صاحب!'' میں نے کالج کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کالج کا ایک طالبِ علم بول رہا ہوں۔ آنے والے امتحانات کا انگریزی کا پرچہ نہ صرف آؤٹ ہو چکا ہے بلکہ کئی پرچے ہاسٹل میں کالج کے ایک طالب علم شہزاد کے کمرے میں موجود ہیں۔ آپ نے اگر دیر کی تو ممکن ہے ملزم پرچوں کو کہیں اور منتقل کر دے۔ ہاں، اس کے کمرے میں شراب کی بوتلیں بھی موجود ہیں۔''

پھر میں نے وہیں سے کراچی کے چند بڑے اخبارات کو فون کیا اور پی سی او سے باہر آگیا۔

پی سی او کے باہر کالج کا ایک لڑکا کھڑا تھا اور میرے باہر نہ نکلنے پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''کیا تم اس وقت اپنی کسی محبوبہ سے گفتگو کر رہے تھے؟'' وہ مشتعل ہو کر بولا۔

''یار! لائن بار بار کٹ رہی تھی۔ میں تو اپنے گھر والوں سے بات کر رہا تھا۔'' یہ کہہ کر میں جلدی سے وہاں سے باہر نکل آیا۔

پیریڈ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ان دونوں لڑکوں کو لان سے دوبارہ شہزاد کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا، ان کے ہاتھوں میں وہ شاپر بھی تھا۔

تھوڑی دیر بعد گویا کالج میں بھونچال آگیا۔ پولیس کو نہ صرف میں نے ٹیلی فون کیا تھا بلکہ پرنسپل صاحب نے بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔

پولیس کی دو موبائل وینز سائرن بجاتی ہوئی کالج کے احاطے میں داخل ہوئیں تو پرنسپل صاحب نے انچارج کا استقبال برآمدے میں کیا۔

وہاں لمحوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع لگ گیا۔

پولیس نے پرنسپل صاحب کے ساتھ فوراً شہزاد کے کمرے کا رخ کیا۔ میں بھی بہت سے دوسرے طالبِ علموں کی طرح تماشا دیکھنے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ ساتھ تھا۔

پولیس کے ایک سپاہی نے اپنے مخصوص انداز میں شہزاد کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد اس نے اس سے بھی زیادہ زوردار انداز میں دستک دی۔

اندر سے شہزاد کی آواز آئی۔ "کون ہے، تجھ سے صبر نہیں ہوتا اور یہ دستک دینے کا کون سا طریقہ ہے؟"

"دروازہ کھول اوئے ....." اس نے غلیظ سی ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔

شہزاد نے بھنا کر دروازہ کھول دیا۔

پولیس والے اچانک اس کے کمرے میں گھس گئے۔ وہ تینوں اس وقت بوتل کھولے شراب سے شغل کر رہے تھے۔ پولیس والوں نے انہیں وہیں دبوچ لیا۔

انچارج نے کہا۔ "اوئے، کالج کے ہاسٹل میں بیٹھ کر شراب پیتے ہو ..... تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔ اسے پی کر میں چاق و چوبند ہو جاتا ہوں۔" شہزاد نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہم کرتے ہیں ابھی تجھے چاق و چوبند۔" انچارج نے کہا۔

"انسپکٹر! اس بات کو یہیں ختم کر دو۔" شہزاد نے کہا۔ "تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں؟"

انچارج نے اس کے سر پر ایک جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تو صدر امریکا کا بیٹا ہے؟ تو ہوا کر..... لیکن میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" پھر اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "وہ پرچے کہاں ہیں جو تُو نے پریس سے چرائے ہیں؟"

"پرچے؟" شہزاد کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"ہاں پرچے!" پرنسپل صاحب نے کہا۔ "تم نے پریس سے پرچے کیوں چرائے اور اب انہیں کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

"سر! آپ بھی ان کی باتوں میں آ گئے۔ کیسے پرچے؟ مجھے پرچے چرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت؟" انچارج طنزیہ لہجے میں بولا۔ "امتحان سے دو دن پہلے وہی پرچہ ہزار دو ہزار میں بکتا ہے۔"

"لیکن میرے پاس پرچے نہیں ہیں۔"

"ناصر خان؟" انچارج نے اپنے ایک ماتحت حوالدار کو حکم دیا۔ "تلاشی لو اس کے کمرے کی۔"

"دیکھو انسپکٹر!" شہزاد نے کہا۔ "اگر میرے کمرے سے پرچے برآمد نہ ہوئے تو میں تمہاری نوکری کھا جاؤں گا اور تم بغیر وارنٹ کے میرے کمرے کی تلاشی کیسے لے سکتے ہو؟"

"وارنٹ کی تو فکر مت کر۔" انچارج نے کہا۔

ناصر خان دو سپاہیوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ شہزاد کی الماری سے کتابیں اور دوسرا سامان اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہا تھا۔ پولیس والوں نے اس کے بیڈ کا میٹریس تک اٹھا کر پھینک دیا۔

پھر انچارج کی نظر شہزاد کے سوٹ کیس اور بریف کیس پر پڑی۔ اس نے بریف کیس اٹھا لیا اور شہزاد سے بولا۔ "اس کی چابی مجھے دے، ورنہ میں تالا توڑ دوں گا۔"

"بریف کیس میں تالا نہیں ہے۔" شہزاد نے کہا اور اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ اس میں شہزاد کے مختلف قسم کے کاغذات تھے، کچھ خطوط تھے۔ کچھ تصویریں تھیں اور کچھ نقد رقم بھی تھی۔

بریف کیس کی تلاشی لے کر انچارج نے تھکے تھکے انداز میں شہزاد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پرنسپل صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ شاید وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ شہزاد کے کسی دشمن نے اسے پریشان اور خوف زدہ کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا ہے۔

شہزاد کا سوٹ کیس کھلا ہوا تھا اور اس میں کپڑے اتنے بھرے ہوئے تھے کہ اس کا ڈھکنا پوری طرح بند بھی نہیں ہو رہا تھا۔

انسپکٹر نے مایوسی کے عالم میں سوٹ کیس اٹھایا اور اس کے کپڑے نکال کر باہر پھینک دیے۔

"میں نے یہ کپڑے کراچی کی انتہائی مہنگی ڈرائی کلین شاپ سے دھلوائے ہیں۔ آپ کو ان کی دھلائی کا معاوضہ بھی دینا پڑے گا انسپکٹر صاحب۔"

انسپکٹر نے کپڑوں کی آخری تہ نکال کر باہر پھینکی تو اسے وہ لفافہ نظر آ گیا۔ اس نے جھپٹ کر وہ لفافہ اٹھا لیا۔ اس کا ٹیپ نکالنے کے بعد انسپکٹر نے اس میں سے چھپے ہوئے پرچے نکال لیے۔

پرچوں کا لفافہ دیکھ کر شہزاد کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ انسپکٹر نے ان پرچوں میں سے ایک پرچہ پرنسپل صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ پرنسپل صاحب نے پرچے پر ایک نظر ڈالی اور قہر آلود نظروں سے شہزاد کو گھورنے لگے۔

"سر! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے ان پرچوں کا بالکل علم نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ میرے کمرے تک کیسے پہنچے؟"

"یہ تو تُو تھانے چل کر خود بتائے گا کہ یہ پرچے یہاں کیسے پہنچے؟" انچارج نے کہا، پھر پرنسپل صاحب سے مخاطب ہوا۔ "سر! میں ان تینوں کو ہاسٹل میں شراب نوشی اور امتحانی پرچوں کی چوری کے سلسلے میں گرفتار کر رہا ہوں۔"

پرنسپل صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ناصر خان!" انچارج نے چیخ کر کہا۔ "ہتھکڑیاں لگاؤ ان تینوں کو۔"

"ہم ..... ہم تو ..... صرف ..... شہزاد بھائی ....."

"بکو مت اوئے۔" انچارج نے کہا اور ان دونوں کے بھی ایک ایک جھانپڑ رسید کر دیا جو شہزاد کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے موج میلا کر رہے تھے۔

پولیس والے انہیں دھکیلتے ہوئے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے ہاسٹل سے باہر لے گئے تو ہاسٹل کے باہر طلبا اور طالبات کا ایک جمِ غفیر تھا۔ شہزاد ان میں سے کسی سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔

میرے دل میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ اب تک میں نے جتنے لوگوں سے اپنی پٹائی کا انتقام لیا تھا، یہ سب سے بھیانک انتقام تھا۔

پولیس کے جانے کے بعد بھی لڑکے اور لڑکیاں ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں ان سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھا اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا اور دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رات بھر میں پولیس والے ان تینوں کی وہ حالت کر دیں گے کہ وہ کم سے کم تین ماہ تک بستر سے نہیں اٹھ سکیں گے۔

اس رات مجھے بھی بہت پرسکون نیند آئی۔

صبح صبح مجھے ماریہ نے جگا دیا اور بولی۔ "شاہد! کل کالج میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا اور تم نے اس کی خبر ہی نہ دی۔"

"کل رات کو ایک تو میں آیا بہت دیر سے تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے سوچا کہ تمہیں صبح تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گا۔"

"شاہد!" ماریہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "ایک بات بتاؤ، کہیں یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے بھویں چڑھا کر کہا۔ "ان کے کمرے میں شراب کی بوتلیں میں نے رکھیں، پھر ان لوگوں کو شراب پینے پر مجبور بھی کیا اور انگلش کا پرچہ بھی چرا کر ان کے کمرے میں رکھ دیا..... تم یہی کہنا چاہتی ہو نا؟"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا دماغ بہت شیطانی ہے اور تم اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے۔"

"تو میں نے انہیں معاف کب کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ جیل سے چھوٹ کر آئیں گے تو میں ان کے بارے میں کچھ سوچوں گا۔ ابھی میرا انتقام تو باقی ہے۔"

میں نے اس دن کالج جانے کی خصوصی تیاری کی اور بن ٹھن کر کالج پہنچا۔

وہاں پہنچ کر مجھے ایک خبر سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ شہزاد کے بارسوخ اور دولت مند باپ نے اپنے تعلقات اور دولت استعمال کرتے ہوئے اس کیس کو دبا دیا تھا۔ پرنسپل صاحب نے بھی صرف اتنا کیا تھا کہ شہزاد کو اس کالج سے نکال دیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہی شہزاد پھر ڈھٹائی سے کالج میں موجود تھا۔ پرنسپل صاحب نے اسے کالج سے نکالا تھا لیکن اس کے وہاں آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

اسے صحیح سلامت دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور لمحے بھر کو مجھے اتنا شدید صدمہ ہوا کہ میرا سر چکرا کر رہ گیا۔

شہزاد نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ادّھے! تو کیا سمجھ رہا تھا کہ اب میں پولیس اسٹیشن سے سیدھا جیل جاؤں گا؟"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے اس انسپکٹر کو بھی معطل کرا دیا ہے جس نے مجھے ہتھکڑیاں لگائی تھیں۔ میں کسی معمولی آدمی کا بیٹا نہیں ہوں۔ ارشاد علی خان کا بیٹا ہوں جو شہر کا ایک معروف بزنس مین ہے۔ جو آدمی سال میں کروڑوں روپے ٹیکس دیتا ہو، اس کے بیٹے کو پولیس اتنی آسانی سے پکڑ کر لے جائے گی۔ ہاں، مجھے ابھی یہ پتا لگانا ہے کہ میرے کمرے میں وہ پرچے کس حرام زادے نے رکھے تھے۔ جس دن بھی مجھے پتا چل گیا میں اسے بھرے مجمع میں ننگا کر دوں گا اور اتنی مار لگاؤں گا کہ وہ آئندہ میرا نام سن کر ہی کانپے گا۔"

میں انتہائی دل برداشتہ ہو کر کالج سے نکلا اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے پولیس پر تو کبھی اعتبار نہیں تھا لیکن اتنا اندھیر ہو گا یہ تو میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے صبح ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا اور اب بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں سے کچھ دور ایک اچھا ریسٹورنٹ تھا۔ اچھا ان معنوں میں کہ وہاں کھانے بہت اچھے ملتے تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے کچھ کھا لوں، پھر اس صورتِ حال پر غور کروں گا۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں نے مغز نہاری کا آرڈر دیا۔

تھوڑی دیر بعد بیرا مغز نہاری اور گرم گرم نان لے آیا۔

اچانک ایک لمبا تڑنگا آدمی میرے سامنے آ بیٹھا۔

اپنے لباس اور چہرے سے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔
اس سے پہلے کہ میں کھانا شروع کرتا، اس نے میرے آگے سے سالن کی پلیٹ کھینچی اور روٹیوں کی پلیٹ بھی اپنی طرف کرلی، پھر وہ یوں کھانے لگا جیسے میرا مہمان ہو۔
میں خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے بیرے کو بلایا اور اس سے ایک اور مغز نہاری لانے کو کہا۔ بیرے نے فوراً ہی میرا آرڈر پورا کردیا۔
اس سے کوئی بات کیے بغیر میں بھی کھانے میں مصروف ہوگیا۔ اس نے پے در پے چار روٹیاں کھائیں۔ اس کے علاوہ اس نے مغز نہاری کی ایک پلیٹ اور بھی منگوائی۔
کھانا کھانے کے بعد اس نے زوردار ڈکار لی اور آسودگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے جیب سے مڑی تڑی ایک سگریٹ نکالی اور بیرے سے ماچس لے کر سلگالی۔
میں نے جل کر کہا۔ ''میں آپ کے لیے چائے منگواؤں؟''
''منگوا لے یار!'' اس نے بھاری لہجے میں کہا۔ ''چائے کی یوں بھی شدید طلب ہورہی ہے۔''
میں نے دو چائے کا آرڈر بھی دے دیا اور بیرے سے کہا کہ سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی لے آؤ۔
بیرا فوراً ہی سگریٹ کا پیکٹ، ماچس اور چائے لے آیا۔
چائے پی کر اس شخص نے پھر زوردار ڈکار لی اور مجھ سے بولا۔ ''تو قسمت کا دھنی ہے۔''
''میں......؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں قسمت کا دھنی ہوں ...... وہ کیسے؟''
''دیکھ اگر تو ذرا بھی چوں چرا کرتا تو میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ تُو شاید مجھے جانتا نہیں ہے۔''
''میں تو پہلے ہی مرا ہوا ہوں بھائی صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''زندگی بھر لوگوں کی ٹھوکریں کھائی ہیں ... آپ نے تو صرف کھانا کھایا ہے۔ مجھے ذلیل نہیں کیا، گالیاں نہیں دیں، تھپڑ نہیں مارا۔ یہ تو آپ کا احسان ہے مجھ پر۔''
''بہت دکھی معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''نام کیا ہے تیرا؟''
''میرا نام شاہد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کوئی بھی مجھے شاہد نہیں کہتا۔ لوگ مجھے اَدّھا، چھوارا، اور اسی قسم کے دوسرے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ جس کا دل چاہتا ہے، مجھے دو چار تھپڑ اور لاتیں مار کر گزر جاتا ہے۔''
''اور تو خاموشی سے پٹ جاتا ہے؟'' اس نے شخص نے کہا۔
''تو اور میں کیا کرسکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''میری جسامت دیکھ رہے ہو؟ مجھے تو چھوٹے بچے تک ذلیل کرکے رکھ دیتے ہیں۔''
''میرا نام حاکم خان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لوگ مجھے حاکو کے نام سے جانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جیل سے رہا ہوا ہوں۔ مجھے شدید بھوک لگی تھی۔ اس لیے اس ہوٹل میں گھس گیا۔ یوں تو میں ہوٹل میں بھی بغیر پیسوں کے کھانا کھا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں تیرا کھانا دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہوا، اگر تو ذرا بھی ناگواری کا اظہار کرتا تو میں تجھے بہت بری طرح پیٹ دیتا لیکن تُو نے اعتراض نہیں کیا۔ میں نے ابھی اپنے ساتھیوں کو ٹیلی فون کرکے یہاں آنے کو کہا ہے۔ تھوڑے بہت پیسے تھے، وہ ٹیلی فون کرنے میں خرچ ہوگئے لیکن تو فکر مت کر، میں تیرا نقصان پورا کردوں گا۔''
''حاکم بھائی! تم میرا کون کون سا نقصان پورا کرو گے۔ مجھے تو لوگوں نے زندگی بھر فٹ بال بنائے رکھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''ارے ارے، تُو تو عورتوں کی طرح ٹسوے بہانے لگا۔ تو مرد ہوکر رو رہا ہے۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تو آج کے بعد روئے گا نہیں۔''
تھوڑی دیر بعد ہی دو آدمی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے چہرے کرخت اور جسم مضبوط تھے۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔
وہ حاکم سے یوں ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔
''استاد! اپنی رہائی کی اطلاع تو دے دیتے؟'' ان میں سے ایک بولا۔
''بس یار، اچانک ہی میری رہائی کے آرڈر آگئے۔ مجھے لگتا ہے یہ سب بڑے صاحب کا کمال ہے۔''
''اب اٹھو، گھر چلو...... اپنا حلیہ درست کرو، کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں؟''
''کھانا تو میرے اس دوست نے کھلا دیا ہے۔'' حاکم خان نے میری طرف اشارہ کیا۔
ان دونوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے پہلی دفعہ انہیں وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا ہو۔
''یہ ......کون ہے استاد؟''
''ارے دوست ہے میرا۔'' حاکم نے کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ''شاہد! یہ میرا دوست بابر ہے لیکن ہم لوگ اسے ببر

کہتے ہیں۔ یہ اپنے دشمنوں کو کسی بھی حال میں زندہ نہیں چھوڑتا۔" اس نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مجید عرف جیدا ہے۔ نشانے بازی میں ماہر اور ڈرائیور ایسا کہ گاڑی کو جیٹ فائٹر کی رفتار سے بھگاتا ہے۔"

ان دونوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میرا نحیف ونزار ہاتھ گویا کچل کر رکھ دیا۔

"اب چلیں؟" ببر نے کہا۔

میں نے بیرے کو بلا کر بل کے بارے میں پوچھا اور جب میں اسے پیسے دے رہا تھا تو حاکم نے میرا ہاتھ روک لیا۔

"نہیں حاکم بھائی!" میں نے کہا۔ "یہ کھانا تو میری طرف سے تھا۔ مجھے مزید ذلیل مت کرو۔"

حاکم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ روانہ ہونے لگے تو میں نے حاکم سے کہا۔ "حاکم بھائی! اب مجھے بھی اجازت دو۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" حاکم نے کہا۔ "ارے بھئی، تو بھی ہمارے ساتھ چل رہا ہے، دیکھ انکار مت کرنا۔ تو نے مجھے پہلی دفعہ بھائی کہا تھا نا؟ میں بڑے بھائی کی حیثیت سے تیرے جھانپڑ ماردوں گا، چل بیٹھ گاڑی میں۔"

اس کی محبت بھری باتیں سن کر میں بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ نئے ماڈل کی ہنڈا سٹی تھی۔

"جیدے!" حاکم نے کہا۔ "ڈرائیونگ بہت آرام سے کرنا ورنہ میں بہت زوردار جھانپڑ ماروں گا۔"

"استاد! فکر مت کرو۔ میں آرام ہی سے چلوں گا۔ ہم لوگ گھر ہی تو جا رہے ہیں۔"

گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے پر پہنچی۔ حاکم مجھے بہت پیار بھرے انداز میں اندر لے گیا اور بولا۔ "شاہد! تو جب تک ٹی وی دیکھ، میں ذرا تازہ دم ہو کر آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد ایک ملازم میرے لیے ایک گلاس میں شربت لے آیا۔

میں ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگا۔ ٹی وی میں شہزاد کی گرفتاری اور رہائی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہاں ٹیبل پر مختلف اخبارات بھی پڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اخبارات میں تو یہ خبر ضرور ہوگی۔ اخبارات میں وہ خبر تھی۔ میں نے ہر اخبار کی خبر پڑھ ڈالی۔ اخبار نے صاف صاف لکھا تھا کہ فرسٹ ایئر کا امتحانی پرچہ وقت سے پہلے آؤٹ کرنے والا ملزم ضمانت پر رہا۔ جب پولیس نے چھاپا مارا تو ملزم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ہاسٹل کے کمرے میں شراب پی رہا تھا۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

حاکم تازہ دم ہو کر آیا تو میں ایک نظر میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کا بڑھا ہوا شیو غائب تھا اور رخساروں کی سفید جلد نظر آ رہی تھی جس میں سرخی کی آمیزش تھی۔ بالوں میں اس نے شیمپو کر لیا تھا اور وہ سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ جسم پر انتہائی نفیس شلوار سوٹ تھا اور پیروں میں خاصی قیمتی خالص چمڑے کی چپلیں۔

"حاکم بھائی! آپ کا تو حلیہ ہی بدل گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"جیل میں تو اچھے اچھوں کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔" حاکم نے کہا۔ "اب تو بھی جا کر نہا لے۔ میں تیرے لیے کپڑے نکالتا ہوں۔"

"میرے لیے کپڑے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ کے کپڑوں میں مجھ جیسے تین آدمی آجائیں گے۔"

"ویسے کپڑے تو تیرے یہی بہترین اور صاف ستھرے ہیں۔" اس نے کہا۔ مجھے یاد آگیا کہ اس دن تو میں خصوصی اہتمام کر کے کالج گیا تھا۔

"دیکھ شاہد!" حاکم نے سنجیدگی سے کہا۔ "انسان طاقتور اپنی جسمانی طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ ذہنی طاقت سے ہوتا ہے۔"

اس نے بھی وہی بات کی جو میں سوچتا تھا لیکن آج کے بعد میرا اس بات پر سے بھی یقین اٹھ گیا تھا۔ اب تو مجھے لگتا تھا کہ انسان طاقتور صرف اور صرف پیسے سے ہوتا ہے۔

"کیا سوچنے لگا؟" حاکم نے کہا۔

"حاکم بھائی! میں بھی اب تک یہی سمجھتا تھا کہ انسان کی اصل طاقت اس کی ذہانت ہوتی ہے۔ میں نے اب تک اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن آج میں اس ذہانت کے باوجود بری طرح مار کھا گیا۔"

"مار کھا گیا؟" حاکم نے کہا۔ "وہ کیسے؟"

نہ جانے کیوں مجھے حاکم پر بھروسا کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

میں نے اپنے دل کے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑ ڈالے۔

حاکم خان بہت غور سے میری بات سنتا رہا پھر بولا۔ "شاہد! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ناکام ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"میرے سینے میں تو انتقام کا جوالا مکھی دہک رہا ہے حاکم بھائی.... شہزاد نے مجھے بہت بری طرح مارا تھا اور وہ

بھی بغیر کسی وجہ کے۔"

"تو مجھے صرف ایک بار اس کا چہرہ کرا دے۔ پھر میں جانوں اور شہزاد جانے۔ میں اسے اتنی بری طرح ماروں گا کہ وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو جائے گا۔"

پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "تو نے کیا نام بتایا تھا اس لڑکی کا.... ہاں نمرہ! تو اس کے ساتھ بات کر، اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کر، میں دیکھتا ہوں کہ شہزاد تیرا کیا بگاڑتا ہے۔"

اس دن حاکم خان دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا، پھر مجھے جیدے کے ذریعے گھر تک چھڑوا دیا۔

مجھے حاکم خان کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ بھلا اسے کیا پڑی تھی کہ وہ میرے لیے شہزاد کی پٹائی کرتا۔

ابھی کالج میں نیا سیشن شروع ہونے میں دیر تھی اس لیے میں اگر کالج جاتا بھی تھا تو یوں ہی تفریحاً جاتا تھا۔

میں حسبِ عادت دوسرے دن کالج پہنچا تو شہزاد کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ جب اسے کالج سے باہر نکالا جا چکا تھا تو وہ یہاں کیوں آتا تھا؟

ابھی میں کالج کے لان میں بیٹھا ہی تھا کہ پیریڈ شروع ہونے کا گھنٹا بج گیا۔

اچانک یہاں بابر خان کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ میں ببر کے بجائے اسے بابر خان ہی کہتا تھا۔

وہ اس وقت خاصے معقول لباس میں تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور کاٹن کی بہترین پینٹ۔ اس نے بال بھی سلیقے سے سنوارے ہوئے تھے۔

وہ سیدھا میری طرف آیا اور بولا۔ "کیسے ہو شاہد!"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہاں، وہ شہزاد کون ہے؟"

"وہ سامنے جو کریم کلر کی ٹی شرٹ اور بلیو جینز میں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ جو اس وقت ہاتھوں سے اپنے بال سیٹ کر رہا ہے؟" بابر خان نے پوچھا۔

"ہاں، وہی۔" میں نے کہا۔

"بس، اب ہم اس سے نمٹ لیں گے۔" بابر خان نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ شہزاد کے پاس پہنچا اور چیخ کر بولا۔ "اپنی ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھو، یہ تمہارے باپ کا لان نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا پرابلم ہے؟" شہزاد کا ایک چمچہ بولا۔

"اگر یہاں سے گزرتے ہوئے میں اس کے پیروں میں الجھ کر گر جاتا تو؟"

"او بھائی، گرے تو نہیں نا؟" دوسرے چمچے نے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ میں اپنے گرنے کا انتظار کروں؟" بابر خان دہاڑا۔ "ورنہ یہ نواب کا بچہ یونہی ٹانگیں پسارے بیٹھا رہے گا۔"

"تو ہے کون اور کیوں فضول میں ہمارے گلے پڑ رہا ہے؟" شہزاد نے درشت لہجے میں کہا۔

"تو مجھے نہیں جانتا؟" بابر خان نے کہا اور اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر زوردار لات رسید کر دی، پھر اس کے منہ پر ایک لات ماری۔ دو لاتیں اس کے چمچوں کو بھی ماریں اور اچانک جیب سے ریوالور نکال لیا اور بولا۔ "آئندہ اس کالج میں نظر مت آنا ورنہ ابھی تو صرف میں نے گن نکالی ہے، آئندہ صرف نکالوں گا نہیں بلکہ گولی بھی ماردوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے گن جیب میں رکھی، ان تینوں پر حقارت بھری ایک نظر ڈالی اور جانے سے پہلے پھر گرج کر بولا۔ "آئندہ یہاں دکھائی مت دینا۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کالج کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ دوڑ کر شہزاد کے پاس پہنچے، میں بھی ان میں شامل تھا۔

شہزاد نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس شام میں نے سنا کہ شہزاد کو کچھ اچکوں نے اتنا مارا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں۔ اس کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا ہے اور جبڑے میں بھی فریکچر ہے۔

پہلے تو مجھے اس خبر پر یقین نہ آیا لیکن جب میں نے شہزاد اور اس کے ایک ساتھی کو اپنی آنکھوں سے اسپتال میں معذوروں کی طرح پڑے دیکھا تو مجھے یقین کرنا پڑا۔

پھر نیا سیشن شروع ہو گیا اور میں پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ پروفیسر شہاب اب مجھ سے بہت فری ہو گئے تھے۔ وہ اکثر مجھے اپنے کمرے میں بھی بلا لیتے تھے اور مجھے چائے بھی پلا دیا کرتے تھے۔ اب نمرہ مجھ سے بلاناغہ پڑھنے لگی تھی۔ ایک دن مجھے احساس ہوا کہ وہ تو بہت کچھ جانتی ہے۔ وہ پڑھتی نہیں ہے بلکہ میرے قریب رہنا چاہتی ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا تو اس سے دور دور رہنا شروع کر دیا۔ وہ اگر مجھے نظر بھی آجاتی تو میں اسے دیکھے بغیر گزر جاتا۔

ایک دن پروفیسر شہاب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولے۔ "شاہد! کل میرے گھر میں چھوٹی سی ایک تقریب

ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی اس میں ضرور شرکت کرو۔"
"سر! تقریب کی نوعیت تو بتائیں؟" میں نے کہا۔
"بھئی میرے بھتیجے کی برتھ ڈے ہے لیکن تم اس میں ضرور آؤ گے۔"
"سر! آپ حکم کریں اور میں نہ آؤں۔"
جب میں جانے لگا تو وہ بولے۔ "ہاں، اس لڑکی کو بھی لے آنا..... کیا نام ہے اس کا جسے تم پڑھاتے ہو.... ہاں نمرہ!"
"سر! اس سے تو آپ براہِ راست ہی کہہ سکتے ہیں۔ وہ بھلا میرے کہنے سے کیوں آئے گی؟" میں نے کہا۔
"یار! میں نے اس سے کہا تھا، وہ بولی کہ سر! مجھے آپ کے گھر کا علم نہیں ہے، پھر میں اکیلی کیسے آسکتی ہوں۔ اگر کوئی میرے ساتھ جانے والا ہوا تو میں ضرور آؤں گی۔"
"ٹھیک ہے سر!" میں نے کہا۔ "میں اس سے پتا کر لوں گا۔"
میں نے نمرہ کی تلاش میں لان اور کیفے ٹیریا کے کئی چکر لگائے۔ آخر وہ مجھے ایک جگہ مل ہی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔
میں نے اسے علیحدگی میں آنے کا اشارہ کیا کیونکہ اس وقت وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور خود میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
تھوڑی دور جا کر نمرہ بھی میرے پاس آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "نمرہ! پروفیسر شہاب نے تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی؟"
"ہاں، انہوں نے کہا تو تھا۔" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔
"پھر تم وہاں جارہی ہو یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔
"تم جارہے ہو کیا؟" نمرہ نے پوچھا۔ "اگر تم جارہے ہو تو میں بھی چلوں گی۔"
میں نے نمرہ سے کہا کہ تم وقتِ مقررہ پر تیار رہنا۔
نمرہ دوبارہ اپنی کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

پارٹی والے دن نمرہ نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ اس نے مجھ سے طے کیا تھا کہ میں اپنی گاڑی لے آؤں گی، پھر ہم دونوں وہاں چلیں گے۔ نمرہ اپنی گاڑی لے کر میرے گھر آگئی تھی۔ ہم لوگ پروفیسر شہاب کے گھر پہنچے تو وہاں گنتی کے چند ہی مہمان تھے۔ مجھے اور نمرہ کو بہت حیرانی ہوئی۔
میں نے ان سے پوچھا۔ "سر! باقی مہمان کہاں ہیں۔ آپ کا وہ بھتیجا کہاں ہے جس کی برتھ ڈے ہے اور....."
"بس ابھی آرہے ہیں اور وہ بھتیجا بھی۔" پروفیسر صاحب مسکرا کر بولے۔ "تم لوگ آرام سے بیٹھو۔" پھر وہ نمرہ سے بولے۔ "تم اپنے گھر بتا کر تو آئی ہونا؟"
"جی سر! میں اپنے گھر بتا کر آئی ہوں کہ میں شاہد کے ساتھ پروفیسر شہاب کی پارٹی میں جارہی ہوں۔"
پروفیسر مسکرائے اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔
اچانک ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ شہزاد تھا۔ نمرہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شہزاد مجھے دیکھ کر مکاری سے مسکرایا اور بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ نمرہ سے دور رہنا۔"
"لیکن مجھ سے تو پروفیسر صاحب نے کہا تھا کہ....."
"تم مجھ پر یہ پابندیاں لگانے والے ہو کون؟" نمرہ چیخ کر بولی۔
اچانک شہزاد نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ میں الٹ کر گرا تو اس نے جنون کی حالت میں دو چار لاتیں بھی رسید کر دیں۔ میرا سانس رکنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے ابھی میرا دم نکل جائے گا۔ میں نے شہزاد کی لاتوں سے بچنے کے لیے آنکھیں موند لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔
شہزاد نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔
"پروفیسر! یہ تو مر گیا۔"
"مر گیا؟" پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ "اس کی لاش اٹھا کر باہر پھینک دو۔ کپڑوں پر شراب چھڑک دو اور ایک خالی بوتل اس کے پاس بھی ڈال دو۔ دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ نشے کی حالت میں یہاں گرا اور سردی سے اکڑ کر مر گیا۔"
اس دن شدید سردی تھی اور لگتا تھا کہ کراچی کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر گیا ہو۔ یہ میرے کمزور اور نحیف و نزار جسم کا احساس تھا۔
پھر کسی نے میرے کپڑوں اور چہرے پر شراب انڈیلی اور دو آدمیوں نے مجھے اٹھا کر بیدردی سے باہر پھینک دیا۔ اگر وہ دونوں خود بھی نشے میں نہ ہوتے تو میری ہلکی سی کراہ سن کر بھی انہیں احساس ہو جاتا کہ میں ابھی مرا نہیں بلکہ زندہ ہوں۔
مجھے نمرہ کی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، پھر وہ آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔
ان بدبختوں نے مجھے بہت بیدردی سے پھینکا تھا۔

گرنے سے میرے جسم میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ خاص طور پر میری اس ٹانگ پر تو شدید چوٹ لگی تھی جو شہزاد نے اس سے پہلے بھی زخمی کی تھی۔

جہاں میں پڑا تھا، وہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا۔ یوں بھی وہ غیر آباد علاقہ تھا اس لیے اس راستے سے کسی کا گزر تقریباً ناممکن تھا۔

میں ہمت کر کے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا بمشکل تمام بنگلے کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیا۔ میرے پیر میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود مجھے چند گز کا وہ فاصلہ طے کرنے میں پسینا آ گیا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ مین گیٹ کی طرف کوئی چوکیدار نہ ہو لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ وہاں سے کچھ فاصلے پر نمرہ کی گاڑی ضرور کھڑی تھی۔ وہ گاڑی دو بنگلوں کے درمیان اس طریقے سے کھڑی تھی کہ یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس گاڑی میں آنے والا کس بنگلے میں آیا ہے۔ شاید اسی لیے ان لوگوں نے نمرہ کی گاڑی پر توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ وہاں جو گاڑیاں پہلے مجھے نظر آئی تھیں، وہ اب موجود نہیں تھیں۔

اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا۔ وہ لوگ نمرہ کے ساتھ اس کا بیگ نہیں لے گئے ہوں گے۔ اس میں گاڑی کی چابی بھی تھی۔ میں وہ گاڑی استعمال کر سکتا تھا۔ یوں تو میں گاڑی کو ڈائریکٹ بھی کر سکتا تھا لیکن میں اس امید پر بنگلے میں جانا چاہتا تھا کہ ممکن ہے، وہاں مجھے کوئی سراغ مل جائے کہ شہزاد اور شہاب میں کیا ملی بھگت تھی۔

مکان کی باؤنڈری وال پھلانگنا میرے لیے اس وقت بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں نے گھوم پھر کے بنگلے کا جائزہ لیا۔ آخر مجھے ایک جگہ نظر آ ہی گئی جہاں سے میں بنگلے کے اندر جا سکتا تھا۔ وہ راستہ دیکھنے میں آسان تھا لیکن مجھ جیسے کمزور اور زخمی آدمی کے لیے اندر جانا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

باؤنڈری وال پر چڑھتے ہوئے میرے گھٹنے میں ایک مرتبہ پھر شدید چوٹ لگی۔ پھر دیوار سے اندر کودنا اس سے بھی بڑا مسئلہ تھا لیکن میں آنکھیں بند کر کے اندر کود گیا۔ اندر کیاریوں کی بھربھری مٹی تھی لیکن مجھے ایک لمحے کو تو ایسا لگا جیسے میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔

میں کئی منٹ تک وہیں پڑا اپنا سانس درست کرتا رہا، پسینا پانی کی طرح میرے جسم سے بہہ رہا تھا۔ میں پھر ہمت کر کے اٹھا اور گرتا پڑتا اندر کی طرف بڑھا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ بنگلے میں اس وقت کوئی موجود نہیں ہے۔

بنگلے کا تالا کھولنے کے لیے مجھے کسی ہیئر پن یا لوہے کے سخت تار کی ضرورت تھی۔ وہ دونوں ہی چیزیں میرے پاس نہیں تھیں۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے برآمدے سے نیچے ایک کی چین نظر آئی۔ میں نے وہ کی چین اٹھا لی۔ پہلے تو میں نے باری باری اس میں موجود ہر چابی دروازے پر آزمائی، پھر اس کی چین کو کھول کر گرل میں پھنسایا۔ اس کا اسٹیل کا رنگ کسی حد تک سیدھا ہو گیا۔

میں نے اس کی مدد سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے تو میری نظر نمرہ کے بیگ پر پڑی۔ میں نے وہ بیگ اٹھا کر اپنے شانے سے لٹکا لیا۔ پھر میں نے شہاب کی الماری کھول لی۔ اس میں اس کے کپڑے اور کالج کی کچھ فائلیں تھیں۔

اسی الماری میں ایک سیف بھی تھا۔ میں نے وہ سیف کھولنے کی کوشش کی تو مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ اس کا تالا کسی طور کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میری نظریں گھڑی پر تھیں، ٹھیک اکیس منٹ بعد میں وہ سیف کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

سیف کھلتے ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس میں بھارتی کرنسی کے بنڈل، امریکن ڈالرز اور پاؤنڈز کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

اس میں نیچے کی طرف چند فائلیں بھی تھیں۔ میں نے وہ فائلیں سیف سے نکال لیں۔

انہیں پڑھ کر میرا جسم پھر پسینے میں ڈوب گیا۔ شہاب اور شہزاد کسی بھارتی اور یہودی لابی کے لیے کام کر رہے تھے اور یہاں ایک علیحدگی پسند تنظیم کو فنڈنگ بھی شہاب کرتا تھا۔

ایک فائل نمرہ کے بارے میں بھی تھی۔ اس کے مطابق نمرہ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی بیٹی تھی اور وہ لوگ اسے اغوا کر کے اس اہلکار کو بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے کمرے میں اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے چھوٹا سا ایک سوٹ کیس دکھائی دیا۔ اس میں بھی شہاب کے کچھ کپڑے، کرنسی نوٹ اور دو تین فائلیں تھیں۔ شاید اس نے وہ سوٹ کیس ہنگامی طور پر فرار ہونے کے لیے رکھا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے نکال کر باہر پھینکے اور اس میں سیف سے نکلی ہوئی تمام فائلیں اور کرنسی نوٹ بھر کے سوٹ کیس بند کر دیا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں بری طرح اچھل پڑا لیکن میں نے ٹیلی فون ریسیو کرنے کی حماقت نہیں کی۔ گھنٹی بج بج کر خاموش ہو گئی۔

میں نے وہیں سے حاکم کو ٹیلی فون کیا لیکن وہ موجود

نہیں تھا۔

میں سوٹ کیس اور نمرہ کا بیگ لے کر مین گیٹ سے باہر آیا اور نمرہ کی گاڑی میں بیٹھ کر مین روڈ پر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے نمرہ کا پتا معلوم تھا، نہ اس کا ٹیلی فون نمبر کہ میں اس کے والد کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیتا۔ پولیس کے پاس میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس بڑے سے بڑے معاملے میں ''مک مکا'' کر لیتی ہے اور مجرم اور ملک کے غدار دندناتے پھرتے ہیں۔

میں نے شہاب کے بنگلے سے نکلتے وقت ایک ضروری کام یہ کیا تھا کہ اس کی الماری سے ایک دور مار رائفل اور ماؤزر کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے فاضل میگزین بھی رکھ لیے تھے۔ حاکم کے ساتھ رہ کے میں نے نشانے بازی تو سیکھ لی تھی لیکن میرا نشانہ ابھی اتنا اچھا نہیں تھا۔ بہرحال بُرے وقت میں یہ ہتھیار میرے کام آ سکتے تھے۔

جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں اپنے گھر آ گیا کہ ممکن ہے حاکم وہاں مجھ سے رابطہ کرے۔

میں گھر میں یوں داخل ہوا جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ ماریہ ایسے موقعوں پر مجھے بعض اوقات بڑے کارآمد مشورے دیا کرتی تھی۔

اس کے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آنے کو کہا۔

جب وہ آئی تو بہت چہک رہی تھی۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ بھی فکرمند ہو گئی اور بولی۔ ''شاہد! خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے ماریہ!'' میں نے کہا۔ ''نمرہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔'' پھر میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

ماریہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''شاہد! میرا خیال ہے کہ میں اس جگہ کے بارے میں جانتی ہوں جہاں وہ لوگ نمرہ کو لے گئے ہیں۔''

''تم جانتی ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، تمہیں یاد ہے کہ ایک دفعہ اسپتال سے میں نے ان دو لڑکوں کا....''

''یس....'' میں جوش میں کھڑا ہوا پھر کراہ کر بیٹھ گیا۔ ''وہ لوگ یقیناً نمرہ کو وہیں لے گئے ہوں گے۔''

''تم ایسا کرو، پہلے تو پولیس کو انفارم کرو۔'' ماریہ نے کہا۔

''پولیس پر تو مجھے ذرہ برابر بھروسا نہیں ہے۔ وہ لوگ

تو ہمیشہ بڑی بڑی رقوم لے کر مجرموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔"
"سبھی پولیس والے ایسے نہیں ہوتے۔" ماریہ نے کہا۔
"یار! میں اس وقت تمہارا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس فلیٹ کا پتا بتاؤ، میں خود ہی ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔"
"تم!" ماریہ نے تضحیک آمیز انداز میں مجھ سے کہا۔ "تم سے اپنے پیروں پہ چلنا تو محال ہے، تم ان لوگوں سے نمٹو گے؟"
"ارے یار! تم مجھے ایڈریس بتا رہی ہو یا نہیں؟"
"ایک منٹ ٹھہرو، میں کوئی جرسی اور شال وغیرہ لے لوں، باہر شدید سردی ہے۔"
"تمہیں باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"
"اس لیے کہ تم گھنٹوں وہ ایڈریس ڈھونڈتے رہو گے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔
وہ دس منٹ بعد آئی تو اس نے جرسی بھی پہن لی تھی اور اپنے جسم پر شال بھی لپیٹ لی تھی۔

☆☆☆

ہم لوگ اس بلڈنگ پر پہنچے جہاں بقول ماریہ وہ فلیٹ تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے گاڑی وہاں سے کچھ فاصلے پر اس انداز میں کھڑی کی کہ اگر ہمیں وہاں سے ایمرجنسی میں فرار ہونا پڑے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔
مین گیٹ پر ایک اونگھتا ہوا چوکیدار بھی موجود تھا۔ ہم لوگوں نے ایک ساتھ اندر جانے کے بجائے تھوڑے وقفے کے بعد اندر جانے کا فیصلہ کیا۔
پہلے ماریہ اندر داخل ہوئی اور یوں آگے کی طرف بڑھی جیسے وہ اس بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں رہتی ہو یا اکثر وہاں آتی رہتی ہو۔
چوکیدار نے ایک نظر اسے دیکھا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ماریہ کا اعتماد اور اس کی دلکش شخصیت دیکھ کر وہ کچھ مرعوب سا ہو گیا۔
جب ماریہ لفٹ کے نزدیک پہنچ گئی تو میں اندر داخل ہوا۔ میری شخصیت میں اتنی دلکشی تھی نہ چہرے پر ماریہ کی طرح کشش۔
چوکیدار نے مجھے روک لیا اور بولا۔ "او، کدھر جاتا ہے، کس سے ملنا ہے؟"
"خان صاحب! میں ڈاکٹر صاحب کے فلیٹ میں جا رہا ہوں۔"
میرا اندازہ تھا کہ ہر بلڈنگ میں اکثر کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور موجود ہوتا ہے۔
"ڈاکٹر امجد؟" اس نے کہا۔
"ہاں خان! اور اس بلڈنگ میں کتنے ڈاکٹر ہیں ان کے علاوہ؟"
"ڈاکٹر تو دو ہیں۔" چوکیدار نے کہا۔ "ڈاکٹر امجد اور ڈاکٹر رشید۔"
"مجھے ڈاکٹر امجد سے ملنا ہے۔ میں ان کا مریض ہوں اور میرے پیر میں اس وقت شدید تکلیف ہے۔"
"اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ تیسرے مالے پر چھٹا فلیٹ ڈاکٹر صاحب کا ہے۔" اس نے ہمدردی سے کہا۔
مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں چوکیدار وہ بیگ کھولنے کی فرمائش نہ کر دے جو میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھا اور اس میں ایک فولڈنگ رائفل اور ماؤزر تھا۔
اس کے اشارے پر میں لنگڑاتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔
مزید سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ لفٹ اس وقت بند تھی۔
"اب کیا کریں؟" میں نے ماریہ سے کہا۔
"تم شاید بھول رہے ہو کہ ہر عمارت میں لفٹ کے ساتھ ساتھ زینے بھی ہوتے ہیں۔" ماریہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"لیکن میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں سات فلور چڑھ کر اوپر جاؤں۔" میں نے کہا۔
"تو پھر بہتر ہے کہ واپس چلو اور نمرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔" ماریہ کے لہجے میں طنز تھا۔
پھر میں گرتا پڑتا، ماریہ کا سہارا لے کر ساتویں فلور تک پہنچا۔
ماریہ نے اشارے سے اس فلیٹ کی نشاندہی کی لیکن وہاں تو پورے فلور پر اندھیرا تھا۔
یہ اندھیرا ایک طرح سے ہمارے حق میں مفید ہی تھا۔
میں نے چند منٹ رک کر اپنا سانس درست کیا۔ میری ٹانگ میں اس وقت شدید تکلیف ہو رہی تھی اور ایک پین کلر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن پین کلر کے بجائے میرے بیگ میں لائف کلر گولیاں تھیں۔ تالا کھولنے کے اوزار تھے۔
میرا سانس کچھ بحال ہوا اور حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں آہستہ آہستہ اس فلیٹ کی طرف بڑھا۔ اس فلیٹ میں سے باتوں کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ دروازہ لاک ہے۔
میں نے اپنے بیگ سے تار نکالنے کی کوشش کی پھر مجھے

خیال آیا کہ ماریہ کے بالوں میں بھی تو ہیئر پن ہو گی۔
میں نے اس سے ہیئر پن لی اور دروازے کا تالا کھول لیا۔ فلیٹ کے بیرونی دروازے اور اندرونی دروازے کے درمیان پتلا سا چار ساڑھے چار فٹ لمبا کوریڈور تھا۔ اس کے بعد ایک اور دروازہ تھا۔ اب باتوں کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔
میں نے ماؤزر نکالا اور اسے لوڈ کر کے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔
میں نے جھانک کر دیکھا، کمرے میں ایک طرف نمرہ بندھی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ خوفناک حلیوں والے... آدمی بھی تھے۔ ان میں ایک تیسرا آدمی بھی تھا، اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ چہرے مہرے سے بندر لگ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر تلک بھی لگا ہوا تھا۔
ایک طرف پروفیسر شہاب بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا جس کا اوپری جسم برہنہ تھا اور اس نے صرف پینٹ پہن رکھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس پر شدید تشدد کیا گیا ہے۔ وہ اس سے نہ جانے کس چیز کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔
اب کسی بھی لمحے باہر سے کوئی آ سکتا تھا۔ میں نے ماؤزر کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھاما اور گرج کر بولا۔
"بس کرو شہاب! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس بلڈنگ کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا ہے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ اپنے ہتھیار پھینک دو۔"
میری آواز سن کر شہاب یوں اچھلا جیسے اس کا پاؤں جلتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ میں نے اپنی آواز اور لہجہ حتیٰ الامکان بدلنے کی کوشش کی تھی۔
"کون ہو تم اور اندر کیسے آئے؟" شہاب دہاڑا۔ "میں ایک معزز پروفیسر ہوں۔ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے جو اس بلڈنگ کو پولیس نے گھیر لیا ہے؟"
"تم ہتھیار پھینکتے ہو یا نہیں؟" میں نے ڈپٹ کر کہا۔
اس کے ساتھ ہی میں نے ایک فائر کر دیا۔
فائر کے دھماکے سے پوری عمارت لرز اٹھی۔ شہاب نے گھبرا کر اپنا پسٹل پھینک دیا۔
فرش پر گرے ہوئے نیم برہنہ شخص نے بہت پھرتی دکھائی اور آسانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس نے اس کی پروا کیے بغیر شہاب کا پھینکا ہوا پسٹل اٹھا لیا اور غرا کر بولا۔ "اب تم میں سے کسی نے بھی حرکت کی تو میں تم سب کو بھون کر رکھ دوں گا۔"

طاقتور شے

"عورت کی شکل وصورت میں قوانین سے زیادہ قوت ہوتی ہے اور اس کے آنسوؤں میں ہمارے دلائل سے زیادہ طاقت ہے۔

واقفیت

ایک اخبار نویس نے مسز آئن اسٹائن سے سوال کیا۔
"کیا آپ اپنے خاوند کے نظریۂ اضافت کو سمجھتی ہیں؟"
وہ کچھ دیر سوچ کر بولیں۔
"وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ لیکن میں اس نظریے کے خالق کو خوب سمجھتی ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

تحفہ

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ جاوید، ریحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"
"اس کے تحفے دیکھ کر۔"
"تحفے دیکھ کر؟"
"ہاں، وہ ریحانہ کو ایسے تحفے پیش کرتا ہے جنہیں عرصہ دراز تک گھر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

دوستی

وہ اپنے دوست کے پاس اکثر و بیشتر جاتا رہتا تھا۔ ایک دن کسی مست و بے فکرے نے اس سے دریافت کیا۔
"یہ تم ہر روز کس کے پاس جاتے رہتے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔ "اپنے دوست کے پاس۔"
"کیوں؟" بے فکرے نے سوال کیا۔
اس نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ ہم دونوں کا رشتۂ دوستی اور زیادہ مضبوط ہو جائے۔"
بے فکرے نے ہنس کر کہا۔ "دوستی کو مضبوط کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تم دونوں کی دوستی بہت زیادہ مضبوط ہو جائے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دوست سے کبھی کبھی ملا کرو۔"

(منڈی بہاؤالدین سے حکیم اللہ کا نادر نسخہ)

"اتنے جوش میں مت آؤ کرنل!" شہاب نے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ تم نے اس سے پہلے بھی ایک غیر قانونی کام کیا ہے۔"

"وہ کام تو میں نے لاعلمی میں کیا تھا اور میں اس کا کفارہ بھی ادا کروں گا لیکن تجھ جیسے کمینے شخص کو نہیں چھوڑوں گا۔"

ان لوگوں نے تشدد کر کے نہ صرف کرنل کا حلیہ بگاڑ دیا تھا بلکہ اس کا سر بھی مونڈ دیا تھا۔

ابھی میں اندر کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کوئی گرج دار آواز میں بولا۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ماؤزر پھینک دیا۔ ماریہ کے ہاتھوں میں تو کوئی ہتھیار ہی نہیں تھا۔

"اب اندر چلو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ میں آواز سے پہچان گیا کہ وہ شہزاد ہے۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو شہزاد نے میری کمر پر زوردار لات رسید کی۔ میں اندر جا گرا۔ میرے پیچھے ماریہ بھی آ کر گری۔

پھر شہزاد کرنل سے مخاطب ہوا۔ "او ہیرو! اب تم بھی رائفل پھینک دو۔ تم نے بہت حبّ الوطنی دکھالی۔ اب یا تو اپنی بیٹی کی زندگی بچاؤ، یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

کرنل نے بے بسی سے ان لوگوں کی طرف دیکھا، پھر رائفل پھینک دی۔

"ادّھے تُو؟" شہاب نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تُو زندہ کیسے بچ گیا؟ خیر، اب تو زندہ نہیں رہے گا اور یہ بلبل کون ہے جسے تو ساتھ لیے گھوم رہا ہے۔ ویسے مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ تجھ میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ لڑکیاں تیری طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ تجھ میں آخر ہے کیا؟ ہاں بیٹا! کہاں ہے وہ پولیس جس نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے؟" شہاب نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "اور پولیس نے گھیر بھی لیا ہے تو اسے یہاں کیا ملے گا؟ تمہاری اور اس گنجے کی لاش۔" اس نے کرنل کی طرف اشارہ کیا۔ "دونوں لڑکیوں کو تو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ لڑکیاں جیسی بھی ہوں، کام آتی ہیں۔ یہ تو پھر خوب صورت لڑکیاں ہیں۔"

کرنل کی پھینکی ہوئی گن ابھی تک وہاں پڑی تھی۔ شہزاد بھی اب اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جھپٹ کر وہ گن اٹھاؤں اور شہاب کا سینہ چھلنی کر دوں لیکن میں ایسا صرف سوچ سکتا تھا، کر نہیں سکتا تھا۔ میرا جسم زخموں سے چور تھا۔ پیر میں شدید تکلیف تھی اور چکر سے آ رہے تھے۔

پھر میں نے سوچا کہ مجھے اپنی قوتِ ارادی سے کام لینا پڑے گا اگر میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے پڑا رہا تو واقعی یہاں میری لاش پڑی ہوگی۔

میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کی اور اچانک جھپٹ کر رائفل اٹھالی پھر اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، میں نے شہزاد کے چمچوں میں سے ایک پر فائر کر دیا تاکہ یہ لوگ اسے محض دھمکی نہ سمجھیں۔

اس نے بھیانک چیخ ماری اور الٹ کر گرا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ سب کو بھون کر رکھ دوں گا۔ مجھے تو بس مرنا ہے لیکن میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس وقت میرے لہجے میں ایسی سفاکیت تھی کہ ان لوگوں نے خوف زدہ ہو کر ریوالور پھینک دیے۔

کرنل نے جھپٹ کر میرا ماؤزر اٹھا لیا جو شہزاد کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ دہاڑ کر بولا۔ "تم لوگ سب زمین پر اوندھے لیٹ جاؤ اور اپنے ہاتھ سر سے اوپر کر لو۔"

وہ سب فرش پر لیٹ گئے۔ ماریہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر نمرہ کے ہاتھ پیر کھولے اور اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا پھر وہ کچن سے پانی کی بوتل لے آئی اور اس نے نمرہ کو پانی پلایا تو وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

"یار! ایک گلاس پانی مجھے بھی پلا دو۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے ہیں اور مجھے ان تمام خبیثوں کو ابھی ٹھکانے لگانا ہے۔ پولیس کو اب یہاں ان مردودوں کی لاشیں ملیں گی، لڑکیاں تو ہمارے ساتھ جائیں گی، لڑکیاں تو یوں بھی کام کی ہوتی ہیں۔" میں نے شہاب کا جملہ دہرا دیا۔

"دیکھو ادّھے!" شہاب نے کہا۔ "مجھ سے سودے بازی کر لو۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ تم نے کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہ کیا ہوگا؟"

میں لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا اور جھک کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور کہا۔ "حرام زادے! تجھے تو میرا نام بھی معلوم نہیں ہے۔ میرا نام ادّھا نہیں ہے۔"

"وہ عادتاً میرے منہ سے نکل گیا۔" شہاب نے کہا۔ "شاہد! تم میری بات پر غور کرو۔ تم فائدے میں رہو گے۔"

"اور اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اس کے بدلے تمہیں سب کچھ بھول جانا ہوگا۔" شہاب نے کہا۔

"کیا بھول جانا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "مجھے اس بھولنے کی تفصیل تو بتاؤ۔"

''تم بھول جاؤ گے کہ تم نے یہاں کیا دیکھا تھا، تم بھول جاؤ گے کہ تم نمرہ کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔تم یہ بھی بھول جاؤ گے کہ تم نے یہاں کس کس کو دیکھا تھا۔''

''اور تم ان لوگوں کا کیا کرو گے؟''

''میں ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردوں گا۔''

''اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟'' میں نے کہا۔

''تمہیں کم سے کم دس لاکھ ڈالرز ملیں گے.... نقد۔''

''اور زیادہ سے زیادہ؟'' میں نے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ تم بولو۔'' اس نے کہا۔

''مجھے بیس لاکھ ڈالرز دو گے، وہ بھی نقد۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں بیس لاکھ ڈالرز دوں گا۔''

''یہ تو ہوئی تمہاری قیمت۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''باقی لوگوں کو کیا فری میں چھڑاؤ گے؟ ان میں سے ہر کسی کی قیمت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

جواب میں شہاب نے مجھے غلیظ گالیاں دیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر پھر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا پھر شہزاد کے چچے سے مخاطب ہوا۔ ''تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے؟''

وہ جلدی سے سہمے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''تو پھر لو شہزاد کو اتنا مارو کہ اس کے حواس گم ہو جائیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور شہزاد کو ہلکے ہلکے ہاتھوں سے مارنے لگا۔

''زور سے مارو ورنہ تمہارا حشر بھی وہی کروں گا جو تمہارے ساتھی کا کر چکا ہوں۔''

وہ وحشیانہ انداز میں شہزاد کو لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مارنے لگا۔ شہزاد نڈھال ہو کر فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔

اچانک وہاں بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی تو میں بھی چونک اٹھا۔ شہاب تو یوں چونکا تھا جیسے اس نے لاعلمی میں بجلی کا ننگا تار پکڑ لیا ہو۔

بھاری بوٹوں کی دھمک سے پوری بلڈنگ گویا لرز رہی تھی۔ دھمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ آنے والے کم سے کم پندرہ یا اس سے زیادہ ہیں۔ پھر فلیٹ میں پولیس کے دو سب انسپکٹر اور ملٹری پولیس کے چار چاق و چوبند جوان داخل ہوئے۔ ان لوگوں نے ان تمام لوگوں کو حراست میں لے لیا۔ مرنے والے کی لاش ان لوگوں نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔

☆☆☆

''تم تو کہہ رہے تھے کہ پولیس ہمیشہ ''مک مکا'' کر لیتی ہے۔'' ماریہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ پولیس کو میں نے وہاں بلایا تھا، اس وقت جب میں جرسی اور شال لینے اندر گئی تھی۔''

پولیس نے شہاب اور شہزاد کو گرفتار کر کے انہیں آرمی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا تھا۔ شہاب ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا اور...... علیحدگی پسندوں کے ایک گروپ کی نہ صرف قیادت کر رہا تھا بلکہ انہیں فنڈز بھی فراہم کر رہا تھا۔ میں شہاب کے سیف سے جو کاغذات اور کرنسی لے کر آیا تھا، ان کی بنیاد پر اسے سزائے موت ہو سکتی تھی۔ شہاب کے ساتھ جو بھارتی گرفتار ہوا تھا وہ ''را'' کا ایک اہم افسر تھا۔

☆☆☆

انٹر...... کرنے کے بعد میں نے آرمی میں اپلائی کیا اور مجھے سلیکٹ کر لیا گیا۔ پھر دو سال کے اندر اندر مجھے کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ مجھے آرمی انٹیلی جنس میں ہی بھیجا گیا تھا۔ میں نے کیپٹن کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد ہی شادی کی تھی۔ اب آپ لوگ اندازہ لگائیں کہ میری بیوی کون ہے؟ جی نہیں آپ کا اندازہ غلط ہے، میری بیوی ماریہ نہیں نمرہ ہے۔ ماریہ سے میری دوستی ضرور تھی، میں خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن جس رات میں نے ماریہ کے ساتھ اس فلیٹ پر دھاوا بولا تھا، اسی رات ان کے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ مہمان دراصل ماریہ کو دیکھنے کے لیے آئے تھے اور اسے پسند کر گئے تھے۔

ہاں، میں راشد بھائی کو اکثر طنز کرتا ہوں کہ پاکستان آرمی نے بونوں کی فوج بنالی ہے، اب آپ جیسے دراز قد کہاں جائیں گے؟

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا کسی خطرناک صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ورزشی جسم اور دلکش چہرہ ضروری ہے؟ جی نہیں، اس کے لیے صرف اور صرف ذہانت کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ ذہانت اللہ تعالیٰ نے مجھے دل کھول کر عطا کی ہے اور میں اب بھی وطن فروشوں سے لڑ رہا ہوں اور جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے میں ان دشمنانِ وطن سے لڑتا رہوں گا۔